ماہنامہ

کرن

اگست 2017

کرن کا دسترخوان

چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

بانی ——— محمود بابر فیصل
نگران ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ——— عامر محمود
نائب مدیرہ ——— شعاع عمیر
مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
اشتہارات ——— خالدہ جیلانی















زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 7000 روپے









اگست 2017

جلد 40 شمارہ 5

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

اداریہ

ماہِ اگست کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

14 اگست 1947ء کا دن، وہ عہد ساز دن تھا جب قائدِ اعظم محمد علی جناح کی زیرک قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہدِ آزادی کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور پاکستان نامی پہلی نظریاتی مملکت دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئی۔

قیامِ پاکستان کی سترویں سالگرہ مناتے ہوئے آج پیچھے مڑ کر دیکھیں تو لگتا ہے کہ وہ خواب امیدیں، وہ نظریات جن کی بنا پر پاکستان کو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی، کہیں پیچھے ہی رہ گئے ہیں۔ اخوت، ایثار، قربانی، ترقی اور نظریاتی اساس پر زندگی گزارنے کا عزم ہوسِ ملک گیری اور طاقت کے اندھا دھند استعمال میں نہ جانے کہاں رہ گیا۔

غیروں کی ریشہ دوانیوں کے باعث ہم آدھا ملک گنوا چکے۔ باقی ماندہ ملک بھی عالم گیر سازشوں کی زد میں ہے۔ جب بھی پاکستان ترقی کی شاہراہ پر قدم دھرتا ہے تو اندرونی و بیرونی عناصر محض اپنے مفادات کے حصول کے لیے اس کی راہ میں روڑے اٹکانے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جشنِ آزادی مناتے ہوئے اس بات کو دھیان میں رکھیں کہ پاکستان ہے تو ہم ہیں۔ ہماری شناخت، ہمارا حوالہ، ہمارا وجود پاکستان سے ہے۔ پروردگار پاکستان کو ہمیشہ خوش حال، شاداب اور قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

قارئین کو یومِ آزادی مبارک۔

محمود خاور،

کچھ لوگ دنیا میں محبتیں بانٹنے اور سمیٹنے آتے ہیں۔ محمود خاور بھی ایسی ہی ہستی تھے۔ بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول اور سب سے محبت کرنے والے تھے۔ آج بھی وہ ہمارے اور اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔

20 اگست کو محمود خاور صاحب کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں کو درگزر کرے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- "دیارِ غیر میں 14 اگست" مختلف شخصیات سے شاہین رشید کا سروے،
- اداکارہ "کبریٰ خان" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "علیزے طاہر" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"،
- "عاصمہ ابراہیم" کے "مقابل ہے آئینہ"،
- "من موہ کو کی بات کی مانو" آسیہ مرزا کا سلسلے وار ناول،
- "راپنزل" تنزیلہ ریاض کا سلسلے وار ناول،
- "بہجورِ نگیں"، مصباح علی سید کا مکمل ناول، • "روشن صبحیں، خوشگوار شامیں" صائمہ اقبال کا مکمل ناول
- "نیم کا پیڑ" غزالہ جلیل راؤ کا ناول، • "ملال" نبیلہ ابر راجہ کا دلچسپ ناولٹ،
- "بیلا" منشا محسن علی کے ناولٹ کی آخری قسط،
- طیبہ عنصر مغل، سحرش فاطمہ اور یمنیٰ اختر کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

"کرن کا دسترخوان" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیشِ خدمت ہے۔



چاند سورج کو روشنی بخشی
پھولوں کلیوں کو تازگی بخشی

ذرے ذرے کو زندگی بخشی
اپنے ہونے کی آگہی بخشی

جس کو نعمت حیات سی بخشی
اس کو لذت ممات کی بخشی

اپنے بندوں کو بندگی بخشی
نورِ ایماں کی سرخوشی بخشی

زہد و تقویٰ پہ برتری بخشی
ورنہ سب کو برابری بخشی

چار شعروں پہ شاد ہوں کہ فصیح
رب نے توفیق حمد کی بخشی

شاہین فصیح ربانی



مدینہ مدینہ مدینہ ہے کافی
یہی رب سے ملنے کا زینہ ہے کافی

مدینہ تو ہے رحمتوں کا خزینہ
ہمارے لیے یہ خزینہ ہے کافی

الٰہی مجھے بھی دِکھا دے مدینہ
وہاں چند لمحوں کا جینا ہے کافی

جو مل جائے نعلین رکھنے کا سر پہ
تو سر کے لیے یہ قرینہ ہے کافی

اگر وہ نگاہِ کرم سے پلا دیں
تو پھر زندگی بھر وہ پینا ہے کافی

رشید ملنگی جو سچ پوچھیے تو
مہکنے کو اُن کا پسینہ ہے کافی

رشید ملنگی

کبریٰ فاطمہ خان سے ملاقات

شاہین رشید



ہم اکثر سوچتے ہیں کہ وہ زمانہ کیسا ہوگا جب ایک ہی ڈرامے میں کام کرنے کے بعد فن کار شہرت کی بلندیوں پہ پہنچ جاتا ہے۔ اگر وہ زمانہ ایسا تھا تو یہ زمانہ بھی کچھ کم نہیں۔ آج بھی اچھا کام کرنے والے راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ زیادہ دور کیوں جائیں، آج کی مقبول فنکارہ "کبریٰ خان" اس کی مثال ہیں، جس نے "سنگ مرمر" میں شیریں کا کردار کرکے اپنے آپ کو ایسا منوایا کہ بقول اس فنکارہ کے کہ 90 فیصد پروڈیوسر اور ڈائریکٹر مجھے اپنے ڈراموں میں بک کرنا چاہتے ہیں۔

☆ "کیا حال ہیں کبریٰ خان... بہت اچھا پرفارم کرتی ہو۔ ماشاء اللہ سے؟"

○ "جی اللہ کا شکر ہے اور بہت شکریہ تعریف کا۔"

☆ "سنگ مرمر میں بہترین پرفارمنس دی اس سیریل سے پہلے کچھ کیا یا یہ پہلا سیریل ہے؟"

○ "دراصل میں مجھے اداکاری اور ماڈلنگ سے بہت لگاؤ تھا۔ میں چونکہ لندن میں رہتی تھی تو لندن میں ہی "احمد بٹ" اور "فاطمہ بٹ" ایک ڈرامہ بنا رہے تھے۔ بلکہ وہ اس ڈرامے میں کام کررہے تھے تو مجھے بھی اس ڈرامے میں بک کرلیا گیا۔ اس کے بعد انہی کے کہنے پر میں نے پاکستان کے شوبز میں قدم رکھا اور وہ بھی ایسے کہ ان لوگوں نے اپنی ایک فیملی تقریب میں مجھے بلایا اور میرا تعارف کرایا گیا اور مجھے دو کمرشلز آفرز ہوئے، جو کہ میں نے کیے۔ یہ بات ہے دو سال پرانی کمرشلز کرنے کے بعد میں واپس لندن چلی گئی۔ اس کے بعد فلم "نامعلوم افراد" کے لیے آفر ہوئی اور میں نے اس میں کام کیا۔"

☆ "آپ نے بتایا کہ آپ لندن میں رہتی تھیں تو کچھ بتائیں اپنے بارے میں؟"

○ "جی میرا نام کبریٰ خان ہے اور میرا نام میری امی نے رکھا تھا اور میرا پورا نام کبریٰ فاطمہ خان ہے۔ مگر اتنا لمبا نام لیتا کون ہے۔ ہاں... پیار کے بہت سے مختصر نام رکھے ہوئے ہیں میرے چاہنے والوں نے... میں 16 جون 1996ء میں ملتان میں پیدا ہوئی اور میری دو بہنیں ہیں۔ میری امی "شیعہ" ہیں جبکہ والد "سنی" اور اللہ کا شکر ہے کہ مذہب کے معاملے میں امی، ابو کا کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ ویسے ہم پٹھان ہیں اور گھر میں اردو اور انگریزی ہی بولتی ہوں۔ میں

لندن میں موٹر اسپورٹس انجینئرنگ پڑھ رہی تھی۔ مگر شوبز نے میری پڑھائی کو ادھورا کردیا۔ اب ٹائم ملے گا تو اپنی پڑھائی مکمل کروں گی۔ ابھی تو میرا سارا فوکس شوبز کی طرف ہے اور مجھے یہ فیلڈ بہت پسند آئی ہے۔ عزت، شہرت، پیسا کیا کچھ نہیں ہے اس فیلڈ میں۔ ابھی تو کوئی مجھ سے شادی کا نام بھی نہ لے۔"

☆ "شوبز میں (پاکستان کی) کیسے آئیں؟"

○ "جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں لندن میں تھی اور احمد علی بٹ اور فاطمہ بٹ ان کی بیٹیوں سے میری دوستی تھی تو ان کے ذریعے سے اس فیلڈ میں آئی اور ایک شادی کی تقریب میں پاکستان آئی تو یہاں پھر ڈراموں کی آفرز آنا شروع ہوگئیں۔"

"امید تھی کہ پاکستان جاؤں گی اور اس طرح آفرز آنا شروع ہوجائیں گی؟"

"ایمان داری سے بتاؤں۔۔۔ ایسی کوئی امید نہیں تھی۔ اور اگر پتا ہوتا تو بہت پہلے آجاتی۔ اگر یہاں پاکستان میں شادی میں نہ آنا ہوتا تو شاید اس فیلڈ میں بھی نہ ہوتی۔"

☆ "پہلا ڈراما؟"

○ "سنگ مرمر۔"

☆ "سنگ مرمر" میں "شیریں" کا رول کیا۔ بہت ہی معصوم اور بھولی بھالی اور ڈری سہمی لڑکی دکھایا گیا۔ اصل لائف میں اس کا کتنا عکس ہے؟"

○ "اصل زندگی میں ایسی ہوں۔ مگر مکمل طور پر نہیں۔ کچھ کچھ عکس ہے اور اتنی سادہ بھی نہیں ہوں جیسی دکھائی گئی ہوں۔ کیونکہ یہ فیلڈ ہی ایسی ہے کہ گلیمرس ہونا پڑتا ہے۔"

☆ "سنگ مرمر" کا کردار کرنے میں مشکل ہوئی؟ یا یہ کردار کیسا لگا آپ کو؟

○ "ہاں تھوڑی مشکل ہوئی۔ کیونکہ میں جس ماحول سے آئی تھی وہاں کافی آزادی تھی اور یہ قبائلی رول تھا۔ ویسے مجھے اس طرح کے کردار بہت پسند ہیں جس میں آپ کی شخصیت کا عکس نہ ہو، آپ مکمل طور پر کچھ اور لگیں، مجھے ذاتی طور پر معاشی اور سماجی ماحول کے ڈرامے بہت پسند ہیں۔ ان میں ایک پیغام ہوتا ہے۔"

☆ "پہلا سیریل ہی سینئر فن کاروں کے ساتھ کیا۔ کیسا لگا اور آپ ان کے بارے میں کتنا جانتی تھیں؟"

○ "جب میرے ہاتھ میں اسکرپٹ آیا تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے والد کا کردار کس نے کرنا ہے۔ میری ماں کا۔ میری ساس کا رول کس نے کرنا ہے۔ لیکن بعد میں جب میں نے پوچھا کہ میرے ساتھ اور کون کون لوگ ہوں گے تو پھر بتایا گیا کہ "داجی" (سسر) کا رول نعمان اعجاز بھائی کریں گے۔ ساس کے روپ میں ثانیہ سعید جی ہوں گی اور میکال ذوالفقار ہوں گے۔ تو میں انہیں ناموں سے تو جانتی تھی، مگر ذاتی طور پر نہیں جانتی تھی۔ مگر میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے پہلے ہی ڈرامے میں اتنے اچھے لوگ ملے اور ڈرامے کی کہانی تو لاجواب تھی۔ اس طرح کے ایشوز ضرور دکھانے چاہئیں۔"



☆ ”کام زیادہ ہے تو کیا اب مستقل قیام پاکستان میں رہے گا آپ کا؟“

○ ”نہیں... نہیں... میں تو یہاں کام کے لیے آتی ہوں اور جیسے ہی میرا کام ختم ہوتا ہے میں واپس چلی جاتی ہوں۔ کیونکہ میں یہاں اکیلی ہوتی ہوں تو مجھے اپنے گھر والوں کی یاد ستانے لگتی ہے اور چونکہ اکیلی ہوں تو صبح اٹھ کر ناشتا بھی خود ہی بناتی ہوں اور ناشتے میں مجھے انڈا پراٹھا اور دو کپ چاہیے ہوتے ہیں چائے کے۔“

☆ ”اچھا گڈ... سب کچھ پکا لیتی ہیں؟“

○ ”جی... پکا بھی لیتی ہوں اور سیکھ بھی رہی ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے کوکنگ کرنا اور مجھے آلو گوشت بہت اچھا لگتا ہے۔ اگر روزانہ بھی کھانا پڑے تو کھا سکتی ہوں۔ ویسے مجھے بھوک زیادہ نہیں لگتی ہے اور کام کے دوران تو بالکل بھی نہیں لگتی۔“

☆ ”زیادہ وقت آپ نے لندن میں گزارا۔ پاکستان کیسا لگا اور ویسے کون سا ملک پسند ہے؟“

○ ”پاکستان اچھا ہے۔ لوگ بھی اچھے ہیں، لیکن دوسرے ملکوں سے بہت مختلف ہیں۔ مجھے پاکستان آنا اچھا لگتا ہے۔ اور ویسے مجھے ساؤتھ کوریا بہت پسند ہے۔ حالانکہ میں وہاں نہیں گئی، لیکن میں نے ویڈیوز میں جتنا بھی دیکھا ہے، مجھے بہت پسند آیا ہے۔ تو ان شاء اللہ ضرور دیکھنے جاؤں گی۔“

☆ ”انسان دنیا میں کیوں آتا ہے؟“

○ ”یہ تو پتا نہیں۔ کیونکہ دنیا میں بھیجنے والا تو رب تعالیٰ ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اگر انسان کو پتا چل جائے کہ اس کا دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے تو یہ اس کی بہت بڑی اچیومنٹ ہوگی اور ہم فنکار اپنے رولز کے ذریعے اس سوسائٹی کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ رائٹر اپنی تحریروں کے ذریعے اور ہم اپنی پرفارمنس کے ذریعے جب تک دوسروں کو آگاہی نہیں دیں گے تب تک تو سمجھیں کہ ہم نے اپنی زندگی میں کچھ نہیں کیا۔ ہر شخص دنیا میں آکر اچھا کام کرنے کی کوشش کرے تو سمجھے کہ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔“

☆ ”اب تو آپ ماشاء اللہ بہت اچھا پرفارم کرنے لگی ہیں۔ لیکن کیا شروع شروع میں کسی نے کہا کہ اداکاری ذرا کمزور ہے اس فنکارہ کی؟“

○ ”جی... بالکل کہا گیا... کیونکہ میری تعلیم و تربیت دونوں لندن کی ہیں۔ میری اردو بھی اچھی نہیں تھی۔ اور مجھے اداکاری کا بھی کوئی بہت زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ تو لوگ تنقید کرتے تھے۔ مگر اب میں اسکرپٹ کو بہت غور سے پڑھتی ہوں۔ کردار کو اپنے اوپر طاری کرتی ہوں اور پھر سیٹ پہ جا کے پرفارم کرتی ہوں۔“

☆ ”اب یہی آپ کا پروفیشن ہے؟“

○ ”جی... فی الحال تو یہی میرا پروفیشن ہے اور اگر میں اس پروفیشن میں نہ ہوتی تو ایک بہت اچھی آرکیٹیکٹ ہوتی۔“

☆ ”اس فیلڈ میں آئیں تو والدین نے اتنا کچھ نہیں کہا ہوگا جتنا رشتے داروں نے؟“

○ ہنستے ہوئے۔ ”جی... جی... لیکن اگر آپ کے والدین آپ کے ساتھ ہوں تو پھر بھلے کوئی کچھ بھی بولتا رہے۔ فرق نہیں پڑتا۔ اکثر اپنے ہی دکھ دیتے ہیں اور اگر آپ پر خدانخواستہ برا وقت آیا ہے تو بھی دل سے ساتھ نہیں دیں گے۔“

☆ ”کوئی کردار جو کرنے کی بہت خواہش ہو؟“

○ ”ہاں جی... خواہش ہے کہ معذور لڑکی کا کردار کروں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے یہاں معذور لوگوں کی کوئی عزت نہیں ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی بات پر لڑکیوں کو کہا جاتا ہے کہ یہ تو پاگل ہے۔ بھئی کیوں پاگل ہے' اس نے ایسا کیا' کیا ہے جو آپ اسے اس طرح بولتے ہو۔ اور جو اسپیشل بچے ہیں ان کا ہم کو زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ تو بس اس طرح کی لڑکی کا رول کرنا چاہتی ہوں۔“

☆ ”ویلفیئر کے کاموں سے لگاؤ ہے؟“

○ ”بہت زیادہ لگاؤ ہے اور میں ویلفیئر کے کام کرنا بھی

چاہتی ہوں۔ معذوروں کے لیے۔ فقیر بچوں کے لیے' جو پڑھنے کی استعداد نہیں رکھتے ان کے لیے کام کرنا چاہتی ہوں۔ ان کے لیے ویلفیئر کا ادارہ بنانا چاہتی ہوں اور بھیک مانگنے والے بچوں کو زبردستی بھی اسکول بھیجوں گی۔"

☆ "سوشل ہونا پسند ہے؟"

○ "بالکل نہیں۔ اس لیے مجھے سوشل میڈیا سے بھی دلچسپی نہیں ہے۔ انٹرنیٹ پہ معلوماتی چیزیں پڑھنے کا شوق ہے۔ مگر فیس بک اور دیگر چیزوں سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ فیس بک تو بہت پرسنل ہو جاتا ہے اور پرسنل ہونا مجھے پسند نہیں۔"

☆ "گھر میں سب سے پیاری شخصیت کون سی لگتی ہے؟"

○ "امی... میری امی میری دوستوں کی طرح ہیں اور مزے کی بات بتاؤں کہ جب بھی میری امی مجھ سے ناراض ہوتی ہیں تو پھر میں ان کے اوپر بیٹھ جاتی ہوں اور جب تک وہ مان نہ جائیں اٹھتی نہیں ہوں۔"

☆ "موبائل سے پہلے زندگی کیسی گزر رہی تھی؟"

○ "بہت اچھی... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا' میں ہر ماحول میں بہت جلدی ایڈجسٹ ہو جانے والی لڑکی ہوں۔ آخر جب موبائل نہیں تھا تو ہمارے بڑوں نے بھی تو گزارہ کیا ہی تھا نا۔"

☆ "آپ نے کہا کہ آپ روڈ پر بھیک مانگنے والے بچوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہیں۔ تو کیا تم ان کو بھیک دیتی ہو؟"

○ "جو بالکل نارمل اور صحت مند ہوتے ہیں ان کو بھیک نہیں دیتی' ہاں جو مستحق ہوتے ہیں' معذور ہوتے ہیں انہیں ضرور سو پچاس دے دیتی ہوں۔"

☆ "غصہ کن باتوں پہ آتا ہے؟"

○ "سچ بتاؤں کہ میں بہت نرم مزاج کی لڑکی ہوں اور مجھے غصہ نہیں آتا۔ لیکن جب لائٹ چلی جائے تو پھر مجھ جیسی نرم مزاج لڑکی کو بھی غصہ آجاتا ہے۔ کیونکہ "یوکے" میں لائٹ چلے جانے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔"



☆ "اس فیلڈ میں پیسہ ہے؟ مزا آرہا ہے؟"

○ "جی... جی... بہت مزا آرہا ہے۔ ماشاءاللہ سے پیسہ بھی ہے اور عزت' شہرت بھی ہے اور لوگ اس فیلڈ کو برا کہتے ہیں اور میں بھی سب کی طرح ایک ہی بات کروں گی کہ فیلڈ بری نہیں ہوتی' آپ خود برے ہوتے ہیں۔ جب تک آپ ہاتھ آگے نہیں بڑھائیں گے کوئی آپ کا ہاتھ نہیں پکڑے گا۔"

☆ "سنا ہے آپ کو "بالی ووڈ" سے بھی آفر آئی ہے فلموں میں کام کرنے کی؟"

○ "جی... جی... بالکل آئی ہے' لیکن میں نے ابھی "یس" نہیں کہا۔ اگر کوئی کہے کہ بھارت کی فلم کے لیے آفر آنا اور ان کی فلموں میں کام کرنا بہت فخر کی بات ہے تو میں اس بات کو نہیں مانتی' کیونکہ ہمیں ہر حال میں اپنے ملک کو پروموٹ کرنا چاہیے اور اپنی فلموں میں کام کرنا چاہیے۔ ہم جب خود ہی فلم انڈسٹری کے لیے کچھ نہیں کریں گے تو دوسرا تو ہمیں اپنی طرف کھینچے گا ہی... مجھے اپنی فلم میں کام کرنے کا موقع ملے یہ میرے لیے اعزاز ہوگا۔"



☆ "کہتے ہیں کہ شوبز میں جگہ بنانے کے لیے سوشل ہونا بہت ضروری ہے۔ تو کیا آپ اس انڈسٹری میں رہنے کے لیے اس فارمولے پر عمل پیرا ہوں گی؟"

○ "میں نے جیسا کہ آپ کو پہلے بتایا کہ میں نہ سوشل ہوں اور نہ ہی پارٹی پرسن ہوں۔ اپنے کام سے دلچسپی رکھتی ہوں اور بس..... مجھے معلوم ہے کہ یہ فیلڈ ایسی ہے جس میں سب سے بنا کر تعلقات رکھنے ہوتے ہیں۔ مگر میں ایسے ماحول کی عادی نہیں ہوں۔"

☆ "اور اگر حالات سازگار نہ ہوئے تو پھر کیا لندن واپسی کا ٹکٹ کٹائیں گی؟"

○ "نہیں..... مجھے شوبز میں کام کر کے اچھا لگ رہا ہے۔ اس لیے میں واپس جانے کی آرزو نہیں کرتی۔"

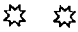
☆ "ایک وقت آتا ہے لڑکی اپنا گھر بسانا چاہتی ہے، آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گی؟"

○ "ہاں..... ضرور میں بھی گھر بسانا چاہوں گی۔ مگر ابھی نہیں۔ ابھی میں اس فیلڈ میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے آپ کو مضبوط کرنا چاہتی ہوں۔ دنیا کو بتانا چاہتی ہوں کہ لڑکیاں اگر چاہیں تو بہت کچھ کر سکتی ہیں، اب لڑکیوں کو کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا۔"

☆ "اور آپ کی پڑھائی جو ادھوری رہ گئی ہے اس کا کیا ہو گا؟"

○ "اس کا اللہ مالک ہے۔ لیکن میں اپنی پڑھائی ان شاء اللہ ضرور مکمل کروں گی۔ تعلیم مکمل کرنا میرا خواب ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے کبریٰ خان سے اجازت چاہی۔



سانحہ ارتحال

ہماری ساتھی روبینہ واجد کے زندگی کے ساتھی عبدالواجد خان مختصر علالت کے بعد قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

دکھ کی اس گھڑی میں ہم اپنی ساتھی روبینہ واجد کے ساتھ اور ان کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے اور لواحقین کو صبر جمیل دے۔ (آمین)

بہنوں سے مغفرت کی درخواست ہے۔

دیارِ غیر میں ۱۴ اگست

شاہین رشید

یہ کیا کم ہمارے لیے باعث تقویت ہے کہ ہم ایک عدد ملک رکھتے ہیں۔ جو ہماری پہچان ' ہماری شناخت اور ہمارا سب کچھ ہے۔ یہ ہے تو ہم ہیں اور یہ نہیں تو ہم کچھ نہیں.... ہمارا ملک بہت اچھا ہے اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں دی ہوئی ہیں۔ اونچے پہاڑی سلسلے ' قدرتی آبشاریں ' نہریں.... موسم.... دنیا کا تمام پھل ہمارے ملک میں پیدا ہوتا ہے۔ خواہ وہ ڈرائی فروٹ ہو یا دیگر انواع و اقسام کے پھل.... سب کچھ ہے ہمارے ملک میں مگر نہیں ہے تو اچھے حکمران نہیں ہیں۔ جن کی وجہ سے اپنی ہی ملک کے نوجوان اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں حالانکہ دوسرے ممالک تمام معدنیات اور دیگر چیزیں پاکستان سے ہی در آمد کرتے ہیں۔

14 اگست کو ہم یوم آزادی تو دھوم دھام سے منا لیتے ہیں۔ مگر مقاصد کو پورا نہیں کرتے ' ہمارے ملک کی ایک بڑی آبادی ملک سے باہر قیام پذیر ہے آیئے ان سے پوچھیں کہ یہ 14 اگست کس طرح مناتے ہیں اور پاکستان چھوڑنے کی کیا وجہ تھی۔

سوال نمبر 1 : دیارِ غیر میں آپ 14 اگست کس طرح مناتے ہیں / مناتی ہیں۔

سوال نمبر 2 : پاکستان کس مجبوری سے چھوڑا؟ کیا آپ پاکستان واپس آنا چاہتے ہیں؟ / ہاں.... تو کیوں؟ / نہیں .... تو کیوں؟



سید علی رضا زیدی : - (لندن - یو کے۔

بزنس مین + جاب)

1 - لندن میں ہماری ایک کمیونٹی ہے جہاں ہم سب پاکستانی 14 اگست کو جمع ہوتے ہیں اور پھر "گرین اسٹریٹ" جاتے ہیں جہاں پہ دیگر علاقوں کے پاکستانی بھی جمع ہوتے ہیں.... وہاں پورا ٹریفک بلاک کر کے ' پاکستان کے جھنڈے ہاتھوں میں لیے پاکستان سے اظہار یکجہتی کرتے ہیں۔ یہاں پھر مختلف لوگوں سے ملاقات بھی ہوتی ہے۔ تھوڑا ہلا گلا تھوڑا ڈانس.... تو بہت انجوائے کرتے ہیں۔ لندن کی حکومت ہمیں خود اجازت دیتی ہے کہ آپ کا تہوار ہے آپ اسے اپنی پسند سے سیلبریٹ کریں۔ تو سچ میں بہت اچھا لگتا ہے - آزادی کا احساس ہوتا ہے اور فخر ہوتا ہے کہ ہم بھی ایک ملک رکھتے ہیں۔ ہمارا اپنا ملک ' اپنا پیارا پاکستان .... اس موقع پر جو جوش و خروش ہوتا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ رونق رات کے وقت لگتی ہے۔

2 - چھوڑنے کی بڑی وجہ وہاں کا لاء اینڈ آرڈر تھا۔ پاکستان میں ہیومن رائٹس سیفٹی کا بہت پرابلم ہے.... تو بڑا ڈر لگتا تھا کہ کچھ بھی کرنے جائیں گے تو کچھ غلط ہو

جائے گا۔ جانے کب کس وقت آپ کوئی مار کر چلا جائے گا۔ پولیس کا کوئی کنٹرول نہیں تھا... مجھے اپنی فیملی کو سپورٹ کرنا تھا چنانچہ میں یہاں لندن آیا۔ ایم بی اے کیا اور پھر ایک ہوٹل میں بہ حیثیت منیجر کے جاب کرتا ہوں۔ پھر میرا اپنا بزنس بھی ہے Velox لندن کارز کا۔ اس کے علاوہ وائس اوور بھی کرتا ہوں ... اور جہاں تک آنے کی بات ہے تو آج اگر لاء اینڈ آرڈر ٹھیک ہو جائے تو آج آجاؤں... پاکستان سے اچھا اور بہترین ملک کوئی نہیں... یہ تو جنت ہے ہماری۔



راحیلہ فردوس : ۔(امریکا ہاؤس وائف+میڈیا جاب)

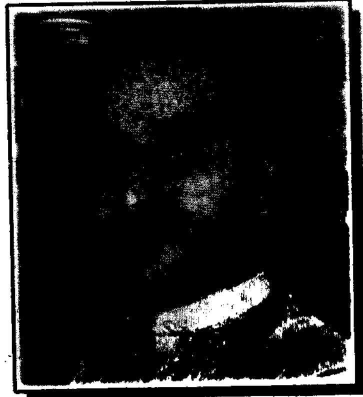
1 ۔ 14 اگست یوم آزادی کی "نیویارک پاکستان ڈے پریڈ" ورجینا کا سب سے بڑا میلا اور نیوجرسی کی پریڈ سب میں ہی پورے جوش و خروش سے شرکت کرتی ہو اور ساتھ ہی میزبانی کے فرائض بھی انجام دیتی ہوں۔ "آج ٹی وی" یو ایس اے ہر اگست کے مہینے ہر ہفتے خصوصی چودہ اگست کے حوالے سے پروگرام کرتی ہوں۔

2 ۔ پاکستان شوہر کی جاب کی وجہ سے چھوڑا' مگر ایسا نہیں کہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا ہے۔ پاکستان آنا جانا لگا رہتا ہے اور یہاں امریکا میں رہ کر بھی پاکستان کا ہر تہوار جوش و خروش کے ساتھ مناتے ہیں... اور ہاں پاکستان آنا پڑے مستقل ہی تو ضرور آؤں گی۔ پاکستان سے اچھا تو کوئی ملک ہے ہی نہیں... اپنوں کے درمیان رہنے کو بھلا کون ترجیح نہیں دے گا۔

نبیلہ ابر راجہ : ۔(رائٹر+ہاؤس وائف)

1 ۔ میں سعودیہ جدہ میں رہتی ہوں۔ مجھے یہاں شفٹ ہوئے ڈھائی سال ہو گئے ہیں' دوبار پاکستان کی سالگرہ یہاں منائی ہے' یہاں کوئی اتنا خاص اہتمام نہیں ہوتا اور نہ ہی ہم اپنے ملک کی طرح یہاں الٹر بازی کر سکتے ہیں... یہاں بادشاہت ہے اس لیے سب کچھ سوچ سمجھ کر کرنا پڑتا ہے... یہاں ایک علاقہ ہے "عزیزیہ" یہاں پاکستانی اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں' یہاں روڈ پہ سب لڑکے اکٹھے ہو کر گاڑیوں میں اونچی آواز میں قومی نغمے بجاتے ہیں ویلنگ کرتے ہیں اور پاکستانی پرچم لہراتے ہیں۔ دو سال سے انہیں دیکھ کر ہی 14 اگست منا رہی ہوں... اس دن میں رات کو اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ گھر سے نکل کر عزیزیہ چلی جاتی ہوں اور وہاں کی رونق میلہ دیکھ کر اور کھاپی کر گھر آجاتے ہیں۔

2 ۔ میرے میاں صاحب کی جاب "سعودیہ" میں ہے اس لیے میں بھی یہاں ہوں... میں اس جگہ کو چھوڑ کر جانے کا سوچتی ہوں تو مجھے رونا آتا ہے کیونکہ یہاں مکہ مدینہ ہے' جب دل چاہتا ہے' چلی جاتی ہوں۔ اس جگہ رکنے اور رہنے کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے... اس کے علاوہ یہاں امن ہے' سکون ہے' برکت ہے۔ قانون کی پاسداری ہے۔ صفائی ہے... لیکن ہمیں ایک دن تو اپنے ملک جانا ہی پڑے گا' کیونکہ اب یہاں کے حالات پہلے جیسے نہیں رہے... پھر پاکستانیوں کی یہاں عزت بھی نہیں ہے... اپنے ملک میں لوٹنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ پاکستان میری پہچان ہے' یہاں میری جڑیں ہیں' میرا خاندان ہے یہاں اپنے ملک میں بہت ساری خامیوں کے ساتھ خوبیاں بھی تو ہیں... پاکستان پھر پاکستان ہے۔



انیل رشید : ۔(بزنس مین۔دبئی)

1 ۔ یہاں (دبئی) شارجہ میں پورے شہر میں چونکہ 14 اگست کی سیلبریشن نہیں ہوتی۔۔۔ اس لیے کوشش ہوتی ہے کہ ٹی وی (پاکستانی) دیکھیں کہ پاکستان میں 14 اگست کا جشن کس طرح منایا جا رہا ہے۔۔۔ لوگوں کا جوش و خروش دیکھ کر، نئے پرانے قومی نغمے سن کر اس بات کو محسوس کر رہے ہوتے ہیں کہ پاکستان میں کس طرح چودہ اگست منایا جا رہا ہے۔ یہاں لوگ اپنی گاڑیوں پہ پاکستانی پرچم لگا لیتے ہیں۔۔۔ اور پاکستان سے اپنی محبت اور اپنی حب الوطنی کا اظہار کرتے ہیں۔۔۔ یا کچھ جگہوں پہ جہاں پاکستانی ریسٹورنٹ ہیں ادھر جا کر ایک دوسرے کو یوم آزادی کی مبارکباد دے دیتے ہیں۔ ہلا گلا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

2 ۔ پاکستان میں میرٹ کی بنیاد پر نہ اچھی جاب ملتی ہے۔ نہ اچھی سیلری اور نہ ہی اتنے اچھے مواقع کہ انسان اپنے ٹیلنٹ کو منوا سکے۔ یا اپنی فیملی کو سپورٹ کر سکے۔ جس طرح پاکستان میں ٹیلنٹڈ بندے کو سیلری ملتی ہے اس سے اس کا اپنا گزارہ مشکل ہوتا ہے تو وہ بھلا فیملی کو کیا سپورٹ کرے گا۔ دبئی ہو یا کوئی بھی دوسرا ملک، وہاں لوگ بے شک کماتے کم ہیں مگر اسی تنخواہ میں وہ اپنا گھر بھی چلاتے ہیں اور پاکستان میں بھی بھیجتے ہیں۔ جبکہ پاکستان میں رہتے ہوئے وہ ایسا نہیں کر سکتے اور ایسی ہی بہت سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے لوگ پاکستان کو چھوڑ کر دوسرے ملک آجاتے ہیں۔۔۔ ایک اور بڑی بات کہ پاکستان میں بنیادی سہولتوں کا بھی بہت فقدان ہے۔ اگر میں پاکستان آیا تو اس لیے آؤں گا کہ اپنے ملک جیسی آزادی کہیں اور نہیں۔ اور اگر نہیں آیا تو اس لیے نہیں آؤں گا کہ اب شاید ڈسپلن ماحول میں رہنے کی عادت ہوگئی ہے۔



صدف آصف : ۔(آسٹریلیا۔رائٹر)

1 ۔ مجھے یہاں آسٹریلیا میں آئے ہوئے تقریباً "10" ماہ ہوگئے ہیں۔ ہم آسٹریلیا کے شہر ملبورن میں قیام پذیر ہیں۔ 14 اگست یہاں کیسے مناتے ہیں تو مجھے اس کا کچھ اندازہ نہیں ہے۔ کیونکہ میری موجودگی میں کوئی چودہ اگست نہیں آئی۔ لیکن میری کوشش ہوگی کہ اس دن ایسا کچھ ضرور کروں کہ جس سے وطن کی محبت کا اظہار ہو۔

2 ۔ پاکستان کیوں چھوڑا کا جواب یہ ہے کہ ہر انسان آگے کی طرف بڑھنا چاہتا ہے۔۔۔ مجھے اپنے ملک سے بہت زیادہ محبت ہے۔۔۔ اور اگر ہمیں اپنے ملک میں یہ سہولتیں حاصل ہوتیں کہ ہم بتدریج آگے کی طرف بڑھ رہے ہوتے تو شاید میں اپنا ملک کبھی بھی نہ چھوڑتی اور پھر میری بیٹی کو یہاں بنیادی تعلیم اچھی ملے گی تو وہ معاشرے میں اپنا صحیح مقام پا سکے گی۔۔۔ اور

رہی پاکستان آنے کی بات تو میں پاکستان آنا چاہوں گی اور بار بار آنا چاہوں گی کیونکہ جو مزا اپنے پاکستان میں ہے وہ یہاں نہیں ہے۔ مجھے اپنے کلچر سے بہت محبت ہے مجھے کراچی کی ایک ایک شاہراہ سے بہت محبت ہے اور پورے پاکستان کے ہر خطے سے محبت ہے.... اب میں یہاں سیٹ ہو گئی ہوں اور اس لیے میں پاکستان وزٹ تو بار بار کروں گی مگر مستقل قیام نہیں کیونکہ جو آگے بڑھ رہا ہوتا ہے وہ پھر پیچھے مڑکر نہیں دیکھنا چاہتا۔ ہاں ہم یہاں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے ہوتے ہیں تو میں ہمیشہ اپنے پاکستان کے لیے اچھا ہی چاہوں گی اور اچھا ہی امیج بناؤں گی۔



نادیہ احمد :۔(رائٹر+ہاؤس وائف دبئی)

سب سے پہلے تو پیارے قارئین اور ہم وطنوں کو یوم آزادی کی ڈھیروں مبارک باد.... اللہ میرے پاک وطن کو رہتی دنیا تک قائم و دائم رکھے اور اس پاک سرزمین کی شان و حرمت کو تاقیامت قائم رکھے۔ (آمین)

1 ۔ دیار غیر میں یوم آزادی اس انداز میں تو نہیں منائی جاتی جیسے ہم پاکستان میں جوش و خروش و جذبے سے منایا کرتے ہیں۔ وہ ہفتہ پہلے جھنڈیاں لگانا.... اور پھر بارش کا بھی عین چودہ اگست کی شام کو برسنا اور ہمارے ارمانوں پہ پانی پھیرنا.... بڑے خوب صورت دن تھے وہ، خیر دبئی میں بڑی تعداد میں پاکستانی کمیونٹی موجود ہیں تو یوم آزادی کے موقع پر گاڑیاں پاکستانی جھنڈوں سے آراستہ دکھائی دیتی ہیں۔ اب تو میرے بچے بھی ایک عدد جھنڈا اور پاکستانی بیج اپنے سینے پہ سجا لیتے ہیں.... باقی لوکل ریڈیو پہ پاکستانی ملی نغمے سنائے جاتے ہیں تو انہیں سن کر ملک کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

2 ۔ میرے بیرون ملک قیام کی وجہ تو میری شادی ہے۔ میرے شوہر ماشاء اللہ ڈاکٹر ہیں۔ وہ شادی سے پہلے یہاں ملازمت کرتے تھے۔ تو میں شادی کے فوراً بعد ہی ان کے ساتھ دبئی آ گئی تھی۔ اور شوہر صاحب یہاں کیوں ہیں تو۔

اگر میسر گورنری ہوتی
نوکری پھر بھی نوکری ہوتی؟

تو بس روزگار یہاں کھینچ لایا تو اب جب تک یہاں روزگار ہے ہم بھی یہاں ہیں.... باقی پاکستان سے تو دل کا رشتہ ہے.... رشتے دار، میکا سسرال دوست اور یہ پیارے ریڈر جن سے قلم کا رشتہ جڑ چکا ہے تو پاکستان سے دور رہ کر بھی میں پاکستان میں ہی ہوتی ہوں۔ اگر حالات اور قسمت میں ہوا تو بالکل پاکستان آئیں گے .... ویسے آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے اس لیے اتنی غریب الوطنی محسوس نہیں ہوتی۔



راحیل رشید :۔(بزنس مین دبئی)

1 ۔ دیار غیر میں تو 14 اگست پاکستانی ٹی وی چینل

دیکھ کر ہی مناتے ہیں لوگوں کا جوش و خروش اور وطن سے محبت کا جذبہ دیکھ کر اچھا لگتا ہے اور احساس ہوتا ہے کہ ملک جیسا بھی ہے۔ جتنے بھی حالات خراب سہی ' ہے تو ہماری پہچان ہم دنیا کے کسی بھی کونے میں چلیں جائیں ہماری پہچان تو اسی سے ہوگی۔ ہم پاکستان سے ہیں اور پاکستانی ہی رہیں گے۔ ایک اچھی دعا کے ساتھ اور ایک اچھی سوچ کے ساتھ 14 اگست مناتے ہیں کہ 70 سال ہوگئے ملک کو بنے ہوئے۔ خدا کرے کہ اس کے حالات بھی اچھے ہو جائیں تاکہ جو لوگ اس ملک سے دور ہیں وہ اپنے ملک واپس آئیں اور آزادی کے ساتھ تحفظ کے ساتھ 'سکون کے ساتھ اور اچھے روزگار کے ساتھ اپنی زندگی گزاریں۔

2 ۔ کوئی بھی انسان بغیر کسی مجبوری کے اپنا ملک نہیں چھوڑتا... پاکستان کے برے حالات 'کرپشن ' امن کی خرابی 'عدم تحفظ ' بے روزگاری 'لا اینڈ آرڈر کا فقدان اب سب باتوں کی وجہ سے پاکستان چھوڑنے پر مجبور ہوئے کسی کی جان و مال محفوظ نہیں خواہ وہ نوکری پیشہ ہو 'بزنس مین ہو یا کوئی ایک عام مزدور 'کوئی یکجہتی نہیں کہ سسٹم کے خلاف مل کر آواز اٹھائیں اکیلا آدمی آواز نکالتا بھی ہے تو اس کی آواز دبادی جاتی ہے۔ یا اسے غائب کردیا جاتا ہے 'تو جہاں ایسے حالات ہوں اس جگہ کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ یہاں کا مفلوج نظام امیر کو اور امیر اور غریب کو مزید غریب کیے جا رہا ہے... اور آپ کے سوال کا دوسرا حصہ... تو میں پاکستان واپس آنا چاہتا ہوں لیکن اس صورت میں کہ پاکستان کے حالات اچھے ہوں۔ دوسرے ممالک کے لوگ اپنا ملک کیوں نہیں چھوڑتے ' صرف اسی وجہ سے کہ انہیں اپنے ملک میں وہ سب کچھ میسر ہوتا ہے جو ایک شہری کا بنیادی حق ہے۔ ہمیں اپنے ملک میں کچھ بھی میسر نہیں ہے بلکہ بچارے لوگ جان ہتھیلی پہ رکھ نکلتے ہیں کہ پتا نہیں واپس گھر جانا نصیب بھی ہوگا کہ نہیں... اپنے ملک سے زیادہ بہتر کوئی ملک ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر ہمیں وہ بنیادی حقوق تو ملیں جن کے ہم مستحق ہیں۔



نیلوفر عباسی : ۔ (امریکہ ۔ آرٹسٹ)

1 ۔ جی یہاں دیار غیر میں ہم چودہ اگست بہت دھوم دھام اور بہت ہی جوش و خروش کے ساتھ مناتے ہیں وطن سے دور رہ کر انسان وطن کے بہت قریب ہو جاتا ہے... یہاں کی پاکستانی کمیونٹیز سب اہتمام کرتی ہیں اور یکم اگست سے ہی گہما گہمی شروع ہو جاتی ہے۔ ہم لوگ "مین ہٹن" میں گورنمنٹ سے اجازت لے کر بڑے بڑے "فلوٹ" نکالتے ہیں۔ جو کہ چاروں صوبوں کے ہوتے ہیں اور پاکستان کی کوئی بڑی شخصیت کو بہ حیثیت مہمان کے بلاتے ہیں۔ پریڈ ہوتی ہے۔ صبح کے وقت ہزاروں لوگ دیکھنے آتے ہیں۔ وہاں ہم لوگوں نے حلوہ پوری ناشتے کا اہتمام بھی کیا ہوا ہوتا ہے اور کچھ لوگ ناشتا گھر سے بھی تیار کر کے لاتے ہیں۔ اس سال ہمارا ارادہ عاطف اسلم کو بلانے کا ہے ... اس میں سال بھر کی بہترین کارکردگی پر ایوارڈز بھی دیے جاتے ہیں۔ گزشتہ سال مجھے بھی ایوارڈ ملا تھا۔ تو بہت ماشاء اللہ ہلا گلا رہتا ہے اور ایسا صرف نیویارک میں ہی نہیں امریکہ کے دیگر بڑے شہروں میں بھی ہوتا ہے۔

2 ۔ کوئی بھی انسان اپنی مرضی سے اپنا وطن نہیں چھوڑتا... ہم نے کیوں چھوڑا ایک طویل کہانی ہے... بس مختصر یہ کہ ہمارے پاس گرین کارڈ تھا پھر حالات کچھ

ایسے ہو گئے کہ ہمیں اپنا ملک چھوڑنا پڑتا۔۔۔ بے شک ہم بہت ترقی یافتہ ملک میں رہ رہے ہیں لیکن جو اطمینان اور سکون اپنے ملک میں رہ کر ملتا ہے کہیں نہیں ملتا۔۔۔ ہمارے ملک کا سسٹم بہت خراب ہے میرے بچے اور ہم یہاں آ بھی جائیں تو کیا انہیں ان کے ٹیلنٹ کے مطابق جاب اور سیلری ملے گی؟ ہر گز نہیں پھر چونکہ اپنے ملک میں کوئی سسٹم ہی نہیں ہے تو کس سسٹم کو فالو کریں گے؟ میں جب پاکستان آتی ہوں "سر آنکھوں پہ بٹھائی جاتی ہوں" سب بہت عزت کرتے ہیں دل بھی چاہتا ہے مستقل قیام کو، مگر ساری بات تو یہ ہے کہ جب بنیادی سہولتیں ہی نہیں ہوں گی اچھا روزگار نہیں ہو گا تو کیا فائدہ یہاں رہنے کا۔

عابدہ احمد : - فری لانس رائٹر + شاعرہ۔

(یو ایس اے + سعودی عرب)

1 - بیرونی ملک رہتے ہوئے وہ بچپن جیسا جوش و خروش تو نہیں رہتا۔ 14 اگست کے حوالے سے۔۔۔ لیکن فیس بک کی بدولت 14 اگست کے Notifications ضرور ملتے رہتے ہیں اور دوستوں کی اسی حوالے سے پوسٹس بھی ملتی رہتی ہیں جو کہ ہمیں 14 اگست کی اہمیت کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔

2 - پاکستان شادی کے بعد ہی چھوڑا۔ سسرال میرا یو ایس اے میں ہے اس لیے شادی کے بعد وہاں شفٹ ہوئی، آج کل سعودی عرب میں رہائش پذیر ہوں۔ جہاں تک دوبارہ پاکستان آنے کی بات ہے تو میرا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں مستقل تو نہیں۔ لیکن اگر حالات بہتر ہو جائیں تو پھر اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔۔۔ پاکستان کی سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے بہت نوازہ ہے۔ اس لحاظ سے مستقل قیام کی خواہش ضرور جنم لیتی ہے، لیکن ذہنی حقائق اس خواہش کا گلا گھونٹنے کے کافی ہیں۔۔۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری سرزمین پہ اپنا خصوصی کرم عطا فرمائے اور پاکستان کے حالات بہتری کی طرف گامزن ہو جائیں۔



حرا تنزیل : - (ہاؤس وائف - دبئی)

1 - دیار غیر میں تو ان تہواروں کا بھی پتا نہیں چلتا جو ان کے اپنے ہوتے ہیں۔ کیونکہ کافی سادگی سے اور بڑی خاموشی کے ساتھ لوگ اپنا تہوار مناتے ہیں۔ تو 14 اگست سیلیبریٹ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ پاکستان میں جب تھی تو بڑا شوق ہوتا تھا جھنڈیاں لگانے اور گھر کو سجانے کا۔ پورا گھر ہرا کر دیتے تھے اور 14 اگست کی خوشی بھی بہت ہوا کرتی تھی۔۔۔ پھر جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے۔ یہ شوق بھی کم ہوتے گئے اور اب تو مجھے لگتا ہے کہ پاکستان میں بھی وہ ہمارے بچپن والا جوش و خروش نہیں ہے کہ گھر سجائے جا رہے ہوں اور خوشیاں منائی جا رہی ہوں۔۔۔ لگتا ہے کہ اب تو جذبے ماند پڑ گئے ہیں۔

2 - پاکستان فیملی بزنس اور پھر شادی کی وجہ سے چھوڑا، اور سچ پوچھیں تو پاکستان آنے کو بالکل بھی دل نہیں چاہتا۔۔۔ میں تو جب پاکستان میں تھی تو دعائیں مانگتی تھی کہ پاکستان سے چلی جاؤں کیونکہ پاکستان کے حالات اور سسٹم اور لاء اینڈ آرڈر بالکل پسند نہیں تھا کیونکہ کوئی بھی شخص وہاں کے قوانین کو اور سسٹم کو مانتا ہی نہیں تھا۔ ہر کوئی اپنی مرضی کر رہا ہوتا ہے کوئی "آرگنائزڈ وے" نہیں ہے۔ چھوٹی سی مثال ہے کہ اگر فارم جمع کرانے یا بل وغیرہ بینک میں جمع کرانے جانا

ہے تو کوئی لائن نہیں ہوتی جس کا دل چاہتا ہے لائن توڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔ کوئی منع کرنے والا نہیں ہوتا۔ پرچی سسٹم بہت زیادہ ہے۔ جبکہ مجھے ہر چیز میں ڈسپلن چاہیے۔ ہر چیز آرگنائزڈ چاہیے' قوانین کی پاسداری چاہیے اور یہاں دبئی میں ایسا سب کچھ ہے۔ اس لیے پاکستان آنے کا دل نہیں چاہتا۔ کچھ رشتے دار ایسے ہیں جن سے ملنے کو دل چاہتا ہے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو اتنا بھی یاد نہ آتا پاکستان۔



محمد ساجد : ۔(سیلزمین پاکستانی شاپ۔ دبئی)

1 - یہاں کیا 14 اگست اور کیسی 14 اگست' کچھ پتا ہی نہیں چلتا' اپنے ملک کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ بہت اچھا لگتا تھا 14 اگست یوم آزادی منا کر۔۔۔۔ اب تو بس ٹی وی پہ ہی جوش و خروش دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ بہت یاد آتا ہے ایسے موقع پر اپنا ملک۔

2 - میں خیبر پختون خواہ میں ایبٹ آباد سے آگے قلندر آباد ایک گاؤں ہے وہاں کا رہائشی ہوں۔ پاکستان غربت کی وجہ سے چھوڑا' گھر کے حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ گزر اوقات مشکل ہو گئی تھی تو پردیس میں آ گیا۔ میری فیملی میں ہم چار بھائی اور چار بہنیں ہیں اور ماشاء اللہ سب شادی شدہ ہیں۔ ایک بھائی سعودی عرب میں ہوتا ہے۔ ایک پاکستان میں اور ہم دو بھائی یہاں ہوتے ہیں۔ چھ سال ہو گئے پاکستان چھوڑے ہوئے اور یہاں شارجہ میں کام کرتا ہوں۔ بہت محنت سے دن رات کام کرتے ہیں تو اچھی گزر اوقات ہو جاتی ہے۔ پاکستان بہت یاد آتا ہے' یہاں ایک دن بھی دل نہیں لگتا۔ اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے اور بہت دل کرتا ہے پاکستان جانے کو مگر مجبوریاں اور ضرورتیں جانے نہیں دیتیں اور پردیس میں زندگی کاٹ رہے ہیں۔ پاکستان جیسا ملک پوری دنیا میں نہیں ہے۔

☆ ☆

کچن اور آپ

اس ماہ "کنزہ مریم" کو "کچن اور آپ" میں انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ ادارے کی طرف سے کنزہ مریم کو تین ماہ کے لیے "ماہنامہ کرن" مفت دیا جا رہا ہے۔

میری بھی سنیے

علیزے طاہر

شاہین رشید



1 "میرا نام؟"

"علیزے طاہر۔"

2 "پیار کا نام؟"

"لیزا اور علیزو۔"

3 "دنیا کا حصہ کب بنی؟"

"8 دسمبر 1993ء۔"

4 "قد بغیر ہیل کے؟"

"5 فٹ 4 انچ۔"

5 "ستارہ؟"

"برج قوس۔"

6 "گھر میں بولی جانے والی زبان؟"

"ہم بنیادی طور پر پنجابی ہیں۔"

7 "فیملی؟"

"تین بہنیں بھائی اور والدین۔"

8 "تعلیمی ڈگری؟"

"ماسٹرز۔۔۔ آئی آر۔"

9 "شادی؟"
"اللہ کے فیصلے کا انتظار ہے۔"
10 "بچپن کا خواب جو پورا ہوا؟"
"سوچا تھا کہ اداکارہ بنوں گی اور اللہ نے میرا یہ خواب پورا کیا۔"
11 "گھر والے خوش ہیں؟"
"میرے اس فیلڈ میں آنے پر بہت خوش ہیں.... میرے گھر والے اور میرے کام کو بھی بہت پسند کر رہے ہیں۔"
12 آن ایئر ڈرامے؟"
"سنگسار" ہم سے آن ایئر ہے اور نزہت سمن اس کی رائٹر ہیں.... بہت اچھی ریٹنگ آرہی ہے۔"
13 "انڈر پروڈکشن ڈرامے؟"
"کافی ہیں.... مگر ابھی بتانا نہیں چاہتی۔"
14 "کس سیریل نے شہرت دی؟"
"میری سہیلی میری بھابھی" ___ تعمیر نشاط کی تحریر تھی.... اور یہ سوپ تھا۔ اسے بھی ناظرین نے پسند کیا۔"
15 "میری کمزوری؟"
"انٹرنیٹ' فیس بک اور انسٹاگرام۔"
16 "شدید غصہ آتا ہے؟"
"جب میری بات کے دوران کوئی مداخلت کرے .... بھئی میں کہتی ہوں کہ پہلے میری بات تو مکمل ہونے دو۔"
17 "لوگ کہتے ہیں؟"
"میں نخرے بہت دکھاتی ہوں اور سچ میں میں بہت نخرے دکھاتی ہوں.... مجھے اچھا لگتا ہے نخرے دکھانا۔"
18 "کچن سے میری دلچسپی؟"
"بالکل بھی نہیں ہے۔ مجھے گھر کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بہت بورنگ کام ہے۔"
19 "میں اچھا پکالیتی ہوں؟"
"اگرچہ کچن سے کوئی لگاؤ نہیں ہے لیکن چونکہ مجھے چائنیز پسند ہیں تو میں چائنیز بہت اچھے بنالیتی ہوں.... مگر کبھی کبھار۔"
20 "تہوار جو شوق سے مناتی ہوں؟"
"نہیں.... مجھے تہوار پسند نہیں.... میں تہواروں کے دن بور ہو جاتی ہوں۔"
21 "موبائل بدلنے کا شوق ہے؟"
"بالکل ہے.... میرا دل چاہتا تھا کہ جدید موبائل میرے ہاتھ میں ہو اور ایسا ہوتا بھی ہے۔"
22 "فون نمبرز بدلے؟"
"نہیں.... ایسا کوئی شوق نہیں ہے پھر بار بار دوسروں کو نمبرز دینا مشکل ہو جاتا ہے۔"
23 "فلم؟ ماڈلنگ کیا کرنا چاہتی ہوں؟"



"فی الحال تو میرا فوکس ڈرامے پر ہے۔ اس کے بعد کچھ سوچوں گی کہ کیا کرنا ہے۔"

24 "مجھے انتظار ہے؟"

"ہر اچھے دن کا... ہر اچھے کام کا... اور ہر اچھی آفرز کا۔"

25 "لڑکا ذہین ہو، امیر ہو یا حسین؟"

قہقہہ... "اگر تینوں خوبیاں ہوں تو کیا ہی بات ہے۔"

26 "اتنا پیسا آجائے کہ؟"

"کہ میں ساری دنیا گھوم لوں... مجھے دنیا گھومنے کا بہت شوق ہے۔"

27 "شاپنگ کے لیے کریڈٹ کارڈ یا اے ٹی ایم کارڈ؟"

"دونوں ہونے چاہئیں... پتا نہیں کس وقت کتنی شاپنگ کرنی پڑ جائے۔"

28 "بہت تھکن ہو جائے تو؟"

"تو پھر میرا بیڈ اور بس کچھ نہیں... نہ موبائل نہ ٹی وی کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔"

29 "غصے کا اظہار کس طرح کرتی ہوں؟"

"جس پر غصہ آیا ہوا ہوتا ہے اس کے آگے بول کر چیخ چنگھاڑ کر اپنا غصہ نکال لیتی ہوں۔ یہی بہترین طریقہ ہے میری نظر میں۔"

30 "کسی کو بچانا ہو تو؟"

"تو جھوٹ بول کر اسے بچا لیتی ہوں۔ کیونکہ مصلحتاً جھوٹ بولنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔"

31 "لڑکوں کی اچھی بات؟"

"کہ وہ لڑکیوں کی طرح کسی سے حسد نہیں کرتے۔"

32 "اپنا ہی پسندیدہ ڈرامہ؟"

"سب ہی اچھے ہیں۔ سنگسار بہت اچھا جا رہا ہے لیکن میرا شروع کا ڈرامہ "میرا درد نہ جانے کوئی" مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ اس کے بعد راستے ہموار ہوئے۔"

33 "کھانا نامکمل لگتا ہے؟"

"اگر پورے لوازمات کے ساتھ نہ ہو... خاص طور پر اگر "سلاد" نہ ہو تو مزا نہیں آتا کھانے کا۔"

34 "دوسروں کی نظروں میں اچھا ہونے کے لیے؟"

"میں کچھ نہیں کرنا چاہتی... جو میری شخصیت ہے وہ سب کے سامنے ہے۔"

35 "فرصت کے اوقات میں کیا کرتی ہوں؟"

"فرصت کے اوقات کہہ لیں یا چھٹی کا دن... میں زیادہ تر وقت اپنے بیڈ پر گزارتی ہوں یا پھر کوئی اچھا سا ٹی وی پروگرام یا مووی دیکھ لیتی ہوں۔"

36 "گھر میں کس کے کمرے میں سکون ملتا ہے؟"

"اپنے اور اپنی امی کے کمرے میں۔"

37 "درگزر کرتی ہوں یا بدلہ لیتی ہوں؟"

"بدلہ لینا میری فطرت نہیں نہ ہی ایسی تربیت ہے۔ درگزر کرتی ہوں۔"

38 "کن چیزوں کے بغیر گزارہ نہیں؟"

"موبائل فون۔ پیسے (تھوڑا کیش) اور اے ٹی ایم کارڈ وغیرہ۔"

39 "میرا مستقبل؟"

"اللہ کو پتا ہے... مگر میری خواہش ہے کہ شادی ہو، اچھی فیملی لائف ہو اور ساتھ ہی اداکاری میرا پروفیشن ہو۔"

40 "پسندیدہ شاپنگ مال؟"

"کوئی خاص نہیں... جہاں سے اچھی اور معیاری چیزیں مناسب داموں میں مل جائیں۔"

41 "وہ دور جو یاد آتا ہے؟"

"مجھے اسکول کا زمانہ بہت یاد آتا ہے۔"

42 "فخر کا کوئی لمحہ؟"

"جب کوئی کہے کہ آپ بہت اچھا پرفارم کرتی ہیں۔ ہم نے فلاں سیریل یا سوپ آپ کا دیکھا تھا۔"

43 "کس ملک کی ترقی سے متاثر ہیں؟"
"یورپ... یورپ کے تمام ممالک مجھے بہت پسند ہیں۔ کاش ہمارا ملک بھی اتنا ہی ترقی یافتہ ہو جائے۔"
44 "شوبز میں آمد؟"
"اپنی صلاحیتوں سے آئی ہوں۔ یہاں پرچی ایک بار چلتی ہے... پھر اپنا ٹیلنٹ دکھانا پڑتا ہے... اللہ کا شکر ہے مجھے پرچی کا سہارا نہ لینا پڑا۔"
45 "کامیابی کے گر؟"
"محنت، لگن اور شوق... وقت کی پابندی بھی کرنی چاہیے مگر... میں کر نہیں پاتی... مگر کوشش ضرور کرتی ہوں۔"
46 "سیکھنے کے لیے انسٹیٹیوٹ یا سینیئرز؟"
"دونوں بہت ضروری ہیں۔ اگر سینیئرز سے آپ کے تعلقات اچھے ہیں تو ان سے بہتر آپ کو کوئی سکھا ہی نہیں سکتا۔ میں اپنے اردگرد لوگوں سے بہت کچھ سیکھتی ہوں۔"
47 "امیر بننے کے لیے اچھی قسمت یا انتھک محنت؟"
"دونوں... کیونکہ اللہ بھی ان کا ساتھ دیتا ہے جو انتھک محنت کرتے ہیں' ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھیں گے تو کیسے کمائیں گے۔"
48 "کن چیزوں کی خریداری بہت کرتی ہوں؟"
"کپڑے' شوز اور خوب صورت ہینڈ بیگز میری کمزوری ہیں ان چیزوں کے لیے بہت فضول خرچ ہوں۔"
49 "لوگ فرمائش کرتے ہیں؟"
"سیلفی بنوانے کی۔"
50 "لڑکوں کی بری عادت؟"
"فلرٹ کرتے ہیں۔"
51 "مجھے شوق ہے جیولری' پراپرٹی یا کیش؟"
"مجھے کیش کی صورت میں پیسا جمع کرنے کا شوق ہے۔"
52 "میرے بیگ کی تلاشی لیں تو؟"
"کچھ چونکا دینے والی چیزیں نہیں نکلیں گی' موبائل فون ہوگا' تھوڑا سا میک اپ کا سامان ہوگا اور چارجر تو ضرور ہی ہوگا۔"
53 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"مجھے شادی میں رسمیں پسند نہیں... بس سادگی سے شادی ہونی چاہیے۔"
54 "اگر اداکارہ نہ ہوتی تو؟"
"ایک بہت اچھی پینٹر' مصور ہوتی۔"
55 "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"گرم اور مزے دار کھانا مل جائے... تاکہ کھا کے پھر میں سوجاؤں۔"



سانحہ ارتحال

ہماری مصنفہ حمیرا نوشین کی والدہ طویل علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔
انا للہ وانا الیہ راجعون
ہم حمیرا نوشین کے غم میں برابر کے شریک اور دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

مقابل ہے آئینہ

عاصمہ ابراہیم

ادارہ

س : "اصلی نام کیا ہے؟ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟"

ج : "اصلی نام عاصمہ ہے گھر والے عاصمہ ہی کہتے ہیں۔"

س : "آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟"

ج : "ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہو۔" (ہاہاہا)

س : "حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟"

ج : "حسین صورتیں دیکھ کر دل میں خیال آتا ہے دیکھتی رہوں۔"

س : "اگر آپ کے پرس کی تلاشی لے جائے تو؟"

ج : "فضول چیزوں کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔"

س : "بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟"

ج : "واقعی ڈرتی ہوں اور میرے خیال میں سب لوگ بھوتوں سے ڈرتے ہیں۔"

س : "مہمان کیسے لگتے ہیں؟"

ج : "اچھے تو لگتے ہیں۔ مگر اچانک آجائیں تو بہت کوفت ہوتی ہے۔"

س : "کھانے میں کیا پسند ہے؟"

ج : "کڑاہی گوشت، قیمہ کریلے اور میٹھے میں کریم چاٹ اور کھیر بہت پسند ہے۔"

س : "اگر آپ کو حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟"

ج : "حکومت ہمارے بس کی بات کہاں اس لیے کچھ بھی نہیں سوچا۔"

س : "پسندیدہ شاعر؟"

ج : "علامہ اقبال اور احمد فراز۔"

س : "مزاجاً "لڑاکا" ہیں؟"

ج : "اپنی برائی بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔" (ہاہاہا)

س : "گھر سے باہر جاتے ہوئے کیا کیا چیزیں ساتھ رکھتی ہیں؟"

ج : "صرف والٹ۔"

س : "کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟"

ج : "سادہ مزاج، بے ریا، بناوٹ سے پاک، لوگ بہت پسند ہیں۔"

س : "اگر لوڈشیڈنگ نہ ہوتی تو؟"

ج : "تو سب کی زندگی میں سکون ہوتا۔"

س : "اللہ پاک کو یاد کرنے کا سب سے بہترین وقت؟"

ج : "ہر وہ وقت بہترین ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو خلوص سے یاد کیا جائے۔"

س : "آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟"

ج : "کفایت شعار ہوں کیونکہ پیسے بہت محنت سے کمائے جاتے ہیں۔"

س : "کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟"

ج : "میرے خیال میں نام کا اثر شخصیت پر ہوتا ہے۔"

س : "وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے خیال آتا ہے دنیا کیا کہے گی؟"

ج : "دنیا تو ہر کام پر ہی اعتراض کرتی ہے کیوں کیا؟"

کیوں نہیں کیا؟"
س : "آپ کسی سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتا پیچھے لگ جائے تو؟"
ج : "تو میں بہت زیادہ بھاگوں گی تاکہ کتے کی پہنچ سے دور ہو جاؤں۔"
س : "آپ کی نظر میں محبت کیا ہے؟"
ج : "محبت کے نام پر وقت گزاری۔"
س : "کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟"
ج : "اپنے والدین اور اساتذہ اکرام ہیں۔"
س : "اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہیں؟"
ج : "جی ہاں اپنی تعریف سن کر بہت زیادہ خوش ہوتی ہوں۔"
س : "ڈرامے دیکھتی ہیں؟"
ج : "جی ہاں کبھی کبھی۔"
س : "اگر دوست ناراض ہو جائیں تو کیسے مناتی ہیں؟"
ج : "مجھے بالکل منانا نہیں آتا۔"
س : "حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟"
ج : "جب ہماری وجہ سے کوئی خوش ہو جائے تو حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے۔"
س : "زندگی سے کیا سبق سیکھا؟"
ج : "وقت بہت قیمتی ہے اس کو ضائع کرنے والے ایک دن خود بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔"
س : "ستاروں پہ یقین رکھتی ہیں؟"
ج : "میں ستاروں پہ بالکل یقین نہیں رکھتی۔"
س : "کوئی آخری بات؟"
ج : "اللہ تعالیٰ پر ہمیشہ کامل یقین رکھنا چاہیے۔"
س : "کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے؟"
ج : "ہم جتنا مرضی جی لیں، لیکن مرنا ضرور ہے اور قبر کی ہولناکی اور قبر کی تاریکی ذہن میں رہتی ہے۔"

✡ ✡

آسیہ مرزا

ہو رکھی بات ستارو

عباد گیلانی بلڈ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی بیوی مومنہ کو طلاق دے کر اپنے بیٹے حازم کو اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دوسری شادی عاظمہ سے کر لیتا ہے۔ حازم اپنی ماں عاظمہ اور بھائی بابر کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہا ہوتا ہے' مگر اپنے باپ عباد گیلانی کی بیماری کی وجہ سے فکر مند رہتا ہے۔ جب کہ عاظمہ اور بابر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ عباد گیلانی کو اپنی بیماری میں احساس ہوا ہے کہ اس نے حازم کی ماں مومنہ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ عباد گیلانی مومنہ کے باپ یاور علی کو بلاتا ہے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے اور حازم کو خاص طور سے اس کے نانا یاور علی سے ملواتا ہے' مگر حازم اپنے نانا سے مل کر اچھے تاثرات کا اظہار نہیں کرتا' مگر بعد میں اپنے باپ کی خواہش پر ان کے ساتھ اپنے نانا کے گھر جاتا ہے اور اپنی ماں مومنہ سے ملتا ہے۔ ماں سے مل کے تمام شکوے بھول جاتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

حوریہ مومنہ کی بھتیجی سے بے حد محبت کرتی ہے اور مومنہ بھی اسے بے تحاشا چاہتی ہے' حازم جب حوریہ کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں حوریہ کے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھرتے ہیں اور یہ ہی حال حوریہ کا بھی ہوتا ہے۔ عباد گیلانی حوریہ سے مل کر بہت خوش ہوتا ہے کیونکہ حوریہ میں اسے مومنہ کا عکس نظر آتا ہے اور حازم سے پوچھ کر اس کے نانا یاور علی سے دونوں کی شادی کی بات کرتا ہے۔

حوریہ اپنی دوست فضا سے بہت محبت کرتی ہے' فضا کی ایک امیرزادے سے دوستی ہے اور وہ گھر والوں سے چھپ کر اس سے ملتی ہے۔ حوریہ کو اس بات سے اختلاف ہے' وہ فضا کو بہت سمجھاتی ہے کہ اس راستے پر نہ چلے' مگر فضا نہ مانی اور آخر کار ایک دن محبت کے نام پر بربادی اپنی قسمت میں لکھوا لیتی ہے اور اس بات کا پتا اس کی سوتیلی ماں جہاں آرا کو چل جاتا ہے اور وہ اپنے بھانجے نصیر سے اس کی شادی کرنے کا پروگرام بنا لیتی ہے جبکہ فضا اس پر راضی نہیں ہوتی حوریہ کو جب پتا چلتا ہے تو وہ فضا کو سمجھاتی ہے اس امیرزادے کو کہے کہ وہ اس سے شادی کرے اور فضا اس کو مجبور کرتی ہے کہ یہ بات



وہ خود اس کو سمجھائے اور فضا کے مجبور کرنے پر جب وہ بابر سے ملتی ہے تو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوتا ہے بابر سے ہرگز نہیں ملنا چاہیے تھا اور اس بات پہ بھی افسوس ہوتا ہے کہ اس نے ایک غلط لڑکی کو دوست بنایا.... (اب آگے

اٹھارویں قسط



عاطمہ بابر کے روم میں اسے ناشتے کے لیے خود آج بلانے آئیں تو "علی شاہ" کو اس کے جہازی سائز بیڈ پر سوتا دیکھ کر نادم ہو گئیں۔
"ارے یہ یہاں سو رہا ہے میں سمجھی نفیسہ نے اسے حوریہ کے روم میں ہی سلایا ہے۔"
بابر باتھ روم سے باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں تولیہ تھا جس سے وہ منہ پونچھ رہا تھا پھر تولیہ ایک طرف ڈال کر گاؤن کی رسیاں باندھنے لگا۔
"یہ تمہارے پاس رات بھر سوتا رہا ڈسٹرب کیا ہوگا۔ تم نفیسہ کے ہاتھ میرے روم میں بھجوا دیتے۔"
"نہیں۔ مجھے بالکل ڈسٹرب نہیں کیا اس نے۔ بلکہ مجھے تو آج کچھ زیادہ ہی سکون کی نیند آئی۔" وہ اٹالین طرز کی ڈریسنگ کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش پھیرتے ہوئے بولا۔
عاطمہ نے جائزہ لیتی نظروں سے اسے دیکھا پھر ہلکی سانس کھینچ کر بولیں۔
"ایکچوئلی میں نے سلیپنگ پلز لے لی تھی۔ سو اس کا دھیان ہی نہیں رہا۔ یہ نفیسہ بھی بہت غیر ذمہ دار ہو گئی ہے اسے علی شاہ کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔"
"او نو۔ مام میں نے کہا ناں اس نے مجھے بالکل ڈسٹرب نہیں کیا بلکہ اب یہ روز میرے پاس ہی سوئے گا۔" وہ بیڈ کے نزدیک آیا اور ایک محبت بھری نگاہ گہری نیند میں سوئے علی شاہ پر ڈالی اور اس کے بال ہلکے سے سہلائے۔
عاطمہ کے چہرے پر یک بیک متفکر سی سنجیدگی چھائی۔ وہ بابر کو دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولیں۔
"اس طرح سے کب تک چلے گا بابر۔"
بابر نے ذرا سا رک کر ان کی طرف گھوما اور استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔
"حوریہ کے بغیر علی شاہ کو کب تک روک سکتے ہیں۔" وہ وضاحتی لہجے میں بولیں۔
"میرے خیال میں پہلے ناشتا کریں پھر اس ٹاپک پر ڈسکس کریں گے۔" وہ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچ کر اطمینان سے بولا۔ عاطمہ اسے دیکھ کر رہ گئیں اور خود بھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔
"میں سیریس ہوں بابر ٹالنے کی کوشش مت کرو تمہارے پاپا زندہ تھے تو اور بات تھی اب مجھ پر بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ تم جو کرتے پھر رہے ہو یہ غلط ہے۔"
"تو آپ کے خیال میں جو ٹھیک ہے وہ بتا دیں۔" وہ نیپکن کو گود میں پھیلاتے ہوئے اطمینان سے بولا اور آملیٹ کی پلیٹ اپنی طرف کھینچ کر کانٹے کی نوک آملیٹ پر جماتے ہوئے ہلکے سے مسکرایا۔ عاطمہ اسے گھور رہی تھیں۔
"تمہاری اپروچ غلط (نقطہ نظر) ہے بابر۔" وہ جھنجلا گئیں۔
"مام۔ اپروچ جو بھی ہو۔ منزل کا پتا میں نے بتا دیا ہے اب راستے کا انتخاب۔ آپ کی مرضی پر چھوڑ رہا ہوں۔ او کے۔"
ایک پل عاطمہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔ پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولیں۔
"جانتے ہو لائبہ کتنا ہرٹ ہو کر گئی ہے یہاں سے۔"
"ہوں۔" اس نے سر کو ہلکے سے جنبش دی۔ "آئی نو دیٹ۔"
"اس کے لیے یہ سب کچھ کسی شاک سے کم نہیں ہے۔"
"تو آپ نے اس سے کیوں ڈسکس کرتی ہیں ہمارے فیملی میٹرز کو۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا مت کیا کریں اس سے شیئر ہر بات کو۔" وہ ناراضی سے بولا۔
"کیا مطلب۔ وہ کوئی غیر نہیں ہے۔ وہ بھی فیملی ممبر کی طرح ہے بابر۔"

"مگر ممبر نہیں ہے۔"
"بابر۔" عاظمہ زچ ہو کر رہ گئیں۔ پھر گلاس اٹھا کر پانی کا گھونٹ بھر کر اپنے اعصاب کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔
"تم جانتے ہو کہ میں ہمیشہ اسے اپنی بہو بنانے کے خواب دیکھتی رہی ہوں۔ پہلے حازم کے حوالے سے پھر تمہارے اور اس کے ذہن میں بھی یہ بات بیٹھ چکی ہے۔"
"یہ خواب آپ نے دیکھے ہیں اور آپ نے ہی اسے دکھائے ہیں' میں نے نہیں۔" بابر نے کانٹا پلیٹ پر پٹخنے کے انداز میں رکھا۔
"میری اس سے کوئی کمٹ منٹ نہیں ہے' میں نے اسے ہرگز خواب نہیں دکھائے۔ پھر ہرٹ ہونے کا کیا سوال۔"
"مگر تم جو سوچ رہے ہو ایسا ممکن بھی تو نہیں ہے۔" بابر کو کرسی دھکیل کر اٹھتے دیکھ کر عاظمہ جلدی سے بولیں۔ ان کا لہجہ پست تھا۔ بابر نے رک کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے کے نازک حصوں خصوصاً" ناک کے ارد گرد گہری سرخی تھی۔ سرخی موسم کے باعث تھی اور کچھ اندرونی خلفشار سے جنم لے رہی تھی۔ ان کی پیشانی پر لکیروں کا جال بھی پھیل گیا تھا۔
"اٹس ناٹ پاسیبل (یہ ممکن نہیں ہے) بابر تم جانتے ہو اچھی طرح کہ وہ حازم کو کتنا چاہتی رہی ہے۔" عاظمہ دلائل دے کر اسے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ "وہ حازم سے بے پناہ محبت کرتی رہی ہے اور کرتی ہے۔"
"تو میں اس کے دل سے حازم کی محبت کھرچ تو نہیں رہا۔"
"اوف۔۔۔ کیسی بے وقوفانہ باتیں کرتے ہو۔ بھلا دو محبتیں دل میں ہوتی ہیں۔ یہ ایک عورت کا دل ہے بابر۔ مرد کا نہیں کہ دس دس محبتیں سمیٹے بیٹھا ہو۔" عاظمہ بگڑے تیوروں کے ساتھ بولیں 'مگر وہاں ایک ٹھہراؤ تھا ایک سکون تھا جیسے اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہ ہو۔
"محبت تو مرد بھی ایک ہی کرتا ہے مام۔" وہ میز کی سطح پر ہتھیلیاں ٹکا کر ذرا سا جھکا۔ "دس کے ساتھ تو فقط وقت رنگین کر سکتا ہے۔ محبت نہیں اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔" عاظمہ اسے فقط ملامتی نظروں سے دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ عباد گیلانی کے حوالے سے انہیں سنا رہا تھا۔ ان کے دل پر عجیب سی چوٹ پڑی تھی۔ وہ چلا گیا امیر علی کو چائے کمرے میں پہنچانے کی تاکید کرتا ہوا۔
عاظمہ بے دلی سے ناشتا کرنے لگیں 'مگر ہر نوالہ جیسے حلق میں کانٹے کی طرح پھنسنے لگا۔
کتنی گہری چوٹ دے کر گیا تھا وہ انہیں۔ وہ یک دم ناشتا سے ہاتھ کھینچ گئیں اور چائے کا مگ اٹھا کر اس کی دھیرے دھیرے چسکیاں بھرنے لگیں۔



مومنہ کو عصر کی نماز سے فارغ ہو کر تخت پر یوں ہی بیٹھے دیکھ کر رقیہ بھابھی اس کے پاس چلی آئیں۔
"تم نے بات کی حوریہ سے۔۔۔ اسے سمجھایا تو ہوگا۔ کیا کہتی ہے وہ۔۔۔" وہ ماں ہونے کے ناطے بے حد فکر مند دکھائی دے رہی تھیں۔ انہیں حوریہ کا یہاں آکر رہنا برا نہیں لگ رہا تھا 'مگر علی شاہ کو گیلانی ہاؤس والوں کے حوالے کر کے اس سے دستبردار ہو کر چلے آنا دکھی کر رہا تھا۔
"وہ اتنی ضدی اور خودسر تو کبھی نہیں تھی مومنہ۔ اب اسے کیا ہو گیا ہے۔" ان کے چہرے پر اور لہجے میں

اضطراب، بے کلی رنج ہلکورے لے رہا تھا۔ مومنہ نے نظریں چرالیں اور تسبیح کے دانے دھیرے دھیرے گرانے لگی۔

"کیفیت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔ یہ انسانی دل ہے بھابھی کبھی کبھی یوں ہی بددلی سی ہونے لگتی ہے۔ اتنی زیادہ کہ ہر شے سے بے زاری اور نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنے وجود سے بھی، لیکن یہ کیفیت دائمی نہیں ہوتی عارضی ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو ختم ہونے میں کچھ وقت چاہیے ہوتا ہے۔"

"مگر کتنا وقت تین روز تو گزر چکے ہیں وہ اپنے بچے کے بغیر کیسے خوش رہ سکتی ہے۔" رقیہ بھابھی کی آواز بھر آگئی۔

"ہاں ایک ماں اپنے بچے کے بغیر کیسے خوش اور مطمئن رہ سکتی ہے وہ خوش نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں۔"

"تو پھر وہ کیوں اتنا ظالمانہ فیصلہ کرکے چلی آئی ہے۔ حالت دیکھی ہے تم نے اس کی۔۔۔ نہ کھارہی ہے نہ پی رہی ہے اجڑ کر رہ گئی ہے۔"

مومنہ نے ہلکی سانس کھینچی اور تسبیح لپیٹ کر جائے نماز پہ رکھ دی۔

"اب صبر ہی کرسکتے ہیں۔"

"کیسے صبر کروں۔ گیلانی ہاؤس سے بھی کسی نے پلٹ کر اس کی خبر گیری نہیں کی۔۔۔ اس کا بچہ تک لوٹانے نہیں آئے۔ کتنے ظالم ہیں وہ لوگ۔"

"کبھی کبھی فیصلے وقت کرتا ہے انسان نہیں اور وقت کا انتظار کریں۔ یقیناً" اچھا ہی ہوگا۔"

"مگر مجھے ڈر لگ رہا ہے مومنہ۔۔۔ کہیں وہی کہانی نہ دہرائی جائے۔ حازم کی طرح علی شاہ کو بھی وہ چھین نہ لیں ہمیشہ کے لیے۔"

"خدا نہ کرے۔" مومنہ نے لرز کر انہیں ٹوکا۔ ایک بے بسی ہر فرد کو اندر ہی اندر ادھیڑ رہی تھی اور خود حوریہ بھی خود کو ایسے دوراہے پر کھڑا محسوس کررہی تھی جہاں سے کوئی منزل نہیں آتی۔ پلٹ کر جائے تو وحشت ناک اندھیرا" آگے بڑھنا چاہے تو تنہائی اور کل متاع لٹادینے کا ماتم۔ وہ خود کو کمرے میں بند کرکے پڑی تھی۔ وہ مومنہ سے بھی نالاں تھی اسے شکوہ تھا ان سے کہ اتنا کچھ جاننے کے باوجود انہوں نے گیلانی ہاؤس والوں کو برا بھلا نہ کہا تھا۔

"آپ بھی بس میری بے بسی کا تماشا دیکھتی رہیں گی کیا؟" وہ مومنہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر خفگی سے بولی۔

"شاید میں ہی پاگل ہوں کہ آپ سے توقعات باندھ لیں۔ آپ نے تو کبھی اپنے لیے آواز نہیں اٹھائی۔ اپنا حق کبھی نہیں مانگا۔ میرے لیے کیا آواز اٹھائیں گی۔" وہ سخت روٹھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"میرے پاس پلٹنے کا کوئی راستہ نہیں تھا حوریہ۔۔۔ سارے راستے بند ہوچکے تھے، مگر تمہارے لیے راستہ کھلا ہے جسے تم خود بند کرنے پر تلی ہوئی ہو۔" مومنہ اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ نرمی سے تھامنا چاہا تو وہ مجروح نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے ان کا ہاتھ ہٹا کر بیڈ سے اترنے لگی۔

"آپ کا مطلب ہے کہ مجھے۔۔۔۔"

"نہیں۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ تم بابر کے حق میں فیصلہ دے دو۔" مومنہ جلدی سے بولی۔ "میں تو بس چاہتی ہوں کہ تم اس کھلے دروازے سے واپس چلی جاؤ۔"

"واپس چلی جاؤں۔۔۔ اس آدمی کے جذبے مجھ پر آشکار ہوچکے ہیں۔ اس کے باوجود وہاں چلی جاؤں۔"

"بابر نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی کہ تم اس سے شادی پر ہامی بھروگی تب ہی کوٹھی میں رہ سکتی ہو۔ وہ گھر تمہارا

بھی ہے علی شاہ کا ہے تم چھوڑ کر آگئیں اپنا بچہ بھی چھوڑ آئی ہو۔ حوریہ بہت سے فیصلے ہمیں وقت اور حالات کے تابع ہو کر کرنا پڑتے ہیں۔"

"پھپھو۔"

"میں نہیں کہہ رہی ہوں کہ تم بابر سے شادی کر لو مگر یہ بھی تمہیں مشورہ نہیں دے سکتی کہ تم اپنے بچے سے دست بردار ہو کر اسی دہلیز پر عمر گزار دو۔ ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے سمجھو۔ عاظمہ کی طرف سے تمہیں پریشر نہیں ہے وہ تمہاری عزت کرتی ہے تم سے محبت کرتی ہے اور تم کہو تو میں خود بابر سے بات کروں گی۔" اس نے رک کر حوریہ کی طرف دیکھا وہ کرب سے لب دانتوں میں دبائے بیٹھی تھی۔

"بے شک میں بابر کو اتنا نہیں جانتی ہاں بس اتنا ہی جتنا تم نے اس کے بارے میں بتایا ہے مگر مجھے لگتا ہے وہ میری بات سنے گا اور سمجھے گا بھی۔"

"مگر کیا۔ آپ اس کے دل کو صاف کر سکیں گی ان خرافات سے۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

"حوریہ۔ تم انتہا پسندی سے سوچ رہی ہو۔" مومنہ کا انداز تادیبی تھا۔ "یاد رکھنا شدت پسندی اور انتہا پسند سوچ انسان کو تنہا اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے محروم کر دیتی ہے۔" حوریہ رخ موڑ کر بیڈ سے اتر کر کمرے سے باہر جانے لگی پھر ذرا سا رک کر بغیر پلٹے بولی۔

"مجھے ایسی کوئی خوشی کی تلاش نہیں رہی اب جو میری ذات کو فنا کر کے میری انا اور خودداری کو کچل کر ملے۔ چاہے میرا بچہ ہی کیوں نہ ہو۔"

"تو کیا تم کھو دو گی علی شاہ کو۔" مومنہ تڑپ کر اس کی طرف بڑھی۔ وہ جھٹکے سے پلٹی۔ اس کی آنکھوں میں خطرناک حد تک سنجیدگی بلکہ وحشت تھی۔

"ہاں۔۔۔ اگر اسے پانے کے لیے مجھے بابر کی طرف جانا پڑے گا اس کا ہونا پڑے گا تو کھو دوں گی۔"

"حوریہ۔۔۔ تم پاگل ہو گئی ہو۔ اس نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی ہے دیکھو مجھے ڈر لگ رہا ہے تم علی شاہ کو کھو دو گی۔" وہ خوف اور اضطراب سے اس کی جانب بڑھی مگر وہ سنی ان سنی کرتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

مومنہ دکھ کے گہرے احساس کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں جلنے سی لگیں۔ حالات کبھی یہ رخ بھی اختیار کر لیں گے انہوں نے سوچا ہی نہ تھا۔

✲ ✲ ✲

بادر ہاؤس کا ہر فرد حیران پریشان تھا کسی کو حوریہ کے یہاں آکر بیٹھ جانے اور علی کو چھوڑ کر آجانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی مگر اس روز عاظمہ کے فون نے سب کی یہ الجھن دور کر دی۔ انہوں نے بابر کا پرپوزل دیا تھا حوریہ کے لیے اور رقیہ بھابھی سے بات کی تھی اور شائستگی سے اس بات پر زور دیا بلکہ جتا بھی دیا کہ "بابر علی شاہ کے لیے بے حد مخلص ہے وہ کسی طور اس کے سر پر یتیمی کا لیبل دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ اسے اپنے سائے میں اپنی ہی کسٹڈی میں پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ علی شاہ اپنے باپ کے گھر یعنی گیلانی ہاؤس میں ہی رہے گا وہیں پلے بڑھے گا۔" فون رکھنے کے بعد رقیہ بھابھی ابا جی کے کمرے میں بیٹھ کر عاظمہ کی ساری کہی ہوئی باتیں من و عن سنانے لگیں۔

"کیا اس نے یہ بھی کہا کہ اگر حوریہ نے بابر کا پرپوزل ریجیکٹ کر دیا تو اس صورت میں وہ علی شاہ کو ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھ لیں گی۔" مومنہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں کی اس نے۔" رقیہ بھابھی نے چائے کے سارے کپ سمیٹ کر ٹرے میں

رکھتے ہوئے جواب دیا پھر سوچتے ہوئے بولیں۔
"ہاں، مگر یہ ضرور کہا تھا کہ بابر۔ علی شاہ کو اپنی کسٹڈی میں ہی رکھے گا۔ وہ اس کے سر پر یتیمی کا لیبل نہیں دیکھ سکتا۔ حوریہ آنا چاہے تو کوٹھی کے دروازے کھلے ہیں۔" مومنہ نے نظریں جھکالیں اور ہلکی سانس کھینچ کر رہ گئی۔
"اگر دیکھا جائے تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔" یاور علی خاصی سوچ بچار اور ایک طویل خاموشی کے بعد گویا ہوئے۔ عادل بھائی نے اپنے خیالات سے چونک کر چائے کا مگ ایک طرف رکھا اور ان کی طرف متوجہ ہوئے۔
"بابر میں تو بظاہر کوئی خاص برائی نظر نہیں آتی مجھے تو اور اچھا ہے گھر کی بات گھر میں ہی رہ جائے۔ علی شاہ کے سر پر سگے چچا کا ہاتھ رہے اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی ہے۔ کیوں مومنہ۔ تمہارا کیا خیال ہے۔" انہوں نے یک دم مومنہ کو مخاطب کیا تھا۔ مومنہ نے ان کی طرف دیکھا پھر نظریں چرا کر اضطراری انداز میں پہلو بدل کر رہ گئی۔
"اتنی جلدی کوئی فیصلہ کیسے کرسکتے ہیں ابا جی۔ جب کہ ہم بابر کو ٹھیک سے جانتے بھی نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ وہ حازم سے یکسر مختلف مزاج کا ہے اور اسے حوریہ سے زیادہ کون جان سکتا ہے حوریہ کی رائے جانے کیا ہو' کے بارے میں۔" وہ مدلل لہجے میں گویا ہوئی۔
"وہ تو حازم کے نام پر عمر گزار دینا چاہتی ہے۔" رقیہ بھابھی شکایتی انداز میں بولیں۔ "ابا جی اب ساری زندگی اسے ہم یوں بٹھائے نہیں رکھیں گے۔ وہ نادان ہے ہم تو نہیں نا۔" رقیہ بھابھی کے لہجے میں الجھن تھی بے تھی ان کا بس نہیں چل رہا تھا وہ ابھی بابر کے اس رشتے پر اقرار کی سند لگادیں۔ پھر عادل بھائی کی طرف دیکھتے ہو بولیں۔
"آپ بھی تو کچھ بولیے۔ اسے سمجھائیے۔ وہ بے کار کی ضد لے کر بیٹھی ہے۔ اسے بھلا گیلانی ہاؤس میں تکلیف تھی۔" جواباً عادل بھائی فقط ہنکارا بھر کر رہ گئے۔
"چلو خیر۔ سوچتے ہیں ہر پہلو پر غور کرتے ہیں۔" ابا جی اذان کی آواز سن کر کرسی سے اٹھے رقیہ بھابھی ٹرے سمیٹے مگ اٹھا کر کمرے سے نکل گئیں۔ عادل بھائی ابا جی کے ہمراہ ہی نماز کے لیے چلے گئے۔
مومنہ ابا جی کی خالی کرسی پر نیم دراز ہوکر آنکھیں بند کرگئی۔
ایک عجیب تھکن رگ رگ سے لپٹنے لگی تھی۔ وہ بابر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ حوریہ نے بابر کے بارے میں جتنا کچھ بتایا تھا ان سب نے اس کے اپنے ہی ماضی کا عباد گیلانی ان کی آنکھوں کے سامنے کردیا تھا۔ حوریہ علی شاہ کا مستقبل... بابر کا کیریکٹر... حوریہ کی اس سے نفرت... بابر کا اس کی طرف کھنچاؤ... وہ جتنا سوچتی اتنا الجھ جارہی تھی، مگر ہر سوچ جیسے بند رستے پر آکر رک جاتی تھی۔ ذہن میں ہر خیال مکھی کے جال کی طرح پھنس کر جاتا۔
محبت تو عباد تم نے بھی کی، مگر تمہیں محبت کا سلیقہ نہیں آیا۔ تم نے محبت میں جبر کو شامل کردیا۔ محبت میں زور جبر' یہاں تک کہ اپنی ذات بھی نکل جائے تب وہ خالص ہوتی ہے۔ تب وہ مقابل کے دل پر اثر کرتی ہے۔
اور اب تم بھی بابر۔ عباد کی طرح محبت کو فقط پالینے کا نام سمجھ رہے ہو۔ چاہے زور سے' جبر سے' کسی بھی طریقو سے۔



فضا کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا اس نے ایک صحت مند بیٹے کو جنم دیا تھا۔ ماں بننے کے وہ جس عمل سے گزر تھی اس نے اس کی سوچوں کو یکسر بدل ڈالا تھا۔
اس کے ہاتھوں میں جب اس کا بچہ دیا گیا تو اسے لگا وہ دنیا کی خوش نصیب' امیر ترین اور ایک مکمل عورت ا

اب کوئی تمنا کوئی تشنگی جیسے باقی نہ رہی ہو۔ نصیر اس کے پاس آیا تو وہ بے اختیار ہو گئی اور اس کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ آنسو خوشی کے تھے، شکر گزاری کے تھے اور وہ بے پناہ مسرت جو اس سے سنبھل نہ رہی تھی۔

"میں تو اس قابل بھی نہیں تھی... میرے رب نے مجھ پر اتنا بڑا کرم کیا ہے نصیر۔"

"ہاں... اس کی رحمت کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ تو نوازنے والا ہے ہم ہی مانگنے میں کنجوسی کرتے ہیں۔ مانگنے کا سلیقہ نہیں رکھتے۔ باوجود اس کے وہ ہم کو دیتا ہے۔" وہ بھی بے حد خوش دکھائی دے رہا تھا اور اس کی اصل خوشی کا باعث فضا کے چہرے پر پھیلی حقیقی بے پایاں خوشی اور تشکر کے آنسو تھے۔ اس کے بازو اس کے گرد پھیل گئے۔ وہ کھل کر روتی رہی۔

"دیکھیں... کتنا پیارا ہے ہمارا بچہ۔" آنسو کی روانی میں کچھ کمی آئی تو وہ بچے کی طرف متوجہ ہوئی۔ نصیر بھی سوئے ہوئے بچے کو دیکھنے لگا۔ پھر اس کے ننھے منے ہاتھوں کو چھونے لگا۔ اس کے لبوں کی تراش میں تبسم کھلنے لگا۔ وہ سوچ کر رہ گیا کہ... اس ننھے وجود نے آج دونوں کو ایک دوسرے سے کتنے قریب کر دیا ہے سارے فاصلے، ساری بے اعتباری، سارے درد گلے، کہیں دور پرے رہ گئے۔ اس نے بچے کی پیشانی پر لب رکھ دیے۔ پھر یک دم یاد آنے پر بولا۔

"ارے ہاں۔ خالہ اور خالو بھی آئے تھے خاصی دیر بیٹھے تھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی گئے ہیں۔"

"ارے۔ چلے گئے، مگر کیوں؟"

"جناب۔ تم اس ننھے منے وجود کو دنیا میں لانے کا جتن کر رہی تھیں تب اور تمہیں تو پتا ہے خالو جان اتنی دیر بیٹھ نہیں سکتے، میں نے ہی ان سے کہا تھا کہ ابھی گھر چلے جائیں۔ میں خود انہیں لے آؤں گا تمہارے پاس۔ خالہ تو ٹھہرنے پر مصر تھیں امی نے زبردستی بھیجا ہے۔"

"ابا بہت خوش ہوں گے نا۔" وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"بہت زیادہ۔ اچھا اب تم ریسٹ کرو۔ میں ذرا دکان کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔ ابھی اماں کو مٹھائی بھی بانٹنی ہے۔"

"بچے کیوں نہیں آئے۔" وہ نصیر کے دونوں بچوں کا پوچھنے لگی۔

"وہ دونوں تو بھئی دیوانے ہو رہے ہیں اپنے ننھے منے بھائی کو دیکھنے کو۔ اماں نے ہی روک رکھا ہے اب کل تو تم گھر آ رہی ہو۔ بے کار اسپتال میں کیا رش کرنا۔" نصیر نے بچے کو اس کی گود سے لے کر کاٹ میں ڈالا اور فضا کی طرف پلٹا۔

"تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔ لیتا آؤں گا۔" وہ بے حد محبت سے اس کے سراپے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ تکیے پر سر رکھے وہ بے حد کمزور دکھائی دے رہی تھی مگر اس کمزوری کے باوجود اس کے چہرے پر ممتا کی ایک چمک تھی۔

"نہیں۔" وہ سر کو ہلکے سے نفی میں جنبش دے کر رہ گئی۔ پھر بولی۔ "اب تو جیسے کسی چیز کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔"

"میری بھی نہیں۔" وہ مسکرا کر اس کے چہرے کی طرف جھکا۔ فضا نے پلکیں اٹھائیں۔ نصیر کی آنکھوں میں محبت کا ایک سمندر گویا موجزن تھا جو اسے ڈبونے کے لیے تیار بیٹھا تھا اور اب وہ کیونکر نہ ڈوبتی اسے ساحل پر نہیں رہنا تھا محبت کے اس سمندر میں ڈوبنے میں آسودگی جو مل رہی تھی۔

نصیر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"اتنے پیارے تحفے کے بعد اتنا حق تو بنتا ہے ناں۔"
"بس۔ اتنا....." وہ بھی شرارت سے گویا ہوئی۔
"ارے۔ میرا تو سارا پیار ہی تمہارا لیے ہے فضا۔" وہ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے ہنس دیا۔ "چلو اب ریسٹ کرو۔ اماں بھی آتی ہوں گی تمہارے پاس ابھی۔" وہ نرس کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر سیدھا ہو گیا اور اس کا ہاتھ تھپک کر بیڈ کے سرہانے سے اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ بچے پر ایک پیار بھری نظر ڈالی اور کمرے سے نکل گیا۔
فضا دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔ پھر ایک آسودگی کے احساس کے ساتھ آنکھیں بند کرلیں۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ شرعی رشتوں کی محبت میں کتنی آسودگی ہوتی ہے۔ کتنی راحت۔ نہ خوف نہ کوئی دھڑکا نہ وحشت نہ بوجھ۔ نہ انا کا بکھیڑا۔ نہ خودداری کا قتل۔ نہ ذلت اور رسوائی کا اندیشہ۔ صاف شفاف سیدھی سڑک کی طرح جس میں آپ آنکھیں بند کر کے پرسکون ہو کر اپنا سفر طے کرتے رہتے ہیں۔
"بی بی۔ بچے کی فیڈ کا ٹائم ہو گیا ہے۔" نرس کی آواز پر وہ اپنے خیالات سے چونکی اور آنکھیں کھولیں۔ نرس بچے کو سفید چادر میں اچھی طرح لپیٹ کر اس کی گود میں ڈالنے لگی۔ وہ اٹھ کر جلدی سے بیٹھ گئی۔
"اب تم ماں کے درجے پر فائز ہو گئی ہو۔ بچے کے دودھ کا ٹائم یاد رکھا کرنا۔" ادھیڑ عمر کی نرس تھی اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ فضا نے گودی میں آئے بچے کو دیکھ کر اپنے بازو وا کر کے اسے سینے سے لگا لیا اور فرط جذب سے اس کے رخسار پر اپنے لب رکھ دیے۔



بابر باغیچے کے ایک حصہ میں علی شاہ کے ساتھ کھیل رہا تھا وہ اپنی واکر میں بیٹھا تھا۔ بابر بڑی سی گیند اس کی طرف اچھالتا وہ واکر سے ہلکے سے ٹکراتی تو وہ خوشی سے ہاتھ ہلا ہلا کر خود بھی اچھلنے لگتا۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں معصومانہ مسکراہٹ اور چمک لہرانے لگتی۔
میر علی ایک طرف گھاس کے سبز حصے پر بیٹھا چچا بھتیجے کی محبت کا یہ منظر بڑے شوق سے دیکھ رہا تھا' ساتھ ساتھ دور گرنے والی گیند کو پکڑ کر بابر کی طرف اچھال دیتا جسے بابر کیچ کرتا اور پھر علی شاہ کی واکر کے سامنے ہلکے ہلکے اچھالنے لگتا۔
پتا نہیں وہ علی کو خوش کر رہا تھا یا خود خوش ہو رہا تھا۔ اتنا لمبا چوڑا یہ لڑکا میر علی کو بالکل معصوم بچے کی طرح لگ رہا تھا۔ اسے یاد تھا جب وہ چھوٹا سا تھا علی شاہ جتنا ہی اور واکر میں ادھر ادھر بھاگتا پھرتا تھا' مگر سوائے ملازموں کے کسی کے پاس فرصت نہ تھی کہ اس کا ہمکنا' کھیلنا کوئی دیکھتا۔ سب کی مصروف زندگیاں پھر وہ اس کی نظروں کے سامنے پاؤں پاؤں چلنے لگا۔ پھر بڑا ہوتا گیا۔ پھر اس کے پاس فرصت نہ تھی کسی کے لیے..... یہاں سب اپنی اپنی زندگیاں جیتے تھے' مگر اب اس نے عباد گیلانی کے انتقال کے بعد بابر کو بہت بدلتے ہوئے دیکھا تھا۔ کہاں وہ کوٹھی میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا تھا۔ کبھی کبھار ہی ناشتے کی میز پر دکھائی دے جاتا تھا اور کوٹھی میں موجود بھی ہوتا تو اپنے موبائل میں مصروف رہتا ارد گرد سے بے گانہ۔
مگر اب وہ باقاعدگی سے ناشتے کی میز پر رات کے کھانے پر دکھائی دیتا۔ ناشتے کے بعد آفس نکل جاتا۔ آفس سے آکر سب سے پہلے علی شاہ کو پکارتا۔ اسے اپنے روم میں لے جاتا۔ کبھی لان میں اس کے ساتھ کھیلتا کبھی اپنے ہمراہ لانگ ڈرائیونگ پر لے جاتا۔ امیر علی بڑا خوش ہوتا تھا یہ سب دیکھ کر۔
جب کہ ادھر عاظمہ کے لیے یہ سب پریشان کن تھا۔ وہ جس تیزی سے علی شاہ سے مانوس ہو رہا تھا اور اسے خود

سے مانوس کر رہا تھا۔ یہ انسیت ان کے لیے بہت سی فکروں کے دروازے کھول رہی تھی۔ وہ اس وقت بھی اپنی خواب گاہ کے ٹیرس میں بیٹھی بابر اور علی شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔

"چائے مل جائے گی امیر علی۔" بابر گیند ایک طرف پھینک کر کین کی ٹیبل پر رکھے تولیے کو اٹھا کر اپنا سرخ ہوتا چہرہ پونچھتے ہوئے بولا اور کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا اور پیر سے واکر کو اپنے نزدیک کھینچ لی۔

"بالکل۔ کیوں نہیں ابھی لے آتا ہوں مزے دار سی چائے۔" امیر علی جلدی سے گھاس کے فرش سے اٹھا۔

"کاش۔ پاپا تھوڑا سا اور زندہ رہ لیتے امیر علی۔" بابر کی نظریں علی شاہ کے دمکتے چہرے پر جمی تھیں' ایک افسردہ سی مسکراہٹ لبوں پر بکھر گئی۔

"کچھ ازالہ ہی کر لیتا۔" امیر علی بھی یک دم اس افسردگی کے سحر میں آکر کھڑا رہ گیا۔

"جب سب کچھ تھا امیر علی۔ تو میں جانے کہاں تھا پاپا۔ حازم سب تھے۔ بس میں ہی نہیں تھا۔"

امیر علی نے نظریں جھکالیں۔ بابر کے چہرے پر پھیلی ندامت' اداسی یا سیت کو امیر علی دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے بولا۔

"بس صاحب.... موت کو کون روک سکتا ہے۔ وہ تو اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔"

"ہاں۔ موت تو اپنے وقت پر ہی آتی ہے' مگر عجیب بات ہے امیر علی بلکہ بہت تکلیف دہ کہ ہم اپنوں کو اپنے رویوں سے موت سے پہلے ہی مار دیتے ہیں۔" ایک افسردہ سانس اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔ "پاپا حازم سے بہت محبت کرتے تھے اس لیے اس کے پاس ہی چلے گئے۔" وہ کسی کم سن ملول سے بچے کی طرح بولا۔

"نہیں صاحب.... وہ آپ سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ بہت زیادہ۔ مجھے کہتے تھے امیر علی میرا یہ بیٹا بہت پیارا ہے اور مجھے بہت لاڈلا ہے میرے بعد اس کا خیال رکھنا۔" امیر علی کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ بابر نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ دوسرے پل ملول سا ہو کر رہ گیا۔

"ہاں.... مگر دکھ تو اسی بات کا ہے امیر علی کہ میں ان کی محبت کو جب محسوس کرنے لگا تب وہ مجھ سے دور جا رہے تھے۔ رشتوں کا احساس ہمیں ان کے دور چلے جانے کے بعد یا ان کے چھن جانے کے بعد ہی کیوں ہوتا ہے۔"

"آپ ایسی باتیں نہ سوچا کریں صاحب! آپ کی یہ اداسی پوری کوٹھی کو اداس کر دیتی ہے آپ ہنستے مسکراتے رہیے اس کوٹھی اور اس کے مکینوں کو آپ کی ہنسی کی ضرورت ہے۔" امیر علی کندھے پر پڑی چادر کا کونا اٹھا کر آنکھیں پونچھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

ہنسنے اور مسکرانے کا اختیار تو دل کے پاس ہوتا ہے امیر علی۔ اور دل ہی اپنے اختیار میں نہ رہا ہو تو۔ اس نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا لیا۔

کوئی موسم ہو دل میں تمہاری یاد کا موسم
کہ بدلا ہی نہیں جاناں! تمہارے بعد کا موسم

نہیں تو آزما کر دیکھ لو کیسے بدلتا ہے
تمہارے مسکرانے سے دل ناشاد کا موسم

رتوں کا قاعدہ ہے وقت پر ہی آتی جاتی ہیں
ہمارے شہر میں کیوں رک گیا فریاد کا موسم

کہیں سے اس حسین آواز کی خوشبو پکارے گی
تو اس کے ساتھ بدلے گا دلِ برباد کا موسم



وہ چائے کی چسکیاں دھیرے دھیرے بھرتے ہوئے کھڑکی کے باہر دھیرے دھیرے پھیلتے اندھیروں کو گھور رہی تھی۔ شام ڈھل چکی تھی۔ ہر شے پر مدھم تاریکی پھیل رہی تھی اسے اپنے دل میں بھی ڈھلتی شام اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اجالا کب کا دم توڑ چکا تھا بس اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کہاں پیر رکھے اور کس طرف قدم اٹھائے۔

رقیہ بھابھی کمرے میں داخل ہوئیں ان کے ہاتھ میں ان کا اپنا موبائل تھا جسے وہ حوریہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

''یہ لو۔ گیلانی ہاؤس سے فون آیا ہے تم نے تو شاید اپنا موبائل آف رکھا ہوا ہے۔'' ان کے لہجے میں ہلکی ناراضی بھی تھی جو موبائل بند رکھنے کے حوالے سے تھی۔ وہ چونکی۔

''گیلانی ہاؤس سے.... کون ہے؟''

''کوئی ملازمہ ہے میرا خیال ہے علی شاہ سے بات کرانا چاہ رہی ہوگی۔ لو بات تو کرو۔'' علی شاہ کا سوچ کر اس کی ساری حسیات بے دار ہو گئیں۔ اس نے جلدی سے چائے کا مگ قریبی تپائی پر رکھ دیا اور رقیہ بھابھی کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔ رقیہ بھابھی نے بس ایک نظر دیکھا پھر پلٹ کر اپنے پیچھے دروازہ بھی بند کر کے چلی گئیں۔

''ہیلو۔'' وہ بے تابی سے بولی۔

کوئی پیغام نہ دعا کوئی
اس قدر ہم سے ہے خفا کوئی

بابر کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اور کسی بوجھ کی طرح سینے پر آگری۔ ایک پل کو وہ اذیت کے عالم میں لب بھینچ کر رہ گئی۔

''کیسی ہو۔'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' حتی الامکان نارمل رہتے ہوئے بولی مگر اس کے لہجے کی چیخ بابر محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔

''تمہارا گیلانی ہاؤس سے یوں چلے جانا کا کیا مقصد ہے۔ تمہارا کلیش (تصادم) مجھ سے ہے علی شاہ سے تو نہیں۔''

''میرا کلیش کسی سے بھی نہیں ہے۔'' وہ یک دم اس کی بات کاٹ گئی۔ ''میں اپنی زندگی جینا چاہتی ہوں بس۔ اور مجھے جینے دیا جائے۔'' وہ چٹختے لہجے میں بولی۔ ایک پل بابر خاموش رہا پھر ہلکی سی سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

''تم کوٹھی میں آکر اپنی مرضی کی زندگی جی سکتی ہو تم پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے بلکہ اس طرح علی شاہ بھی نگلیکٹ (نظرانداز) نہیں ہوگا۔''

''میں یہاں ٹھیک ہوں اور علی شاہ کے لیے تم ہو نا۔'' وہ سلگ کر بولی تھی۔

''نہیں تم ٹھیک نہیں ہو۔ کوئی ماں اپنے بچے کے بغیر ٹھیک ہو ہی نہیں سکتی۔ ان فیکٹ (حقیقت) تم علی شاہ کو نہیں مجھے نظرانداز کر کے یہ جتانا چاہ رہی ہو کہ......'' بابر ذرا سا رکا پھر سر جھٹکتے ہوئے خفیف سی سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

''اینی ویز۔ میں نے تمہیں اس لیے کال کی ہے کہ تم کوٹھی میں آکر رہو۔ میں کوشش کروں گا تمہارے سامنے

نہ آؤں۔ جہاں تک ممکن ہوگا۔"

"اگر تمہیں مجھ پر کوئی مہربانی کرنی ہی ہے تو میرے بچے کو یہاں بھیج دو۔ میرے پاس۔" وہ خود آزاری کی کیفیت سے گزرتے ہوئے بولی۔

"تم احمق ہو حوریہ 'مگر میں نہیں۔ میں علی شاہ کو اس کا حق دے رہا ہوں۔ وہ گیلانی ہاؤس کا ممبر ہے۔ وہ عباد گیلانی کا پوتا اور حازم گیلانی کا بیٹا ہے اس کا اس کوٹھی پر پورا حق ہے اور میں تمہاری اس بچکانا ضد 'تمہاری اس نفرت اور احمقانہ اموشن (جذبات) پر علی شاہ کا فیوچر (مستقبل) برباد نہیں کر سکتا۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم..... تمہیں علی شاہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تم صرف اور صرف مجھے مینٹلی ٹارچر (ذہنی تشدد) کر رہے ہو۔ انتقاماً" یہ سب کر رہے ہو۔" وہ سلگتی لکڑی کی طرح تڑخی تھی۔ جواباً" وہ افسردگی سے ہنس دیا۔

"ایک ماں سے اس کا بچہ چھین کر تم کون سا اسے حق دے رہے ہو تم ایک ظالم آدمی ہو بابر۔ تم حازم بن ہی نہیں سکتے۔ تم حازم کے پاؤں کی خاک بھی نہیں ہو۔" وہ زہر بجھے لہجے میں پھنکاری۔ بابر کو پل بھر کے لیے اپنے دماغ کی رگیں کٹتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ میں حازم بن ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ اسے قدرت نے ایسا ہی بنایا تھا اور مجھے نہیں۔" وہ دھیرے سے بولا۔ اس کا لہجہ پست تھا۔

"قدرت پر الزام مت دھرو۔ انسان اپنے اردگرد سے سیکھتا ہے اچھا بننا اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ قدرت اسے اچھے برے دونوں راستے دکھاتی ہے۔ اچھائی کی جزا اور برائی کے انجام سے واقف کرا دیتی ہے اب اس کی مرضی وہ کس راستے پر چلے۔"

"ہاں نا" وہ ہلکے سے ہنسا۔ اس کی ہنسی میں طنز ہلکورے لے رہا تھا۔ "کوئی اچھا بننا چاہے تو لوگ اسے بننے بھی تو نہیں دیں گے۔ اسے اس کے ماضی کے حوالے سے ٹارچر کر کے اس کے قدم وہیں روک دیتے ہیں۔" وہ ایک پل کے لیے رکا پھر افسردگی سے بولا۔

"حوریہ عادل ماضی میں کی ہوئی غلطیوں اور گناہوں کا کوئی کفارہ نہیں ہو سکتا۔ صرف توبہ ہوتی ہے اور توبہ کرلی جائے معافی مانگ لی جائے تو خدا بھی معاف کر دیتا ہے..... ازالہ تو شاید کوئی کر نہیں سکتا اپنے کیے کا..... شاید اسی لیے قدرت نے توبہ کا دروازہ آخری وقت تک کھلا رکھا ہے 'میں بھی معافی مانگ سکتا ہوں اپنے کیے پر..... ازالہ نہیں کر سکتا۔" وہ شاید فضا کے حوالے سے بھی بات کر رہا تھا اس کے لہجے سے شدید بے بسی اور افسردگی جھلک رہی تھی۔ حوریہ چپ سی رہ گئی۔

"میں حازم نہیں بننا چاہتا۔ میں بابر ہی رہنا چاہتا ہوں 'مگر ایسا بابر۔ جو اپنی ماضی کی غلطیوں پر نادم ہے اور آئندہ ایک بہتر لائف گزارنا چاہتا ہے اور اس کے لیے مجھے تمہاری..... تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے۔ پلیز۔" وہ جلدی سے اسے روکتے ہوئے بولا۔ مبادا وہ کال ڈس کنکٹ نہ کر دے۔

"تم علی شاہ کے پاس آجاؤ..... میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں جہاں تک ممکن ہوگا میں تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔" وہ موبائل غصے سے آف کر کے پٹخ دینا چاہتی تھی 'مگر جانے کیوں ایسا نہ کر سکی۔ بابر کہہ رہا تھا۔

"میں علی شاہ کو استعمال نہیں کر رہا ہوں۔ کسی آلہ کار کے طور پر۔ تمہیں میں یوں بھی حاصل کر سکتا ہوں۔ میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے 'مگر میرا مقصد تمہیں فقط حاصل کر لینا نہیں ہے۔" وہ مزید کچھ کہتا۔ حوریہ نے لائن ڈس کنکٹ کر دی اور ڈھیلے ہاتھ سے موبائل ایک طرف ڈال دیا۔

کتنا اچھا ہوتا حازم کہ تم مجھے اس لاچاری اور بے بسی کے صحرا میں نہ پھینک کر جاتے۔ وہ کرسی کی پشت سے لگ کر بے آواز رونے لگی۔

☆ ☆ ☆

فضا کی زندگی میں گویا انقلاب آگیا تھا۔ ایان کی آمد نے اسے یکسر بدل کر رکھ دیا تھا آج نصیر اسے ڈنر پر لے آیا تھا۔ بہت ہی اچھے اور مشہور ہوٹل میں۔ جو ہمیشہ اس کی خواہش رہی تھی' مگر اب کی بار اس نے ایسا کوئی اصرار نہیں کیا تھا نہ خواہش ظاہر کی تھی وہ یوں بھی خوش تھی' مگر نصیر اپنی خوشی سے اسے دو دریا پر بنے خوب صورت ریسٹورنٹ میں لے آیا تھا۔ وہ خاصی دیر پانی کی مدھر لہروں کے اوپر بنے اس ریسٹورنٹ میں بیٹھے رہے پھر واپسی پر نصیر پان کے لیے اٹھ گیا۔ وہ گاڑی کے پاس کھڑی اپنا موبائل نکال کر بتول آپا سے ایان کے بارے میں پوچھنے لگی کہ وہ تنگ تو نہیں کر رہا۔ بتول آپا نے بتایا کہ وہ سو رہا ہے ابھی تک۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

''آپ بھی آتی نا خالہ۔ بہت مزا آتا۔'' وہ مروتاً کہنے لگی۔

''ارے نہیں۔ نہیں بس تم لوگ خوش رہو انجوائے کرو۔ میں تو تم سب کو خوش دیکھ کر خوش ہوتی ہوں اور ہاں ایان کی فکر مت کرو۔ ابھی اٹھے گا نہیں وہ۔''

''جی بہتر۔'' اس نے موبائل دوبارہ اپنے شولڈر بیگ میں ڈال دیا اور نصیر کا انتظار کرنے لگی۔

اچانک بلیک پراڈو بے حد تیزی سے اس کے نزدیک سے گزری' مگر آگے جا کر رک گئی۔ دوسرے پل ریورس ہوتی فضا کے نزدیک آکر رک گئی۔ فضا نے سٹپٹا کر دیکھا اور جیسے ایک پل تو اسے پوری کائنات رکتی محسوس ہوئی' مگر ایسا نہیں تھا کائنات نہیں بس اس کا دل جیسے رکا تھا۔ سانسیں تھمی تھیں۔

بابر ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اس کی طرف آرہا تھا' ایک خوش گوار حیرت اس کی آنکھوں میں بھی جھلک رہی تھی۔ فضا سے یوں غیر متوقع ملاقات اس کے لیے یقیناً'' حیرت کے ساتھ خوش آئند تھی۔ اس کے چہرے سے تو کچھ ایسا ہی ظاہر ہو رہا تھا۔

''ہیلو۔ کیسی ہو فضا۔'' وہ اس سے کچھ فاصلے پر رک گیا اور مخصوص بے تکلفانہ اور دوستانہ لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔ جب کہ فضا کی آنکھوں کے آگے تو ایک پل پورا آسمان گھوم گیا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر وہ یک دم اس کے سامنے آکھڑا ہو گا۔ وہ اپنے منتشر اعصاب سنبھال کر ذرا سا پیچھے ہٹی۔ ناگواری کے باوجود بابر کو دیکھ کر اس کے اعصاب پر کوئی چنگاری سی گری تھی' مگر اس سے پہلے کہ بھڑک کر شعلہ بنتی وہ رکھائی سے قدرے غیر شائستگی سے بولی۔

''فائن۔ بلکہ بے حد خوش بھی۔''

''ہاں۔ خوش باش دکھائی دے رہی ہو۔ بیلومی (میرا یقین کرو)۔ تمہیں یوں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' بابر نے اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر سر کو ہلکے سے جنبش دی۔

وہ ایک بکھری اور ٹوٹی ہوئی فضا سے ایک بالکل الگ فضا دکھائی دے رہی تھی۔ پراعتماد خوب صورت' مسرور اس نے بے حد خوب صورت کپڑے پہنے تھے۔ ہلکا ہلکا میک اپ کر رکھا تھا۔ کھنکتی سنہری چوڑیاں اس کی کلائیوں کو سجا کر اسے ایک باوقار عورت کا روپ دے رہی تھیں۔ کوئی خوف کوئی بے یقینی نہیں تھی اس کی آنکھوں میں۔ ایک پرانے ماڈل کی گاڑی سے بے حد اعتماد سے لگ کر کھڑی تھی۔

''لگتا ہے تمہاری شادی ہو گئی ہے۔''

''ہاں۔ ایک بچہ بھی ہے۔ بہت پیارا سا بیٹا۔''

''واؤ۔ ویری گڈ۔ بہت خوشی ہوئی۔'' جواباً'' فضا نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی مصنوعی پن نہیں تھا بلکہ حقیقی خوشی تھی۔

"میں نے کانٹیکٹ کرنے کی بہت کوشش کی تم سے' مگر تمہارا سیل فون آف تھا۔ آئی تھنک تم نے سم چینج کرلی ہے۔"

"ہاں۔ جب انسان خود بھی اندر سے بدل جائے تو پھر ہر چیز بدل لینی چاہیے۔ بھلا دینا چاہیے۔ پرانے زخم ہوں یا زخم لگانے والے..... سب کو پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔" اس کے لبوں پر پھیلنے والی افسردہ مسکراہٹ میں استہزائیہ رنگ بھی شامل ہوگیا۔ جیسے وہ یہ سب کہہ کر خود پر ہنس رہی ہو' مگر یہ مسکراہٹ دوسرے لمحے بکھر گئی۔ دل سے اٹھنے والی درد کی لہر نے اسے کاٹ ڈالا تھا۔

"کہتے ہیں نا کہ جب وقت اور حالات ہمارے بس میں نہ رہیں تو خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا چاہیے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ آہستہ آہستہ خود کو حالات کے سپرد کرتی رہی اور آج حالات میرے بس میں ہیں۔" بابر نے چونکتے ہوئے اس کے جملوں سے پھیلی افسردگی کے سحر سے جیسے خود کو آزاد کراتے ہوئے ایک گہری سانس کھینچی اور اس کی طرف بغور دیکھا۔

"تم نے شادی کی؟" اس کی آواز یہ سوال کرتے ہوئے ذرا سا لڑکھڑائی تاہم وہ جلدی سے اپنا اعتماد سنبھالنے لگی۔ "اکیلے نظر آرہے ہو اس لیے پوچھ رہی ہوں۔ ورنہ مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اس بات سے۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟" وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

"جس سے کرنا چاہتا ہوں اسے منانے کے جتن کر رہا ہوں۔" وہ ہلکے سے ہنسا۔ عجیب خود آزار قسم کی ہنسی تھی پھر سر کو جھٹکتے ہوئے بولا۔

"بیلیو می۔ تمہیں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ کیا تم سے کانٹیکٹ (رابطے) میں رہ سکتا ہوں آئی مین کہ تم اپنا کانٹیکٹ نمبر....."

"بابر میں ایک شادی شدہ عورت ہوں ماضی کی وہ فضا نہیں ہوں کہ....."

"خدانا خواستہ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔ اس کا انداز مدافعتی تھا "میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں فضا تم سے ملنے کا مقصد صرف تم سے اپنے کیے کی معافی مانگنا ہے۔ میں تمہارے گھر نہیں آنا چاہتا تھا۔ تم نے پہلے ہی میری وجہ سے بے حد پریشانی اٹھائی ہے۔ آئی ہوپ تم مجھے معاف کردوگی۔"

فضا نے غایت درجے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا۔ دوسرے پل اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل کر سکڑ گئی۔

"حیرت ہے بابر جیسا شخص اور معافی۔" انداز میں طنز واضح تھا۔

"تم جیسا شخص گزرے واقعات پر بیٹھ کر انجوائے کرسکتا ہے یہ دھوکا کسی اور کو دینا بابر صاحب میں اس فریب میں اب آنے والی نہیں۔"

وہ رکھائی سے کہہ کر گاڑی کا دروازہ کھولنے لگی۔ اس کے اعصاب شدید متاثر ہو رہے تھے۔ وہ اس کے سامنے معصومیت کے ساتھ کھڑا تھا اور چہرے پر جہاں بھر کی ندامت اور بے بسی لیے اور وہ اس ڈھونگ پر آگ بگولا ہونے لگی۔

"میں اپنے کیے کا ازالہ نہیں کرسکتا فضا۔ ہاں معافی ضرور مانگ سکتا ہوں اور مانگ رہا ہوں۔ مجھے اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف ہے میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے فضا اور میں بہت بے چین ہوں۔ بلیوی!"

"پلیز۔" وہ ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک گئی۔ "تم جیسے آدمی کے لیے تو وہ محض کھیل تھا جو تم نے کھیل لیا۔ کیسی بے چینی۔ ساری اذیت' ذلت اور رسوائی تو عورت کے حصے میں آتی ہے۔" وہ یوں چیخی تھی جیسے

شیشے پر پتھر پڑا ہو۔ اس کی آنکھوں کے آگے ماضی کا ایک ایک لمحہ بدنما دراڑ کی طرح دکھائی دینے لگا۔
"تم کیا بے چین رہو گے بابر۔ تم نے کون سے محبت کی تھی ہاں تم نے محبت ہی کب کی تھی۔ تم نے تو دوستی کے تقاضے بھی پورے نہیں کیے.... اور ان اذیت آمیز لمحوں پر تو تم مرہم بھی رکھنے نہیں آئے۔ اب کون سی معافی۔" وہ جیسے پھٹ پڑی۔
"آئی نو ڈیٹ۔ تم بہت دکھ اور کرائسس سے گزری ہو گی اور میں ان فورچونیٹلی (بدقسمتی سے) تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ پلیز فضا میں بہت اپ سیٹ ہوں۔ یہ احساس مجھے کاٹ رہا ہے۔ فار گاڈ سیک مجھے معاف کر دو۔"
وہ اس کے یوں دامن سمیٹ لینے پر تڑپ کر اس کی طرف بڑھا مگر وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور دروازہ لاک بھی کر دیا۔
وہ اسے کوئی رعایت دینے کو تیار نظر نہیں آرہی تھی۔ عموما" ایسا ہی ہوتا ہے مسلسل بے اعتنائی دھوکے کی مسلسل فضا جذبوں کا بلکہ ہر احساس کا گلا گھونٹ دیتی ہے یا سخت خول میں سمیٹ دیتی ہے اور فضا نے بھی اپنے ان تمام جذبات کو سخت خول میں سمیٹ لیا تھا اب بابر کے لیے فقط صحرا جیسا سناٹا تھا۔
بابر کی معافی کے چند الفاظ اس صحرا کی پیاس کو نہیں بجھا سکتے تھے۔ اس میں نرمی نہیں لا سکتے تھے۔ وہ بے مہری سے رخ موڑ گئی۔
بابر' نصیر کو اس طرف آتے دیکھ کر ذرا سا ٹھٹکا پھر جلدی سے فضا سے لاتعلقی ظاہر کرنے کو پیچھے ہٹ کر جیب سے سگریٹ نکال کر لبوں سے نکالی۔
نصیر پان کا شاپر اٹھائے گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور شاپر فضا کی گود میں پھینکتے ہوئے ہلکے سے مسکرا کر کچھ کہنے لگا۔
بابر نے سگریٹ کو لائٹر کا شعلہ دکھاتے ہوئے نصیر کو بغور دیکھا پھر یونہی فضا کی طرف اس پل فضا نے بھی نظریں اٹھائی تھیں ہلکا سا تصادم ہوا۔ گاڑی ریورس ہو کر آگے بڑھ گئی۔
بابر سگریٹ کا دھواں ہونٹوں کے درمیان سے نکال کر فضا کے سپرد کرتے ہوئے عجیب گم صم سا دکھائی دے رہا تھا۔
اس کی نظروں میں ابھی تک ۔ نصیر کا سراپا سمٹا ہوا تھا کوئی افسردگی جیسے اس کے دل کو کاٹنے لگی۔ ندامت کا احساس شدید ہو گیا۔
"میں واقعی تمہارا مجرم ہوں فضا۔ میں قابل معافی نہیں ہوں۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے فل اسپیڈ پر چھوڑ دی۔ ایک دل گرفتگی نے دل کو جکڑ لیا تھا۔



"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اتنی ضدی اور خود سر کب سے ہو گئی ہو۔ ابا جی کی بات تک کو اہمیت نہیں دے رہی ہو۔" رقیہ بھابھی صبح سے ہی بے حد غصے میں دکھائی دے رہی تھیں اور اب ان سے رہا نہ گیا وہ حوریہ سے الجھ پڑیں۔
"گیلانی ہاؤس میں جا کر رہنے میں تمہیں کیا قباحت ہے۔ عاظمہ تمہیں محبت سے بلاتی رہتی ہے۔ ادھر بچہ الگ خوار ہو رہا ہے اور تم اس کے بنا الگ پریشان پھرتی رہتی ہو۔"
"میں بالکل ٹھیک ہوں اس کے بغیر۔" وہ اپنا چائے کا مگ اٹھا کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"ہاں بہت ٹھیک ہو تم۔۔۔ حال دیکھو ذرا اپنا۔ جا کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھو۔"
"آپ چاہتی ہیں کہ میں اس گھر سے چلی جاؤں تو چلی جاؤں گی کہیں بھی۔"
"فضول مت بولو۔ اگر گیلانی ہاؤس میں نہیں جانا چاہتی، یہیں رہنا چاہتی ہو تو علی شاہ کو لے آؤ۔ اسے کس بات کی سزا دے رہی ہو تم۔ دیکھ رہی ہو مومنہ یہ سمجھتی ہے میں اسے گھر سے نکالنا چاہتی ہوں۔ ارے میں تو علی شاہ کی وجہ سے کہہ رہی ہوں اور خود اس کا حال دیکھ کر کہہ رہی۔ دن بچے کے بنا کیا ہو گیا ہے۔" رقیہ بھابھی ٹیبل سے ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے آبدیدہ سی ہونے لگیں۔ "اسے کیا پتا کہ میں کس طرح دن رات جل رہی ہوں اس کے لیے۔"
مومنہ نے ان کے کندھے کو نرمی سے تھپکا اور ان کے ہاتھ سے خالی مگ کی ٹرے تھام لی۔ رقیہ بھابھی وہیں کرسی پر بیٹھ کر رونے لگیں۔
"تو آپ پاپا سے کہیے کہ وہ اگر طاقت رکھتے ہیں تو بابر پر کیس کریں۔ علی شاہ کو میں جبراً یہاں نہیں لا سکتی۔" وہ پلٹ کر ناگواری سے چیخی۔
"کیا ہو گیا ہے۔ آخر تم بابر کی دشمن کیوں ہو رہی ہو۔ وہ تمہیں گیلانی ہاؤس میں جا کر بچے کے ساتھ رہنے پر منع تو نہیں کر رہا ہے۔ وہ تو صرف علی شاہ کو اس کا حق دے رہا ہے۔ وہ بڑے گھر کا بچہ ہے ان کا خون ہے اسے وہ ہر سہولیات دینا چاہتا ہے وہ غلط تو نہیں ہے۔"
"غلط تو صرف میں ہوں بس۔" وہ کمرے میں جا کر دھاڑ سے کمرے کا دروازہ بند کر گئی۔ رقیہ بھابھی نے بند دروازے پر ایک بے بس سی نگاہ ڈال کر مومنہ کی طرف دیکھا جو سر جھکائے ٹیبل پر اب کپڑا پھیر رہی تھی۔ رقیہ بھابھی بے بسی سے کرسی سے اٹھ گئیں اور مومنہ سے بولیں۔
"تم رہنے دو مومنہ۔ یہ سب نوری کر لے گی۔" نوری کچن سے باہر نکلی اور مومنہ کے ہاتھ سے کپڑا لے لیا۔ رقیہ بھابھی جھنجلاہٹ سے رونے لگیں۔ وہ ماں تھیں اور ماں ہونے کے ناطے حوریہ کے لیے فکر مند ہونا غلط نہیں تھا۔
"میں نے آپ سے کہا تھا اس سے مت الجھا کریں۔ ابھی وہ خود سے بھی ناراض ہے اپنے آپ سے الجھ رہی ہے اسے خود کسی فیصلے پر پہنچنے دیں۔"
"وہ علی شاہ کے بنا نہیں رہ سکتی مومنہ چند دنوں میں ہی وہ مرجھا کر رہ گئی ہے اتنی لمبی زندگی کیسے کٹ سکتی ہے۔" رقیہ بھابھی اذیت کے احساس سے گزرتے ہوئے بولیں۔
"ہاں۔ اور یہ بات وہ خود بہتر جانتی ہے اس لیے کہ وہ برت رہی ہے اور علی شاہ سے دور رہ کر وہ زیادہ چڑچڑی ہو رہی ہے ایسے میں اس پر کسی قسم کی نصیحت، غصہ الٹا اثر کرے گا۔ ایک ماں کے لیے اولاد سے دور رہنا کوئی معمولی دکھ نہیں ہے وہ بہت بڑے دکھ سے گزر رہی ہے۔"
"تم بات کرو ناں بابر سے۔" رقیہ بھابھی کچھ سوچ کر آس مندانہ لہجے میں بولیں۔ "اسے کہو وہ علی شاہ کو بھیج دے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہاری بات مان لے۔"
جواباً مومنہ رقیہ بھابھی کو دیکھ کر رہ گئی۔ اس طرح بہت سی سوچیں اس کے اندر سے بھی ابھرتی تھیں پھر ٹوٹ جاتی تھیں۔ وہ کئی دنوں سے اس کشمکش میں تھی۔ ایک تھکن روح کو کاٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پلٹ کر ٹیرس میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

حوریہ کو لگ رہا تھا اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ اسے اپنی پیشانی کی رگیں کھنچتی اور درد سے پھٹتی محسوس ہو رہی



تھیں۔ کمرے میں آکر اس نے چائے سے بھرا مگ یوں ہی رائٹنگ ٹیبل پر پٹخ دیا اور موبائل اٹھا کر بابر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ بابر اس وقت آفس کی آرام دہ چیئر پر بیٹھا سگریٹ سے شغل کر رہا تھا حوریہ کی کال اس کے لیے بڑی غیر متوقع ثابت ہوئی تھی۔

"ہیلو..... کیسی ہو۔" وہ اپنے دل سے اٹھتے شوریدہ سر جذبوں کو تھپک کر سلاتے ہوئے نارمل لہجے میں بولا تھا۔

"تم اچھا نہیں کر رہے ہو بابر۔" اس کی آواز سنتے ہی جیسے پھٹ پڑی۔ "تم ایک ماں کی ممتا کا امتحان لے رہے ہو تم اس طرح کر کے سمجھ رہے ہو میں سرنڈر ہو جاؤں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔"

"میں ایسا کچھ نہیں چاہتا۔"

"ایک معصوم بچے کو ماں سے دور کر کے اس کو چھین کر مجھ سے تم کون سا حق دے رہے ہو۔" وہ چیخ کر رہ گئی۔ کتنے دنوں کی اذیت آمیزی کا لاوا بہنے لگا۔

"تمہاری مس انڈر اسٹینڈنگ (غلط فہمی) کب ختم ہو گی کہ میں نے علی شاہ کو تم سے چھینا ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"تو چھیننا اور کسے کہتے ہیں تمہاری ڈکشنری میں..... تم اسے چھیننا نہیں حق دینا کہتے ہو، مگر ایک ماں کے دل سے پوچھو کہ اسے کیا کہتے ہیں۔"

"یہ فیصلہ خالص تمہارا اپنا ہے۔ جس کی وجہ سے تم اذیت اٹھا رہی ہو۔ تمہارے لیے کوٹھی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ تم جب آنا چاہو اپنے بچے کے پاس رہو۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔"

"آخر تم میرے بچے کو میرے حوالے کیوں نہیں کر دیتے۔ میں اپنی زندگی اپنی مرضی سے کیوں نہیں جی سکتی۔ کیوں میری زندگی کو مشکل بنا رہے ہو بابر..... تم سمجھتے ہو حازم کے بعد میں کمزور ہو گئی ہوں۔ سرنڈر ہو جاؤں گی۔ تو یہ خوش فہمی ہے تمہاری۔" وہ چلائی۔

"یہی تو دکھ ہے کہ تم سمجھنے میں غلطی کر رہی ہو۔" بابر کے چہرے پر پھیلی افسردہ مسکراہٹ بھی گم ہو گئی۔ وہ ہلکی سی سانس بھر کر کرسی کے گداز ہتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں بولا۔

"میں تمہیں سرنڈر نہیں کر رہا ہوں۔ میں تمہیں صرف جیتنا چاہتا ہوں۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کوئی نہیں جانتا حوریہ۔ فیصلے تو وقت کرتا ہے۔"

"یہ وقت کا فیصلہ ہی سمجھ لو۔" وہ دوبدو بولی۔

"ابھی وقت نہیں آیا..... ابھی تو یہ فیصلہ فقط تمہارا ہے۔"

"بابر..... یو..... "بابر کے لہجے کا یہ اطمینان حوریہ کے دل کو چھید گیا۔

"بہرحال میں نے تم سے کسی فضول ٹاپک پر بے کار بے معنی باتیں کرنے کو کال نہیں کی۔ مجھے میرا بچہ چاہیے "تمہارے بے رحمانہ رویے مجھے تم سے فقط دور کر سکتے ہیں۔ اتنا دور کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔" جواباً" بابر کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایک ہلکی سی سانس کھینچی اور لائن ڈس کنکٹ کر دی۔

اور کتنا دور ہونا چاہتی ہو حوریہ..... اس نے سگریٹ سلگا کر ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے کرسی کی پشت پر سر ٹکا لیا۔

علی شاہ کو تمہارے سپرد کر کے میں کیسے ہمیشہ کے لیے تم سے دست بردار ہو جاؤں۔ پھر تو تم بہت دور بہت دور چلی جاؤ گی۔ میری تمام تر دسترس سے دور..... ایک اضمحلال اس کی روح پر چٹکیاں لینے لگا۔

اس کے لہجے سے ٹپکتی اذیت' لاچاری اس کا علی شاہ کے لیے تڑپنا اسے دکھ دے رہا تھا' مگر وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا اگر وہ کمزور پڑ گیا تو وہ ہمیشہ کے لیے حوریہ کو کھو دے گا۔ اسے کبھی نہ دیکھ پائے گا اور وہ اسے کھو کر عمر بھر کی اذیت کو نہیں پانا چاہتا تھا۔

وہ بھی حازم کی طرح ایک بار ہی مرنا چاہتا تھا۔ اپنے باپ کی طرح بار بار مرنے کے عمل سے نہیں گزرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی زندگی کے آخری لمحات سے یہ جانا کہ مرنا آسان ہے' مگر مر کے زندہ رہنا اور زندہ رہتے ہوئے بار بار مرنا کتنا کٹھن' کتنا تکلیف دہ اور اذیت آمیز ہے۔

اس کے ذہن کی طنابیں چٹخنے لگیں۔ وہ کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ سگریٹ کا پیکٹ لائٹر اور اپنا موبائل ٹیبل سے اٹھایا تو موبائل اسکرین پر حوریہ کا میسج ابھر رہا تھا۔

"تم ایک بے رحم انسان ہو۔" تکلیف کا ایک رنگ اس کے چہرے پر پھیل گیا وہ ڈھیلے ہاتھ سے موبائل اٹھا کر آفس سے باہر آگیا۔



عاظمہ عجیب سی ندامت محسوس کر رہی تھیں۔ وہ اپنی بہن سبینہ کے پاس آئی تھیں جب سبینہ نے انہیں یہ خبر دی کہ اس نے لائبہ کا رشتہ طے کر دیا ہے سیٹھ حمدان کے بیٹے شایان سے۔۔۔ وہ دکھی ہو گئیں اور شرمندہ بھی۔۔۔

"کیا کرتی۔ کب تک بٹھا کر رکھتی۔ اس کے پاپا تو اول روز سے ہی شایان کے حق میں فیصلہ دے چکے تھے۔ وہ تو بس لائبہ کی وجہ سے میں ان کو ٹال رہی تھی۔۔۔"

"چلو خیر۔" وہ ملول سی سرہلا کر اسے مبارک دینے لگیں۔ "میں لائبہ سے مل لوں۔ گھر پر ہے یا گئی ہے کہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"اپنے روم میں ہی ہے۔ لائبہ اس رشتے پر دل سے راضی تھی اسی لیے میں نے یہ اسٹیپ لیا۔"

عاظمہ لائبہ کے روم میں چلی آئیں۔ وہ اپنے جہازی سائز بیڈ پر نیم دراز اپنے موبائل پر مصروف تھی۔ عاظمہ کو دیکھ کر کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ یوں ہی مصروف رہی۔

"خفا ہو مجھ سے سوئٹی۔" عاظمہ اس کے نزدیک بیٹھ گئیں۔ لائبہ نے موبائل سے نظریں اٹھائیں پھر سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔

"ارے نہیں۔ یہ کیوں کہا آپ نے۔ آپ سے بھلا کیوں خفا ہونے لگی۔" اس نے موبائل ایک طرف رکھ دیا۔

"تم نے کچھ جلد بازی نہیں کرلی لائبہ۔ تھوڑا انتظار کر لیتیں۔ بابر تمہاری طرف ضرور آتا۔" ان کے لہجے میں اداسی تھی۔

"یہ آپ کی سوچ ہے وہ کبھی نہیں آتا میری طرف۔" وہ افسردگی سے ہنس دی۔

"حوریہ کی طرف سے اسے پوزیٹو رسپانس نہیں مل رہا ہے۔ حوریہ اس سے کبھی شادی نہیں کرے گی۔ بلکہ وہ شادی ہی نہیں کرنا چاہتی۔" عاظمہ نے اسے قائل کرنے کی ادنیٰ سی کوشش کی۔ لائبہ کے لبوں کی تراش میں استہزائیہ آمیز مسکراہٹ رینگ گئی۔

"انتظار تو وہاں کیا جاتا ہے آنٹی جہاں تھوڑی سی امید ہو' مگر مجھے ایسی امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دے رہی تھی۔"

"نہیں وہ حوریہ سے یقیناً "ایک ون ڈس اپوائنٹڈ (مایوس) ہو کر تمہاری طرف ہی آتا۔ اس کے پاس پھر کوئی

آپشن نہیں تھا۔" عاظمہ جلدی سے بولیں، مگر اسے جواباً لائبہ کی شکایتی نظروں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے عاظمہ کی یہ بات سخت ناگواری گزری تھی۔

"ڈس اپوائنٹڈ ہو کر۔ ہاؤفنی۔ یعنی میری کوئی امپورٹنس (اہمیت) نہیں ہے اس کی نظر میں۔ وہ حوریہ سے مایوس ہو کر مجھے قبول کرتا۔ آپ کو نہیں لگتا یو آر ان فیئر ٹو می۔" (آپ میرے ساتھ ناانصافی کررہی ہیں) اس کی نگاہیں شکوہ کناں تھیں۔ عاظمہ نے نظریں چرالیں۔

"جانے بابر کو کیا ہو گیا ہے۔ ہی چینج کمپلیٹلی (وہ مکمل طور پر بدل گیا ہے)" تم بھی جانتی ہو وہ ایسا نہیں تھا اتنا سینٹی مینٹل (جذباتی)" عاظمہ کے لہجے میں حقیقی اضطراب، تحیر اور بے یقینی تھی۔

"اس لیے کہ اس سے پہلے اسے محبت نہیں ہوئی تھی آنٹی۔ وہ جسٹ فلرٹ کرتا رہا تھا۔ سیریس نہیں تھا۔" لائبہ ہلکے سے ہنسی۔ خود آزاری سلگتی سی ہنسی۔ وہ بیڈ سے اتر کر سنگھار میز کے سامنے جا کر بال لپیٹنے لگی۔ عاظمہ نے رخ موڑ کر اسے دیکھا اس کا جملہ پتھر کی طرح ان کے اعصاب پر لگا تھا۔ وہ ایک پل چپ سی رہ گئیں۔

"گیلانی ہاؤس میں محبت کے جراثیم کچھ زیادہ ہی ہیں آنٹی۔ فلرٹ بھی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ محبت بھی کرتے ہیں۔" وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔ پھر سر جھٹک کر ساکت بیٹھی عاظمہ کی طرف پلٹی۔

"اینی ویز۔ میں نے شایان کے پرپوزل کو اسی لیے قبول کیا ہے کہ اس کی زندگی میں آنے والی میں پہلی لڑکی ہوں فرسٹ چوائس ہوں۔" وہ اپنا موبائل اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" عاظمہ کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ ابھر کر بکھر گئی۔

"عورت اسی فریب میں ماری جاتی ہے بہت سفر کرنے کے بعد اسے پتا چلتا ہے کہ وہ تو سیکنڈ چوائس تھی۔۔۔ شاید بابر ٹھیک ہی کہتا ہے محبت تو مرد بھی ایک ہی کرتا ہے باقی تو ٹائم پاس کرتا ہے۔ آپ کسی کا بھی ہاتھ تھام لیں تن کی آسودگی کے لیے۔ تن کی تسکین ہو جاتی ہے۔" وہ ایک گہری سانس کھینچ کر اپنا پرس کندھے پر ڈال کر سبینہ کے گھر سے نکل آئیں۔

انہیں لائبہ کا فیصلہ کچھ اتنا غلط بھی نہیں لگا تھا۔ ایک طویل انتظار کے بعد بھی ضروری تو نہیں کہ اسے بابر ملتا بھی اور ملتا بھی تو وہ حوریہ کی جگہ اسے کبھی نہ دیتا۔ جیسے عباد گیلانی نے انہیں "مومنہ" کا درجہ نہیں دیا تھا۔ وہ مضمحل احساس کے ساتھ گیلانی ہاؤس لوٹ آئی تھیں۔ اسی روز کے بعد سے انہوں نے بابر سے الجھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ مزاحمت کی ساری طاقت دم توڑ گئی تھی۔ لائبہ شایان حمدانی کے نام لکھی جا چکی تھی وہ مزاحمت بھی کرتیں تو کس کے لیے۔۔۔



کچھ ہار پرو ڈالو، گلدستے بنا رکھو
آراستہ محرابیں، آنگن میں سجا رکھو
فرش دل و جاں یونہی تا صبح سجا رکھو
ہے رات اندھیری، چوکھٹ پہ دیا رکھو
شاید کہ وہ آجائے، دروازہ کھلا رکھو

وہ سگریٹ کے مرغولے آنکھوں کے گرد پھیلائے گم صم سا بیٹھا تھا۔ اپنا آپ اسے کبھی کبھی بڑا اجنبی سا محسوس ہونے لگتا تھا۔ پہلے بھی وہ اردگرد سے کٹ جاتا تھا، مگر خود میں مگن اور مست رہتا تھا، مگر اب۔ وہ خود سے بھی بے گانہ، بے نیاز ہو گیا تھا۔ وہ کانوں میں ہینڈ فری لگائے آنکھیں موندے پڑا تھا۔ سگریٹ بجھا کر اس نے ایش

ٹرے میں ڈال دی۔
آصف علی کی خوب صورت غزل کے بول اس کے دل سے گویا ہم آہنگ ہو کر نکل رہے تھے۔

یاد آہی گئی ہوگی' اب آہی رہا ہوگا
ڈر جائے نہ رستے میں سنسان بڑا ہوگا
مدت سے نہیں آیا' اب یاد بھی کیا ہوگا
دہلیز پہ جا بیٹھو گھر بھول گیا ہوگا
آکر نہ پلٹ جائے دروازہ کھلا رکھو
ایسا نہ ہو کہ یہ شب' پھر یونہی گزر جائے
تاصبح یونہی تڑپوں پھر بھی نہ مگر آئے
جب بھی کوئی آہٹ ہو دم آنکھ میں آجائے
رہ رہ کے نظر اٹھے مایوس پلٹ آئے
شاید مگر آجائے' دروازہ کھلا رکھو
کچھ ہار پرو ڈالو' گلدستے بنا رکھو

اس کا اضطراب بڑھنے لگا اس نے یک دم ہینڈ فری کھینچ کر ہٹائی اور موبائل تپائی پر پٹخ کر لابی سے باہر نکل آیا۔
ٹیرس میں مدھم روشنی پھیلی تھی' مگر اسے یکایک دبیز اندھیرا محسوس ہونے لگا۔ ملازم سب اپنے اپنے کوارٹرز میں تھے کچھ کاموں میں مصروف تھے۔ اسے عجیب وحشت ناک سناٹا محسوس ہونے لگا۔ اتنا اندھیرا اتنا سناٹا اسے آج سے پہلے اس کوٹھی میں کبھی محسوس نہ ہوا تھا جیسا اس وقت وہ محسوس کر رہا تھا۔ درحقیقت کوٹھی کا ماحول تو معمول کا تھا بس یہ سناٹا اور اندھیرا اس کے اپنے اندر تھا۔
''امیر علی۔۔۔ امیر علی۔'' بہت زور سے امیر علی کو پکارا تھا۔ گویا اپنے اندر کا سناٹا کاٹنا چاہا ہو۔ بے نام وحشت کا گلا گھونٹا ہو۔ نفیسہ کسی کونے سے بھاگتی ہوئی آتی دکھائی دی۔
''جج۔ جی صاحب۔ آپ نے بلایا۔'' اس نے رک کر نفیسہ کو دیکھا۔
''وہ امیر علی کھانا کھا رہا ہے۔ میں اسے بھیجتی ہوں جی۔'' وہ بابر کی خاموشی سے گڑبڑا کر پلٹنے لگی۔
''بات سنو!'' اس نے اپنے کسی خیال سے نکلتے ہوئے اسے پکارا۔

"تم ایک کام کرو۔ علی شاہ کو تیار کرو اور ہاں اس کے بیگ میں اس کے کچھ کپڑے بھی رکھ دو۔ آئی مین کہ اس کی ضرورت کی چیزیں۔"

"کیوں صاحب۔۔۔؟ علی شاہ بابا کو کہیں لے کر جا رہے ہیں آپ۔۔۔" نفیسہ حیران ہو کر بے اختیار پوچھنے کی جسارت کر بیٹھی۔ جواباً "اسے سخت نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔

"جتنا کہا ہے۔۔۔ بس اتنا کرو۔" وہ اس پر ایک غصیلی نگاہ ڈال کر پلٹ کر اپنی خواب گاہ کی جانب بڑھ گیا۔



"آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ وہ اپنی غلطیوں پر نادم ہے۔ وہ اچھا اور بہتر انسان بننا چاہ رہا ہے۔ اگر وہ اتنا ہی اچھا بننا چاہتا ہے تو میرے بچے کو میری گود میں ڈال جائے اور فیصلے کا حق مجھے دے دے۔"

وہ جھنجلا کر بولی۔ اسے مومنہ کی یہ بات سخت کھلی جب انہوں نے کہا کہ۔۔۔ "ہو سکتا ہے بابر۔ اپنی غلطیوں پر پشیمان ہو اور اب وہ ازالہ کرنا چاہتا ہو۔ اور مجھے جانے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ وہ بدل رہا ہے۔"

وہ مومنہ سے ہی الجھ پڑی۔ یوں بھی بابر سے بات کرنے کے بعد اس کا غصہ اور بے کلی بڑھ گئی تھی۔ علی شاہ کی جدائی کی اذیت نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کسی جادوئی زور سے اپنے بچے کو لے آئے یا اس کے پاس چلی جائے۔

"اور مجھے پتا ہے وہ ایسا نہیں کرے گا۔ وہ میرے بچے کو مجھے نہیں دے گا۔" وہ کھڑکی کا پٹ زور سے بند کر کے سرہانوں میں تھام کر بیڈ کے کونے پر بیٹھ گئی۔

"وہ دراصل خوف زدہ ہے۔ تمہیں کھو دینے کا رسک نہیں لینا چاہتا۔" مومنہ دھیرے سے بولی۔

حوریہ نے جھٹکے سے رخ موڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ مومنہ نے سر کو ہلکے سے اثبات میں ہلایا پھر کھڑکی سے لگ کر صحن میں پھیلنے والے اندھیرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"محبت کے سفر میں خدشات ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور سفر یکطرفہ ہو تو محبت مٹھی میں ریت کی طرح ہوتی ہے سنبھالنے میں پھسلتی چلی جاتی ہے۔"

"آپ کو تو "گیلانی ہاؤس" والوں سے ایک طرح کی انسیت رہی ہے نا۔ آپ لاشعوری طور پر بھی ان ہی کی سائیڈ لیں گی۔" حوریہ جھٹکے سے بیڈ سے اٹھی۔ تولیہ اٹھایا اور ان پر ایک شکایتی نگاہ ڈال کر باتھ روم کی جانب بڑھی۔ مومنہ کے لبوں پر مضمحل سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

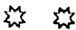
"انسیت نہیں۔ محبت۔"

حوریہ نے تڑپ کر انہیں دیکھا تھا مگر وہ حوریہ کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ اندھیرے پر نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھی۔

"محبت نہ ہوتی تو یہ اذیت کیونکر جھیل رہی ہوتی۔" ان کا انداز از خود رفتہ سا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں گیلانی ہاؤس کے مکینوں کے ساتھ آپ کو بھی شاید کبھی سمجھ نہیں پاؤں گی۔" وہ خفا خفا سی باتھ روم میں جا کر بند ہو گئی۔ مومنہ نے کسی طرح کا ردعمل اختیار نہیں کیا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے ملاحظہ فرمائیں)



یمنیٰ اختر

پارسا



اگست بھیگا سا شروع ہوا تھا.... آسمان گہرا سرخ تھا نظر اُوپر اُٹھا کے دیکھ نہیں سکتے تھے بہت تیز برسات تھی... حتیٰ کہ بادلوں کو چھوتے صنوبر کے درخت بھی اِس سے بھیگ کر مردار محسوس ہوتے تھے۔ برسات کی وہ مخصوص ٹھنڈ سارے ماحول میں رچی تھی۔ یہ سیاہ ڈامر کی سڑک اس پل چکنی پھسلن معلوم ہورہی تھی بارش کی موٹی موٹی بوندیں آبشار کی مانند گر رہی تھیں۔ اِس سنسان، پانی سے بھری سڑک کے کنارے سے دیکھو تو ایک جانب صنوبر سرکنڈے کے گھنے درختوں کی قطار تھی غالباً پیچھے جنگل شروع ہوجاتا تھا، اسی پل آسمان پہ جامنی رنگ کی تیز بجلی کڑکی اور اِس روشنی میں قطار کے درمیان وہ سیاہ رنگ کی کار کھڑی دکھائی دے گی۔ جس کی ہیڈ لائیٹس بند تھیں.... اور کار کے ساتھ ہی وہ انسانی ہیولہ کھڑا معلوم ہوگا۔ اور یہاں سے ہماری کہانی شروع ہوتی ہے۔ قریب جانے پہ وہ لڑکا واضح دکھائی دے گا۔ وہ اٹھائیس اُنتیس برس کا گوری چٹی رنگت اور باریک نقوش کا حامل خوبصورت لڑکا تھا۔ اُس کا سراپا سڈول مگر مضبوط تھا۔ قد دراز، وہ سفید شرٹ اور جینز میں ملبوس تھا۔ لیکن نزدیک سے اُس کی سیاہ آنکھیں دیکھو تو وہ بھیگی ہوئی تھیں سرخ سی۔ نہیں بارش کی وجہ سے نہیں وہ آنسو تھے جو اُس کے چہرے پہ گر کے برسات کے ساتھ بہے جارہے تھے۔ وہ پوری طرح بھیگا ہوا تھا ٹھنڈ سے کانپ بھی رہا تھا نہ جانے کب سے وہ یہاں کھڑا تھا اور نہ جانے کب تک کھڑے رہنا تھا۔ وہ سردی کی وجہ سے مسلسل کانپ رہا تھا لیکن شاید اُسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ ٹھنڈ کی وجہ سے اُس کے ہونٹ سفید پڑ چکے ہیں اور کسی حد تک چہرہ بھی۔ اُس کی نگاہیں سامنے بنے اِس خوبصورت بنگلے پہ ٹکی تھیں وہ مسلسل اُس کھڑکی کی سمت دیکھ رہا تھا جہاں سفید پردے گرے تھے اور تمام روشنیاں بند تھیں۔ نظروں میں بہت سے رنگ تھے۔ بارش کے شور میں ایک عجب آواز تھی کسی کے بولنے کی مگر اس آواز کو صرف وہ شخص ہی سن سکتا تھا۔ شاید وہ دل کی آواز تھی۔

"میں کچھ نہیں جانتا.... اور میں کچھ نہیں سمجھتا.... اور میرے لیے کچھ ممکن نہیں ہے کیونکہ میں محدود ہوں میری سوچ محدود ہے..... میں نہیں مان سکتا کہ سمندر کا پانی ساحل پہ چلنے والی ہوا سے خشک ہوسکتا ہے میں نہیں مانتا کہ سورج کبھی ٹھنڈا ہوسکتا ہے... میں نہیں مانتا کہ بجلی اور پانی اکٹھے ہوسکتے ہیں ایسا نہیں ہوتا کہ تو کسی کو بے جوڑ پیدا کرے کیونکہ میں انسان ہوں محدود انسان اور میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے لیکن.... تو کرتا ہے.... تو نے سمندر کو خشک کیا ہے... تو سردیوں میں سورج کو ٹھنڈا کردیتا ہے اور برسات میں بجلی کڑکتی ہے لیکن کسی کو اُس سے ڈر نہیں لگتا... تو نے بے جوڑ پرندے کو پیدا کیا ہے اور اُس کی نسل کو تو بڑھاتا ہے.... تیرے لیے کچھ ناممکن نہیں ہے..... کیونکہ تو اللہ ہے سب پہ قادر.... اور تو نے ہی میرے دل میں محبت پیدا کی ہے.... اور تو نے ہی اُس کی چاہ.... سو اگر میری محبت سچی ہے..... تو آج تو مجھے اُسے دے گا..... اگر میں اُس کے حق میں بہتر ہوں تو تو مجھے اُس سے ملائے گا.... اب میں کچھ نہیں کروں گا کیونکہ جہاں تک میری حد ہے میں وہاں تک کر چکا ہوں اب تیرا کام ہے"۔

وہ نظریں اُس مخصوص کھڑکی پہ ٹکائے بار بار تہیہ کیے جارہا تھا۔ سانس کا تنفس مزید گہرا ہوتا جارہا تھا۔ رگوں میں خون کی جگہ ٹھنڈک نے لے لی تھی۔ اور بارش مزید بڑھتی جارہی تھی۔ بجلی مسلسل چمک رہی تھی۔

☆☆☆

اس خوب صورت بیڈروم کی کھڑکی پہ سفید ریشمی پردے گرے تھے اور بیڈ کے سامنے فرش پہ وہ بکھری سی لڑکی سر گھٹنوں پہ دیئے بیٹھی تھی۔ شاید رو رہی تھی اُس کا سفید دوپٹا قدموں تلے بکھرا تھا سیاہ بال چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ اردگرد ایک نظر دوڑاؤ... بیڈ کی چادر نیچے گری تھی، ریڈنگ ٹیبل کی کتابیں آدھی اوپر آدھی نیچے تھیں جبکہ لیمپ بھی تار سمیت نیچے لٹک رہا تھا۔ ٹیبل پہ پڑے میگزین سب نیچے گرے تھے اور

وہیں ذرا فاصلے پہ وہ تصویریں بھی تھیں....ایک تصویر ایک بہت ہی خوب صورت جوڑے کی تھی....اور اُن کے ساتھ سلونی رنگت والی معصوم سی بچی کھڑی تھی، اُس تصویر کے ساتھ ہی چند اور بھی تصویریں تھیں کچھ کی فریم ٹوٹ گئی تھیں ایسی ہی ایک فریم پہ اُس لڑکی کی شکل سمجھ آئے گی۔ وہ سلونی مائل رنگت بڑی سیاہ آنکھوں پتلے نقوش کی حامل معصوم سی لڑکی تھی سیاہ بال کندھوں تک تھے سیدھے کھلے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اُسی لمحے ادھ کھلے دروازے سے وہ ادھیڑ عمر مگر تندرست خاتون کمرے میں داخل ہوئیں وہ سفید غرارے میں ملبوس تھیں سر پہ سفید دوپٹا اوڑھے اُن کے چہرے پہ روحانیت سی تھی۔ وہ چھوٹے قدموں سے اندر داخل ہوئیں اور جھک کر دروازے کے پاس گرا کشن اُٹھایا۔

"پتا نہیں کمزور لوگ بے جان چیزوں پہ طبع آزمائی کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں"....وہ صاف مگر سپاٹ لہجے میں بولی تھیں۔ وہ لڑکی بیٹھی رہی البتہ اب وہ کانپ نہیں رہی تھی شاید رونا تھم گیا ہو....یا اس نئے آنے والے کی وجہ سے آنسو تھام لیے ہوں۔ جبکہ خاتون مسلسل نیچے گری چیزیں اُٹھا رہی تھیں اور بڑبڑائے جا رہی تھیں۔ اور ساری چیزیں اُٹھا کے صوفے پہ ڈھیر کیں پھر کھڑکی کی طرف گئیں پردہ ہٹایا نہیں بس یونہی دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ویسے وہ ضدی ہے یا انا پرست"...انداز سوالیہ تھا۔ اور اُس لڑکی نے گردن اُٹھائی، بڑی سیاہ آنکھوں میں سرخی تھی ہلکی سی نمی بھی معصوم چہرے پہ آنسوؤں کے داغ واضح تھے، وہ سپاٹ دکھائی دیتی تھی۔

"غیرت مند ہے"....وہ مختصر سا بولی۔ خاتون نے دکھی نظروں سے دیکھا تھا۔

"بٹیا روگ لگانا آسان ہوتا ہے مگر سوگ پالنا مشکل....اور تم بچپن سے ہر مشکل کام سے بھاگتی آئی ہو"...وہ لڑکی یک ٹک فرش پہ بکھرے اپنے ڈوپٹے کو دیکھ رہی تھی۔

"عزت زیادہ قیمتی ہے یا محبت"....وہ سپاٹ سا بولی۔

"محبت عزت دیتی ہے بیٹی"...خاتون کا لہجہ اب ذرا تلخ ہوا تھا۔

"تو میں نے بھی تو محبت کی عزت رکھ لی"....وہ بھیگی آنکھوں سے بولی تھی جملے کے آخر تک لہجہ بھی بھیگ گیا تھا۔ وہ اب تک دوپٹے کو دیکھ رہی تھی۔

"اور وہ جو باہر بیٹھا ہے محبت کا دعوا لیے اُس کا کیا"...خاتون اب کے نرمی سے بولی تھیں۔

"اور وہ جو اسٹڈی میں بیٹھے ہیں عزت کا دعوا لیے اُن کا کیا"....وہ کھوئی سی بولی۔

"وہ محبت کرتا ہے تم سے"...خاتون نے اپنی بات پہ زور ڈال کے بولا۔

"وہ عزت کرتا ہے میری"...وہ فوراً بولی۔

"وہ تمہاری خاطر باہر بیٹھا ہے"....خاتون کا انداز حتمی تھا۔

"وہ اپنی غیرت کی خاطر باہر بیٹھا ہے"...وہ پھیکی سی ہنسی تھی۔

"لیکن وہ تمہارے انتظار میں وہاں ہے بیٹھا ہے"...اب کے خاتون کا لہجہ تھکا سا لگا....یہ بحث باز لڑکی۔

"نہیں" اب کے اُس لڑکی کا لہجہ مضبوط تھا "وہ میرے باپ کے انتظار میں باہر بیٹھا ہے"....

"اور وہ بھی اُس کا یہ انتظار ختم نہیں ہونے دیں گے"...وہ خاتون تڑپ کر بولی تھیں۔

"جانتی ہوں لیکن میں کچھ نہیں کر سکتی"....وہ روکھی سی بولی تھی۔

"بیٹا یہ ٹھیک نہیں وہ دونوں ہی نہیں ہٹ رہے اپنی رٹ سے ایک احتجاج کر رہا ہے اور دوسرے نے جنگ چھیڑ رکھی ہے"....

"اور اس احتجاج اور جنگ دونوں میں سے جو بھی کامیاب ہو ناکامی میرے حصے میں آئے گی....ہاروں گی میں"....وہ سپاٹ سی بولی تھی۔

"کچھ تو کہو اُسے وہ باہر یوں کھڑے کھڑے مر جائے گا بارش میں"...اب کے خاتون چلائی

تھیں۔اور اُس لڑکی نے بھنویں سکیڑی....اِدھر اُدھر دیکھا تاثرات ایسے تھے جیسے نیند سے ابھی ابھی جاگی ہو۔

''وہ مرجائے گا'' وہ سرگوشی میں بولی تھی، خاتون بے بسی سے اُسے دیکھ رہی تھیں ''ہاں وہ مرجائے گا وہ مرجائے گا'' وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی خاتون اُس کے پاس بیٹھ گئیں اور کندھے سہلانے لگیں وہ روتے ہوئے بولنے لگی۔

''وہ''... آواز میں کرب سا تھا... ''وہ مرجائے گا.... یہ برسات یہ ٹھنڈ اُسے ماردے گی اب کی بار آواز اور انداز دونوں میں ہیجان تھا...''اُسے ٹھنڈ لگ جاتی ہے فوراً اُسے سردی برداشت نہیں ہے اسے انفلیوئنزا ہوجاتا ہے....وہ مرجائے گا جہاں آرا، وہ مرجائے گا''....وہ اب کہ دھاڑے مار کر رونے لگی تھی۔

''نہیں زیمل نہیں یوں مت رو، رونے سے قسمت نہیں بدلے گی''...وہ اب پھر سے دلاسے دینے لگی تھیں۔

''میں قسمت کو بدل نہیں سکتی جہاں آرا'' وہ روتے ہوئے بولی تھی''میں یوں اُس کے ساتھ نہیں جاسکتی ...میں بابا سے بہت محبت کرتی ہوں اور بھی اُنہیں بے عزت نہیں کرواسکتی...مگر میں اُس سے بھی بہت محبت کرتی ہوں اور اُس کے بغیر رہ نہیں سکتی...آپ جائیں جہاں آرا جاکے کہیں اُسے وہ جائے یہاں سے بابا نہیں مانیں گے۔اُسے میری قسم دیں میرا واسطہ دیں کہ وہ چلا جائے یہاں سے''....وہ روئے جارہی تھی بولے جارہی تھی۔اور وہ خاتون اُسے تسلیاں دیے جارہی تھیں سفید پردوں والی کھڑکی سے بارش تیز محسوس ہورہی تھی اور بجلی پھر کڑکی تھی۔

☆ ☆ ☆

آسمانی بجلی کی تیز روشنی کھڑکی کے شیشوں سے اندر آرہی تھی جبکہ شیشوں پہ پانی کی موٹی موٹی بوندیں بن رہی تھیں یہ اس اندھیرے کمرے میں روشنی واضح محسوس ہورہی تھی۔اردگرد دیواریں کتابوں سے بھری تھیں سامنے ایک ریڈنگ ٹیبل جس کی پشت پہ آتش کدہ روشن تھا۔ریڈنگ ٹیبل پہ وہ انسانی ہیولا نمایاں تھا...بجلی کی روشنی میں اُن کا چہرہ واضح ہوا تھا، وہ کرخت چہرے والے ایک بارلیش سے شخص تھے اُن کا چہرہ ہر طرح کے تاثرات سے عاری سپاٹ تھا مگر نظریں فانوس پہ ٹکی تھیں ....البتہ وہ دیکھ وہاں نہیں رہے تھے۔اُن کے کانوں میں مسلسل زیمل کی آواز گونج رہی تھی۔نظروں میں وہ لمحہ اب تک ٹھہرا تھا جب زیمل اِن کے سامنے سہمی سی کھڑی تھی یہیں اسی آتش کدے کے پاس ... مسلسل انگلیاں مڑورتی، چہرے پہ ڈر تھا اور اُمید بھی یہ منظر شام کا محسوس ہوتا تھا...برسات ابھی بھی ہورہی تھی۔

''بابا معیز اور میں ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں پڑھتے ہیں وہ میرا سینئر ہے'' وہ ہچکچا کر بولی ''بابا وہ اور اُس کے گھر والے آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔وہ ہم....ہم..م ....''وہ بول نہیں پارہی تھی''بابا وہ ہم ایک دوسرے کو .....پپ..پسن''....وہ جملہ اور لفظ دونوں ادھورا چھوڑ گئی....اُنہوں نے گہرا سانس بھرا۔ آنکھیں بند کیں اُن میں سرخی تھی۔ جب دوبارہ آنکھیں کھولیں..تو سماعت میں دوسری آواز گونج رہی تھی .وہ آواز معیز کی تھی۔ وہ خوب صورت سا مضبوط بدن کا حامل نوجوان تھا۔اِن کے گھر کے لان میں کھڑا تھا ٹی شرٹ اور جینز میں ملبوس۔وہ وہاں کرسی پہ بیٹھے تھے اور اِس وقت اُنہیں یہ لڑکا زہر لگ رہا تھا، بارش نہیں تھی اب''ہاں بادل اب بھی چھائے تھے۔

''انکل میں ...''اور کہتے ہوئے اچانک رکا تھا وہ بہت جوشیلے انداز میں بولا تھا کہ تب ہی اِنہوں نے اپنی کرخت آواز سنی..

''صرف کرنل حسین ...اِس سے زیادہ کچھ نہیں ....اِس آواز میں رعب تکبر سب تھا....غالباً مخاطب کو محسوس کرلینا چاہیے تھا۔

''سر میں معیز ہوں' معیز عباس ہوں...زیمل کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں...''اب کے اُس کا لہجہ آواز سب مضبوط اور پُر اعتماد تھا، یعنی وہ محسوس کرگیا تھا۔

''ہم بہت اچھے فیلوز ہیں اور وہ بہت اچھی لڑکی ہے... سر میں اُسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں .....'' انتہائی سلیقے سے بات کی گئی تھی...

''تم کام کیا کرتے ہو''.... کرخت آواز کا سوال۔ سپاٹ چہرہ۔

''سر ابھی تو پڑھائی کر رہا ہوں لاسٹ ائیر ہے مگر ایک پرائیویٹ بینک میں جاب کر رہا ہوں''...وہ ہچکچا کے بولا۔

''اور خاندان کیا ہے تمہارا''....وہی کرخت انداز۔

''سر میرا تعلق کراچی سے ہے ابّا فرنیچر کا بزنس کرتے ہیں اور امی اِسکول پرنسپل ہیں''..اب کے وہ اور زیادہ مضبوط لگا تھا۔

''کیا تمہارے والدین کو علم ہے تمہاری یہاں آمد کا....''

''سر وہ جانتے ہیں وہ خود آپ سے ملنا چاہتے تھے لیکن زیمل نے کہا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو....'' وہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ گیا۔

''کیا تم جانتے ہو میں کون ہو....'' وہ ہی ہتک آمیز لہجے میں پوچھا گیا تھا۔ اور معیز اُنہیں بے تاثر نظروں سے دیکھے گیا۔

''میں آرمی میں کرنل ہوں....میرے والد ائیر مارشل تھے...میرے دادا برٹش انڈین آرمی میں کیپٹن تھے...میری بیوی ڈاکٹر تھی...میرا تعلق ہندوستان کے شہر ہریانہ کے زمیندار خاندان سے ہے اور آج بھی میں اِس ملک کے امیر ترین شخصیات میں شامل ہوتا ہوں آج بھی میرے پاس کئی زمینیں اور جاگیریں ہیں ...ملیں، فیکٹریاں ہیں وہ شہر جہاں تم رہتے ہو میری کئی جائیداد وہاں ہے..''متکبرانہ انداز تھا، معیز خاموشی سے دیکھتا رہا اور میری بیٹی......وہ لٹھ مار انداز میں کہہ کر تھمے.. ''مجھے نہیں لگتا کہ مجھے تمہارے سامنے وہ روایتی جملے کہنے کی ضرورت ہے کہ تم میری بیٹی کی خواہشات کو ایک بینک کی جاب میں پورا کر سکو گے یا نہیں، تم خود سمجھ دار لگتے ہو زیمو کے ساتھ پڑھتے ہو اُس کا لائف اسٹائل دیکھ رکھا ہو گا تم نے اُس کا لباس کھانا پینا جیب خرچ گاڑی سب تمہارے سامنے ہے۔اور پھر تمہاری تعلیم ختم ہو جائے گی تو شاید تمہیں اچھی نوکری مل بھی جائے مگر میرا مسئلہ کچھ اور ہے...''.وہ اُسے گھورتے ہوئے بولے جو اب سپاٹ سا کھڑا تھا لیکن آنکھوں میں چبھن سی تھی۔بادل اب مزید گہرے ہو گئے تھے...فضا میں گھٹن کا تناسب بڑھ گیا تھا ہوا بند تھی۔ گویا اب برسے کہ تب۔

''تمہیں پتا ہے میری بیٹی کے لیے میرے ایک دوست جو کہ کور کمانڈر ہیں اُنہوں نے اپنے بیٹے کا رشتہ دیا ہے...وہ ائیر فورس میں پائلٹ ہے...ایک اور آرمی آفیسر ہے میری کمان کا اُس کی والدہ نے بھی زیمل کے لیے پیغام بھیجا ہے...لاہور کی ایک بہت اعلا سیاسی خاندان کا بھی ایک پیغام ہے لڑکا اگلے انتخابات میں الیکشن لڑے گا...المختصر میرے پاس دولت نسب صورت اور سوشل اسٹیٹس میں بہترین رشتے میری زیمل کے لیے موجود ہیں.... جہاں میری بیٹی کی نہ صرف پر اسائش زندگی ہو گی بلکہ ایک اچھی سوسائٹی میں اُس کا اُٹھنا بیٹھنا ہو گا....اور یہ تو کامن سینس ہے کہ ہر باپ اپنی بیٹی کے لیے بہترین مستقبل چاہتا ہے..تو پھر بتاؤ کیا ہے تم میں جو میں تمہارے حق میں سوچوں''....اُن کا انداز بہت سادہ ہو گیا تھا لیکن نظروں میں سرد آگ تھی۔معیز خاموشی سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

''ممکن ہے تم محنت کر کے میری بیٹی کو سال میں ایک لاکھ کا جوڑا پہنا لو ایک ملازمہ رکھ کے اُس کے کام کاج کروا لو مگر....خاندان....وہ کہاں سے لا کر دو گے...ایک مڈل کلاس فیملی ہے تمہاری.... نہ ہم جیسا پس منظر نہ حسب نسب.....میں کیسے تمہیں اپنے خاندان میں شامل کر لوں...کیسے اپنی پھولوں جیسی بچی اُٹھا کے تمہیں دے دوں.....کیسے؟''..اب کے اُن کا انداز سوالیہ تھا۔معیز نے جو خاصی دیر سے اُنہیں دیکھ رہا تھا گہرا سانس بھرا..اُسے اپنے چہرے پہ پھوار سی محسوس ہوئی اُس نے گردن اُٹھا کر دیکھا بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ پھر مسکرایا...اور بولا۔

''سر جہاں تک تعلق حسب نسب کا ہے تو میرے لیے اتنا ہی کافی ہے میں ایک شریف ماں اور شریف باپ کی جائز اولاد ہوں میں آپ کو یہ بتانا ہرگز ضروری

نہیں سمجھتا کہ میرے دادا نانا کا تعلق کہاں سے تھا یا وہ کیا تھے کیونکہ زیمل کے ساتھ زندگی مجھے گزارنی ہے اُنہیں نہیں۔" اس کا انداز جتلاتا ہوا تھا، کرنل حسین سپاٹ نظروں سے اُسے دیکھے گئے...

"اور آپ کو شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا شاید زیمل نے میرا تعارف آپ کو مکمل کروایا نہیں میں نے نہ کبھی زیمل کو ایسی کوئی اُمید بندھائی ہے اور نہ ہی آپ کو دلاؤں گا نہ تو میں کبھی اُسے کوئی لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا سوٹ دلاؤں گا اور نہ ہی اُسے درجنوں ممالک کی سیر کو لے کر جاؤں گا اور نہ ہی اُسے کسی محل میں رکھوں گا.... میں اُس کے لیے آسمان سے چاند تارے لانے کا وعدے نہیں کر سکتا، یہ سودے بازی ہے اور محبت میں سودا نہیں ہو سکتا۔ اور آپ بالکل حق پہ ہیں سر جب کل آپ کی جگہ میں بیٹھا ہوں گا اور میری طرح کوئی میرے سامنے کھڑا مجھ سے میری زندگی مانگ رہا ہو گا ناں تب میں بھی آپ کی طرح ایسی باتیں کروں گا کیونکہ مجھے بھی اپنی بیٹی کے لیے پرفلیکٹ انسان چاہیے ہو گا اور مجھے بھی وہ لڑکا اتنا ہی برا لگے گا جتنا اِس وقت آپ کو میں لگ رہا ہوں... تو لیس سر میں سمجھ سکتا ہوں... اور یہ سچ بھی جہاں ایسے ایسے آپشنز ہیں وہاں مجھ جیسے کے لیے کوئی جگہ نہیں بنتی اور سر سچ کہوں تو حقیقت یہ ہے کہ میں بھی زیمل سے بہت محبت کرتا ہوں اور آپ کی بات سن کر لمحے بھر کو میرا دل بھی کیا کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں کیونکہ میں زیمل کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور زیمل ڈیزرو کرتی ہے ایک پرآسائش زندگی۔ سر، میں خود غرض نہیں ہوں لیکن ایک مسئلہ ہے سر......" وہ کہہ کہ سانس لینے کو رکا "میں ضرور ہٹ جاتا اگر میں یہ نہیں جانتا ہوتا کہ زیمل مجھ سے محبت کرتی ہے... اگر اُس کی زندگی میں کوئی اور آیا تو آپ کی خوشی کی خاطر وہ اُس کی زندگی میں چلی جائے گی مگر وہ کبھی مجھے دل سے نکال نہیں سکتی سر!" .... وہ کہہ کے تھما تھا۔

"وہ ہمیشہ مجھے چاہتی رہے گی وہ دماغ سے کسی اور کے ساتھ ہو گی اور دل سے میرے ساتھ ہو گی وہ خیانت کرتی رہے گی سر وہ عورت بدترین ہوتی ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ خیانت کرے اور میں نہیں چاہتا کہ میری زیمل خائن بنے.. اور میں اتنا بہادر نہیں ہوں کہ اُسے کسی اور کا ہوتے دیکھوں.... اور سر جہاں تک بات رہی لائف اسٹائل کی تو ہاں یہ فیکٹ ہے کہ میں اُسے بہت قیمتی لباس نہ پہنا سکوں گا لیکن میں خود اُس کا لباس ضرور بنوں گا تاکہ وہ دنیا سے چھپ جائے میں اُسے درجنوں ذائقے نہ کھلا سکوں لیکن اپنے کھانے کا پہلا نوالہ ہمیشہ اس کے منہ میں ڈالوں گا وہ بھوکی نہیں رہے گی کبھی .... میں کبھی بھی تنگی حالت کی وجہ سے اُسے کبھی کمانے کے لیے گھر سے نکلنے نہیں دوں گا..... سر میں اُسے کبھی آپ جتنی محبت نہیں کر سکتا" اب کہ وہ بولا تو لہجے میں طنز تھا "لیکن اس دنیا میں کوئی بھی شخص اُسے مجھ جتنی محبت نہیں کر سکتا" .... وہ کہہ کر تھما تھا گہرا سانس بھرا... کرنل حسین خاموشی سے اُسے دیکھے گئے... پھر سر کو خم دیا ... گلا کھنکھار کے بولے۔ پھوار اب ہلکی ہلکی بارش میں بدل رہی تھی۔

"تم .... اچھی باتیں کرتے ہو.... اچھی سوچ ہے... اور دعوا بھی بڑا دم دار ہے.... لیکن ..... وہ سپاٹ سے کہہ رہے تھے اور کہتے ہوئے کھڑے ہوئے... میرے پاس آپشنز ہیں تمہیں سلیکٹ کرنے کا اور ریجیکٹ کرنے کا.... سو میں نے تمہیں.... ریجیکٹ کیا" وہ سرسری انداز میں بولے، معیز جو اُنہیں سپاٹ تاثرات سے دیکھ رہا تھا مسکرایا... "اب تم جا سکتے ہو اور دروازہ پار کرتے ہوئے تم بھول جاؤ گے اس جگہ کا نام پتا اور سب سے اہم ... زیمل .... " وہ اپنے جملے پہ زور ڈال کے کہتے ہوئے واپس پلٹنے لگے، تب ہی وہ بولا.... اب بارش تیز ہو رہی تھی۔

"سر...... لبوں پہ مسکراہٹ تھی تپانے والی" آپ مجھے مسترد کر رہے ہیں کیونکہ آپ بھی اُس سے بہت محبت کرتے ہیں اور میں اُسے چھوڑ نہیں سکتا سر کیونکہ میں بھی اُس سے بہت محبت کرتا ہوں"...

انداز پراعتماد تھا۔
''تو لڑو گے مجھ سے''.... کرنل حسین کا لہجہ اب بھی کھردرا سا تھا۔
''میں آپ سے کبھی نہیں لڑ نہیں سکتا''..... معیز مسکرا کے بولا۔
''تو کیا بھیک مانگو گے محبت کی سستے عاشقوں کی طرح''......
''اتنی بے مول نہیں ہے سر بہت عزت کرتا ہوں اپنی محبت کی میں اور اپنی بھی.... آپ وہ ہیں جو اللہ کے بعد سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں زیمل پہ اسی لیے اُس کے بعد آپ کے پاس آیا اُسے مانگنے ....لیکن اب آپ سے نہیں مانگوں گا''.... وہ سادگی سے بولا۔
''تو پھر کیا کرو گے''.... کرنل حسین نے پوچھا۔
''اُس سے مانگوں گا جس نے میری قسمت بنائی ہے''.... معیز بہت پراعتماد معلوم ہو رہا تھا۔
''اور اگر اُس نے تمہاری قسمت زیمل کو نہ بنایا ہو پھر....'' کرنل صاحب نے گویا حظ اُڑایا ہو۔
''سنا ہے اُس (اللہ) سے مانگو تو وہ قسمت بدل دیتا ہے....''معیز دھیمے لہجے میں بولا تھا مسکراہٹ برقرار تھی۔
''اُسے آزماؤ گے؟''.... کرنل صاحب نے بھنویں اُچکا کر پوچھا۔
''اُس کی بنائی مخلوق بھلا اُسے کیسے آزما سکتی ہے.... مجھے لگتا ہے وہ مجھے آزما رہا ہے...''.وہ کھویا کھویا سا بولا تھا۔ کرنل صاحب مسکرائے وہ اس سارے میں پہلی بار مسکرائے تھے۔
''ایک طرف تمہاری محبت ہے اور ایک طرف میری.. تم بیٹھ کر اُس کی محبت میں احتجاج کرو....اور میں جنگ کروں گا...''.وہ مسکراتے ہوئے کہہ کے واپس گھر کی طرف پلٹے تھے اور معیز دروازے کی مت بڑھا تھا۔''ٹھک ٹھک''...دروازے پہ دستک کی آواز سے اُنہوں نے آنکھیں کھولیں کمرے میں سامنے وہی ادھیڑ عمر خاتون کھڑی تھیں ہاتھ میں ٹرے لیے جس میں چائے کا کپ رکھا تھا۔
''چائے''.... جہاں آرا مختصر بولیں۔ کہتے ہوئے اُن کے جواب کو سنے بغیر ہی اندر آگئیں اور چائے سامنے رکھ دی۔ پھر پلٹنے لگیں تو وہ بولے۔
''تو آپ مجھ سے خفا ہیں جہاں آرا''....وہ تھمیں....گہرا سانس بھر کے بولیں۔
''نہیں بھلا میں آپ کی ملازمہ ہوں آپ سے خفا کیسے ہوسکتی ہوں ...یہ ہمیں شوبھا نہیں دیتا''....وہ بولیں تو کرنل مسکرائے۔
''آپ نے مجھے پالا....میری بیوی کی خدمت کی....اور میری بیٹی کو پالا....پھر بھی آپ ملازم ہیں ....میں تو آپ کو اپنا واحد بزرگ اور اپنا سمجھتا ہوں''....وہ اس سے بالکل بھی چند لمحوں پہلے والے کرنل حسین نہ لگ رہے تھے جن سے معیز ملا تھا۔
''اچھا''....وہ یوں بولیں گویا کچھ نیا ہو....طنزیہ انداز تھا۔ کرنل حسین مسکرائے....اور اُٹھ کے کمرے کی مرکزی دیوار پہ لگی اُس تصویر کے پاس گئے جو لیمپ کی روشنی میں واضح تھی وہ ایک حسین خاتون کی تصویر تھی سیاہ آنکھیں بالکل زیمل جیسی تھیں۔
''آپ کو کیا لگتا ہے جہاں آرا میں اپنی بیٹی کا دشمن ہوں۔'' وہ تصویر کی طرف دیکھتے بولے، جہاں آرا خاموش کھڑی تھیں.....''یا میں خود غرض ضدی انا پرست ہوں ....نہیں جہاں آرا میں ایسا نہیں ہوں میں صرف ایک باپ ہوں....ایک باپ''....وہ کہہ کہ سانس لینے کو تھمے تھے جہاں آرا نے دکھ سے اُنہیں دیکھا تھا۔
''اور ایک باپ صرف محتاط ہوتا ہے.....حقیقتاً وہ بہت ڈرپوک ہوتا ہے....اُسے ڈر لگتا ہے کیونکہ اُس کی بیٹی اُس کے لیے کیا ہوتی وہ کبھی دنیا کو یہ بتا نہیں سکتا اور نہ ہی اُسے ضرورت ہے.....'' وہ کہتے کہتے رکے....پھر بولے۔
''میں آج اپنے مرحوم سسر ہمایوں صاحب کو سمجھ پایا ہوں.....میں ہمیشہ ماریہ کو کہتا رہا تمہارے ابا نے تو مجھے ریجیکٹ کر دیا تھا وہ تو کبھی مجھے پسند کرتے ہی

نہیں تھے میں نے ہمیشہ ماریہ کو اُس کے والد کے حوالے سے چھیڑا'' شرارت کی تنگ کیا.....لیکن آج مجھے پتا چلا.... کہ واقعی ایک باپ کو اپنی بیٹی کے لیے پرفیکٹ چاہیے ہوتا ہے اور وہ پرفیکٹ اُسے کبھی نہیں ملتا.....خاص کر وہ تو بہت برا لگتا ہے جو بیٹی کو اچھا لگے''.....جہاں آرا اُنہیں خاموشی سے دیکھے گئیں۔

''مجھے سچ میں معیز برا لگا.....وہ میری بیٹی کو اچھا جو لگتا ہے...ایسا کیوں ہوتا ہے جہاں آرا ہماری بیٹی جو ہمیں سب سے زیادہ پسند کرتی ہے اُسے کوئی اور پسند آجائے پہلے اُس کے آئیڈیل ہم ہوتے ہیں اور پھر کوئی اور آجاتا ہے اُس کا آئیڈیل بن کے.....اور پھر آکے کہتے ہیں کہ ہمیں دو وہ ہماری چیز ہے.... وہ میری بیٹی اور وہ کیسے کھڑا دعوا کر رہا ہے کہ وہ اُس کی ہے تو اُسے دے دوں...ایسے کیسے دے دوں.....بھئی کیا معلوم وہ کیا ہو کون ہو میری بیٹی کو خوش رکھے بھی یا نہیں پتا نہیں اُس کے گھر والے کیسے ہوں پتا نہیں کتنا قابل ہو کتنا نہیں.....ایک باپ اگر ڈر کے یہ سب سوچتا ہے کیا وہ غلط ہے.....نہیں جہاں آرا وہ غلط نہیں حق پہ ہے.....اُس کی بیٹی اُس کی رحمت ہوتی ہے سب سے قیمتی متاع اور وہ یونہی کسی کو اُسے اُٹھا کے نہیں دے سکتا.....''

''وہ محبت کرتا ہے بیٹا اُس سے''.....جہاں آرا مدھم آواز میں بولیں۔اُسی پل تیز بجلی کڑکی تھی۔

''یہ ہی چیز تو مجھے مجبور کر رہی ہے.....کیسے میں اپنی بیٹی سے اتنی محبت کرتا ہوں وہ بھلا کیسے اتنی محبت کر سکتا ہے''.....اب کہ وہ بھی مدھم آواز میں بولے تھے اور کھڑکی کی طرف بڑھے جہاں سفید باریک پردے کہ پار وہ بیٹھا نظر آرہا تھا۔

''جہاں آرا.....آپ کو یاد ہے جب ماریہ کی موت سے پہلے جب زیمل کافی چھوٹی تھی.....تب ایک دفعہ اُس کے برتھ ڈے پہ جب میں دیر سے گھر پہنچا تھا تو مجھ سے ناراض ہو گئی تھی اور مجھے گھر آنے نہیں دے رہی تھی میں باہر بارش میں کھڑا تھا.....ماریہ نے آپ نے لاکھ جتن کیے مگر وہ نہ مانی ماریہ نے مجھے

چپ کے سے اندر بلانا بھی چاہا لیکن میں نہیں آیا کہ جب تک وہ مجھ سے ناراض ہے میں نہیں آؤں گا وہ مجھے معاف کرے گی تو آؤں گا اور میں کئی گھنٹے تک باہر کھڑا بارش میں بھیگتا رہا تھا.....اور دیکھیں وہ باہر بیٹھا اُس کے لیے بھیگ رہا ہے''.....وہ کھوئی اور کچھ بھیگی سی آواز میں کہہ کے تھم گئے.....جہاں آرا نہ سمجھی سے اُنہیں دیکھے جا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ سفید پردہ اب بھی کھڑکی پہ ویسا ہی پڑا تھا۔ اور سامنے بیٹھی زیمل اب بھی رو رہی تھی.....وہ کانوں سے فون لگائے بیٹھی تھی۔

''معیز تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی تمہیں ویسے ہی انفلوئنزا کا مسئلہ ہے پلیز تم چلے جاؤ.....اپنے پیرنٹس کا سوچو تم اُن کی واحد اولاد ہو.....میں بھی تمہارے لیے اُن سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتی.....اُنہیں دکھ نہ دو.....وہ بڑھاپے میں بیمار اولاد کیسے برداشت کریں گے.....میرے بابا نہیں مانیں گے کبھی نہیں مانیں گے .....وہ مجھے پیار بہت کرتے ہیں مگر لاڈ نہیں کرتے وہ کبھی نہیں مانیں گے''.....وہ رو رہی تھی اور بول رہی تھی۔اور سفید پردوں کے پار جا کے دیکھو.....معیز فون کان سے لگائے کھڑا تھا وہ پیڑ کی اوٹ میں تھا کار سے تھوڑا فاصلے پہ ٹھنڈ سے اب وہ پورا سفید محسوس ہوتا تھا آنکھیں مزید سرخ ہو گئی تھیں لب ٹھٹھرے سے محسوس ہوتے تھے لیکن شاید اُسے اپنے حال کی پروا نہیں تھی ...اور سنجیدگی سے سن رہا تھا۔وہ چپ ہوئی تو بولا۔

''اگر موت آئی ہے تو وہ تو چھینکنے سے بھی ہو جائے گی.....تم رونا بند کرو زیمل.....مجھے تمہارا رونا اچھا نہیں لگتا.....نہ تمہارے بابا کو اچھا لگے گا.....اور میرے پیرنٹس.....وہ مجھے یوں چلے جانے پہ کہیں گے میاں افسوس''.....اب کے وہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔''تم بھی اُنہی بزدل مردوں میں سے نکلے جو عورت کو پہلے تو سہانے سفر کے وعدے دیتے ہیں اور پھر بیچ راستے میں ہاتھ چھوڑ جاتے ہیں.....

اور امی کہیں گی محبت میں دھوکا کرنے والوں کو محبت کرنے والے تو معاف کردیتے ہیں مگر اللہ معاف نہیں کرتا... تو پلیز تم اُن کی پروا مت کرو اور ایک بات کان کھول کر سن لو... تم روؤ گی نہیں کبھی نہیں کیونکہ اگر تم روؤ گی تو تمہارے بابا دکھی ہوں گے وہ سوچیں گے وہ تمہارے ساتھ زیادتی کررہے ہیں یا تم اُن کے فیصلے سے اُن سے خوش نہیں پھر اُنہیں لگے گا کہ تم اُن سے اب پیار نہیں کرتیں اور وہ تمہارے سپر ہیرو نہیں رہے... اپنے بابا کو دکھی مت ہونے دو... جاؤ اُن کے پاس"... معیز نے کہہ کر اُس کی سنے بغیر ہی فون بند کردیا تھا۔ معیز نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کیں... اور پھر کھولی... آنکھیں سرخ تھیں۔

"تو مجھے دے دے یارب... پلیز"... وہ گردن آسمان کی جانب اُٹھا کر بولا۔ اور کمرے میں کھڑی۔ زیمل خشک آنکھوں سے فون کی سیاہ اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ آنسو تو اُسی پل پونچھ لیے تھے جب اُس نے کہا تھا... اُس نے فون بیڈ پہ پھینکا... پھر آئینے میں اپنا عکس دیکھا... بکھرے بالوں کو ہاتھ سے کانوں کے پیچھے اڑسا... چہرے پہ خشک ہاتھ پھیر کے جانے کیا صاف کیا تھا... پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔ چند لمحوں بعد وہ اُسی اسٹڈی کہ دروازے پہ کھڑی تھی ...بتیاں اب روشن تھیں... وہ دستک دے کے بولی۔

"بابا آپ نے بلایا"... وہ دھیمے سے بولی... لہجہ سادہ تھا۔ کرنل صاحب اب ناک پہ چشمہ ٹکائے بیٹھے تھے ہاتھ میں بڑا سا البم کھلا پڑا تھا... آواز پہ چونک اچنبھے سے دیکھا...

"تمہیں... تو نہیں بلایا"... پہلے لفظ پہ خاصا زور ڈالا تھا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔

"پر جہاں آرا تو کہہ رہی تھیں آپ نے مجھے بلایا ہے"... کرنل صاحب گہرا سانس بھر کے دوبارہ البم کی طرف متوجہ ہوئے۔

"جہاں آرا واقعی بوڑھی ہوگئی ہیں... بھولنے کی بیماری بڑھتی جارہی ہے اُن کی... بھئی میں نے کہا تھا زیم میری دوست زیم کو بلائیں وہ میری بٹی کو بلا لائیں"... وہ سادگی سے بولے تھے... جبکہ ان کی بات پہ زیمل چند لمحے یونہی دیکھتی رہی اُس کی آنکھیں ہلکی سی نم محسوس ہورہی تھیں... اچانک ایک معصوم سی مسکان لبوں پہ اُبھری...

"کہیے کرنل حسین کیوں بلایا ہے مجھے"... وہ شوخی سے کہتی ہوئی اُن کے سامنے رکھے کاؤچ پہ جا بیٹھی... اُنہوں نے عینک اُتاری اور بولے...

"زیم ایک پریشانی ہے"... وہ بہت نرم لہجے میں بولے...

"کیا"... وہ بولی۔

"وہ پرانا البم نہیں مل رہا ہے جس میں زیمو کے بچپن کی تصویریں تھیں... وہ جب ہم آسٹریلیا گئے تھے وہ والی"... وہ سادگی سے بولے تو زیمل کی آنکھیں پھٹیں...

"آپ نے مجھے اِس کام کے لیے بلایا ہے"... وہ صدماتی انداز میں بولی۔

"ارے ہاں یار مل نہیں رہی ہے... مجھے وہ چاہیے اب ساری البمز اکٹھی کر کے رکھوں گا آخر کو زیمل کی شادی کے بعد تصویروں سے ہی تو گزارا ہوگا"... وہ البم میں کچھ ڈھونڈتے مصروف سے بولے۔ اور وہ چند لمحے خاموشی سے اُنہیں دیکھے گئی۔

"آپ اپنی بیٹی سے بات کیوں نہیں کرتے"... وہ اچانک بولی۔ تو اُنہوں نے سر اُٹھا کے اُسے دیکھا... چہرے پہ پریشان سے تاثرات تھے۔

"ڈر لگ رہا ہے مجھے"... وہ سرگوشی میں بولے۔

"آپ ڈر نہیں سکتے آپ سپر ہیرو ہیں"... وہ معصوم سے لہجے میں بولی تھی... "آپ بھاگ رہے ہیں اُس سے"... وہ بولی تو کرنل حسین خاموشی سے اُسے دیکھے گئے۔ وہ اُٹھ کے اُن کے پاس گئی اور گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر بولی۔

"آپ اُس سے ڈریں مت بھاگیں مت... پلیز ایسے مت چھوڑیں اُسے اکیلا" وہ بھیگی آواز میں بولی تھی... "وہ ٹوٹ جائے گی وہ سوچے گی آپ اُس سے خفا ہیں... ناراض ہیں... اُس کے پاس تو ماں

بھی نہیں ہے جس سے وہ دل کی باتیں کرے...وہ اکیلے پاگل ہوجائے گی اپنی بیٹی کو سمجھیں پلیز....اُس کا دل ٹوٹا ہے اُسے بہت سارونا ہے آپ کے گلے لگ کر رونا ہے بابا"...وہ کہتے کہتے رو پڑی تھی...اُن کے گھٹنوں پہ ماتھا ٹکائے وہ رو رہی تھی، کرنل حسین اُسے گیلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر مضبوطی سے ہاتھ اُس کے سر پہ رکھے۔

"کیا میری بیٹی مجھ سے خفا ہے..." وہ بہت پیار بھرے دھیمے لہجے میں بولے اور زیمل نے چونک کر سر اُٹھایا۔ "کیا اُسے لگتا ہے کہ میں نے اُس کے لیے غلط فیصلہ کیا ہے....کیا وہ سمجھتی ہے کہ میں خودسر ضدی انا پرست ہوں کیا اُسے اُس کا باپ برا لگتا ہے"....زیمل نے حیرت سے اُنہیں دیکھا تھا جیسے سمجھ نہ پائی ہو....

"بابا ایسا کیوں کہتے ہیں آپ، کیا میں کبھی آپ سے خفا ہوسکتی ہوں مجھے گناہ ہوگا اس عمل سے اللہ ناراض ہوگا.....آپ میرے لیے کبھی کچھ غلط کیسے سوچ سکتے ہیں آپ ہی کہا کرتے تھے ناں مجھے والدین زمین پہ اللہ کے نائب ہیں جو اپنی اولاد کی حفاظت کرتے ہیں پرورش کرتے ہیں اُسے صحیح غلط بتاتے ہیں۔ فیصلے لینے کا اختیار ہوتا ہے اُن کے پاس تو پھر بابا میں کیسے آپ کو....ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ میں یہ سوچوں بھی کہ آپ میرے لیے غلط سوچ بھی سکتے ہیں ....آپ میرے ہیرو ہیں بابا میرے آئیڈیل میرے سب سے فیورٹ سپر ہیرو جو ہمیشہ میرے پاس رہتا ہے میری حفاظت کرتا ہے میرے مسئلے حل کرتا ہے جو اس دنیا میں مجھے سب سے زیادہ پیار کرتا ہو وہ مجھے برا کیسے لگے گا وہ تو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے"....وہ بھیگی آواز میں ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔اور کرنل حسین بغور اُسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"اور وہ تمہیں کیوں پسند آیا"....لہجہ سپاٹ تھا چہرہ بے تاثر تھا...اُسی سمے باہر بارش میں تیز بجلی کڑکی...اور زیمل کو لگا یہ بجلی اُس پہ آگری ہو۔وہ چند لمحوں کے لیے منجمد ہوگئی۔اُس نے نظریں نیچے جھکا لیں...باہر بارش ویسی ہی زوروں پہ تھی....اور ہوا کا ایک تیز جھونکا بارش کے ساتھ آیا....اور معیز کو لگا یہ ہوا اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں جا گھسی ہے....وہ کانپ سا گیا...وہ ذرا جھکا سا کھڑا تھا پیڑ کے ساتھ....شدید سردی کا احساس اب ہو رہا تھا...اُس کے منہ سے دھواں نکل رہا تھا لیکن وہ پھر بھی ہمت نہیں ہارنا چاہ رہا تھا۔کیا تھا جو موسم وفا کر جاتا....اس موسم کی فطرت میں ہی بے وفائی ہے۔

"یا اللہ پاک....."اب تو دل بھی سرگوشی سے زیادہ کی ہمت نہیں رکھتا تھا "...میری مدد کر....اُسے دے دے مجھے.....دے دیے"....جملہ دل میں بھی دم توڑ گیا تھا...لیکن بارش تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی....بادل کی گرج وہی تھی بجلی کی چمک وہی تھی....سب کچھ ویسا ہی تھا چلتا ہوا....کچھ ساکت تھا تو زیمل....

"بابا وہ بالکل آپ کی طرح لگا تھا مجھے۔"وہ نادیدہ نقطے کو دیکھتے بولی....کھوئی کھوئی سی لگی"...جیسے آپ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں لیکن کبھی میرے لاڈ نہیں اُٹھائے مجھے یاد ہے میں نے کبھی اکلوتی اولاد ہونے والے فائدے نہیں اُٹھائے....کیونکہ آپ کو ڈر تھا کہ کہیں یہ عادتیں مجھے بگاڑ نہ دیں....پتا ہے بابا وہ بھی ایسا ہی کرتا تھا آج تک ساری یونیورسٹی میں کوئی یہ بات نہیں جان سکا کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے دوست بھی نہیں۔"وہ اب بیتے دنوں میں چلی گئی تھی شاید.."وہ مجھے کبھی کینٹین لے کر نہیں جاتا ہم لائبریری میں ملتے وہ بھی صرف ایک سنیئر جونیئر کی حیثیت سے کوئی ٹاپک سمجھنے کے لیے.....وہ مجھے فون تو بہت ہی کم کرتا تھا....تب جب طبیعت خراب ہو یا میرا کسی سے جھگڑا ہوا ہو یا اُس کی امی مجھ سے بات کرنا چاہیں تب یا پھر میری برتھ ڈے ہو تب.....میں اُس سے کہتی تو مجھے کہتا کہ تم کیا چاہتی ہو کہ سب تمہیں میرے نام سے جوڑ دیں ....اور اِس سے سب زیادہ مسئلے تمہارے لیے کھڑے ہوں گے تمہارا امیج اسپوائل (خراب) ہوگا....سب کچھ بھی سوچ سکتے ہیں کسی کی سوچ پہ ہم بند تو نہیں

ہو سکتے ناں....محبت کا مطلب بدنام ہونا نہیں ہے....اُسے میری عزت کی بہت پروا تھی....اور پتا ہے بابا وہ میرے نخرے ناز بھی نہیں اُٹھاتا تھا۔'' وہ اُن جیسے انداز میں بولی گویا شکایت لگارہی ہو'' وہ کبھی مجھے باہر ہوٹلوں میں کھانا کھلانے یا شاپنگ مال گھمانے نہیں لے گیا کبھی مہنگے مہنگے گفٹس دیتا تھا اور جب میں کہتی تو کہتا کہ یہ سارے چونچلے میں نہیں کرسکتا کہ بڑے بڑے ریسٹوران میں تمہیں کھانے کھلاؤں اور شاپنگ مال میں تمہارے بیگز اُٹھا اُٹھا کے پیچھے پھروں....بھئی اگر شادی کے بعد میں یہ سب نہیں کرسکا تو تم مجھے طعنے دو گی اور بولو گی میں بدل گیا ہوں....اور پتا ہے بابا وہ میری بیوقوفی یا پڑھائی میں لاپروائی پہ ہمیشہ مجھے ڈانٹتا تھا جیسے آپ ڈانٹتے' میں آپ کی ڈانٹ سن کر۔ اُس سے شکوہ کرتی تو وہ اُلٹا مجھ پہ ہی غصہ کرنا شروع ہوجاتا تھا'' سب کے وہ یاد کرکے مسکرائی تھی۔'' پر بابا وہ لوگوں سے میرے لیے لڑتا بھی تھا ہماری یونیورسٹی میں، میں نے آپ کو بتایا تھا ناں اُن بدتمیز لڑکوں کا جو مجھے اور میری دوست کو تنگ کرتے تھے اُس نے اُن کی خوب پٹائی لگائی تھی....بالکل ویسے ہی جیسے کانوینٹ میں آپ نے اُن اوباش لڑکوں کی لگائی تھی....بابا وہ بالکل آپ جیسا لگا تھا....وہ بھی آپ کی طرح مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا بلکہ وہ ہمیشہ مجھے ایک پروٹیکشن کا احساس دیتا تھا....اور بابا وہ بھی آپ کی طرح میرا دوست تھا۔'' وہ اب کے روئی تھی پھر کرنل حسین کو دیکھ کر بولی ''بابا میں نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا....بس وہ....'' وہ کہہ کر تھمی پلکوں پہ آئی نمی کو صاف کیا....اپنے آپ کو مضبوط کرنے کی کوشش کی غرض میں ہلکی سی مسکان لبوں پہ لائی۔ کرنل حسین کو دل میں مسلسل ایک تکلیف محسوس ہورہی تھی؛ وہ حیرت میں تھے اور ان کے سامنے خود کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کررہی تھی کیا ان کی بیٹی اتنی بڑی سمجھ دار ہوگئی تھی....اس پل شدت سے نفرت محسوس ہوئی خود سے اور اُس سے جو باہر بھیگ رہا تھا وہ رو رہی تھی اور اِس کے ذمے دار یہ دو مرد تھے جو اُس سے بہت محبت کرتے تھے۔

''لیکن بابا آپ یہ نہ سوچیں....کہ اگر میری اُس سے شادی نہیں ہوئی تو میں رُوں گی آپ سے خفا....نہیں بابا'' بہت پیار سے کہا تھا اور کرنل حسین کو آج محسوس ہوا تھا باڈر پہ بھی لگی وہ گولی بھی اتنی تکلیف دہ نہیں تھی جتنا یہ لہجہ تھا۔'' وہ بھی آپ سے زیادہ اہم نہیں ہوسکتا....وہ کیا کوئی بھی نہیں ہوسکتا....کیونکہ آپ میرے بابا ہیں میرے واحد اپنے.....آپ بڑے ہیں آپ زندگی کو وہاں سے دیکھ سکتے ہیں جہاں سے میں شاید کبھی نہ دیکھ پاؤں....بابا محبت کرنے والے ایک ہزار ہوتے ہیں مگر باپ تو ایک ہوتا ہے ناں....ہوسکتا ہے جس کو آپ میرے لیے سلیکٹ کریں وہ اس سے کئی گناہ اچھا ہو'' زیمل کو اپنی آواز کھوکھلی سی لگی اور پھر.....

''کیا میں اتنا برا باپ ہوں کہ میری بیٹی میرے سامنے اپنی احساسات کو چھپائے اور مضبوط بننے کی اداکاری کرے....سارے آنسو پی جائے...کیا اُسے نہیں لگتا کہ اُس کے باپ کو اُس کی پسند پہ اعتبار نہیں ہوگا....کیا وہ شخص جو اتنا اہم ہو کہ میری بیٹی اُس کے لیے روئے وہ مجھے عزیز نہ ہوگا''....وہ بول رہی تھی کہ حسین صاحب نے درمیان میں ٹوکا....اور اُنہیں یونہی دیکھے گئی....چند پل تک اور پھر خود پہ ضبط نہیں کرسکی....

''بابا میں اُسے بھ....بھول جاؤں گی....'' وہ بری طرح سے رو دینے کو تھی بول نہیں پارہی تھی۔'' وہ مر جائے گا بابا....اُسے ٹھنڈ لگ....'' آگے کا جملہ وہ بول ہی نہیں پائی اور پھوٹ پھوٹ کے رو دی....سر اُن کے گھٹنے پہ رکھ دیا اور اُنہوں نے اپنا ہاتھ واپس اُس کے سر پہ رکھ دیا....البتہ گردن کا رخ اب کھڑکی کی طرف تھا۔ جہاں بارش اب کچھ کم ہوگئی تھی....اپنے میں مصروف ان دونوں نے ہی موسم پہ توجہ نہ دی تھی۔

☆ ☆ ☆

برسات میں اب کمی آگئی تھی ہاں بادل کی گرج چمک اور ہوا ویسی ہی تھی بس بارش تھوڑی کم ہوئی تھی تھمی اب بھی نہ تھی۔ پیڑ کے ساتھ بیٹھا معیز اب حالت غیر میں تھا وہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا سر پیڑ سے ٹکائے..... سانس تو شاید محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی..... اور اُسی پل اُسے لگا کہ گیلے جسم پہ کچھ ڈلا ہے اُس نے بمشکل آنکھیں کھولیں..... دھندلاہٹ میں اُسے کرنل حسین اُسے اپنے پاس نظر آئے..... وہ حواسوں میں تھا... اُٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوا.... اور پھر کرنل حسین نے خود آگے بڑھ کر اُسے اُٹھایا.... چند لمحوں بعد وہ لیونگ روم میں موجود تھے وہ موٹے کمبلوں میں لپٹا... آتش کدے کے پاس بیٹھا تھا اور مٹی کے پیالے کو کانپتے ہاتھوں سے لبوں پہ لگائے بیٹھا تھا جس میں جہاں آرا کی بنی کشمیری چائے تھی۔ اور آتش کدے میں سامنے بیٹھے کرنل لکڑیاں ڈال رہے تھے۔

"ذرا سی بارش میں یہ حال ہو گیا نوجوان.... اگر ہماری طرح سرحدوں پہ رہتے تو جانے کیا حال ہوتا"..... وہ خفا سے بولے تھے.... معیز نے خاموشی سے اُنہیں دیکھا پھر چائے کا گھونٹ بھرا۔

"ہر جگہ ہر کسی کے لیے نہیں ہوتی.... آپ بھی ہماری طرح کراچی کی گرم دوپہر کا مقابلہ نہیں کر سکتے جس میں اے سی بھی بے کار ہو جائے اور سامنے آپ کے وہ سرپھرے کلائنٹس موجود ہوں جنہیں آپ کو ہر حال میں مسکرا کے دیکھنا ہو"..... وہ بھی اُنہی کے انداز میں بولا تھا۔ اور کرنل حسین نے بغور اُسے دیکھا... وہ خاموشی سے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھے نائٹ سوٹ کی جیب میں سے سگریٹ نکالی اور اُس کی طرف بڑھائی.... اُس نے حیرت سے پھٹی آنکھوں سے اُنہیں دیکھا۔

"اگر تم کراچی کے سمندر میں ڈوبتے ہوئے بھی مجھے کہو ناں کہ سگریٹ نہیں پیتے تو میں مان نہیں سکتا"..... اُن کا انداز ایسا تھا کہ وہ منع نہیں کر سکا.... چند لمحوں بعد وہ دونوں سگریٹ جلائے اکٹھے کش لگا رہے تھے۔

"آئندہ میں نے سنا کہ تم نے کسی بھی بات [illegible] میری بیٹی کو ڈانٹا ہے تو یاد رکھنا آج بھی میرے پا[illegible] وہ بندوق سلامت پڑی ہے جو میں نے کارگل [illegible] استعمال کی تھی"..... وہ آگ کے شعلوں کو دیکھ[illegible] ہوئے بولے لہجے میں نرمی تھی..... معیز مسکرایا۔

"اور آپ اس بات کی طرف سے بے فکر رہیں [illegible] اُس کا لائف اسٹائل کیسا ہوگا میں بہت محنت کرو[illegible] اور اُسے اچھی زندگی دوں گا جس میں سکو[illegible] ہو"..... وہ بھی آگ کے شعلے کو دیکھتے ہوئے بولا [illegible] کرنل صاحب نے کش بھرا اور دھواں ہوا میں چھ[illegible] دیا۔ پھر چند لمحوں بعد بولے۔

"میری بیٹی کو خوش تو رکھو گے ناں"..... اب کہ لہجہ [illegible] سا تھا۔

"اُسے خوش رکھنا میرا ذاتی مفاد ہے اور میں [illegible] معاملے میں بہت مفاد پرست ہوں"..... وہ ٹھہر[illegible] ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

"کیا وہ جانتی ہے کہ آپ اسموکنگ کر[illegible] ہیں"..... کرنل حسین نے گھور کر دیکھا۔

"اگر اُسے پتا چلا تو صرف میرا نہیں ہم دونوں [illegible] چلے گا...." وہ دھمکانے والے انداز میں بولے [illegible] معیز نے گردن اثبات میں ہلائی۔

"ویسے آپ میرے ساتھ کیوں سگریٹ پی ر[illegible] ہیں..." وہ شرارت سے بولا تھا۔

"کیونکہ مجھ میں اور تم میں بہت کچھ کامن ہے۔ تمہارے سامنے کسی بناوٹ کی یا خود کو کسی خاص [illegible] میں سمیٹنے کی ضرورت نہیں ہے میں تم سے اپنے [illegible] انداز میں بھی مل سکتا ہوں"..... وہ ویسے ہی سنجیدہ بولے۔

"اچھا کیا کامن ہے ہم میں"..... وہ پھر چھیڑ[illegible] والے انداز میں بولا۔

"ہم ایک سے ہیں، جو جو کام تم نے کیے زیمو کے لیے میں نے وہ سب کیے تھے زیمو کی کے لیے ماریہ کے ابا بھی آرمی آفیسر تھے سردی موسم میں رات کے دو بجے مجھ سے مارچ

...وائے تھے اُنہوں نے۔" وہ کہانی بھی ایسی ہی
...کی سے سنا رہے تھے جیسے کوئی روبوٹ ہوں اور
... اُنہیں حیرت سے دیکھ رہا تھا" اور پھر سب سے
...ن بات یہ ہے کہ ہم دونوں ہی زیمل سے محبت
...تے ہیں اور زیمل ہم دونوں سے .... لیکن ایک
... ہے لڑکے۔" وہ اس کی طرف گردن موڑ کر
...کی سے بولے۔" تم کبھی بھی زیمل کو مجھ سے
...ادہ نہیں چاہ سکتے اور کوشش بھی مت کرنا"..... عجب
... بھرا جتلاتا انداز تھا.... معیز مسکراتی نظروں سے
...نہیں دیکھے گیا۔

"...بھی نہیں کروں گا اور آپ کی طرح تو میں واقعی
...ں کر سکتا کیونکہ اس طرح میں اپنی بیٹی کو پیار کروں
...." مسکراتے ہوئے بولا اور سگریٹ کو دوبارہ منہ
... لگایا تھا۔

"نہیں تم اُسے بھی مجھ سے زیادہ پیار نہیں کر سکتے
...ونکہ اصل سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے"... محبت کا
...ں بھرا لہجہ اور معیز پھر مسکرا کے رہ گیا وہ سچ ہی تو
... رہے تھے۔

"ویسے ہم میں ایک اور بات کامن ہے جو آپ
...ں گئے"... اب کے وہ بھی سیریس ہوا تھا۔ کرنل
...ب نے جاننے والی نظروں سے دیکھا۔

...م دونوں ہی زیمل کو روتے ہوئے نہیں دیکھ
..." .... اُس کی بات پہ کرنل صاحب کہ چہرے پر
...ب سا ابھرا تھا۔

...ت معصوم ہے میری بیٹی ...... میں نے اُس کی
...پرورش کی ہے کہ وہ ہر طرح کہ حالات میں گزارا
... لے گی اور تم سے کبھی کوئی ایسی فرمائش نہیں کرے
...م پوری نہ کرسکو"......

...ایسی ہی ہے بالکل...." معیز بھی آگ کے
...ں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

... اسی معصومیت میں اُسے تم پسند آگئے۔" معیز
...ونک اُنہیں دیکھا وہاں نرم سی سختی تھی اور کچھ کچھ
...ھی .... "پتا نہیں کیا دکھا نہ ہڈی نہ پسلی کوئی دم خم ہی
"اور اُن کی اس بات پہ معیز نے اپنے چوڑے
سینے کو دیکھا... "قد بھی اتنا بوٹا...." معیز نے حیرت سے اُنہیں دیکھا چھ فٹ قد بھی بوٹا ہوتا ہے بھلا" سوکھا سڑا" اور اب کے معیز نے اپنے بائی سیپس دیکھے تھے "ہم"..... وہ بول کے چپ ہوئے تو معیز بھنویں اچکائے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

"اور اسی سوکھے سڑے کے ساتھ آپ برسوں بعد کسی پرانے دوست کی طرح سگریٹ پی رہے ہیں..." اُس نے پلٹ کر اُنہی کے انداز میں بولا اور اُن کے تاثرات یوں تھے گویا سنا ہی نہ ہو..... اور اب کرنل صاحب مزید کچھ بول رہے تھے اور ساتھ میں وہ بھی بول رہا تھا مگر آواز دھیمی ہوتی جارہی تھی منظر بھی دھندلا سا گیا تھا بس شیشے میں پڑنے والی پانی کی بوندیں نمایاں تھی..... اب اس لیونگ روم میں تاحیات ایسی ہی محفلیں جمنی تھیں۔ جبکہ اِن سے اُوپر اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس جائے نماز بچھائے بیٹھی وہ رو رہی تھی....

"اللہ پاک تیرا شکریہ.... تو نے اپنی رحمت مجھ پہ برسا دی.... شکریہ"..... وہ روتے ہوئے دل میں اللہ سے مخاطب ہوئی.... پھر آسمان کی طرف دیکھا.... اور بولی۔

"تھینکس امی مجھے پتا ہے آپ نے سب سے زیادہ دعا کی ہوگی میرے لیے"..... اور بول کر رونے لگی... ڈھیر سا.... یہ ملے جلے آنسو تھے اِس میں معیز کو پالینے کی خوشی بھی تھی اور امی کی یاد بھی بابا کی محبت اور اُن سے دور ہونے کا درد بھی تھا اور معیز اور بابا کی دوستی کا سکون بھی.... اور آج اُس سے بہت سا رو کر اِن آنسوؤں کو نکال دینا تھا.... کیونکہ آج کے بعد وہ پھر کبھی نہیں روئے گی.... کیونکہ وہ جان گئی تھی اس دنیا میں موجود وہ دو مرد جن سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتی ہے اُسے روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے... اور اُسے آج آخری بار رونا تھا.... سو وہ رو رہی تھی....

کھڑکی سے باہر آسمان اب بھی ویسا ہی تھا بارش دوبارہ تیز ہوگئی تھی بجلی کی چمک بادلوں کی گرج سب کچھ ویسا ہی تھا۔ اگست کو ابھی اور بھیگنا تھا۔

☆☆

صائمہ اقبال

دھن صبحیں ہو گئیں سائیں

"بھائی صاحب اب اس کا یہاں رہنا بنتا نہیں ہے۔ اپنے وارثوں کے پاس کیوں نہیں چلی جاتی یہ۔"
اندر سے آتی آواز نے اس کے قدموں کو جیسے جکڑ لیا تھا۔ وہ بات، جو بہت دنوں سے اس کے لاشعور میں تھی ایک دم جیسے حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے آگئی تھی۔ اس کے اردگرد سوالوں کا ایک ہجوم تھا اور ان کا جواب اسے معلوم ہی نہیں تھا۔ شام کا سارا وقت اس نے بے حسی سے بیٹھے گزارا تھا ہر بار سوچتے وہ ایک بار پھر سے بے چینی کا شکار ہوتی تھی۔

دسمبر کی خنک رات اپنے آخری دموں پر تھی۔ گرم شال کو اس نے کس کے اپنے گرد لپیٹا' پچھلی کئی راتوں کی طرح یہ رات بھی سرد تھی' دھند نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور میانی چھت کی اوپر کو جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھے اسے ناجانے کتنی دیر ہو گئی تھی۔
سردی اور کہر میں لپٹا چاند مدھم چاندنی ہر طرف بکھیر رہا تھا۔ ساری رات دھند میں چمکنے والے ستارے منزل پر پہنچنے کی بے تابی میں جل جل کر بجھ رہے تھے اور بجھ بجھ کر جل رہے تھے۔

قریب و دور کی روشنیاں دھند سے کچھ اور بھی مدھم ہو گئی تھیں ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھتے اس نے ایک لمبی آہ خارج کی۔ تقدیر کے فیصلے لکھے تو آسمانوں پر ہی جاتے ہیں پر آسمان پر نظر تھوڑی آجاتے ہیں۔ ان اٹھارہ سالوں میں اس نے کیا کیا نہ دیکھ لیا تھا۔ لیکن شاید ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی تھا۔ کالی گھور آنکھوں میں اردگرد کی دھند سے زیادہ دھند تھی۔ تراشیدہ ہونٹ سردی اور رونے کی بدولت کچھ اور بھی سرخ ہو گئے تھے تیکھی ناک کی نوک لالی سے چمک رہی تھی۔ چپل میں مقید پاؤں جو چل چل کر بھی نہیں تھکے تھے۔ شکن زدہ لباس جو اس کا اپنی ذات سے لاپروائی کا غما تھا۔

سوچتے سوچتے اس کا دماغ دکھنے لگا تھا مگر اسے ابھ تک سمجھ نہ آسکی تھی۔ وہ پہلے ہی پریشان تھی اور آ تو حد ہو گئی تھی۔ اس کے مسائل اور ان کا حل بھا اس کے پاس تھا کب اور اگر ہوتا تو کچھ عرصہ پہلے ہی..... زندگی کے نشیب و فراز عمریں کہاں دیکھتے زندگی تو بس روندنا جانتی ہے اور روندتی چلی جاتی ہے بھی سامنے آئے۔ ٹپ ٹپ' بارش نہیں ہو رہی ہاں کچھ قطرے اس کی آنکھوں سے اس کے ہاتھوں گرے تھے اور وہ جیسے خواب سے بے دار ہوئی تھی ایک بار پھر اس کے قدم چھت پر ٹھہر ٹھہر کر چلنے لگے ساری رات گزر گئی تھی اور فیصلہ نہ ہو سکا تھا لیکن فیصلہ کرنے کی صلاحیت اس میں تھی کب۔ وہ تو ہم دوسروں کے کیے فیصلے پر جیتی رہی تھی اور اب۔ لیکن اب تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔
سوچ کی اڑان جانے کہاں جا پہنچی تھی۔
"کیا اسے بڑی آپا کے پاس چلے جانا چاہیے۔" ہی سوچ نے اسے خوف میں مبتلا کر دیا تھا بڑی آپا پاس جا کر رہنا عذاب سے کم نہیں تھا۔ اس سے بہ پیار کرتی تھیں مگر ان کے سسرالی عزیز اور ان کی کتر چلتی زبانیں آرے کی مشین کی طرح تھیں۔ ا سامنے آئی ہر چیز کاٹتی چلی جاتیں کاٹتی چلی جاتیں دیکھے بغیر کہ کسی کا دل چھلنی ہو چکا۔
"ایک بہن ہی ہے لے دے کے اس کے سر آ گی۔" غیروں کی آنکھوں میں اس کے لیے ترحم

ترس تھا ہمدردی تھی اور اپنوں کی آنکھوں میں خوف' بن ماں باپ کی لڑکی کہیں ان کے در پر نہ آجائے' اس نے کیا کیا نہ دیکھ لیا تھا مگر شاید ابھی بہت کچھ دیکھنا باقی تھا۔ وہ ٹکر ٹکر لوگوں کا منہ دیکھا کرتی۔ اگر یہ گھر نہ ہوتا تو نا جانے کچھ مہینے پہلے ہی اس کی زندگی مشکلات کا شکار ہو جاتی۔۔۔ اپنا سفر تمام کرتے چاند نے اس خوب صورت اداس لڑکی کے آنسوؤں کو بہت غور سے دیکھا تھا اور اپنا منہ بادلوں کی اوٹ میں چھپا لیا تھا۔



مکمل ناول

میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں
مرجھا کے آگرا ہوں مگر سرد گھاس میں
سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو ایک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

دو دن سے ہونے والی شدید برف باری نے جیسے اردگرد کے تمام مناظر کو سفید کفن اوڑھا دیا تھا' پہاڑ' درخت' سڑکیں' عمارتیں غرض یہ کہ ہر چیز سفید چادر تلے تھی۔ برف پر چلنے والی برفیلی ہوا ہڈیوں کے اندر گھس رہی تھی۔ اس کے بھاری گلوز کوٹ کی جیب میں پڑے تھے جنہیں پہننے کی زحمت اس نے قطعاً" نہیں کی تھی۔ پارکنگ سے گھر تک آتے آتے دانت بجنے لگے تھے۔ گھر کے دروازے کے سامنے پڑی برف کو اس نے بھاری بوٹوں سے ادھر ادھر کیا۔

برف باری اس سال وقت سے پہلے شروع ہو گئی تھی اور محکمہ موسمیات کی پیشن گوئی کے مطابق اس سال پچھلے سارے ریکارڈ ٹوٹنے والے تھے۔ ہاتھوں کو ایک دوسرے سے رگڑتے' لانگ کوٹ کو سیدھا کرتے' اس نے دروازہ کھولا' ہمیشہ کی طرح خاموشی نے اس کا استقبال کیا تھا۔ بھاری بوٹ اتارتے' کوٹ ہینگ کرتے اس نے کچن کی جانب قدم بڑھا دیے۔ علی یقیناً" اس کا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ اسے دو گھنٹوں کا کہہ کر وہ کئی گھنٹے بعد گھر آیا تھا۔

بہت سا فضول وقت اس نے کافی شاپ پر بیٹھے تلخ کافی اپنے اندر انڈیلتے ضائع کیا تھا اور باقی وقت شدید برف باری میں ادھر ادھر گاڑی دوڑاتے۔ وہ اب اس زندگی کا عادی ہو چکا تھا۔ ٹھنڈا ملک' ٹھنڈے جذبات سے عاری انسان اور شاید اب تو وہ خود بھی اسی بھیڑ میں کھو چکا تھا۔ علی نے بہت دیر تک اس کا انتظار کیا ہو گا کارٹون دیکھے ہوں گے کھلونوں سے کھیلا ہو گا یا پھر فریڈ سے باتیں کرتا رہا ہو گا یا پھر اپنی ماں کے بارے میں سوچتا رہا ہو گا۔ اس کا خیال آتے ہی اس کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔

"بے راہ رو معاشرے کی گندی پیداوار۔" ایزی چیئر روک کر وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس بدتمیز عورت کے بارے میں سوچنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ ہاں' وقت تو اس کے پاس اپنے لیے بھی نہیں تھا' علی کے لیے بھی نہیں اور وہ عورت تو پھر بعد میں آتی تھی۔ قابل نفرین' گھٹیا' خود غرض بے حس۔

اس کی نیند کم تھی بہت کم' اپنے اندر کے انتشار کو وہ کم نہیں کر پاتا تھا بہت سالوں سے اس نے یہ کوشش بھی ترک کر دی تھی۔ زندگی پر چھایا جمود کسی طرح ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ وہ "انسومینیا" کا مریض نہیں تھا مگر پرسکون نیند کے لیے ضرور ترس گیا تھا۔ سونے پر عجیب و غریب خواب اس کے منتظر ہوتے وہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا مگر "میراتھن" تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ نہ وہ پیسے کے لیے دوڑ رہا تھا نہ آسائشات کے لیے تو پھر وہ دوڑ کیوں رہا تھا اس سوال کا جواب اسے بہت سوچنے پر بھی نہیں ملا تھا۔

"ڈیڈ کیا آپ رات کو بھی دیر سے آئے تھے۔" علی کو اس سوال کا جواب معلوم تھا لیکن نا جانے کیوں اسے پوچھنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ ناشتے کی میز پر سلائس کھاتے اس نے بڑی ترسی نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا بظاہر اتنا قریب نظر آنے والا شخص اسے کتنی دور لگا کرتا تھا کہ فاصلہ پاٹنا مشکل ہو گیا تھا۔

"ہاں مجھے دیر ہو گئی تھی آپ جلدی سو گئے تھے ناں؟" اس نے دو سیکنڈ اس کی طرف دیکھا اور پھر سامنے رکھے سلائس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شاید اس کا اپنا بیٹا اس مکھن اور سلائس سے بھی زیادہ غیر ضروری تھا جس کی طرف اس نے چند سیکنڈ بھی دیکھا نہیں تھا۔

"ڈیڈ فریڈ نے نیا ڈوگی لیا ہے۔ کل وہ ہمارے گھر بھی آیا تھا۔ بہت پیارا ہے اس کا روڈلف۔ ہاں میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں اس نے اپنے ڈوگی کا نام روڈلف رکھا ہے۔ پیارا ہے ناں۔" اسے غیر ضروری لفظوں کا استعمال ہمیشہ ناگوار گزرا کرتا تھا لیکن جتنا وہ کم گو تھا اس کا بیٹا اتنا ہی باتونی تھا۔ اس نے چائے کا کپ ایک طرف رکھ کے اپنے چھ سالہ بیٹے کی طرف دیکھا جس کے بال اور اس کا رنگ بالکل اس کی طرح تھا۔

"فریڈ اس کو لے کر دوبارہ ہمارے گھر نہیں آئے گا۔" اس کی آواز میں ایک حتمی پن تھا جیسے اسے یقین ہو کہ ایسا ہی ہو گا اس کی لمبی پلکوں والی براؤن آنکھیں اس پر جمی تھیں۔

"لیکن ڈیڈ....." علی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کے ماتھے پر پڑی تیوریاں دیکھ کر اگلا جملہ اس کے حلق میں ہی اٹک گیا تھا۔

"اوکے ڈیڈ!" اس کے کہے لفظ اس کے اپنے کانوں کو شاید سنائی نہیں دیے تھے۔

"آپ اپنا ناشتا ختم کرو پھر چلتے ہیں۔" کرسی گھسیٹ کر اس نے ایک نیا حکم صادر کیا۔ علی کی نظروں نے دور تک اس پتھریلے چہرے کے مالک شخص کو دیکھا جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر کمرے میں غائب ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسٹاک ہوم یونیورسٹی کا قابل ترین لیکچرار، جو انگلش ڈیپارٹمنٹ کا فخر تصور کیا جاتا تھا اور اس کے چھپنے والے مضامین اور اس کی کامیابیوں کی ایک لمبی فہرست تھی وہ زندگی میں بری طرح سے ناکام ٹھہرا تھا۔



"اوئے دیکھو چاہے کوئی دروازہ کھٹکھٹا کر مر جائے۔ کوئی دروازہ نہیں کھولے گا۔ سن رہے ہو نا تم میری بات۔" اس نے ان دونوں کو مخاطب کیا جن کی نظریں سامنے ٹیبل سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ لیکن سر اثبات میں ضرور ہل رہے تھے۔

"میں نے اپنا موبائل آف کر دیا ہے تم دونوں بھی اپنے موبائل آف کر دو۔ کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اندر ہی ہیں۔" اس نے ایسا ماحول طاری کر دیا تھا جیسے کسی جاسوسی فلم کا حصہ ہو۔ کمپیوٹر ٹیبل پر بیٹھے اس نے ان تینوں کو اس ٹیبل کے گرد بیٹھے دیکھا تھا۔ انہوں نے اسے بھی لالچ دیا تھا مگر اس کے لیے ان کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔ ان ہی کو فوکس کر رہا تھا۔

"لائٹ آف کر دو۔ آج ہم کینڈل لائٹ ڈنر کریں گے۔" فہد نے راحیل کو سوئچ کی جانب دھکیل دیا۔

"نا بابا نا مجھے اس خونخوار شخص سے جوتے نہیں کھانے۔" اس نے کمپیوٹر ٹیبل پر سنجیدگی سے کام کرتے ایک کی جانب اشارہ کیا تھا جو اس کمرے کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس کا حصہ نہیں لگ رہا تھا۔

"اسے میں دیکھ لوں گا جا تو کر لائٹ آف۔" لائٹ آف کرتے راحیل نے فیضان کی طرف اشارہ کیا وہ تو جیسے کمرے میں موجود ہی نہیں تھا چھرے کو ہاتھوں میں تھامے وہ آموں کو گھورے جا رہا تھا۔ ایک زور کی دھپ۔ اس نے اسے لگائی تھی۔

"ہائے اوئے مر گیا۔ کیوں میری ننھی جان کے پیچھے پڑے ہو۔ سال بعد تو ان کا دیدار کر رہا ہوں۔" وہ دونوں اس کو دیکھ کر ہنس ہنس کے دہرے ہو رہے تھے چھوٹے قد اور پتلی جسامت کے مالک فیضان نے دونوں پہ تکیے برسانے شروع کر دیے۔

"یار آجا تو بھی اب ادھر۔" کمپیوٹر کی روشنی نہ ہوتی تو کمرے میں قبر جیسی تاریکی چھا چکی ہوتی اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے ان تینوں کو دیکھا۔ ایک عرصے بعد ان تینوں نے آم کی شکل دیکھی تھی وہی چیز جو پاکستان میں گرمیوں کے آتے ہی ہر سڑک اور ہر گلی میں نظر آتی یہاں اس کی قیمت سن کے ہی ہاتھوں کے توتے اڑ جاتے۔ اس بار ان سے رہا نہیں گیا تھا لیکن چار دن سے وہ ان کو کھانے کی کوشش میں تھے۔ ان کا کمرہ کیا تھا ایک سرائے تھی جس کا دل چاہتا اور آکر میٹرس پر سو جاتا اور صبح اٹھنے کا موڈ ہوتا تو اٹھتا ورنہ..... کل بھی ایسا ہی ہوا تھا وہ آم بڑے شوق سے لے کر بیٹھے تھے للچائی نظروں سے ان کو گھور رہے تھے کہ فرید آ گیا تھا اور پھر فرید کو اٹھانا کون سا آسان تھا۔ اگلی صبح ہی گیا تھا۔ پرسوں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی طرف سے پوری احتیاطی تدابیر کر لی تھیں۔ دروازہ بند، موبائل آف، لائٹ آف کوئی آواز نہیں راحیل نے چھری پکڑی، مسکراتی نظروں سے آم کی طرف اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر ایک قاش کاٹ ڈالی۔ ان دونوں کے منہ میں پانی آ گیا۔

"جلدی کاٹ یار۔" فیضان کے منہ سے رال ٹپکنے کی دیر تھی۔

"ڈنگ ڈونگ۔" دروازے پر ہونے والی بیل سے

راحیل کے ہاتھ میں پکڑی چھری کافی آواز کے ساتھ میز پر ڈھیر ہو گئی تھی۔

ذوجیب ایبک ان کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا اسے بیٹھنے سے بھی منع کر دیا گیا تھا مگر بیل دینے والا بھی نہایت ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔

"دروازہ کھولو۔ مجھے پتا ہے تم اندر ہی ہو۔ اتنے خاموش تو تم فوت ہو کے بھی نہیں رہ سکتے۔ کر کیا رہے ہو اندر تم۔ سازش! کسی سازش کی بو آرہی ہے۔" آنے والا بھی حسن تھا ان کے ساری کرتوں سے واقف' اس نے ایک زور دار ٹھڈا دروازے کو رسید کیا۔ انہیں پتا تھا وہ جانے والا نہیں اس سے جان چھوٹنے والی نہیں ہے۔ غصے میں جلتا بھنتا فہد ایک جھٹکے سے اٹھا تھا دروازہ کھول کے اس نے حسن کو گردن سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔

"اندر آجا خبیث انسان۔ مجھے پتا تھا کوئی اور آئے نہ آئے تو ملک الموت بن کے ضرور آئے گا۔ دیکھ لے کیا کر رہے ہیں ہم۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا آم سے پہلے اس کی گردن پہ چھری چلا دے۔ حسن نے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے چوتھی کرسی سنبھال لی۔

"ہاں مجھے پتا تھا کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔" خباثت سے کہتے حسن نے کٹی ہوئی قاش اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔

"واہ کیا بات ہے پاکستان کے آم کی۔"

"اب چاہے قیامت آجائے دروازہ نہیں کھلے گا اگر کسی نے کھولنے کی کوشش کی تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔" دانت کچکچاتے' ان سب کو کینہ توز نظروں سے گھورتے فہد نے آم کاٹنے شروع کر دیے۔ الماری کے اندر پڑے پڑے آموں کی حالت خراب ہو گئی تھی۔

"جب کھانا نصیب ہوا تو آدھے آدھے کاٹ کر پھینکنے پڑ رہے ہیں۔ کپڑوں سے الگ آم کی خوشبو آرہی ہے۔ ایک تو یہاں پرائیویسی نصیب نہیں ہوتی۔ جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آرہا ہے۔" آم کاٹتے اور غصے میں بولتے فہد اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے غصے نے ایک بار پھر اسے محروم کر دیا ہے۔ وہ چاروں نہایت خاموشی سے کاٹی گئی قاشیں مزے لے لے کر کھا رہے تھے اور جب اسے خیال آیا تھا تو دیر ہو چکی تھی آخری قاش حسن کے منہ میں تھی۔

"واہیات شخص شرم کر۔ سب کچھ کھا گیا۔ میرے لیے۔" اسے جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ وہ چاروں خاموشی سے بیٹھے تھے جیسے وہ حدیث سنا رہا ہو۔ چھری کو نیچے گراتے اس نے ساتھ بیٹھے فیضان کے منہ پر آم سے سنے ہاتھ پھیر دیے۔ فیضان خود کو چھڑانے کی کوشش میں ٹیبل پر ہی ڈھیر ہو گیا تھا اور فہد اسے ہاتھوں سے دبائے ان سب کو کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا جو ہنس ہنس کے پاگل ہو رہے تھے۔ یہ چاروں دوست سویڈن کی ایک نامور یونیورسٹی کے ہاسٹل کے ایک کمرے میں رہائش پذیر تھے۔ چاروں کے ڈیپارٹمنٹ مختلف تھے' مگر کلاسز کے بعد کا وقت اکٹھا گزرتا تھا۔



"شکل تو خیر تمہاری ہے ہی ایسی عقل بھی اس سے بڑھ کر ہے کوئی جو ڈھنگ کا کام ہو جائے تم سے۔ ساری عمر گزر گئی ناشتا رکھنے کی تمیز نہ آسکی تمہیں۔" اس شخص کی زبان کے جر کے اندر تک گھاؤ لگاتے تھے جنہیں بھرنے میں زمانہ لگ گیا تھا' مگر گھاؤ تھے کہ ابھی تک رس رہے تھے۔ اس نے نم آلود آنکھوں سے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا جو کئی سال گزرنے کے بعد بھی اس کی خدمتوں اور ریاضتوں کو نظر انداز کر کے صرف اس کے ظاہر کو نشانہ بنائے ہوئے تھا۔ اب تو اس کی اولاد کو بھی اس کی سمجھ آنے لگی تھی' مگر یہ شخص.... اس نے سامنے بیٹھے اونچے لمبے گورے چٹے مرد کو دیکھا جو اس کی قسمت ٹھہرا تھا اور اس کے مقدر کو اندھیر کر گیا تھا وہ اس کا ماموں زاد تھا ماں باپ کی اچانک وفات کے بعد ماموں نے ہی اس کی شادی کی تھی اور ساری زندگی کے طعنے اس کا مقدر بن گئے تھے۔ ساری عمر کی کلرکی نے رحمان اللہ کے حالات کو

کچھ اور بھی دگرگوں کر دیا تھا جس کا غصہ بھی اس عورت پر اترا کرتا۔

"آئینہ دیکھو ذرا جا کر پیلا رنگ کیسا لگ رہا ہے تم پر۔" باہر سے آنے والی آواز نے اسے اندر تک سلگا دیا تھا۔ بیگ میں کاپیاں چیک کرتے اس نے ایک ٹھوکر سامنے پڑے میز کو رسید کی' روز ہونے والا تماشا کون سا نیا تھا' مگر اس کی تکلیف ہر بار جدا ہی ہوتی تھی۔ اس کا باپ ہر روز کوئی نئی بات نکال کر اذیت کا جہنم دھکا کر ہی دفتر جایا کرتا تھا اور اس کے اسکول کا رستہ بھی ایسے ہی دہکتے جہنم کو پار کرتے ختم ہوتا تھا۔ اس کا احسان عظیم تھا کہ اس کی بدشکل ماں کو ابھی تک اس نے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ کاش کہ وہ کوئی اور شادی ہی کر لیتا تو کم از کم اس کے احسانوں کی لمبی فہرست میں تو کمی آ جاتی۔ اس کے باپ کا زعم تھا کہ ساری عمر ختم ہی نہ ہو سکا تھا۔ کئی بار اسے ماں پر غصہ آتا آخر وہ اتنی صابر کیوں تھی' کبھی کچھ کہتی کیوں نہیں تھی ہر روز ہونے والی بے عزتی کے باوجود وہ کیوں اس کے آنے پر بھاگ بھاگ کر کام کرتی ہے۔ اس کے آگے پیچھے پھرتی ہے۔ اس کی شکل و صورت میں عجیب ملاحت تھی' مگر اس کے باپ کو کبھی نظر نہیں نہ آئی تھی اس کے نقوش بے حد سبک اور خوب صورت تھے ہاں رنگت دبتی ہوئی تھی اور اس کے باپ کے سرخ و سفید رنگ کے سامنے یہ دبتی رنگت بالکل گہنا جاتی۔ اس نے کبھی کسی چیز کی فرمائش نہ کی تھی ہر طرح سے اس کا خیال رکھا تھا' مگر اس کے باوجود اس کی خوبیاں کبھی اسے خوبیاں ہی نہ لگیں۔

"چھوٹے کیا تم چل رہے ہو میرے ساتھ۔"

بوٹوں کے تسمے بند کرتے اس نے آخری لقمہ منہ میں ڈالتے شامی کی جانب دیکھا۔ پلیٹ ایک جانب رکھ کر وہ بیگ اٹھا رہا تھا وہ دونوں اپنے باپ کا پرتو تھے گورے چٹے اور اس پر بھی اس عورت نے کتنی بار خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ اس کا غصہ بھی باپ پر چلا گیا تھا چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنے والا غصہ اس کے کنٹرول سے باہر ہو جاتا۔ اب بھی باہر سے آنے والی آوازوں نے اسے سیخ پا کیا تھا شامی کا ہاتھ پکڑے' ان دونوں کو بغیر سلام کیے وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔ آٹھویں کلاس میں پڑھنے والا نوعمر لڑکا ہر چیز سے بے زار تھا یہاں تک کہ خود سے بھی۔

"شامی' قطب ٹھہرو پیسے تو لیتے جاؤ۔" پیچھے سے آنے والی آواز کو یکسر نظر انداز کرتے اس نے دروازہ پار کیا۔

"جانے دو سورما کو' مزاج ٹھکانے نہیں ہیں صاحب زادے کے۔ اس کی عمر میں کیسی ذمہ داری تھی میرے اندر' کیسے میں نے محنت کی اپنے بھائیوں کو پڑھایا' سائیکلوں پر لاد لاد کر اسکول چھوڑ کر آتا' باپ کا بازو بن گیا تھا میں اور یہ اسے باپ کی' اس کی محنت اور اس کی بڑھتی عمر کی کوئی پروا ہے ساری تمہاری شہ ہے۔" انہوں نے سامنے پڑے برتنوں کو ہاتھ سے پرے دھکیل دیا۔ ٹیبل سے برتن اٹھاتے اس نے سر جھکائے سب کچھ سنا تھا اور سننا بھی کوئی نئی بات تو تھی نہیں اس کی بدصورتی اور بے عقلی کے قصے سارے خاندان میں مشہور تھے۔ آنکھوں سے نکلنے والے آنسو اس نے کچن پار کرتے صاف کیے تھے۔

پیچھے سے آنے والی آواز پر اس کی استہزائیہ ہنسی ساتھ چلتے شامی نے بھی سنی تھی وہ اس سے دو سال چھوٹا تھا اسے چیزوں کی رویوں کی سمجھ اتنی زیادہ نہ تھی ہاں' مگر گھر میں ہونے والا ڈرامہ وہ بھی ہر روز دیکھتا تھا سنتا تھا اور خاموشی سے اس کے غصے کو دیکھتے وہی کرتا تھا جو وہ کہتا تھا۔ دونوں کا اسکول ایک تھا' مگر کلاسیں جدا جدا تھیں۔ اس نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے رستے میں آئے ہر پتھر کو ٹھوکر پر رکھتے دیکھا تھا نہ جانے اس میں اتنا غصہ کیوں بھر گیا تھا۔ اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑتے اس نے اس کے تیز قدموں کا ساتھ دینے کی کوشش کی تھی۔



"ثمن آپا! ابا کیا کہہ رہے ہیں۔ سنا آپ نے مجھے کوئی شادی وادی نہیں کرنی ابھی۔ مجھے بہت سا پڑھنا

ہے اتنے اچھے نمبرز ہیں میرے پارٹ ون میں۔"
کمرے کا دسواں چکر کاٹتے وہ تھک کر پاس پڑی کرسی پر گرسی گئی تھی۔ آنکھوں میں بھرا پانی چھلکنے کو بے تاب تھا۔ ثمن کو سامنے دیکھتے وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ اس نے دن رات محنت اس لیے کی تھی کہ......

"ارحمہ میری جان کیوں ہلکان کررہی ہو خود کو کتنی بار بتایا ہے اور پھر بھی تم وہی رٹ لگائے بیٹھی ہو۔ تمہاری پڑھائی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا جانو۔" ثمن نے اسے ایک چھوٹے بچے کی طرح چمکارتے اپنے ساتھ لگالیا۔ چھوٹی بہن آخر کو بچوں کی طرح ہی تو پیاری تھی انہیں۔

"کریم چچا کی اچانک وفات نے ابا کو بہت پریشان کردیا ہے۔ تمہیں جلد از جلد اپنے گھر کا دیکھنا چاہتے ہیں ان کے علاوہ ہمارا اس دنیا میں ہے کون اور یہی تو ان کی اصل پریشانی ہے۔" وہ اس سے پورے چھ سال بڑی تھیں شادی شدہ دو بچوں کی ماں' سبھاؤ سے بات کرتے آخر انہوں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کر ہی دیا تھا۔

ارحمہ اور ثمن محمد سعد شیرازی کی دو ہی اولادیں تھیں۔ محبت کرنے والی بیوی کئی سال پہلے داغ مفارقت دے چکی تھی جس کی بدولت انہوں نے تن تنہا دونوں کو پالا تھا۔ ثمن چار سال پہلے بیاہ کر اپنے گھر جاچکی تھی اب انہیں صرف ارحمہ کی فکر تھی جو ان کے جگری یار کی اچانک موت سے کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ اس کے فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ ریلوے سے ریٹائرڈ ہوئے تھے بمشکل حالات گزر چکے تھے مگر زندگی کتنی فانی ہے آج کل بس یہی ایک چیز اور فکر ہر فکر پر بھاری تھی۔ انہیں بھی ارحمہ کو پڑھانے کا بہت شوق تھا مگر وہ اپنی اس بے چینی کا کیا کرتے جو لمحہ بہ لمحہ ان پر حاوی ہوتی چلی جارہی تھی۔ خدیجہ ان کی رشتے کی بہن تھیں جنہوں نے اس کا رشتہ انہیں بتایا تھا۔ ان کے محلے دار تھے' لڑکا بینک میں ملازم تھا اچھے شریف لوگ تھے۔ ایک دو ملاقاتوں کے بعد انہوں نے بات پکی کردی تھی۔



"ارحمہ ادھر آؤ۔" کھانا ان کے سامنے رکھتے وہ ناراض ناراض سی مڑ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی جب ان کے پکارنے پر رک کر مڑی اور ان کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

"تمہاری بیٹی ہم سے ناراض ہو اور ہم سکون سے رہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے بھلا۔" اس نے شاکی نظریں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا اس کا سارا واویلا بے کار گیا تھا اور انہوں نے ڈیٹ بھی فکس کردی تھی۔

"دیکھو بیٹا تم تو ساری باتیں جانتی ہو پھر بھی...... تمہاری یہ ناراضی سوہان روح ہے میرے بچے' تمہاری فکر نا جانے کیوں سر پر سوار ہوگئی ہے راتوں کو سو نہیں سکتا اگر مجھے کچھ ہوگیا تو تمہارا کیا ہوگا۔" انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا تھا اور وہ "اگر مجھے کچھ ہوگیا" پر تڑپ گئی تھی۔

"اللہ نہ کرے ابا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔"

"میری مشکل کو سمجھو بیٹا مجھے میری ذمہ داری پوری کرنے دو' انس بہت ہونہار بچہ ہے اس سے بات کی ہے تمہاری پڑھائی کی اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور لمبا چوڑا سسرال بھی تو نہیں ہے کہ کوئی مشکل ہو' ایک سسر ہیں تو خوب تیاری کرنا اور اچھے اچھے پیپر دینا۔" اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے جیسے انہیں یقین تھا کہ وہ اسے قائل کرچکے ہیں وہاں سے اٹھتے اگرچہ اس کی ناراضی ختم نہیں ہوئی تھی مگر ابا کی پریشانی نے اس کا غصہ کسی حد تک کم ضرور کردیا تھا۔

ایک خدیجہ پھپھو ہیں اپنے گھر میں سکون نہیں انہیں۔ اب اس کی ناراضی کا سارا نزلہ خدیجہ پھپھو پر گرا تھا۔

شادی کے حوالے سے کوئی خوش کن تصور اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکا تھا۔ کپڑوں کو الماری میں ٹھونستے اس نے اپنے سامنے بیالوجی کی بک کھول لی مگر کتنی دیر گزرنے کے بعد ایک لفظ بھی سمجھ نہ آسکا تھا تنگ آکر اس نے کتاب کو بیڈ پر پٹخ دیا۔



"آج اس کے فون نے اس کے زخموں کو پھر سے ہرا کر دیا تھا۔ کرسی پر جھولتے جھولتے وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا اسے سکون کی تلاش تھی جو اس کی قسمت میں سرے سے تھا ہی نہیں۔ سگریٹ اس کے ہاتھوں میں سلگ رہا تھا نا جانے کون سا واں نمبر تھا اس سگریٹ کا اسے تو یاد بھی نہیں رہا تھا۔ اس عورت نے اسے اسے جہنم میں دھکا دیا تھا کہ اب تک اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ مگر اسے نکلنے کا کبھی کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا۔

"میں علی کو کچھ دنوں کے لیے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔" اس کے کہے جملے اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ کمرے کا ایک اور چکر لگاتے اس نے سگریٹ کا بجھا ٹکڑا ایش ٹرے میں پھینک دیا۔

"وہ عورت جس کا نام ہی ایک گالی جیسا ہے اسے اپنا بیٹا یاد آگیا ہے۔" ایک بار پھر کرسی پر جھولتے ہوئے اسے ماضی یاد آیا تھا۔

یونیورسٹی میں بطور لیکچرر اس کا پہلا دن تھا۔ اس نے اسی یونیورسٹی سے ماسٹرز اور پھر ایم فل کیا تھا اور جب اسے جاب آفر کی گئی تھی وہ ان دنوں جاب کی تلاش میں ہی تھا اس نے بلا تامل اس آفر کو قبول کر لیا تھا۔ سر وسیم بیمار ہو کر چھٹی پر جا چکے تھے اور اسے ان ہی کی کلاس لینی تھی۔ اپنا تعارف کروا چکنے کے بعد وہ لیکچر شروع کرنے ہی والا تھا جب وہ اندر داخل ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی اس کا تعلق کسی بھی طرح یونیورسٹی سے جوڑنا اسے احمقانہ خیال ہی لگا تھا مگر آنکھوں دیکھی بات جھٹلانی ممکن نہیں تھی وہ کرسی سنبھال چکی تھی۔ وہ اسے تیسری یا چوتھی مرتبہ دیکھ رہا تھا پہلے کے سارے حوالے اس قدر تلخ تھے کہ اس نے اسے خوش آمدید تک کہنا گوارا نہ کیا تھا۔ پھر سارے لیکچر کے دوران اس نے دو آنکھوں کو خود کو دیکھتے پایا تھا۔ لیکچر ختم کر کے باہر نکلتے اسے اس سے پہلی ملاقات یاد آئی تھی۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر تھا اس نے پہلی بار اسے کہاں دیکھا تھا۔

"ارے، سنو، رکو، ٹھہرو۔" اپنے کمرے کی بالکنی میں سگریٹ کے کش لگاتے وہ شور ہی کرتا رہ گیا تھا۔ اس کے بھاگ کر نیچے آتے، لفٹ آپریٹ کرتے اور پارکنگ تک جاتے جاتے وہ گاڑی بھگا کر لے جا چکی تھی۔

"ہوا کیا ہے۔ کہاں بھاگے جا رہے تھے پاگلوں کی طرح اور کسے آوازیں دے رہے تھے۔" منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے گالیاں بکتے اسے اندر آتے دیکھ کر فہد نے اس سے پوچھا تھا۔

"پاگل ہو گیا ہوں خود سے باتیں کر رہا ہوں۔" کمرے کا دروازہ زور سے بند کرتے اس نے خود کو صوفے پر گرا دیا۔

"کوئی نئی بات ہو تو بتاؤ۔" وہ بھی اس کا دوست تھا کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ شرارتی انداز میں مسکراتا وہ ایک کے غصے کو ہوا دے رہا تھا۔

"یہ جو تم مسٹنڈوں کی طرح اندر ہی اندر مسکرا رہے ہو نا ساری مسکراہٹ ابھی رفوچکر ہو جائے گی۔"

"کیوں تو خودکشی کرنے لگا ہے۔" فہد نے ساتھ بیٹھے فیضان کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور دونوں کے قہقہے سے درودیوار لرزنے لگے۔

"نہیں میں نہیں تو خودکشی کرنے لگا ہے ابھی جو گاڑی تو شوروم سے نکلوا کر نیچے کھڑی کر کے آیا ہے اسے کسی نے ٹکر ماری دی ہے پچھلا مرر، بمپر شہید ہو چکا، میں نے یہ نظارہ اپنی ان دو گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مگر وہ بدتمیز لڑکی میرے جانے سے پہلے ہی گاڑی بھگا کر لے جا چکی تھی۔" فہد اچھل کر کھڑا ہو گیا وہ ابھی گاڑی خرید کر آ رہا تھا۔

"کیا میری گاڑی.... کس نے ٹکر ماری.... یار تو جھوٹ بول رہا ہے۔" اس کی حالت دیدنی تھی۔ ساری مستی یکسر غائب ہوئی تھی۔

"یقیناً" وہ لڑکی ڈرنک تھی، کھڑی گاڑی کو ٹکر مار دی۔" فیضان نے بڑے معتبر انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"چل یار چل کے دیکھتے ہیں کتنا نقصان ہو گیا ہے۔" فہد جلدی سے جوتے پہننے لگا۔

"نہ جانے کتنے دن لگ جائیں گے ابھی تو رننگ بھی پوری نہیں ہوئی۔" فہد اس وقت کسی کی نہیں سن رہا تھا اسے صرف گاڑی کی فکر تھی۔
"گاڑی انشورڈ ہے فکر کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اسے تسلی دی۔
"میں نے نمبر نوٹ کرلیا ہے۔" اسے لڑکی کا چہرہ بھی یاد تھا۔ انشورنس کی رقم چاہے دیر سے ملتی مل جاتی۔ فیضان کی بات صحیح تھی وہ لڑکی ڈرنک تھی۔ ہفتے کی شام تھی ویک اینڈ پہ 'پارٹیز' بار' ڈانس ساری رات چلتا تھا۔

دوسری بار اسے دریا کے پاس دیکھا۔ اکتیس دسمبر کی رات نیو ایئر پر ہونے والی آتش بازی دیکھنے کے لیے وہ فیضان اور حسن کے ساتھ گیا تھا۔
"اے کیا پاگل ہوگئی ہو۔ ہوش میں تو ہو تم ابھی اگر مجھے آگ لگ جاتی' آتش بازی دور' اس پہاڑی کے پیچھے ہوگی اور تم یہاں کررہی ہو' کسی پر بھی گرسکتے ہیں یہ۔" اس نے پٹاخوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہی لڑکی جو فہد کی گاڑی کو ٹکر مار کر فرار ہوگئی تھی اس کے سامنے تھی' پچھلا حوالہ بھی کچھ ایسا اچھا نہیں تھا۔ آج تو اس کا دل چاہ رہا تھا دو تھپڑ کس کے رسید کرے۔ نہایت خود سر تھی' ابھی بھی اس پر کسی بات کا اثر نہ ہوا تھا۔ اس کا غصہ کنٹرول سے باہر ہورہا تھا۔ وہ واپسی کے لیے مڑ گیا۔

اس کے بعد کے ہونے والے اتفاقات محض اتفاقات نہیں تھے۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ ہر اس جگہ موجود ہوتی جہاں وہ موجود ہوتا۔ وہ اس پر بری طرح مرمٹی تھی۔ وہ وجیہہ تھا' اسے اپنی وجاہت کا احساس تھا' مگر لڑکیوں سے کبھی گھل مل نہیں سکا تھا اور اس چیز نے اس خوب صورت بلا کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔



"جن عورتوں کی شکل اچھی نہ ہو وہ زیادہ شوہروں کے آگے پیچھے پھریں گی خدمت گزاریاں کریں گی مگر مرد بھی بے چارے کیا کریں منہ نہیں لگاتے انہیں۔"
ناجانے بات اس کے لیے کی گئی تھی یا ویسے ہی کی گئی تھی مگر نیزے کی انی کی طرح سیدھی اس کے دل میں جاکر کھب گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جب گھر ہی میں کوئی عزت نہ ہو تو کسی کو کیا کہنا۔ اس کے شوہر نے ساری عمر دوسروں کے سامنے انہیں ذلیل کیا تھا اس کی شکل اس کی رنگت کو نشانہ بنایا تھا' تو دوسروں کو تو خود موقع مل گیا تھا۔ اس کی نند کے ساتھ بیٹھی دیورانی فلسفہ جھاڑ رہی تھی۔ چائے کے لیے پانی رکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
بات ناجانے کیا تھی کیوں شروع ہوئی تھی مگر اس کے چہرے پر پژمردگی ضرور چھاگئی تھی۔ چائے ان کے سامنے رکھتے وہ باتھ روم میں آگئی اب تک تو اس کو عادت ہوجانی چاہیے تھی مگر نہیں ہوئی تھی کم روئی اس کی پہچان تھی جو اس کے شوہر نے اسے عطا کی تھی اور اب سارے خاندان میں اس کی عزت نہ تھی۔
"خوب صورت بیوی بھی قسمت والوں کو ملتی ہے آپا۔" گھر میں داخل ہوتے کانوں میں جانے والے پہلے جملے نے قطب کے دماغ کو الٹا دیا تھا۔ باتھ روم سے باہر نکلتی ماں کو دیکھتے ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس نے چہرہ کیوں دھویا ہے آنسوؤں کو پی جانے کا فن اس نے ناجانے کہاں سے سیکھا تھا مگر اس فن میں وہ بہت طاق تھی۔
"آگیا میرا بیٹا۔" اسے ساتھ لگاتے اس نے اس کا ماتھا چوم لیا۔
"تمہاری پھپھو اور چچی آئی ہیں اندر بیٹھی ہیں ان کو سلام کرکے ہاتھ منہ دھولو میں تمہارے لیے کھانا نکالتی ہوں۔"
"ہاں وہ تو گھر آتے ہی پتا چل گیا ہے مجھے کہ وہ آئی ہیں۔" اس کا لہجہ تلخ تر تھا۔ انہیں سلام کیے بغیر ہی باتھ روم میں گھس گیا۔
"اے شہناز گھر کو کیا آثار قدیمہ بنا رکھا ہے۔ کئی سالوں سے اسی طرح دیکھ رہی ہوں کوئی تبدیلی نہیں ہے اس کی حالت کچھ بہتر کرو کل کو بچوں کے رشتے

طے نہیں کرنے کیا۔" یہ اس کی پھپھو تھیں۔
ابا کا سارا خاندان باتیں کرنے میں ماہر تھا ایک سے بڑھ کر ایک بعض اوقات تو نمبر دینا مشکل ہو جاتا کہ کس کو پہلے نمبر پر رکھا جائے۔ ان کا گھر عام گھروں جیسا ہی تھا تین کمروں پر مشتمل، کچن اور باتھ روم کئی سالوں سے کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لیکن یہ شو آف کرنے والے رشتہ دار نہ خود سکون سے بیٹھتے تھے نا دوسروں کو بیٹھنے دیتے تھے۔ وہ حساس تھا ماں کی بے بسی اور باپ کی بے حسی نے اسے بہت پہلے شعور بخش دیا تھا۔

"بھیا تو ساری عمر دو اور دو چار کے چکر میں پڑے رہے نہ باہر سکون ملا نہ گھر میں۔ جمع کرنا گھر کو سنوارنا تو عورت کا کام ہوتا ہے۔" اس کی پھپھو کی تیکھی آواز برابر کے کمرے میں بلا روک ٹوک آرہی تھی۔ اس کے باپ نے کبھی ایک پیسہ اس کی ماں کے ہاتھ پر نہ رکھا تھا۔

"گھر کی حالت۔" طنزیہ کہتے اس نے سامنے پڑے کھانے کو پرے دھکیل دیا۔

"ہاں آپا بالکل صحیح کہا آپ نے۔ گھر سنوارنا تو عورت کی ذمہ داری ہے۔" چچی نے بھی ہاں میں ہاں ملانا ضروری سمجھا تھا وہ بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔

"اب مجھے ہی دیکھ لو نا جانے کب سے پیسے جوڑ رہی تھی۔ تنگی ہوئی پر کبھی کسی کو کچھ نہ کہا۔ اب ابیہ اور فاخر کالج جانے لگے تو سارے پیسے نکال کر آپ کے بھائی کے ہاتھ پر رکھ دیے کچھ انہوں نے خود سے ڈالے، پر گاڑی لا کر کھڑی کردی۔ اب فاخر پہلے ابیہ کو کالج اتارتا ہے پھر اپنے ابا کو، کتنی آسانی ہوئی ہے۔"

اس کی ماں یقیناً "باتیں سنتی کسی کام میں مگن ہوگی۔ کیا اس کی ماں کو کبھی دوسروں کا طنز محسوس نہیں ہوا تھا یا وہ جان بوجھ کر توجہ نہیں دیتی تھی۔ کھولتے دماغ کے ساتھ وہ جل رہا تھا۔ ان لوگوں کو گاڑی لیے دو دن ہوئے تھے اور گاڑی کے قصے گھر گھر مشہور ہوگئے تھے۔ ان کی عقل مندی، دور اندیشی اور شوہر کی عظمت کے قصے سننا اس کی ماں کا ہی وصف تھا اور وہ اس وصف سے بالکل تہی تھا۔ بیگ اٹھا کر وہ باہر نکل گیا۔



لہنگے کو سنبھالتی وہ بیڈ سے نیچے اتری۔ یہ پانی کا گلاس اسے تھما کر کب کی باہر جا چکی تھی۔ بیڈ سے اترنے کے بعد اس نے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔

"نا جانے اس کا بیگ اس کمرے میں رکھا بھی گیا تھا یا نہیں۔" کمرے کے طول و عرض کا جائزہ اس نے باریک بینی سے لیا تھا جہازی سائز بیڈ نے کمرے کی بہت سی جگہ گھیرلی تھی دو سنگل صوفوں اور ایک الماری کے علاوہ ایک کونے میں اسے بڑے بیگ کے ساتھ بڑے چھوٹے بیگ نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔

بڑے جوش سے بیڈ کے دوسری طرف جاتے اس نے جھٹ سے چابی پاؤچ سے نکالی زنگالی اور سرخ کمبینیشن کے لہنگے کا جانے کون سا کونا پاؤں کے نیچے آیا تھا اگر خود کو سنبھال نہ لیتی تو سیدھی دیوار کے ساتھ جا ٹکراتی۔

بیگ کھولتے اس کی خوشی دیدنی تھی۔ آپا سے چھپا کر اس نے ساری کتابیں اس بیگ میں رکھ لی تھیں۔ ایک ایک کتاب باہر نکالتے وہ اتنی خوش تھی جیسے ہفت اقلیم ہاتھ آگئی ہو۔ کچھ گھنٹوں کی دلہن کی کتابوں سے محبت دیکھنے لائق تھی اگر کوئی اور دیکھ لیتا تو یقیناً" غش کھا جاتا۔ ارادہ تو باہر نکال کر رکھنے کا ہی تھا مگر نازنین کے دیے گئے گیس پیپرز دیکھتے نا جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔

پڑھتے پڑھتے وہ ارد گرد سے بے گانہ ہو گئی تھی۔ دروازہ کھول کر اندر آتے اس نے اسے بیڈ کے ایک طرف آلتی پالتی مارے بیٹھے دیکھا تھا۔ نا جانے وہ اتنے انہماک سے کیا پڑھ رہی تھی۔ دروازہ بند کرتے وہ کچھ دیر یوں ہی کھڑا اسے دیکھتا رہا اس کا ارتکاز اس کے دیکھنے پر ٹوٹا تھا اور گڑبڑا کر اس نے کتاب نیچے رکھ دی

تھی جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔ ہونقوں کی طرح اسے دیکھتے، اچانک اسے اپنے دلہناپے کا خیال آیا تھا۔ سر جھکاتے وہ عجیب خجالت کا شکار ہوئی تھی۔

"ارحمہ! آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں کیا ہوا ہے۔" جھکے سر کے ساتھ اس نے اسے اپنے سامنے بیٹھتے دیکھا تھا۔

"اف ارحمہ اتنی بھی کیا بے اختیاری کتابوں کو ہاتھ مار کر بیڈ کے نیچے ہی دھکیل دیتی۔" خود کو سرزنش کرتے اسے اپنی بے اختیاری پر شرمندگی ہوئی تھی۔

وہ اس کے اردگرد بکھری کورس کی کتابیں دیکھ کر تھوڑا حیران ہوا تھا ثمن آپا اور سعد انکل کا بار بار اس کی پڑھائی کا تذکرہ اور اس کی محبت کا ذکر کرنا اسے اب سمجھ آیا تھا۔ قہقہہ بدقت تمام زیر لب مسکراہٹ میں بدلا تھا۔ نئی کلاس میں جانے والے بچے کی طرح وہ اپنا سارا کا سارا کورس آج ہی دیکھ لینا چاہتی تھی۔

خدیجہ خالہ نے اس کی خوب صورتی کا جتنا تذکرہ کیا تھا وہ اس سے بڑھ کر خوب صورت تھی۔ سنگ مرمر کے تراشیدہ مجسمے نے بڑی بڑی آنکھیں جھپکائیں تو ہی وہ ان کے ٹرانس سے باہر نکلا تھا۔ جھکے سر کے ساتھ اس نے ایک مردانہ ہاتھ اپنی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔

"آئیں۔" اس کا ہاتھ تھامتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ کتابیں میں ادھر الماری میں رکھ دیتا ہوں۔" اسے بیڈ تک چھوڑتے وہ اب کتابیں سمیٹ رہا تھا۔

"ویسے مجھے علم نہیں تھا کہ آپ کو کتابوں سے اس قدر محبت ہے۔"

"اس قدر۔" پر اس نے کچھ زور دیا تھا اس کا جھکا سر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا وہ زیر لب مسکراہٹ لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ مسکراتی ہوئی شرارتی نظروں نے پہلی بار اسے صحیح معنوں میں خجل کیا تھا۔ وہ بلا کا وجیہہ و شاندار شخص تھا۔

"نہیں تو۔۔۔ وہ تو۔۔۔ بس میں ایسے ہی ان کو دیکھ رہی تھی۔" وضاحت دینا اس کی عادت نہیں تھی مگر وہ دے رہی تھی۔

"اگر دیکھنے پر محویت کا یہ عالم ہے تو پڑھتے وقت تو آپ خود کو بھی بھول جاتی ہوں گی۔" آواز کچھ دھیمی ہوئی تھی مگر اتنی بھی دھیمی نہ تھی کہ اسے سنائی نہ دیتی۔

"پیپرز کی ڈیٹ شیٹ آگئی ہے اور میری تیاری ابھی پوری نہیں ہے۔ بہت سے دن تو شادی کی شاپنگ میں ہی گزر گئے۔ ابا سے کہا بھی کہ بعد کی کوئی تاریخ رکھ لیں۔" شیروانی اتارتے اس نے اسے کہتے سنا تھا۔

"اگر بعد کی کوئی ڈیٹ رکھ لی جاتی تو؟"

"تو اچھا ہوتا میں اچھے طریقے سے تیار کرلیتی۔"

"اور اب۔۔۔؟"

"اب تھوڑی مشکل ہوگی۔"

"کیوں۔" اس کے سوالوں کے جواب وہ ایسے دے رہی تھی جیسے اس کی کوئی سہیلی اس سے پوچھ رہی ہو۔ اور اس "کیوں" پر اچانک سٹپٹا کر اس کی جانب دیکھتے اس کی زبان کو بریک لگی تھی۔ وہ بھی جیسے حظ اٹھا رہا تھا۔ گھنی مونچھوں کے نیچے مسکراتے ہونٹ اور شرارت سے چمکتی آنکھیں اسی پر جمی تھیں۔ "اف ثمن آپی نے بتایا نہیں کہ اتنا ڈیشنگ ہے۔" اس نے تصویر دیکھنے سے انکار کردیا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں تیاری بھی ہوجائے گی۔"

"آپ کی منہ دکھائی۔" پڑھائی کا ٹاپک ختم ہوا تھا اور کئی لمحے گمبھیر خاموشی میں گزر گئے۔



Loneliness of Kids Modern Society

سیمینار میں پڑھا جانے والا اس کا پیپر جسے سب سے زیادہ داد و تحسین حاصل ہوئی تھی اس نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا تھا اسٹاک ہوم یونیورسٹی کا قابل ترین لیکچرار ایبک اپنی سیٹ پر واپس آچکا تھا کرسی پر بیٹھتے اسے سب سے پہلا خیال اپنے اکیلے بچے کا آیا تھا جو ہوٹل کے کمرے میں تنہا تھا۔ اس کا پیپر نگلیکٹ ہونے والے بچوں ان کی شخصیات کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کر گیا تھا۔ وہ بھی تو وہی کچھ کر رہا تھا۔

اس کی توجہ کا طالب اس کا چھ سالہ بیٹا' اس نے سر جھٹک کر اپنا دھیان روسٹرم پر بولتے شخص اور اس کی باتوں کی طرف لگانا چاہا مگر ناکام رہا تھا نا جانے وہ کیا گفتگو کر رہا تھا۔ بے چینی اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ سیمینار کا وہ وقت اس نے بڑی مشکل سے کاٹا تھا۔ وہ جلد سے جلد اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ ہر چیز میکانکی انداز میں ہوتی چلی جا رہی تھی اس کا اپنے بیٹے سے تعلق سب سے مضبوط تعلق تھا اور اسی تعلق کو اس نے سب سے آخر میں رکھا تھا۔ اس کی ماں نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا تو وہ کون سا اچھا کر رہا تھا۔ اس کی سوچیں تو اپنے ساتھ ہونے والے المیے پر ہی آکر رک گئی تھیں' اس سے آگے اس نے کبھی کچھ سوچا ہی نہ جانا۔ بیٹے کی شخصیت کیسی بن رہی ہے کیسی بننی چاہیے' اسے کیسے سہارے کی ضرورت ہے اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا اور اب.... اس کی زندگی اسکول اور گھر' گھر اور یونیورسٹی کے درمیان گزرا کرتی اسے کھانا کھلانا' سلانا اس کی باقی ضروریات کا خیال رکھنا سب کچھ تو ہو رہا تھا تو پھر۔ اور آج اسے حقیقی طور پر اس کا احساس بھی ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی لکھتے' لیکچر تیار کرتے اور کلاسیں لیتے گزرتی اور اس کے بیٹے کی زندگی اس کی توجہ حاصل کرنے کی کوششیں کرتے۔

''ڈیڈ آپ جلدی آگئے۔'' کارٹون دیکھتے دیکھتے اس نے اسے حیرت سے دیکھا تھا اس کا آنا حیرت کی بات نہیں تھی مگر جلدی آنا حیرت کی بات ضرور تھی۔

''جلدی سے تیار ہو جاؤ' ہم باہر جا رہے ہیں۔'' اس کے جلدی جلدی کہنے کو وہ غور سے دیکھ اور سن رہا تھا۔

''کیا ہوا ینگ مین کیا سوچ رہے ہو۔ باہر جانا ہے یا نہیں؟'' اس نے اس کے سامنے آکر ہاتھ ہلایا وہ جیسے ایک دم ہوش میں آیا تھا۔ اس کے اس طرح کے موڈ کا وہ عادی نہیں تھا۔ اس کی تیاری میں مدد کرتے وہ باہر نکلے ''پلے سینٹر'' تک پہنچتے پہنچتے علی کی ایکسائیٹمنٹ انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ پھر وہاں وقت گزرنے کا دونوں کو احساس نہیں ہو پایا تھا ایک دوسرے میں مگن وہ دونوں شاید پہلی بار خوش ہو رہے تھے۔ کھانا باہر کھایا گیا تھا۔

کمرے تک پہنچتے پہنچتے وہ سوچ کا تھا۔

اسے اپنے بچے کو وہ تنہائی نہیں دینی تھی جس کا شکار ہو کر بچے خود کو بھی فراموش کر دیں۔'' خود سے عہد کرتے اس نے اس کا ماتھا چوم لیا۔



''آج کل کے بچے اپنی مرضی کرتے ہیں کہاں بڑوں سے پوچھتے ہیں۔'' رفیق چچا اور چچی کو دیکھ کر اس کا منہ تک کڑوا ہو گیا تھا اس کی شادی میں سب نے بے گانوں کی طرح شرکت کی تھی اور یہ بھی شکر کا مقام ہی تھا ورنہ اس کے رشتہ دار ہوں اور کوئی کام بغیر فساد کے ہو جائے ممکن نہیں تھا۔ رفیق چچا' ابا سے ملنے آئے تھے عطیہ چچی بھی ساتھ تھیں۔ چائے اور اس کے لوازمات ان کے سامنے رکھتے ارحمہ چچی کے ساتھ بیٹھ رہی تھی انہیں سلام کرتا وہ بھی وہیں بیٹھ گیا تھا۔ چچا کی کہی بات کا رد عمل ارحمہ کے چہرے پر دیکھنے کے لیے اس نے درزیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا وہ چچی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔

''بھئی میرے بیٹے نے تو میرا مان رکھا جہاں میں نے کہا اس نے وہیں سر جھکا دیا۔ بڑا ہونہار اور فرمانبردار ہے میرا انس۔'' اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا ابا اس کی تعریف کر رہے تھے اسے سراہ رہے تھے۔

''خدیجہ بہن نے رشتہ بتایا ہمیں ارحمہ بٹیا اتنی اچھی لگی کہ بس اسے گھر لانے کی جلدی پڑ گئی۔'' چچا کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں متوقع رد عمل نہ پا کر ایک لمحے کے لیے حیران ہوئی تھیں۔ اپنی اولاد کی برائیاں کرنے والا شخص اس کی تعریفیں کر رہا تھا۔

''جو شخص ساری زندگی اپنی بیوی کی عزت نہیں کر سکا اسے میں بیٹی دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آخر کو اسی کا بیٹا ہے اسی جیسا ہو گا۔'' رحمان اللہ کو سامنے بیٹھے شخص کی بات یاد آگئی تھی جو ان کا بھائی تھا جسے انہوں نے اپنی اولاد پر بھی فوقیت دی تھی۔ فاخر کی شادی تھی وہ کچھ ہی دیر کے لیے تو منظر سے غائب ہوئے تھے اور واپس کمرے میں آتے انہوں نے رفیق

کو خود صالح سے باتیں کرتے سنا تھا اس دن انہیں صحیح معنوں میں اپنی غلطیوں کا احساس ہوا تھا۔ حالانکہ انہوں نے تو اس کے رشتے کی بات بھی نہیں کی تھی تو پھر وہ۔۔۔۔ اب جبکہ انس اچھی جاب پر تھا سب کو غیر خاندان میں اس کی شادی کی آگ لگ گئی تھی مگر وہ مطمئن تھے۔

"مقطب کیسا ہے۔" ان کی طمانیت اور سرشاری بھلا اس سے کیسے برداشت ہوتی سورفیق نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے آج کل بہت مصروف ہے۔" ان کو اپنی آواز کتنی اجنبی لگی تھی۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ دونوں رخصت ہوگئے تھے۔ بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے انہیں وہ کتنا یاد آیا تھا اب تو حساب رکھنا بھی بھول گئے تھے۔ وہ غلط تھے ہمیشہ غلط تھے اور وہ کہاں چلا گیا تھا۔

"مقطب کون ہے۔" دراز میں سے کچھ ڈھونڈتے وہ انس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی شرٹ اتارتے اس کا ہاتھ کچھ لمحے کے لیے رکا تھا اس کا سوال غیر متوقع نہیں تھا۔

"مجھ سے دو سال بڑا ہے قطب میرا بھائی' سویڈن میں ہوتا ہے۔"

"آپ نے کبھی بتایا نہیں میں تو سمجھی تھی آپ اکیلے ہیں۔" حیرت اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"شادی شدہ ہیں کیا۔ کتنے بچے ہیں۔" اس کے سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اس کی خاموشی دیکھتے اس نے بھی مزید کچھ پوچھنے سے احتراز کیا تھا۔

"شکر ہے کہ اس کا صرف تذکرہ ہی کیا تھا کوئی کہانی نہیں سنائی تھی ورنہ اسے کیسے کیسے وضاحت کرنی پڑتی۔" شرٹ ایک طرف پھینکتے وہ باتھ روم میں بند ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"کیا تمہیں کبھی اپنا بیٹا یاد نہیں آیا۔ اور ڈینیل کیسا ہے؟" کافی کے ہلکے ہلکے سپ لیتے یہ جین تھی اس کی بہترین دوست' اس کی رازدار' اس نے جین پر ایک نظر ڈالی اور دوسری اچٹتی سی نگاہ گلاس ونڈو سے باہر دوڑتی گاڑیوں پر کافی کا گھونٹ بھرا اور مگ ٹیبل پر دھر دیا کافی اسے بے حد تلخ محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ کوئی جواب دیے بنا وہاں سے اٹھ کر گھر آگئی۔

ڈینیل اس کا نیا دوست تھا۔ روزی کے ساتھ نیا نیا بریک اپ ہوا تھا۔ اسے ایک جذباتی سہارے کی ضرورت تھی اور ساناں کو ایک نئے بوائے فرینڈ کی۔ وہ خوب صورت تھا' امیر تھا اور اس کی شخصیت کے سحر میں گم ہونے کا دعوا کرنے لگا تھا۔ اسے اس سے آگے کچھ اور سوچنا بھی نہیں تھا۔

علی کے سارے حقوق وہ خود اس کے باپ کو تفویض کر آئی تھی۔ اس کی بہت سی دلچسپیوں کے درمیان اس سے ملنے کا خیال بہت تھوڑی دیر کے لیے بے چین کرتا تھا اور پھر کوئی نئی ایکٹیوٹی اسے اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔

دن آفس میں ڈینیل کو SMS کرتے گزرتا تھا تو راتیں اس کی خوب صورت سنگت میں۔ شاپنگ اس کا شوق تھا اور ڈینیل اس کے شوق کا شیدائی' آئے دن کے نت نئے تحائف اس کی آنکھوں کو خیرہ کیے رکھتے۔ وہ خوب صورت تھی حسین تھی اسے چاہنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ اس لیے احساس' کبھی احساس زیاں میں نہیں بدلا تھا۔ وہ پچھتائی تھی مگر اس بات پر کہ اس نے اپنے حسن کی قدر و قیمت کا کبھی اندازہ ہی نہیں کیا تھا اس نے گھوم پھر کے شیشے میں خود کو دیکھا تراشا ہوا مرمریں بدن' بڑی بڑی روشن آنکھیں' خوب صورت تراشیدہ بال' مجسم حسن۔ بجلیاں گرا رہا تھا وہ تو خود اپنے حسن کے طلسم میں گرفتار ہو جاتی تھی دوسرے تو پھر دوسرے تھے خوب صورت جاندار مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا تھا۔ ڈینیل اسے لندن لے جانے والا تھا۔

"لندن ڈینیل کے ساتھ کیسا لگے گا۔" سوچتے سوچتے اس نے خود کو بیڈ پر گرا لیا۔ زندگی خوب

صورت تھی، بے حد خوب صورت بالکل اسی کے جیسی۔" اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔



فہد کے بڑے بھائی کی اکیڈمی میں پڑھاتے پڑھاتے اسے کئی مہینے ہوگئے تھے ساتھ ساتھ ٹیوشنز بھی چل رہی تھیں۔ ایف ایس سی کے ایگزامز کے بعد آج کل فارغ تھا اس لیے یہ مصروفیت اس کے لیے غنیمت تھی کم از کم پریشان کن سوچوں سے تو نجات مل جاتی تھی جو ہر لمحہ اس پر سوار رہا کرتی تھیں۔ انس کے میٹرک کے پیپرز ہوگئے تھے وہ بھی فارغ تھا گھر کے حالات جوں کے توں تھے ان ہی دنوں نبیل بھائی کی شادی کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا تھا نبیل بھائی اس کے ددھیال میں وہ واحد فرد تھے جن کے ساتھ اس کی دوستی تھی۔ تھے تو اس سے بہت بڑے مگران کی اچھی نیچر کی بدولت اس کی ان سے بہت بنتی تھی سو ابا کے کہے بغیر ہی وہ پھپھو کی طرف آگیا تھا۔ وہ کالج میں لیکچرار تھے اور جاب کی طرح ہی بہت ڈیسنٹ تھے۔

اس شادی کے لیے پہلی بار اس نے شاپنگ کی تھی خاص طور پر شہناز بیگم کے لیے بہت خوب صورت نفیس سے جوڑے پسند کیے تھے۔

"امی آپ پہنیں گی تو بہت اچھی لگیں گی۔"

"شکل تو وہی رہے گی نا۔" رحمان اللہ نا جانے کب پیچھے آکر کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک چھچھلتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور کچھ کہے بغیر منظر سے آؤٹ ہوگیا۔ وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی نا جانے وہ کبھی کسی کو خوش کیوں نہیں ہونے دیتا تھا۔ انہیں اب تک تو اس شخص سے نفرت ہوجانی چاہیے تھی مگر نہیں ہوئی تھی۔ سوٹوں کو بے دلی سے تہ کر کے اس نے باہر کا رخ کیا۔

"قطب' ہال کے سارے انتظامات تمہیں ہی دیکھنے ہیں فرہاد کے ساتھ۔" وہ بھی نبیل کا پسندیدہ ترین ذمہ دار آدمی تھا۔

"کھانا کھا کر چلتے ہیں۔" فرہاد کو بھوک نے تنگ کر رکھا تھا اب کچن سے آنے والی خوشبو نے ہی تو اسے روک رکھا تھا۔ رات مہندی کے فنکشن سے بچ جانے والا کھانا گرم کیا جا رہا تھا۔

"ہاں بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے ٹھیک ہے پھر کھانا کھا کر ہی چلتے ہیں کچن کے ساتھ بنے ہال میں ڈائننگ ٹیبل پر دونوں کھانے کے انتظار میں تھے۔

پھپھو کے سسرالی رشتہ دار چچاؤں کی فیملی اور خود ان کا خاندان سب ہی تو ادھر موجود تھے ڈائننگ ٹیبل کی دوسری کرسیاں ابا' چچا اور پھپھو نے سنبھالی تھیں چچی اور امی کھانا لا کر رکھ رہی تھیں۔

"رحمان یاد ہے جب تمہاری شادی ہوئی تھی' ہائے کتنا ارمان تھا تمہاری شادی کا۔" ان کا لہجہ ایک دم غمگین ہوگیا تھا جیسے شادی کا نہیں کسی مرگ کا ذکر ہو رہا ہو۔ مہناز ایسے موقعے پر ایسا ذکر کرتیں کہ اگلا پھڑ پھڑا کر رہ جاتا۔

"ہاں یاد ہے آپا ویسے ایسا کون سا یاد کرنے والا وقت ہے پر برا وقت بھی کبھی بھولا ہے سو مجھے بھی یاد ہے۔" رحمان اللہ تو جیسے ہر وقت تیار بیٹھے ہوتے تھے۔

"گلے میں پڑا ڈھول بجا تو رہا ہوں تب سے۔" ان کے منہ میں جیسے ریت بھر گئی تھی۔ عطیہ بیگم نے استہزائیہ انداز میں ساتھ کھڑی شہناز کو دیکھا تھا۔ وہ گھر میں تو ایسی باتیں کرتے ہی تھے اور اب..... شہناز کی آنکھوں میں جیسے مرچیں بھر گئی تھیں۔ بریانی کے ٹرے میز پر رکھتے وہ جلدی سے کچن کی جانب مڑ گئی۔ سامنے پڑا پانی کا گلاس اس نے جیسے ایک ہی سانس میں جلتے الاؤ پر ڈالا تھا مگر الاؤ تھا کہ مزید بھڑک اٹھا تھا۔ ایک نوالہ بھی منہ میں ڈالے بغیر وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

"ایک تو مجھے اس مسٹنڈے کی سمجھ نہیں آتی ایسے ہی سانڈ بنا اکڑتا رہتا ہے۔" اس کا وہاں سے اٹھ جانا بھی انہیں گوارا نہیں تھا۔ ان کی کہی باتیں اگر چپ چاپ وہاں بیٹھ کر سنتا رہتا تو تب ٹھیک تھا۔

"ماں کی شہہ ہے جو باپ کو یوں اکڑ دکھاتا ہے۔" انہیں اپنی غلطی بھلا کبھی کب نظر آتی تھی جو اب مان لیتے۔ اب رخ اس کی جانب مڑ گیا تھا۔

"گھر میں تو آپ یہ کرتے ہی ہیں باہر تو کسی کو بخش دیا کریں۔" مڑ کر واپس آتے اس کا کہنا غضب ہو گیا تھا۔

"دیکھا کیا غلط کہا میں نے باپ کو آنکھیں دکھا رہا ہے ابھی زمین سے اگا نہیں اور سبق پڑھا رہا ہے مجھے رحمان اللہ کو۔" ان کا بس نہ چل رہا تھا وہ چار ہاتھ اسے جڑ دیتے۔ کہہ کر وہ رکا نہیں تھا۔ شادی والے گھر میں اچھا خاصا تماشا بن گیا تھا۔ ایسے تماشے گھر میں تو روز ہوتے تھے ہاں آج جگہ کی تبدیلی نئی چیز تھی۔ فرہاد دروازے تک اس کے پیچھے آرہا تھا۔ ساری باتیں اسے سلگا رہی تھیں اور وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہا تھا۔ اس کا سارا غصہ گھر کے بیرونی دروازے پر نکلا تھا۔ دندناتے ہوئے اس نے گلی پار کی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے والی بھوک اب سرے سے غائب تھی وہ کڑھ رہا تھا اسے رہ رہ کر ابال چڑھ رہے تھے۔ ابا ایسا کیوں کرتے تھے اور پھپھو' اس نے تنفر سے سوچا۔ ساری باتیں ہتھوڑے کی طرح اس کے سر پر برس رہی تھیں۔ وہ ہر چیز سے اکتایا ہوا بے زار تھا۔ یہاں تک کے اسے اپنا وجود بھی بے مصرف ہی لگنے لگا تھا۔ اس کا فنکشن اٹینڈ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا موبائل پر موصول ہونے والی کالز کو دیکھتے اس نے موبائل ہی آف کر دیا تھا۔ بہت سا وقت اس نے باہر ہی گزارا تھا اس کے بعد اسے نہ جانے کہاں جانا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے دیے گئے "IELTS" ٹیسٹ میں آٹھ بینڈ لینے والا قطب تو مذاق مذاق میں فہد کے ساتھ بہت سی باہر کی یونیورسٹیوں کے فارم فل کر چکا تھا سنجیدگی سے ان کے بارے سوچ رہا تھا۔ وہاں بیٹھے اسے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ دکانوں کے شٹر ایک ایک کر کے گر رہے تھے۔

"باؤ جی ہوٹل بند کرنا ہے۔" ہوٹل کا مالک اس کے پاس کھڑا تھا چائے کے کئی کپ پینے کے بعد بھی وہ وہاں بیٹھا رہا تھا۔ سب سے آخر میں بند ہونے والا ہوٹل بھی تھا۔ باہر نکلتے وہ سڑک پر چلتا رہا نہ جانے اسے جانا کہاں تھا۔ اس کے باپ نے کبھی کسی کی عزت نفس کا خیال نہ کیا تھا گھر میں ہونے والا تماشا اب باہر بھی ہونے لگا تھا۔ رشتہ داروں کا مجمع اور ہونے والی بے عزتی اسے کسی طرح بھولنے والی نہیں تھی۔ آخر ان لوگوں کا قصور کیا تھا اس گھر میں پیدا ہونا اگر جرم تھا تو وہ بھی انہوں نے تو نہیں کیا تھا وہ شخص ہی اس کا ذمہ دار تھا تو پھر سزا انہیں کیوں مل رہی تھی۔ ان کے باپ کی زندگی انتھک محنت سے عبارت تھی تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ اس کے اشتہار لگوا دیے جاتے۔ ان کی پوجا کی جاتی ان کے چرنوں میں سب کچھ دان کر دیا جاتا یہاں تک کہ عزت نفس بھی اور وہ شخص کیا چاہتا تھا۔ یک بارگی اسے محسوس ہوا اسے اس طرح ان کے سامنے کھڑے نہیں ہونا چاہیے تھا اگر تھوڑی دیر اور خاموش رہتا تو کیا ہو جاتا۔ خود کو سرزنش کرتے اس کی خودسری ایک دم سے پھر عود کر آئی تھی۔

"کبھی ان کو احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں' کیا کرتے رہے ہیں۔" وہ زندگی کے آغاز میں ہی تھکنے لگا تھا۔

اڑتے ہی رنگ رخ میرا نظروں سے تھا نہاں
مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

وہ بھی ایک ایسا ہی پرندہ تھا جو ٹوٹے پروں' شکستہ سوچوں کے ساتھ محو پرواز تھا۔ پژمردگی اس کے پورے وجود کو لپیٹ میں لے رہی تھی۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ کئی منٹ کے بعد کوئی اکا دکا گاڑی شور مچاتے قریب سے گزر جاتی۔

"آج اسے اکیڈمی میں ہی رہ لینا چاہیے تھا۔" سوچ کر اس کے قدم اسی جانب اٹھنے لگے تھے۔ ایک چابی اس کے پاس تھی سو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اداسی تھی کہ پورے وجود پر مسلط ہو چکی تھی۔

"اوئے ٹھہر ذرا کدھر بھاگ رہا ہے بے شرموں کی طرح۔" اپنے دھیان میں مگن چلتے اس نے پاس سے کچھ لوگوں کو دوڑتے دیکھا تھا اور اس کے پیچھے آنے والے وردی والے نے اسے پکڑ لیا تھا۔

"جوا کھیلتے ہو اور پھر ہماری دوڑیں لگواتے ہو۔ پکڑ اظہر اس کو ذرا ورنہ بھاگ جائے گا یہ۔ اس کی تو

چھترول آج ایسی ہوگی کہ ساروں کے نام بھی بتائے گا اور.....“ اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کرتے اسے اس کی طرف دھکیل دیا۔

”نہیں‘ جی ایسا کچھ بھی نہیں ہے میں تو.....“

”نہیں جی میں جی کے بچے چپ کر۔“ لاک اپ میں گزرنے والی رات اس کا واویلا کام آسکا تھا نہ اپنی صفائی میں کھائی گئی قسمیں‘ وہ اس سے اس کے ساتھیوں کے نام پوچھتے رہے تھے۔ تھانے میں گزرنے والی رات اور وہاں کی جانے والی اس کی حالت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس کے فون سے گھر فون کرتے وہ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ اس کے باپ کی منت سماجت کے باوجود وہ اسے چھوڑنے پر تیار نہیں تھے اور تھک ہار کر چچا کا سہارا لینا پڑا تھا جس کے نتیجے میں باہر نکلنا اس کے لیے سبکی‘ رسوائی اور ذلت لے کر آیا تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی کوئی اس کی بات ماننے پر تیار نہیں تھا۔

”بھائی صاحب اسی لیے کہتا تھا کہ نظر رکھیں ان پر۔ آپ کی نرم مزاجی نے ہی یہ دن دکھایا ہے۔ کتنی بدنامی ہوئی ہے خاندان کی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔“ اس کے چچا کو موقع ملا تھا بھلا وہ اسے ہاتھ سے کیسے جانے دیتے۔ اس دن ان کے گھر میں نبیل کی شادی کی دعوت تھی سو سب ہی مفت کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ سب کے درمیان مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ اپنی بے گناہی کا یقین دلاتے دلاتے آخر وہ بالکل خاموش ہوگیا تھا۔ ایسا سناٹا تھا جیسے کسی کی میت اٹھائی گئی ہو۔

”اگر آج میں نہ ہوتا تو اس کی جو چھترول ہوتی وہ سارا زمانہ دیکھتا اور چار دن تک تو خود بھی اپنی شکل دیکھنے سے ڈرتا یہ۔“ ڈر تو وہ اب بھی رہا تھا۔ ناک کے نیچے جما خون اور سوجی ہوئی آنکھ‘ جس کے نیچے پڑا نیل چیخ رہا تھا‘ پپڑی زدہ ہونٹ۔ کیا وہ سر اٹھا کر بات کرنے کے قابل تھا۔

”ہاں کر سکتا ہوں کیوں کہ میں مجرم نہیں ہوں۔“ اس کا جھکا سر ایک دم ہی اٹھا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“ اس کا مستحکم لہجہ‘ رفیق اللہ اور رحمان اللہ دونوں کو طیش دلا گیا تھا۔

”ہاں‘ ہاں وہ تو تمہیں گھر سے اٹھا کر لے گئے تھے کہ کاکا‘ ایک جواریے کی ضرورت ہے تو تو بن جا اور تو بن گیا۔“ اس کے منہ پر لگنے والا تھپڑ اس نے منہ پر نہیں اپنی روح پر لگتا محسوس کیا تھا۔

”بندہ کوئی شرم ہی کر لیتا ہے کوئی تو شرمندگی ہو چہرے پر پر نہ جی‘ باپ کے سامنے تو اونچی آواز میں بولتا ہی تھا اب یہی ایک کمی رہ گئی تھی جواریا بننے کی۔“ رحمان اللہ سارے صحن میں چکراتے پھر رہے تھے۔ کئی آنکھیں اس پر جمی تھیں۔ کیا وہ اتنا ہی بے اعتبار تھا کسی نے بھی اس پر اعتبار کرنا گوارہ نہ کیا تھا۔ اتنے لوگوں میں اس نے اپنی ماں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ وہ اسے سب سے پیچھے کھڑی نظر آئی تھی۔

”بس کریں ماموں اب بس کریں بچہ ہے غلطی ہوگئی۔“ نبیل ابھی آیا تھا ساری خبر اسے فون پر مل چکی تھی۔ نئی نویلی بیوی کے سامنے اسے بھی شرم ساری ہو رہی تھی۔

”کوئی غلطی نہیں کی میں نے۔“ اس کی آواز ایک چیخ سے مشابہہ ہوگئی تھی۔

اس کے بعد وہ انتہائی خاموش ہوگیا تھا۔ بالا ہی بالا اس نے سویڈن جانے کا سارا انتظام کیا تھا۔ ٹیسٹ‘ فارم‘ ویزا سب مکمل تھا کچھ تھوڑے بہت پیسے اس کے پاس موجود تھے اور باقی اس نے فہد سے قرض لیا تھا۔ فہد بھی اس کے ساتھ ہی تھا دونوں کی روانگی ایک ہی دن تھی۔ اسے انس پر غصہ تھا اسے امی پر غصہ تھا انہوں نے بھی اسے ویسا ہی سمجھا تھا جیسا سب کہہ رہے تھے کم از کم وہ دونوں تو اس کو بہت اچھی طرح جانتے تھے اس کے زخموں پر ہمدردی اور یقین کا مرہم ہی رکھ سکتے تھے‘ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا وہ ہر چیز سے بے زار تھا حالانکہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ انس ایک دبا ہوا‘ شرمیلا لڑکا ہے اور اس کی ماں کو کبھی اس کے باپ نے کچھ سوچنے ہی نہیں دیا پھر بھی..... وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا یہاں اس کی عزت و

وقار پر کاری ضرب لگی تھی اور اور وہ خود کی نظروں میں گر گیا تھا' مگر اسے خود کو اٹھانا تھا' معاشرے میں بہتر مقام حاصل کرنا تھا اور یہی اس کی جستجو تھی۔ اس کی فیلڈ انجینئرنگ ہوتی اگر وہ یہاں رہتا' مگر اب اسے بھی چھوڑنا پڑا تھا اس نے انگلش لٹریچر چوز کیا تھا۔ یونیورسٹی آف اسٹاک ہوم میں بیچلرز میں ایڈمیشن ہو چکا تھا اس کی تیاری مکمل تھی۔

"قطب' بیٹے کیا کر رہے ہو؟" وہ اس کے پیچھے کھڑی پوچھ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں بس ویسے ہی۔" اس نے ابھی تک گھر میں کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔

"بیٹا اب ناراضی ختم کردو۔" اب وہ ویسے ہی کھڑا تھا۔ بغیر جواب دیے اس نے ایک شرٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑلی وہ ساتھ لے جانے والے کپڑوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

"ماں باپ سے بھی بھلا ناراض ہوتا ہے کوئی۔ دیکھو گھر میں کیسی ویرانی چھائی ہوئی ہے انس ہے تو الگ منہ سر لپیٹے پڑا رہتا ہے تم ہو تو تمہارے آنے جانے کی ہی خبر نہیں۔" ان کو سنتے وہ اسی بے حسی سے کھڑا رہا۔

"میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔" اس کی سنجیدہ ہموار آواز نے انہیں بہت کچھ باور کرایا تھا۔ شدید ناراضی میں وہ بولنا بند کر دیتا اور اب تو کئی دن سے ایسا ہی تھا۔

"تمہیں تو پتا ہے تمہارے باپ کی عادت کا اور تم پھر بھی غصہ کرتے ہو۔ ہر چیز کو خود پر سوار نہ کرلیا کرو ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے۔" اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے اس کے تیکھے نقوش سے مزین چہرہ ان کے سامنے آگیا۔

"تم ہی سمجھ جاؤ اگر وہ نہیں سمجھتے۔" نرمی سے سمجھاتے انہوں نے اس کے بال سنوارے وہ ان سے بھی لمبا ہو گیا تھا۔

"ہاں سمجھ گیا ہوں۔" اس نے ہٹیلے پن سے کہا۔ اس نے ابھی گھر میں کسی کو جانے کا نہیں بتایا تھا آج بتانے کا ارادہ تھا اور اس پر بھی گھر میں ایک طوفان آنے والا ہے وہ نہیں جانتا تھا۔

"نہیں سمجھے اسی لیے تو کہہ رہی ہوں سمجھ جاؤ یہ غصہ انسان کی خوبیوں' اچھائیوں کو کھا جاتا ہے۔"

"اولاد کی غلط بات کو غلط کہنا ماں باپ کی ذمہ داری ہے۔" اس نے پاس کھڑی اس فلسفہ بولتی عورت کو دیکھا جو اس کی ماں تھی ہر روز رونا اور روتے رہنا اس کا مقدر ٹھہرایا گیا تھا اور وہ پھر بھی قانع تھی۔ اس نے ان کی کسی بات کی تردید یا تائید نہیں کی تھی۔

"میں سویڈن جا رہا ہوں دو دن بعد میری فلائٹ ہے وہاں یونیورسٹی میں میرا ایڈمیشن ہو گیا ہے۔"

"ہاں ہاں جانے دو اب اسے منہ چھپانے کے لیے کوئی تو جگہ چاہیے نا اب یہاں کہاں رہ پائے گا۔" رحمان اللہ نے سننے کے بعد اپنی رائے دی تھی۔

"پہلے ایسے کام ہی نہ کرے انسان کہ دوسروں سے چھپنے کی نوبت آئے اور ویسے بھی جا کر شوق پورا کرلینے دو اسے چار دن بعد ہی ذلیل ہو کر واپس آجائے گا۔ اس کے باپ کا گھر تھوڑی ہے جو آرام سے پھیل کر بیٹھا رہے گا اور اسے آگے کھانا لا کر دے دیا جائے گا۔" بولتے بولتے انہوں نے صحن کے کئی چکر لگا ڈالے۔

اسے اب یہاں کبھی واپس نہیں آنا تھا۔ بیگ پیک کرتے ارادہ مصمم تھا اور اس مصمم ارادے نے ہی اسے وہاں سیٹ کر دیا تھا۔ اس کی زندگی محنت' محنت اور محنت سے عبارت تھی پڑھنا' جاب کرنا سب کچھ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کبھی کبھار شہناز بیگم سے فون پر بات ہو جاتی انہیں اپنے پاس بلانے کے لیے وہ پیسے اکٹھے کر رہا تھا' اسے نیشنلٹی مل گئی تھی اور انہیں اپنے پاس بلانا تھا' مگر اس سے انتہا درجے محبت کرنے والی شہناز بیگم اس کے پاس آنے سے پہلے اللہ کے پاس چلی گئی تھیں۔



اور پھر اسی طرح بہت سے دن گزر گئے تھے وہ بہت خوش تھی پیپرز کی تیاری کے لیے جتنا واویلا اس نے

مچایا تھا اتنے ہی پیپرز اچھے ہو گئے تھے۔ پیپرز کے بعد راوی چین ہی چین لکھتا' گھر کو سنوارنا' سجانا' انس کے آنے کا انتظار کرنا' خود کو سجانا سنوارنا' زندگی بہت خوب صورت تھی۔

"ارحمہ! ارحمہ! نہ جانے یہ لڑکی کیا کرتی رہتی ہے سارا سارا دن۔" خود سے کہتے انہوں نے اسے آواز دی تھی۔ انس کے کپڑے استری کرتے کرتے اسے ان کی آواز آئی تھی۔ استری بند کرتے وہ ان کے کمرے میں آ گئی۔ انس کے ابا مزاج کے ذرا تیز تھے' مگر اسے ان کی کوئی بات بری نہ لگا کرتی۔ اس شخص کی بے پایاں محبت نے اسے ہر چیز سے محبت کرنا سکھا دیا تھا وہ تو پھر اس کے ابا تھے۔ ان کی چائے کا ٹائم ہو گیا تھا ان کے لیے چائے بنا کر وہ بھی ان کے پاس بیٹھ گئی۔

ان دونوں باپ بیٹوں کے درمیان ہونے والی سرد مہری کو محسوس کرنے کے باوجود وہ اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھی نہ جانے وہ کیوں ایک دوسرے سے اکھڑے اکھڑے رہا کرتے ایک ہی کمرے میں بیٹھتے ان کے درمیان نہ ہونے کے برابر گفتگو ہوتی۔ اس نے بہت کم ان دونوں کو ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے دیکھا تھا۔

"انس سے کہنا میری دوا لے آئے ختم ہونے والی ہے اور ہاں کھانسی کی دوائی بھی منگوانا' دو تین دن سے بہت کھانسی ہو رہی ہے مجھے۔"

"جی اچھا۔" کہہ کر ارحمہ نے پیسے ان کی جانب کھسکا دیے۔ ہر بار کی طرح اپنی کوئی بھی چیز منگوانے کے لیے انہوں نے پیسے آگے رکھے تھے جو اس نے خاموشی سے وہیں رہنے دیے تھے۔ عجیب فارمیلٹی تھی۔ اسے ان دونوں کا رویہ بڑا عجیب لگتا۔ اس کا دل ویسے ہی آج بہت اداس تھا وہ بہت خاموش خاموش سی تھی۔

ایک ہفتہ پہلے اس نے سعد شیرازی کو ٹھیک ٹھاک چھوڑا تھا اور دوسرے دن ان کا انتقال ہو گیا تھا وہ سعد شیرازی جو کبھی سر درد میں بھی مبتلا نہ ہوئے تھے ہارٹ اٹیک سے جانبر نہ ہو سکے تھے اسے یقین ہی نہ آتا۔ ابا شاید اس کے اپنے گھر کا ہونے کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ابھی تو اس کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہ اتری تھی اور وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس نے اسے ہر طرح سے سہارا دیا تھا اور ابا کا فیصلہ جو اسے پہلے بھی عزیز تھا اب دل و جاں سے پیارا ہو گیا تھا۔

"کیا ہوا ارحمہ؟ کیا ابا بہت یاد آ رہے ہیں؟" وہ کچن میں نہ جانے کیا کرنے آئی تھی اور وہیں کھڑی کتنی دیر روتی رہی تھی اس کی ہچکیوں کی آواز سے ہی رحمان اللہ کچن میں آئے تھے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بہت محبت کرتے تھے تم سے۔" ان کا سوال کس قدر عجیب تھا ایک باپ اولاد سے محبت ہی کر سکتا ہے۔

"امی کی وفات بہت پہلے ہو گئی تھی ابا نے تن تنہا ہم دونوں کو پالا' مگر کبھی احساس تک نہیں ہونے دیا کہ وہ ہمارا خیال رکھتے رکھتے خود کو بھول گئے ہیں۔" اس کے آنسو گر رہے تھے اس محبت کا کوئی نعم البدل نہیں تھا جو اس سے چھن گئی تھی۔ آگے بڑھ کر انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس دن کے بعد سے ان دونوں کی جیسے نئے سرے سے واقفیت ہوئی تھی وہ انہیں اخبار پڑھ کر سناتی' ان سے گھر کی روٹین ڈسکس کرتی وہ زیادہ تر سنا کرتے۔ اس کا رزلٹ آ گیا تھا اگرچہ میڈیکل میں جانے کے لیے نمبر کم تھے' مگر وہ خوش تھی نمبر بہرحال اچھے تھے۔ اس نے کالج میں بی ایس سی آنرز میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔



ڈینیل کے ساتھ لندن کے مہنگے ترین شاپنگ مال میں گھومتے اور وہاں سے اپنے لیے چیزیں خریدتے وہ کتنی خوش تھی خوشی اس کے انگ انگ سے عیاں تھی۔ "بانڈ اسٹریٹ" سے شاپنگ کرنا اس کا خواب تھا جس کے پورا ہونے کا اسے کبھی یقین نہیں تھا' لیکن پورا ہو رہا تھا۔ ڈولی گبانا' چینل بربری جن کا نام اس نے صرف ٹی وی پر دیکھا تھا آج وہ انہیں خرید رہی تھی۔ "مے فیئر" میں گھومتے وہ سب بھولنے لگی تھی۔ "دی پکاڈلی فاؤنٹن" میں بک ان کا سویٹ اور

ڈینیل کا ساتھ 'دن رات کیسے گزر رہے تھے 'سرخوشی' مستی میں رقصاں اس کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی خوشی کی مدت بہت کم ہے۔

"تو تم ہو ساناں۔" اپنے سامنے کھڑی عورت کو اس نے نہیں پہچانا تھا' مگر وہ اسے اس کا نام لے کر مخاطب کر رہی تھی۔ ڈینیل اسے دیکھتے ہی بیڈ سے اچھل کر ایسے کھڑا ہوا تھا جیسے اسے بچھو نے ڈنگ لیا ہو۔ دروازہ کھولنے والی ساناں ہی تھی۔ اسے پیچھے دھکیلتے وہ اندر آچکی تھی۔

"تو یہ ہے تمہاری بزنس ڈیل جس کے لیے تم اپنے بیوی بچوں کو دھوکا دے رہے ہو۔" ڈینیل کی حالت غیر تھی اور وہ بار بار کچھ کہنے کے لیے منہ کھول رہا تھا۔

'روزی میری بات سنو۔" اور ساناں کے سر پر جیسے چھت گر گئی تھی تو کیا روزی' ڈینیل کی بیوی تھی اس کے بچوں کی ماں' تو اس نے جھوٹ کیوں بولا تھا وہ اس کی گرل فرینڈ نہیں تھی جس کے ساتھ اس کا بریک اپ ہو چکا تھا۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو گئی تھیں۔

"میرے پیسوں پر عیش کرنے والے تھرڈ کلاس' گھٹیا شخص تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو کہ تم میری ناک کے نیچے یہ کھیل کھیلتے رہو گے اور روزی اس سب سے بے خبر رہے گی۔ میرے باپ کی کمائی حرام کی نہیں کہ تم اس واہیات عورت پر لٹاتے رہو۔ مجھے سب معلوم ہے وہاں اس کے ساتھ گھومنا اور پھرنا لیکن..... باہر میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں لاؤنج میں بیس منٹ کے بعد اس عورت کو دفع کر کے میرے ساتھ چلو۔" اس کے دبنگ لہجے اور انداز نے ڈینیل کی قوت گویائی چھین لی تھی۔ وہ صرف اسے دیکھ رہا تھا۔

"اور ہاں تم....." اس نے اس کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "اگر تمہیں دوبارہ اس کے آس پاس دیکھا تو تمہارا وہ حشر کروں گی کہ تمہاری سات پشتیں یاد رکھیں گی۔ اس کو صرف دھمکی نہ سمجھنا۔ تم نے جو سمیٹنا تھا سمیٹ چکی اب عیش کرو۔" اور گنگ تو وہ بھی تھی ذلت' پستی کی انتہا تھی جو اس نے محسوس کی تھی۔ اپنے قدموں پر کھڑا ہونا اور کھڑے رہنا اس سے مشکل ہو گیا تھا۔

نوکری چھوڑ دینے کے بعد ڈینیل کے دیے گئے فلیٹ میں رہنے والی ساناں کیا پھر اسی جگہ واپس جانے والی تھی اپنے ماں باپ کے دہکائے گئے جہنم میں۔ اس نے جھرجھری لے کر خود کو کمپوز کیا۔

"نہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" خود سے عہد کرتے وہ کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ اس نے ڈینیل کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور اب اتنی آسانی سے "نہیں کبھی نہیں" اس نے زیر لب دہرایا تھا۔ ڈینیل ابھی ابھی سویٹ سے گیا تھا۔

"یہ عورت مجھے اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔ بزنس کو پھیلانے میں ساری بھاگ دوڑ میں نے کی ہے تم فکر نہ کرو سویٹ ہارٹ۔" اپنے ساتھ لگاتے اس نے اسے تسلی دی تھی۔ نوکری چھوڑ دینے کے بعد اس کے پاس ڈینیل کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

"روزی جیسی عورت کو ڈینیل جیسے شخص کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے نفرت سے پھنکارتے سوچا تھا۔ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں اس کا فیصلہ وقت کے علاوہ کون کر سکتا ہے۔



"یار کبھی تو شکل دکھا دیا کرو تم تو عید کا چاند ہی ہو گئے ہو۔ ہم تو پھر بھی کبھی کبھار مل لیتے ہیں پر تم....." فیضان کی آواز پر اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ پڑھائی ختم ہونے کے بعد سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ فیضان کمپیوٹر سافٹ ویئر فرم سے وابستہ ہو گیا تھا۔ راحیل واپس پاکستان جا چکا تھا اور فہد دوسرے شہر میں یونیورسٹی ہی میں پڑھا رہا تھا۔ چاروں کی ملاقات دو سال پہلے ہوئی تھی جب راحیل جا رہا تھا تو سب ہی اس سے ملنے آئے تھے۔ اس کے بعد اس کی ملاقات صرف فہد سے ہوئی تھی۔

"ہاں یار تم سناؤ کیا حال ہے کیا کر رہے ہو آج

کل؟"

"کرنا کیا ہے وہی کام اور وہی آفس سب ویسے ہی چل رہا ہے کوئی تبدیلی نہیں۔ تم سناؤ علی کیسا ہے اب تو بڑا ہو گیا ہو گا۔"

"ہوں ٹھیک ہے اسکول جاتا ہے۔" فیضان تو دو چار ملاقاتیں کر کے چلا گیا تھا، لیکن اسے ایک بار پھر ماضی میں لا پٹخا تھا۔

یونیورسٹی میں لیکچرر شپ اس کا خواب تھا جو پورا ہو گیا تھا، مگر اس بلا کا کیا کرتا جو پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ اس نے اس کا سانس لینا دو بھر کر دیا تھا وہ اپنے کمرے میں ہوتا یا لیکچر کے دوران وہ اسے زچ کر دیتی۔ اس کے کوریڈور میں کھڑے اس کا انتظار کرنا پھر اسے لیکچر روم تک چھوڑ کر آنا، اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہنا، وہ صحیح معنوں میں تپا ہوا تھا۔ پہلے پہل اس نے اسے نظرانداز کیا تھا، نظرانداز کرنے کے بعد ایک وقت ایسا آیا تھا جب وہ اسے کلاس میں جھاڑتے اس کے پرخچے اڑایا کرتا۔ راستے میں کھڑے ہونے پر اس نے اسے خوب جھاڑ پلوائی تھی ایک دو دن تک رہنے والا سکون تیسرے دن پھر سے اس کے موجود ہونے سے عارضی ثابت ہوا تھا۔

"اگر کوئی اور شخص ہوتا تو اب تک گھٹنے ٹیک چکا ہوتا میرے سامنے، مگر تم... کیا ہو تم ایسے کیوں کر رہے ہو۔" اس کے کمرے کا دروازہ دھاڑ سے کھول کر اندر آنے والی ہستی نے اسے سر سے پیر تک سلگا دیا تھا۔ وہ خطرناک حد تک حسین تھی اور اس کی کہی بات سو سے بھی دو سو فیصد تک درست تھی۔

"میں نے بہت برداشت کر لیا اگر تم نے خود کو چینج نہ کیا تو میں تمہاری شکایت کروں گا۔" اس کی پیشانی پر ابھرنے والے ننھے قطرے اس کے غصے کی انتہا کو ظاہر کر رہے تھے۔ ہاتھ میں پکڑا پین اس نے ایک دم ٹیبل پر پٹخ دیا۔

"ایک تم سمجھتے کیوں نہیں۔" وہ جیسے بے بس سی کھڑی تھی۔ اپنا نام اس بے تکلفی سے اس سے سنتے اس نے ایک خشمگیں نگاہ اس پر ڈالی اور بنا بولے رخ موڑ کر باہر سڑک پر دیکھنے لگا۔

"اگر تم صرف ایک بار میری بات سن لو تو میں سب چھوڑ دوں گی۔ ویسے بھی میں یہاں کی باقاعدہ اسٹوڈنٹ نہیں ہوں ڈیڑھ مہینے تک میرا کورس مکمل ہونے والا ہے۔ اس کے بعد مجھے یہاں سے جانا ہی ہے۔"

"ہاں بولو کیا کہنا چاہتی ہو تم۔" اب وہ مڑ کے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ انگلیاں مروڑتی رہی۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے پرہیز کر رہی تھی۔

"میں منتظر ہوں۔ بولو کیا کہنا چاہتی ہو۔ میری اگلی کلاس ہے اور میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ خود کو مکمل بدل کے۔ جیسی تم چاہو ویسی بن کے رہنا چاہتی ہوں۔ محبت میں بہت طاقت ہوتی ہے اور میں اس طاقت ور جذبے کے آگے ہار گئی ہوں خود کو بھول گئی ہوں۔" بولنے کے بعد وہ تیزی سے کمرے سے نکلتی چلی گئی تھی اور وہ سن سا وہیں کھڑا تھا۔ اس کے بعد اس کا رویہ کچھ اور بھی سخت ہو گیا تھا۔ اس کے لیے جیسے وہ ارد گرد موجود ہی نہیں تھی، مگر اس دن اسی کی کلاس میں بے ہوش ہونے والی لڑکی سے وہ لاتعلق نہیں رہ سکا تھا۔ یونیورسٹی ڈاکٹر کو کال کرتے اسے ریسٹ روم میں منتقل کرتے وہ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

"کمزوری زیادہ ہونے کے باعث ایسا ہوا ہے شاید آج کل یہ بہت ڈائٹنگ کر رہی ہے۔" ڈاکٹر اسے کھانے پینے کی تاکید کرتے وہاں سے جا چکا تھا۔ اسے کلاس ختم کرنی پڑی تھی، بہت سے اسٹوڈنٹس بھی اس کا حال پوچھ کر ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔

"اٹھو! اب جاؤ جا کر ریسٹ کرو اور اپنے کھانے پینے کا خیال کرو تاکہ ٹھیک ہو جاؤ جلدی سے۔"

"ایک تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" اس کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"کیا تمہیں میرے رویے سے جواب کا علم نہیں ہوا۔" اس نے قصداً" خود کو تلخ ہونے سے روکا تھا۔

"ہاں چل گیا پتا اسی لیے تو... زندگی ہم جیسے لوگوں سے ہی مذاق کیوں کرتی ہے کیوں خدا اس دنیا میں بھیج

دیتا ہے ہمیں جب ہماری کسی کو ضرورت ہی نہیں ہوتی ہم جیسے لوگوں کو زندہ رہنے کا حق بھی نہیں ہونا چاہیے۔" آہستگی سے کہتی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی وہ ابھی تک اس کے پاس کھڑا تھا۔

اس کے باپ نے کبھی ٹک کر کوئی جاب نہیں کی تھی۔ بار بار نوکری بدلنا شاید اس کا مشغلہ تھا۔ کبھی اس کی لڑائی ہو جاتی کبھی اس کا کیا گیا کام دوسروں کو پسند نہیں آتا تھا اور اس کی ماں اس کے باپ سے لڑتی رہتی۔ اس کی ماں زبان چلایا کرتی اور پھر اس کا باپ۔ نہ جانے دونوں میں سے کون ٹھیک تھا۔

"ذلیل عورت تم کام کر کے کون سا مجھ پر احسان کرتی ہو تم ہو کیا اور تمہاری اوقات کیا ہے۔ گاؤں کے ایک گھٹیا گھرانے سے تعلق رکھنے والی منحوس عورت اگر میں تم سے شادی نہ کرتا تو ابھی تک تم وہیں مٹر اور اسٹابری توڑتے ذلیل ہو رہی ہوتی۔ سورج کی بدولت تمہارا چہرہ اتنا سیاہ اور بھیانک ہو چکا ہوتا کہ تم خود بھی آئینہ دیکھنے سے پہلے سو بار سوچتی۔" اس کے اسکول کے لیے نکلنے تک اس کے ماں باپ کا یہ تماشا بعد تک جاری رہتا تھا۔ اس کی ماں دیہاتی پس منظر سے تعلق رکھنے والی خوب صورت عورت تھی۔ واجبی تعلیم اس کی خامی تھی جسے اس کی انتہا درجے کی خوب صورتی نے چھپالیا تھا۔ اپنی زندگی کے ابتدائی کچھ سال اس نے ان باتوں کو ڈرتے ڈرتے سنا تھا اور اب سب کچھ اس کے لیے معمول کی بات تھی۔ اب تو وہ ان کی اس قدر عادی ہو گئی تھی کہ اگر اسے یہ سب باتیں سنائی نہ دیتیں تو اسے بے سکونی ہونے لگتی۔ اس کے ماں باپ ابھی تک ایک دوسرے کے ساتھ کیوں تھے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ انہیں تو بہت پہلے الگ ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے یا الگ ہو جاتے اب اس کو اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا ہاں وہ ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس کی شخصیت گھر کے ماحول سے مسخ ہوئی تھی وہ سب کچھ برا سمجھتے خود بھی ویسی ہی تھی اپنی ماں جیسی خوب صورت' بدزبان اور اپنے باپ جیسی بداطوار۔ اس کی سہیلیاں ابھی تک اس کے ساتھ تھیں تو اس کی خوب صورتی کی بدولت' لیکن اب وہ بدلنا چاہتی تھی اس شخص نے اس پر نہ جانے کیا جادو کیا تھا کہ ہر چیز اس کے سامنے ہیچ ہو گئی تھی۔



اس دن کے بعد سے اسے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی وہ بھی تو اسی کی طرح کے حالات کا شکار رہی تھی۔ والدین کے رویے کس طرح اولاد کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں ان دونوں کی زندگیوں سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کی ساری کہانی اس نے بڑے غور سے سنی تھی کوئی بھی تبصرہ کیے بغیر اندر ہی اندر وہ اس کی پیچیدہ شخصیت کی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔ وہ یونیورسٹی سے جا چکی تھی اس کا کورس کمپلیٹ ہو گیا تھا' مگر اس کے پیچھے آنا اس نے ترک نہ کیا تھا۔ آخر کوئی کب تک لاتعلق رہ سکتا ہے۔ کہتے ہیں پتھر پر بھی قطرہ قطرہ مسلسل گرتا رہے تو اس میں بھی چھید ہو جاتا ہے وہ تو پھر انسان تھا وہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ سر پر اسکارف لیے پورے کپڑوں میں ملبوس اس نے خود کو سر سے پیر تک بدل لیا تھا اور پھر اس نے اس کی محبت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔

ثانیہ کے نئے نام کے ساتھ وہ اس کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ ان سب نے اس کی شادی میں شرکت کی تھی ثانیہ کی طرف سے کوئی بھی شادی میں شریک نہ ہوا تھا شاید وہ کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ خوش تھا شاید پہلی بار خوش ہو رہا تھا۔ فہد گھر پورا کا پورا اس کے حوالے کر کے کہیں اور منتقل ہو گیا تھا۔ سرخ عروسی گاؤن میں وہ شاید کوئی اپسرا تھی جو راستہ بھٹک کر یہاں آگئی تھی۔ آخر اس نے اس شخص کو پالیا تھا جسے ہر پل اپنے ساتھ محسوس کیا تھا وہ ہواؤں میں نہ اڑتی تو اور کیا کرتی۔ پھولوں سے سجے کمرے میں اس نے ایک لمبا سانس کھینچا پھولوں کی خوشبو اس کے رگ و پے میں اترنے لگی تھی۔ محبت جیت جاتی ہے۔ اور اس لڑکی کی محبت بھی جیت گئی

تھی۔ اس کی مرمریں گردن سے خوب صورت نیکلس علیحدہ کرتے وہ عین اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ ان دونوں کی خوب صورتی کو دیکھتے آئینہ جیسے وہیں جم گیا تھا۔ وقت نے ثابت کردیا تھا کہ اس کا فیصلہ کتنا غلط تھا۔



کسلمندی سے لیٹے لیٹے اس نے کمرے پر طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ ثانیہ کہیں نہیں تھی' باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"شاید چائے یا کافی بنانے نیچے گئی ہوگی۔" خود سے کہتے اس نے گاؤن کی ڈوریاں کسیں اور سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ دو بیڈ روم اوپر کی منزل پر اور کچن اور لیونگ روم گراؤنڈ فلور پر تھا۔

"لو آگئے حضرت جنہوں نے مجھے کئی ماہ تک اپنے پیچھے خوار کیا ہے۔" اس کی فرینڈز اس کے سامنے بیٹھی تھیں۔ اپنی نوبیاہتا دلہن کو دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ انتہائی مختصر ٹاپ اور اسکرٹ کے ساتھ وہ عین اس کے سامنے تھی۔ "ہاں تو لوسی آج میں شرط جیت گئی' تمہارا ہی کہنا تھا نا کہ ہر شخص ایک جیسا نہیں ہوتا' دیکھ لو آج میں نے ثابت کردیا کہ ہر شخص ایک جیسا ہی ہوتا ہے بس اس کو قابو کرنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔" وہ وہیں پتھر کا ہوچکا تھا۔ اب وہ اس کے عین سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ "تو مسٹر ایبک تم نے گھٹنے ٹیک دیے۔ بس تمہیں بیڈ تک لانے کے لیے....." خون چوسنے والی ڈائن سرخ ہونٹوں کے ساتھ اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ان دونوں کی ہنسی کو اس نے اپنی دائیں جانب سنا تھا۔

"تم ڈیشنگ ہو' مگر مجھ جیسی خوب صورت لڑکی کسی کے لیے یوں پاگل ہوسکتی ہے بھلا جسے میں استعمال کرتی رہی۔" حد سے زیادہ نرگسیت کا شکار سیانال مکروہ چہرے کے ساتھ اس کے بالکل قریب تھی۔

"دفع ہوجاؤ یہاں سے" ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کرتے اس نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ جسے وہ خواب سمجھ رہا تھا وہ خواب نہیں تھا ہوش میں آتے اس پر جیسے جنون طاری ہوگیا تھا شاید وہ پاگل ہوچکا تھا یا پاگل ہونے والا تھا۔ "دفع ہوجاؤ اس سے پہلے کہ میں تمہیں قتل کردوں۔"

دروازے سے باہر دھکا دیتے اس نے ان دونوں کو بھی باہر دھکیل دیا۔ کمرے کی ہر چیز اس پر ہنس رہی تھی اس کا مذاق اڑا رہی تھی ہر ایک کی آنکھیں نکل آئی تھیں۔ وہ ڈھاریں مار مار کر رونے لگا اس کی آواز درودیوار کو ہلا رہی تھی وہ خود اپنے جنازے پر رو رہا تھا ماتم کررہا تھا میت اٹھائی جاچکی تھی اور وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھا۔ اسے لگا وہ چھوٹا سا بچہ بن گیا ہو وہ مرا نہیں تھا زندہ تھا اور اسے سب کچھ دیکھنے اور سہنے کے لیے زندہ ہی رہنا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچتے وہ جیسے ہوش سے بے گانہ ہوگیا تھا۔ اسے لگا وہ اپنی محرومیوں کے ساتھ ساتھ اپنی ماں کی تکلیفوں کا بھی ماتم کررہا ہے۔ وہ ماں جو اس کو دیکھنے کی آس میں منوں مٹی تلے جا سوئی تھی۔

پھر اس نے اپنے سب دوستوں سے قطع تعلق کرلیا۔ دوست اس کو فون کر کر کے تھک گئے تھے تنگ آکر اس نے نمبر بدل لیا' گھر بدل لیا' اس گھر سے وابستہ یادیں اسے سنگ سار کرتیں' وہ خود کو ملامت کرتا رہتا' جاب سے پہلے ہی چھٹی لی ہوئی تھی' ہاں وہ بھاگ جانا چاہتا تھا کسی ایسی جگہ جہاں وہ خود کو بھی پہچان نہ سکے' مگر اس روئے زمین پر ایسی جگہ کہیں بھی نہیں تھی۔ خود کو ختم کرنے کا بھی اس میں حوصلہ نہ تھا ہاں وہ اتنا بزدل نہیں تھا۔

"یار ایبک کہاں ہو آج کل' فون کر کر کے تھک گئے ہم تو۔ پہلے ہم سمجھے تھے شاید ہنی مون پر گئے ہوگے پر یار بندہ فون ہی اٹینڈ کرلیتا ہے۔" چھٹیوں کے بعد یونیورسٹی میں اس کا پہلا دن تھا اور فہد آن وارد ہوا تھا وہ واقعی پریشان ہوگیا تھا۔

"ہنی مون۔" اس کا حلق تک کڑوا ہوگیا۔

"کیا ثانیہ بھابھی سے لڑائی ہوئی ہے۔" اس کی

بڑھی شیو' آنکھوں کے نیچے پڑے حلقے اور ملگجی شرٹ اس کی ذہنی حالت عیاں کر رہی تھی۔

"اس عورت کو میں طلاق دے چکا ہوں اور اب اس کا ذکر بھی سننا پسند نہیں کروں گا۔" اس کے سامنے بیٹھا اس کا جگری یار اس کا مخلص دوست جو اس کی بہت سی صبحوں اور شاموں میں اس کے ساتھ رہا تھا' مگر کیا وہ یہ ذلت آمیز' رسوائی بھری داستان اسے سنا سکتا تھا۔

"نہیں۔"

"خود اپنے ہی ہاتھوں خود کو ذلیل کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔" چیئر پر پیچھے ہو کے بیٹھتے اس نے فیصلہ کیا تھا۔

"میری کلاس ہے میں جا رہا ہوں۔" اتنی بے مروتی تو اس نے کبھی نہیں کی تھی وہ آہستگی سے اٹھا اس سے پہلے کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

گھر چینج کرنے کے بعد اس نے یونیورسٹی سے بھی ٹرانسفر کروا لیا تھا۔ اس جگہ سے جڑی یادیں اتنی تلخ تھیں کہ اسے کسی پل سکون نہ لینے دیتی تھیں دو دن کے بعد اسے دوسری یونیورسٹی میں پہلا لیکچر دینا تھا۔ اس جگہ سے اپنی ساری چیزیں سمیٹتے وہ گھر آ گیا۔ پچھلے کئی دنوں سے ایک ٹاپک پر لکھنا اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ آج لکھنے کے ارادے سے بیٹھتے پھر سے اس کے سارے لفظ کہیں کھو گئے تھے۔ کئی گھنٹے ایک ہی جگہ پر بیٹھے وہ ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں لکھ پایا تھا۔ کاغذ گول مول کرتے اس نے بیل کی آواز سنی تھی۔

"اس جگہ کون آ سکتا ہے اس کے دوستوں میں سے کوئی بھی اس گھر سے واقف نہیں تھا۔"

"تم یہاں کیوں آئی ہو۔" دروازہ کھولنے پر سامنے کھڑی ہستی کو دیکھتے اس کا دماغ آؤٹ ہو گیا تھا۔ دروازے میں جم کر کھڑا وہ اسے نفرت و حقارت سے گھورتا رہا۔

"تمہاری یونیورسٹی سے تمہارا ایڈریس لیا ہے اور تمہاری عطا کردہ سوغات تمہیں لوٹانے آئی ہوں۔" اس نے کمبل میں لپٹا وجود اس کی جانب بڑھا دیا۔ اسے جیسے کالے ناگ نے سر راہ کاٹ لیا تھا اچھل کر پیچھے ہوتے اس کے منہ سے مغلظات کا ایک طوفان برآمد ہوا تھا۔

"بکواس بند کرو اسے اٹھاؤ اور یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ اس گناہ کی پوٹ کو....." اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ اسے اتنی گالیاں دے کہ کوئی تشنگی باقی نہ رہے۔

"اگر گناہ کی پوٹ ہوتی تو تمہارے پاس لے کر کبھی نہ آتی۔ اس بیگ کے اندر اس کی ساری رپورٹس پڑی ہیں یقین نہیں تو کھول کر دیکھ لو یا ڈی این اے....." اس کے نیچے اترتے تک وہ سڑک پار کر کے جا چکی تھی۔ اسے آوازیں دیتے اس نے اس کے پیچھے بھاگنے کی بھی کوشش کی تھی' مگر وہ اس سے پہلے ہی جا چکی تھی۔ بچے کے چلتے ہاتھوں سے کمبل اتر گیا تھا۔ کالے گھور بال اور بالکل اس جیسی آنکھیں وہ جیسے خود کو دیکھ رہا تھا۔ نفرت سے سکڑتی آنکھوں کو سکیڑ کر اس نے اندر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دروازہ بند کرتے وہ کتنی دیر ادھر وہیں کھڑا رہا' مگر زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکا تھا۔ باہر سے آنے والی آواز نے اسے دروازہ کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ منہ پھاڑ کر رو رہا تھا۔ اسے وہاں سے اٹھاتے اندر لاتے وہ جیسے میکانکی انداز میں سب کر رہا تھا۔ صوفے پر ایک طرف اسے رکھتے وہ کتنی دیر اس کے سر پر کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا۔ نفرت کا احساس جیسے ہر جذبے پر حاوی ہو گیا تھا۔ سامنے صوفے پر بیٹھتے وہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔

"اسے کسی یتیم خانے میں جمع کروا دینا چاہیے۔" اسے اٹھاتے' گاڑی میں رکھتے' سوچتے گاڑی اس نے ایک یتیم خانے کے سامنے روکی اسے اٹھایا بچہ پھر سے رونے لگا تھا۔ دروازہ کھولتے باہر نکلتے اس کے قدم جیسے آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئے تھے۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اس کا سرخ چہرہ تپ رہا تھا۔ "شاید اسے بخار ہے۔" اس کا ماتھا چھوتے جیسے اس نے آگ کو چھو لیا تھا۔ "اسے ڈاکٹر کے پاس

لے کر جانا تھا۔" گاڑی کلینک کی جانب موڑتے اس نے اپنے فیصلے کو کچھ دیر کے لیے موقوف کر دیا تھا۔

"اوہ بچہ نمونیہ کا شکار ہے اور اسے یرقان بھی ہے کیا اسے پیدا ہونے کے بعد بلیو لائٹ میں رکھا گیا ہے؟" ڈاکٹر اس سے پوچھ رہی تھی اس نے بیگ سے نکالا اس کا سارا ریکارڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔ ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ اس نے خود بھی وہ سارا کچھ پڑھا تھا اس کا قد' وزن' سر کا سائز اس کا ڈی این۔ اے' ناجانے اسے کیا ہوا تھا اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کا اسے خود بھی علم نہیں تھا وہ رو کیوں رہا تھا۔

سویڈن آنے کے بعد اس کا بھی مکمل چیک اپ ہوا تھا بلکہ یہاں آنے سے پہلے بھی آنسو لڑی در لڑی گر رہے تھے۔ بچے کو بازوؤں میں لے کر چومتے شاید وہ اپنے آپ میں نہیں تھا اسے جینے کا بہانہ مل گیا تھا.... اس کے جگر کا ٹکڑا.... علی



ابر آلود موسم نے ہر طرف اندھیرا کر رکھا تھا نہ بارش ہوتی نہ ہی موسم کا یہ عجیب پن دور ہوتا اسے بخار ہو رہا تھا نزلے نے سانس لینا دوبھر کر دیا تھا تو اس نے کالج سے چھٹی کر لی تھی۔

"اگر ایک دن کالج نہ جاؤ تو کوئی حرج نہیں ہو گا۔ آرام کرو آج سارا دن' خبردار جو پاؤں بھی نیچے اتارا تو۔" اس کی محبت آمیز دھمکی پر اس نے تکیے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھتے بال بنا رہا تھا۔

"چائے اور ناشتا' تمہارا ناشتا ادھر سائیڈ پر رکھا ہے اٹھ کر ناشتا کرو' دوا لو اور سو جاؤ' ابا کو بھی ناشتا بنا کر دے دیا ہے میں جلدی آجاؤ گا آج تو آکر سالن بنا لوں گا۔"

اس نے اس شخص کو دیکھا جو رگ جاں بن گیا تھا اس قدر چاہنے والا شخص اس کی قسمت میں لکھا تھا وہ کیوں۔ شکر ادا نہ کرتی۔ گرے پینٹ' وائٹ شرٹ میں اس کا دراز قد کچھ اور بھی نمایاں ہو رہا تھا "لگتا ہے کل بھی سردی لگی ہے تمہیں' کہا بھی تھا بڑا سوئیٹر پہن کر جاؤ مگر نہ جی کہاں سنتی ہیں میری زوجہ محترمہ" اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے اس نے اس کے بکھرے بال سنوارے تھے۔ "ریسٹ کرنا میں آجاتا ہوں تھوڑی دیر تک" ایک اور بار تلقین کرتے وہ باہر نکل گیا۔

گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سے گاڑی کے دور ہونے تک کی آواز پر اس کے کان باہر ہی لگے رہے تھے۔ آج وہ اسے باہر رخصت کرنے نہیں گئی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ اسی طرح لیٹی رہی اس کی جلتی پیشانی پر ابھی تک اس کا لمس تازہ تھا۔ اس کے جانے کے بعد عجیب بے چینی تھی جس نے اسے گھیر لیا تھا اس نے اسے اپنی طبیعت کی خرابی پر محمول کیا تھا۔ اٹھ کر بیٹھتے ٹانگیں نیچے لٹکاتے اس نے صرف چائے پی تھی کچھ بھی کھانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ پھر وہیں بیٹھے بیٹھے بھی اسے ناجانے کتنا وقت گزر گیا تھا کہ اچانک دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز آئی۔ باہر دروازہ دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔

"ناجانے کون ہے" اس کا دل گھبرانے لگا۔

"یا اللہ خیر۔" ابا اس سے پہلے دروازہ کھول چکے تھے۔

"انس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ٹرک بے قابو ہو کر گاڑی پر چڑھ گیا ناجانے ڈرائیور نے نشہ کر رکھا تھا۔ دوسرا سانس لینے کی نوبت نہیں آئی۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔" شاید کوئی محلے دار تھا۔ وہ ان ہی قدموں پر نیچے آرہی تھی۔ عالم بے ہوشی میں جانے سے پہلے اس نے دروازے سے اندر لایا جانے والا جواں لاشہ دیکھا تھا اور پھر ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گئی تھی۔

جلدی کا کہہ کر جانے والا انس بہت جلدی واپس آگیا تھا۔

"انس تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ تم تو مجھ سے ناراض نہیں تھے ناں تو پھر۔ بیٹے قطب آجاؤ دیکھو یہاں آکر کیا ہو گیا ہے یہاں دیکھو تمہارا چھوٹا بھائی ہمیں چھوڑ کر جا رہا ہے۔" کھچڑی بالوں والا بوڑھا آہ و

لفغاں کر رہا تھا وہ کہاں تھی اور کس کی آواز آرہی تھی لغلب کون تھا جسے پکارا جارہا تھا۔ اس نے عجب بیگانگی سے چاروں طرف دیکھا صحن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی ثمن آپا رو رہی تھیں سب ہی تو جمع تھے مگر جمع کیوں تھے اسے اپنے کسی سوال کا جواب نہ ملتا تھا۔

"آج انس کو جلدی آجانا ہے۔" خود سے باتیں کرتے وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ کچھ مہینوں کی بیاہی دلہن اجڑ گئی تھی۔

"ثمن اسے پانی پلاؤ' رلانے کی کوشش کرو۔" ثمن کی ساس نے ثمن کے کان میں کہا تھا اس نے ان کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ ثمن نے اسے لاکر انس کے سامنے بٹھا دیا۔ سفید کفن میں لپٹا شخص اٹھتا کیوں نہیں تھا۔ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کا لمس ابھی تک زندہ تھا۔ بے حسی اور پتھرائی آنکھوں سے وہاں بیٹھے اسے ناجانے کتنی دیر ہوگئی تھی۔ وہ اسے لے کر جارہے تھے اس سے دور کر رہے تھے۔

"جب تک تم مجھے دیکھتے رہتے ہو مجھ سے تمہاری طرف دیکھا نہیں جاتا۔"

"تو کیا آنکھیں بند کرکے تمہیں دیکھا کروں۔"

اس کا زندگی سے بھرپور قہقہہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ایک آنسو بے قابو ہو کر آنکھ سے باہر نکل آیا تھا اور پھر اس کی چیخوں نے آسمان کا سینہ بھی شق کردیا تھا۔ اس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ وہیں گر گئی تھی۔

آیا تھا ایک شخص میرے غم کو بانٹنے
رخصت ہوا تو اپنے بھی غم دے گیا مجھے

انس کے بعد ناجانے کتنے دن گزر گئے تھے اس نے تو حساب رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ گھر کے کسی کونے میں خاموش پڑی در و دیوار کو تکا کرتی۔ رحمان اللہ "دمے" کے مریض تھے ان کا دمہ انہیں سانس نہ لینے دیتا یا وہ خود سانس ہی نہ لینا چاہتے تھے۔ وہ خود کو بھول کر ان کی فکر میں مبتلا ہوگئی تھی۔ ثمن نے اس کو اپنے ساتھ لے جانے کی سرتوڑ کوشش کی تھی لیکن وہ انہیں اس حال میں اکیلا چھوڑ کر کیسے اس کے ساتھ چلی جاتی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی بیڈ کے پاس کھلی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی جہاں سے ہلکی دھوپ کھڑکی کے راستے اندر آرہی تھی صحن میں لگے درخت کے پتے ہوا سے ہل رہے تھے اور تنے پر بیٹھی ننھی چڑیا ادھر ادھر پھدک رہی تھی۔ ایک پل کو اسے اپنا آپ بھی اس چڑیا کی طرح لگا تھا۔ "بے یارو مددگار" تنہا' اداس' زندگی جیسے رک سی گئی تھی۔ کوئی امید کوئی آس نہیں تھی۔ ثمن آپا نے اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا مگر اس نے رحمان اللہ بیماری کی وجہ سے ساتھ جانے سے انکار کردیا تھا۔ اگر رحمان اللہ بیمار نہ ہوتے تو ناجانے وہ کتنی دیر تک اسی کیفیت کے زیر اثر رہتی مگر اب اسے ان کے لیے توانائیاں اکٹھی کرنا تھیں۔ پچھلے دو دن وہ اسپتال میں رہے تھے۔ ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ انہوں نے جینے کی امنگ کا دامن چھوڑ دیا ہے۔ وہ اب ہوش میں تھے مگر سارا سارا دن چھت کو تکا کرتے' ان کو کچھ کھلانے کے لیے بہت کوشش کرنا پڑتی۔ اس کی آنکھیں شفاف پانیوں سے بھر گئیں۔

ان دونوں کا غم ایک جیسا تھا۔ کبھی اسے لگتا وہ ایک بھیانک خواب دیکھ رہی ہے۔ آنکھ کھلنے پر پھر سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہوگا مگر سب کچھ خواب نہیں تھا۔ سارا دن وہ کمروں میں چکراتی رہتی رحمان اللہ مشکل سے سانس لیتے وہ ان کے پاس بیٹھی رہتی اپنے کمرے میں جانا تو اس کے لیے عذاب بن گیا تھا ہر طرف اس کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ دل کرتا اس جگہ سے دور بھاگ جائے مگر بہت بے چینی پر اسے سکون بھی یہیں ملتا تھا۔ ناجانے اسے کیا ہوگیا تھا۔ اس کی چیزوں کو ہاتھ لگاتے' محسوس کرتے وہ رونے لگتی تو روتی رہتی۔ اس کی کیفیات اس کے اپنے بس میں رہی کہاں تھیں۔

ان لمحوں کی یادیں سنبھال کر رکھنا
ہم یاد تو آئیں گے مگر لوٹ کر نہیں



وقت کا کام گزرنا ہے اور گزر ہی جاتا ہے اچھا ہویا برا' خوشی کا ہو یا غمی کا' ان کا وقت بھی آگے بڑھ گیا تھا رحمان اللہ کی طبیعت اس کی دل جمعی اور خدمت کی

بدولت اب بہتر تھی۔ ان دونوں کا ایک جیسا غم انہیں ایک دوسرے کے اور قریب لے آیا تھا انہیں وہ اپنی سگی بیٹی سے زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ اگر ان کی اپنی بیٹی بھی ہوتی تو شاید ان کی اتنی خدمت نہ کرتی۔ کئی مہینے اس نے جیسے ان کے ساتھ ساتھ سانس لینا بھی بند کر دیا تھا۔ کئی بار انہوں نے اسے روتے دیکھا تھا۔ ان کے سامنے وہ ہشاش بشاش ظاہر کرتی مگر اس کی آنکھوں کے نیچے پڑے حلقے اور اس کی زرد رنگت اس کی کیفیت عیاں کرتی تھی۔

"میں نے تو اپنی زندگی گزار لی۔ اب تو سامان باندھ کے بیٹھا ہوں نا جانے کب...... فکر ہے تو بس اس بچی کی۔ ابھی اس کی ساری زندگی پڑی ہے اتنی سی عمر اور ..... اچھا ہوا اس کا باپ پہلے ہی رخصت ہو گیا ورنہ اس اجڑی صورت کے ساتھ اس کو دیکھتا تو سکون سے مر بھی نہ پاتا۔" زندگی میں پہلی بار وہ خود کے علاوہ کسی اور کے لیے سوچ رہے تھے۔ کرسی پر خاموش بیٹھی زرد رو لڑکی نے ان کی طرف دیکھا اور انگلیاں چٹخانے لگی۔ جب بھی وہ ان کے پاس آتی ان کی سوچتی نظریں اس پر آن پر ٹھہر جاتیں۔

"میرے بعد اس کا کیا ہو گا۔" خود اپنے بہن بھائیوں سے تو انہیں کوئی توقع نہیں تھی ساری زندگی انہوں نے اپنے بچوں کو چھوڑ کر صرف ان ہی کا دم بھرا تھا اور آخر ان کی اصلیت بھی ان پر کھل گئی تھی۔ سب کے سب مطلبی اور خود غرض تھے۔ ان کے مرنے کے بعد سب سے پہلے وہ اسی کو نکال باہر کرتے۔

"قطب" اس کا نام ذہن میں آتے ایک ٹیس سی دل میں اٹھی تھی۔ انہوں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ غلطی پر نہیں تھا انہوں نے اسے ہی..... "کاش کہ وقت واپس آسکتا" لیکن نہیں آتا صرف پچھتاوے چھوڑ جاتا ہے ان کے لیے بھی چھوڑ گیا تھا۔ خود سے کی گئی اس کی بدتمیزی کا ان کو جو غصہ تھا وہ سارا کا سارا اس کے پکڑے جانے کے بعد اس پر نکل گیا تھا۔ "نا جانے آخری بار انہوں نے اسے کب دیکھا تھا۔" آنکھوں میں اترتی دھند نے ہر منظر کو دھندلا دیا تھا یہاں تک کہ ماضی کو بھی۔ وہ انہیں ایسا بھولا تھا کہ پلٹ کر کبھی خبر ہی نہ لی تھی "کیا ان کا جرم اس قدر سنگین تھا۔" انہیں خود سے اس سے رابطہ کرنا تھا اس کے مرنے پر انہوں نے اسے کس کس طرح نہ یاد کیا تھا اور اب اس کو دیکھنا ضروری ہو گیا تھا۔

"فہد" اکیڈمی کو سوچتے انہوں نے کل وہیں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اکیڈمی سے انہیں فہد کے گھر کا نمبر اور ایڈریس معلوم ہوا تھا۔ فہد کے والد سے اس کا سویڈن کا نمبر معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس دن وہ بہت خوش تھے۔ ارحمہ کو ان کی سرگرمیاں مشکوک سی لگا کرتیں سویڈن والے نمبر پر کال کر کے وہ تقریباً" مایوس ہو چکے تھے کہ ایک دن فون اٹینڈ کر لیا گیا تھا۔

"انکل اس کا نمبر تبدیل ہو گیا ہے میں ابھی تھوڑی دیر تک آپ کو سینڈ کرتا ہوں۔" اور وہ تھوڑی دیر دو دن پر محیط ہو گئی تھی۔ ہر دن وہ اس کے نمبر کی آس لے کر اٹھتے بیٹھتے کئی بار فون چیک کرتے اور SMS نہ پا کر نا امید ہو جاتے اور آخر اس دن انہیں نمبر مل ہی گیا تھا جیسے سارے جہان کی دولت ان کے ہاتھ میں دے دی گئی ہو۔ فہد کی باتیں انہیں رہ رہ کر یاد آتیں۔

"کچھ سال پہلے اس نے ایک سویڈش لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ شادی تو زیادہ عرصے نہ چل سکی لیکن اس کا ایک بیٹا ہے علی۔ ملاقات ہوتی رہتی ہے اس سے۔"

"کیسا ہو گا علی" ان کا پوتا۔" کتنا خوش کن تصور تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" آج کئی دنوں کے بعد اس کی ملاقات ثمن سے ہو رہی تھی نا جانے کیوں وہ اسے بہت پریشان لگی تھیں۔

"بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہونے والا ہے اس لیے زیادہ ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔"

"اچھا ٹھیک ہے ایسی بھی کیا افرا تفری' بیٹھ تو

جائیں۔" ارحمہ نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے تھوڑا مسکرا کے ان کی جانب دیکھا۔

"مسز انیس! وہی جو میری گھر کے برابر رہتی ہیں ان سے تمہارے رشتے کے سلسلے میں بات کی تھی میں نے کچھ عرصہ پہلے۔ کل آئی تھیں وہ میری طرف ان کی بہن کا سوتیلا بیٹا ہے۔ بیوی' بچے کی وفات پر بہت پریشان ہے' بچے کی پیدائش پر بیوی کا بھی انتقال ہو گیا تھا دو سال پہلے۔ اس کے لیے تمہارا ذکر کر رہی تھیں۔" انہیں اس کا جواب معلوم تھا لیکن اب بات کچھ مختلف تھی۔

"آپا! آپ جانتی ہیں کہ میں انس کی جگہ کسی کو نہیں دے سکتی اور پھر...." اس کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرایا تھا۔ ان کی جانب دیکھتے وہ ناجانے کیوں خفت کا شکار ہوئی تھی۔ وہ اس کے لیے ایسی ہی حساس تھیں جبکہ اس کا دل کچھ ایسا ماننے پر تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔

"ہاں میں جانتی ہوں کہ تم ایسا نہیں چاہتیں لیکن مجھے بتاؤ کہ اس کے علاوہ کیا حل ہے تمہارے پاس۔ میرے پاس تم رہ نہیں سکتیں' یہ گھر تمہارا مستقل ٹھکانا نہیں ہو سکتا اور اب تو ایک نیا مسئلہ بھی آن کھڑا ہوا ہے۔" وہ ساری تیزی اور سرخوشی جو تھوڑی دیر پہلے ان کے انداز سے جھلک رہی ہے اب اس کی جگہ افسردگی نے لے لی تھی۔

"کیسا مسئلہ۔" اس کے پوچھنے پر انہوں نے اس کی الجھن زدہ آنکھوں میں جھانکا۔

"ماموں مظفر کو تو تم جانتی ہو۔" مظفر ثمن کی ساس کے بھائی اور ابراہیم کے ماموں تھے اسی بدولت وہ بھی انہیں ماموں ہی کہا کرتی تھیں۔ انہوں نے رک کر اسے دیکھا۔ جو آگے سننے کی منتظر تھی "اماں (ساس) ان کے لیے تمہارا رشتہ مانگنے آنا چاہتی ہیں مجھ سے کئی بار جھڑپ ہو چکی ہے ان کی اسی لیے ابھی تک ادھر نہیں آئیں لیکن ان کو ان کے ارادوں سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا۔ وہ ادھر ضرور آئیں گی اور پھر میرے لیے زیادہ مشکل ہو جائے گی۔ شاید وہ مجھے تنگ کر کے تم پر اور ابا پر دباؤ بھی ڈالیں۔ اس لیے اس سے بہتر کوئی اور حل میرے پاس نہیں ہے۔ مسز انیس بہت اچھی پڑھی لکھی فیملی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک دوبار ان کی بہن سے ملی بھی ہوں میں۔" وہ دم سادھے حیران آنکھوں سمیت انہیں تک رہی تھی۔ مظفر ماموں ساٹھ کے نہیں تو پچپن کے تو ضرور ہوں گے ساری اولادوں کو بیاہنے کے بعد اب اکیلے رہ گئے تھے بیوی وفات پا چکی تھی۔ کوئی ایسا بھی سوچ سکتا ہے اسے حد درجہ حیرانی ہو رہی تھی۔

"ان سے شادی سے بہتر ہے میں خود ہاتھ پکڑ کر کسی کنویں میں دھکیل دوں تمہیں۔ عمر تو خیر ان کی ہے ہی اوپر سے بیماریاں کبھی بلڈ پریشر تو کبھی دمہ' لوگوں کو بھی شرم نہیں آتی اب ان کی مرضی کے بغیر تو اماں کچھ نہیں ناں کہہ رہیں۔ قبر میں ٹانگیں لٹکا کے بیٹھے ہیں پھر بھی شرم نہیں۔" ثمن بول رہی تھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی لیکن وہ خاموش تھی بالکل گنگ جیسے اس کی قوت گویائی سلب کر لی گئی ہو ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکل سکا تھا۔

اسے فیصلہ کرنا تھا۔ اور اب تو یہ ضروری ہو گیا تھا۔ اس کی بہن کی زندگی میں پہلے کیا کم مشکلیں تھیں کہ وہ کچھ اور کا اضافہ کر دیتی۔ اس کی ساس کو بہت اچھے سے جاننے کے بعد تو ایسا کرنا اور بھی ضروری تھا ورنہ وہ ثمن کی زندگی اجیرن کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتیں۔

٭ ٭ ٭

"بھائی صاحب مجھے یقین ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ اپنا گھر سمجھ کر آئی ہوں۔ خدا ترسی بڑے نصیب والوں کو نصیب ہوتی ہے۔" ثمن کی ساس بہت دنوں بعد آئی تھیں اور اکیلی تھیں ثمن ان کے ساتھ نہیں تھی۔ ان کی خدا ترسی کو وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ ان کی فلسفیانہ گفتگو اور ان کا مقصد بھی عیاں تھا۔ جس کو وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

"جی جی بہن جی۔ کیسی ہیں آپ' ثمن بیٹی نہیں آئی ٹھیک ہے وہ اور بچے' بچوں کا کیا حال ہے۔"

رحمان اللہ نے نا سمجھنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھا انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے وہ خود بھی ان کے سامنے بیٹھ گئے۔

"جی اللہ کا کرم ہے سب خیر خیریت ہے۔" ارحمہ کو چائے کا اشارہ کرتے وہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھے۔

"بیٹیاں اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ اللہ نے اس بدنصیب کے نصیب میں سکھ لکھا ہی کم تھا۔"

آج ان کی باتیں رحمان اللہ کو کچھ عجیب محسوس ہو رہی تھیں۔ کاٹ دار، چبھتی باتیں کرنا ویسے تو ان کی فطرت تھی لیکن آج ان کا انداز جدا تھا۔ رحمان اللہ کو ان کی باتیں ناگوار گزری تھیں اظہار چہرے کے تاثرات سے ہو رہا تھا لیکن نا جانے کیوں برملا اظہار نہیں کیا تھا چپ بیٹھے ان کو سن رہے تھے۔ ارحمہ کچن میں جا چکی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دینے لگی تھی۔ ایک دم ہی خاموشی طاری ہوئی تھی۔ انہوں نے بولنا بند کر دیا تھا۔

"بس آپ...." وہ تھوڑا رکیں۔

"ارحمہ مجھے دے دیں۔" وہ اب بھی نہیں سمجھے تھے۔ ثمن کا شوہر ابراہیم ان کا اکلوتا بیٹا تھا تو اب وہ ارحمہ کو کس کے لیے مانگ رہی تھیں۔

"آپ تو جانتے ہیں میرے بھائی مظفر کو، پچھلے سال بیوی کا انتقال ہوا تھا ابھی تک اس صدمے سے سنبھل نہیں سکا۔ اولادیں سب اپنے اپنے گھر والی ہیں۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے سوائے.... نہ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ کوئی اچھا برا کہنے والا۔ عیش کرے گی ہماری بیٹی۔" اندر آتے اس کے قدم وہیں جم گئے تھے۔ "بیٹی" کیسا میٹھا لہجہ تھا ان کا، اس لہجے میں بات کرتے اس نے انہیں آج تک نہیں سنا تھا مگر آج سن رہی تھی چائے کی ٹرے اس کے ہاتھ میں لرز اٹھا۔

"ابا۔" اس کے ہونٹوں نے رحمان اللہ کو پکارا تھا۔ اسے رحمان اللہ پر خود سے زیادہ یقین تھا۔ رحمان اللہ کی طرف سے مکمل خاموشی تھی وہ کچھ اندازہ نہیں کر پائی تھی۔

"آپ تو جانتے ہی ہیں ہمارے خاندان کو۔ اب ثمن کو ہی لے لیں کتنی خوش ہے۔ کسی قسم کی کمی نہیں ہے اسے، اسے بھی نہیں ہوگی۔" انہوں نے سیدھے ہوتے دوپٹا ٹھیک کیا۔ "بڑی آس لے کر آئی ہوں میں آپ کے پاس" پتا نہیں ابا کیا سوچ رہے تھے۔ "بیوہ عورت سے شادی تو ویسے بھی ثواب کا کام ہے۔"

"مجھے پتا ہے وہ راضی نہیں ہوتی شادی کے لیے۔ لیکن اگر آپ کہیں گے تو وہ کبھی انکار نہیں کرے گی۔" جیسے انہیں یقین ہی تو تھا کہ وہ اسے اس بات پر راضی کر لیں گے۔

"بہن جی۔" رحمان اللہ نے گلا صاف کیا۔ ان سمیت ارحمہ بھی ہمہ تن گوش ہوئی تھی۔

اس کی قسمت کا کیا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اسے ابا پر خود سے زیادہ بھروسا تھا لیکن.....

"آپ کا بہت شکریہ کہ آپ تشریف لائیں۔ میں تو آج آپ کی طرف آنے کا سوچ رہا تھا۔ ایک بہت اچھی خبر آپ کو جو سنانی تھی۔ ثمن اور آپ بھی بہت خوش ہوں گی یقیناً" "سن کے۔" انہوں نے ان کے ہونق چہرے کی طرف دیکھا اور ذرا سا گلا صاف کیا۔ کیا بات تھی جس کو کرنے کے لیے انہیں بار بار گلا صاف کرنا پڑ رہا تھا۔

"میرا بیٹا قطب شاید دیکھا ہوگا آپ نے اسے...." انہوں نے ذرا سا توقف کر کے ان کی جانب دیکھا جو ابھی تک بے تکے انداز میں ان ہی کو گھورے چلے جا رہی تھیں۔ "لیں میں بھی کیسا بھلکڑ ہوں۔ آپ نے بھلا کب دیکھا اسے۔ ہاں اب آئے گا تو ضرور ملواؤں گا آپ سے۔ خوش ہوگا آپ سے مل کے۔" انہوں نے مصنوعی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ "پاکستان آ رہا ہے کچھ عرصے بعد بس اسی کے ساتھ رخصت کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ بس دعا کیجیے گا اللہ دونوں کو خوش اور اپنی امان میں رکھے۔" اور باہر اس کے قدم مٹنے سے انکاری ہو گئے تھے۔ پہلے رحمان اللہ کے رشتہ داروں نے اسے سوچنے پر مجبور کیا تھا اس گھر سے اپنا

کھانا کہیں اور بنانے کے لیے پھر ثمن کی ساس نے اس فیصلے پر یقین کی مہر ثبت کی تھی اور اب۔۔۔

ان کے جانے کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوئی تو ابا اس سے مخاطب ہوئے۔

"بیٹا اسے کوئی بھی نام دے لو' باپ کی محبت' خود غرضی یا کچھ اور۔۔۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا' زندگی ہے کہ دغا کر رہی ہے سانسیں ہیں کہ اکھڑی جاتی ہیں۔ اگلا دن نصیب ہوگا یا نہیں ساری رات یہی سوچتے گزرتی ہے۔ فکر ہے تو تمہاری اور اس کی۔"

اسے سامنے بٹھا کر لمبی تمہید باندھتے ناجانے وہ کیا کہنے والے تھے ثمن کی ساس کے جانے کے بعد اس کی ان سے کوئی بات نہ ہو سکی تھی شاید وہ اسے اسی بارے میں کچھ بتانا چاہتے تھے۔ ناجانے انہوں نے اس کے لیے اتنا بڑا فیصلہ خود کیسے کر لیا تھا شاید حالات نے انہیں مجبور کر دیا تھا۔

"تم سے پوچھے بغیر بن جی سے ایسی بات کہہ بیٹھا ہوں اب سوچتا ہوں کہ تم سے پہلے بات کرنی چاہیے تھی۔" رحمان اللہ کو کئی بار خود پہ بھی حیرت ہوتی وہ بدلے بھی تھے تو زندگی کے کس موڑ پر جب وہ بالکل تنہا اور خالی ہاتھ رہ گئے تھے۔

"لیکن ابا آپ جانتے ہیں کہ میں ابھی۔۔۔" جھجک نے اسے چپ کرا دیا۔

"میں کالج جانا شروع کر دوں گی تو سب بہتر ہو جائے گا۔"

"کالج جانا ضرور شروع کرو لیکن ایسا کرنا اب بہت ضروری ہو گیا ہے۔" شاید وہ اس دن کی باتوں کو یاد کر رہے تھے۔ "بھائی صاحب یہ کب تک ادھر رہے گی اب آپ کے ساتھ بھلا اس کا کیا تعلق رہ گیا اپنے وارثوں کے پاس کیوں نہیں جاتی۔" ان کے بھائی رفیق کی باتیں اس نے دروازے کے پیچھے سے سن لی تھیں۔

"اگر قطب نہیں تو میں ثمن سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ ان لوگوں کو بلا لے۔" ثمن آپا نے شاید ان سے بھی رشتے کی بات کی تھی۔

"نہیں ابا ایسی بات نہیں ہے ابھی تو میرا غم ہرا ہے۔" اس کے آنسو بہنے لگے۔

"بس زندگی کا یقین نہیں رہا اسی لیے تمہارا کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے اس کے بہتے آنسوؤں کو کرب سے دیکھتے آنکھیں پھیریں۔

"جیسا آپ چاہیں۔" کہہ کر وہ تیزی سے اندر کی جانب چلی گئی ایک بار پہلے بھی وہ اسی طرح بے بس ہو چکی تھی اور اب بھی ہو گئی تھی۔



اولاد سے دوری بھی کیا شے ہے انسان کو کسی پل سکون سے نہیں رہنے دیتی سوتے جاگتے' اٹھتے بیٹھتے اسی کا خیال رہتا ہے۔ ایک کو اپنے ہاتھوں منوں مٹی تلے دفن کیا تھا اور دوسرا انہیں جیتے جی مار گیا تھا وہ ان کے پاس نہیں تھا رابطہ بھی نہیں تھا دونوں طرف سے کبھی کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی۔ دوسری طرف سے فون اٹھا لیا گیا تھا۔

"تمہارا بھائی انس ہمیں چھوڑ کر چلا گیا قطب' ایکسیڈنٹ نے اسے دوسرا سانس لینے کی مہلت نہیں دی۔" وہ سانس لینے کو رکے۔ آنکھوں کے آگے بار بار دھند سی آجاتی تھی جسے وہ ہاتھوں سے صاف کر دیتے۔

"کیا۔۔۔ کب۔۔۔ انس۔۔۔" اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ دوری کا عذاب تو اس نے بھی سہا تھا مگر وہ تو ایسی جگہ چلا گیا تھا جہاں سے واپس لوٹا نہیں جا سکتا تھا۔

"ہاں کئی مہینے ہو گئے اب تو حساب رکھنا بھی چھوڑ دیا اپنی زندگی میں تمہیں اور علی کو دیکھ لوں تو شاید سکون سے مر سکوں۔" دوسری طرف وہ رو رہا تھا لائن پر موجود تھا ان سے متنفر تھا مگر بات کر رہا تھا۔ پہلے ان کی آواز سن کر اس نے فون بند کرنا چاہا تھا مگر نہیں کر سکا تھا۔ وہ انہیں نہیں سننا چاہتا تھا مگر سن رہا تھا اس آواز نے جیسے اس کے احساسات کو منجمد کر دیا تھا۔ اسے سب کچھ بھول گیا تھا سوائے انس کے۔

"انس نہیں رہا۔ آپ نے پہلے نہیں بتایا۔" بڑی

مشکل سے اس کی گھٹی ہوئی آواز نکلی تھی۔
"تم سے رابطے کا ذریعہ ہی نہ تھا کوئی اب بڑی مشکل سے فہد سے لیا ہے نمبر۔" اسے لگتا تھا اسے کسی چیز سے اب کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے یہ اس کی خام خیالی تھی اسے فرق پڑ رہا تھا۔ ایک فون کال نے اسے اس حد تک بے چین کر دیا تھا کہ وہ بتائے بغیر اس پتے پر سفر کر رہا تھا جہاں سے برسوں پہلے وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سات سمندر پار آگیا تھا۔



میری سانس کا کیا بھروسا کہاں ساتھ چھوڑ جائے میری ذات سے وابستہ لوگوں مجھے معاف کر کے سونا
فون کرنے کے بعد سے وہ اس کے انتظار میں تھے اس نے آنے کی بات نہیں کی تھی کچھ بتایا بھی نہیں تھا مگر نا جانے کیوں انہیں یقین سا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ دن کے ساتھ ان کا انتظار شروع ہوتا دروازے پر دستک سننے کے منتظر کان چوکس رہتے پھر شام ڈھلے نا امید اور افسردہ ہو کر بستر میں چھوٹے بچے کی طرح دبک جاتے۔ اسی طرح امید' نا امیدی کی کیفیت میں نا جانے کتنے دن گزر گئے تھے۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ بے دلی سے چپل پہنتے وہ دروازے تک گئے تھے۔
"کسی بچے کا بال آگیا ہوگا اب لینے کے لیے منتیں کرے گا۔" سارا دن ان کی یہ پریڈ جاری رہتی تھی۔ بچوں کا بال اندر آجاتا تو وہ اسے باہر پھینک دیتے۔
"تنگ کرنے کے بہانے ہیں سارے آرام بھی نہیں کرنے دیتے۔" بڑبڑاتے انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ اور پھر دروازے میں ہی ایستادہ ہو گئے تھے۔ اسے سامنے کھڑا دیکھ کر پہلے پہل انہیں اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ آنکھیں جھپک رہے تھے۔
"دادا جان!" پہل اس ننھے فرشتے نے کی تھی بھاگ کر ان کی ٹانگوں سے لپٹے وہ ان کے یقین کو کچھ اور بھی مضبوط کر گیا تھا۔ اسے اٹھاتے بے تحاشا چومتے وہ رو رہے تھے۔

"تم آگئے مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔" نا جانے وہ کس سے کہہ رہے تھے۔ ان کی محبت کی شدت سے گھبرا کر وہ نیچے اتر گیا وہ اس کی جانب بڑھے۔ جو ایک بت کی طرح وہیں کھڑا تھا انہوں نے آگے بڑھ کر اس کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اسے دیکھے شاید صدیاں بیت گئی تھیں۔ اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامے نا جانے انہوں نے کتنی دیر اسے دیکھا تھا۔ کمرے کے دروازے سے باہر نکلتے اس نے یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھا تھا اور وہ بھی وہیں بت بن گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کی پہلی نظر اپنے پاس کھڑے بچے پر پڑی تھی۔
"السلام علیکم!" اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ایک خیر مقدمی مسکراہٹ بھی اس کے ہونٹوں پر آگئی تھی۔
"مجھے معاف کردو میرے بچے۔ مجھے معاف کردو۔" وہ تواتر سے بس ایک ہی جملہ بول رہے تھے۔ خونی رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں ساری ناراضی ایک پل میں ختم ہو جاتی ہے جیسے کوئی برا لمحہ ان کے درمیان آیا ہی نہیں تھا۔ اس کے بھی آنسو نکل آئے تھے۔ جذباتی منظر نے اسے بھی رلا دیا تھا۔ "میرے بچے مجھے معاف کردو۔" انہوں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ "میں ہمیشہ غلط تھا ہر جگہ پر غلط تھا تمہارے باپ کا دل دکھایا اس سے معافی کا موقع ہی نہ مل سکا مگر تم سے مرنے سے پہلے ضرور معافی مانگنا چاہتا ہوں۔" وہ علی کا ہاتھ پکڑ کر اندر جا چکی تھی۔ اس لمبے چوڑے شخص کے چہرے پر صدیوں کی تھکن تھی۔
"جو گزر چکا اس کی تلافی ممکن نہیں مگر......" ان کے لفظ ان کے گلے میں گھٹ کر رہ گئے تھے۔ اس نے ان کو ساتھ لگا لیا۔ اس نے کب ان کو اس طرح سوچا تھا۔ کتنے بدل گئے تھے وہ سارا کروفر' اکڑ' دھونس عمر کے ساتھ رخصت ہو چکا تھا اس کے سامنے کھڑا شخص تو بس پچھتاووں کو ساتھ لیے کر جی رہا تھا۔
"مجھے مت روکو مجھے کہہ لینے دو سب جو میں پہلے نہیں کہہ سکا۔" اس کا باپ ہاتھ جوڑے اس کے سامنے کھڑا تھا اپنی غلطیوں پر معافی مانگ رہا تھا ایک دم

اس کے دل کو کچھ ہوا اس نے آگے بڑھ کر پورے جوش سے انہیں سینے سے لگایا تھا۔ وہ خود بھی تو ایک باپ تھا اس سے بھی بہت سی غلطیاں ہوئی تھیں اس کا دل نرم ہو گیا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو حال میں لانے کی کوشش کی۔

"بس کریں ابا جی ایسے نہ کریں مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ انس کو کیا ہوا تھا۔" وہ غور سے اسے دیکھتے رہے اس کے چہرے پر چھایا رہنے والا غبار اور غصہ اب کہیں نہیں تھا گزرتے سالوں نے اسے ایک مضبوط شان دار مرد کا روپ دے دیا تھا اور وہ ابھی تک اس کے اندر اس نو عمر لڑکے کو تلاش رہے تھے۔

"اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا بینک جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا اور دو گھنٹے بعد..." اب وہ اپنے جواں عمر بیٹے کو رو رہے تھے جو ان کو چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اسے ساری تفصیل بتاتے وہ اسے اندر لے آئے۔ گزرتے ماہ و سال نے کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا وہی سنگل بیڈ، سائیڈ پر پڑی کرسیاں اس کی نظریں جیسے کچھ تلاش کر رہی تھیں مگر جن کو تلاش کر رہی تھیں وہ تو اتنی دور جا چکے تھے کہ ان کے آنے کی کوئی امید ہی نہیں تھی۔

"اس کی جواں سال بیوہ کو دیکھتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے کیسے گزرے گی یہ پہاڑ سی زندگی۔"

ان کا دکھ صرف ان کا دکھ نہیں تھا وہ تو کئی زندگیوں کو متاثر کر گیا تھا۔ ان کے ناتواں ہاتھوں کی کپکپاہٹ اچانک بڑھ گئی تھی۔ اس کا سارا غصہ نا جانے کہاں جا سویا تھا بس ایک بے یقینی، سوگ اور ماتم کی کیفیت اس پر طاری تھی اس کیفیت کا خاتمہ انس اور ماں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے بعد ہوا تھا۔

گھر کی منڈیروں پر اترتی شام نے اس گھر کی رونق کو دیکھتے خوشی سے خود کو رات میں مدغم کر دیا تھا۔

"دادا جی..."

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ میں کس کے ساتھ سوؤں وہ آنی ہیں تو اتنی اچھی دل کر رہا ہے ان کے ساتھ، کبھی دل کرتا ہے آپ کے ساتھ اور کبھی ابا کے ساتھ، اب آپ بتائیں کیا کرنا چاہیے۔"

سلیپنگ سوٹ میں خود سے الجھا ہوا ان کے سامنے کھڑا تھا الجھن اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"ہوں تو یہ بات ہے تو یوں کرو کہانی مجھ سے سنو، سو آنی کے ساتھ جانا اور اپنے ڈیڈ کو آج چھٹی دے دو۔" انہوں نے چٹکی میں اس کا مسئلہ حل کر دیا تھا وہ خوشی خوشی ان کے بستر میں گھس گیا۔



"غم ہمدردی اور محبت کا مرہم چاہتے ہیں۔ محبت ہی ان کا علاج ہے۔ اور اسی سے غم کم ہوتے ہیں۔" رحمان اللہ نے اس کے تاثرات سے عاری چہرے کو دیکھتے بات شروع کی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ ان کی باتوں پر کس رد عمل کا اظہار کرے گا یا کیا کہے گا۔ ان کی بات مانے گا یا نہیں لیکن بس وہ اس سے بات کر لینا چاہتے تھے۔

"مجھے نہیں علم کہ علی کی ماں کیوں چھوڑ کر چلی گئی یا تم نے چھوڑ دیا۔" انہوں نے تھوڑا ٹھہر کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ جو ہنوز سپاٹ تھا۔ اتنا سپاٹ کہ ایک باپ ہو کر بھی وہ کچھ اندازہ نہیں لگا پائے تھے۔ وہ ٹھس انداز میں دیوار سے اکھڑے پلستر کو گھورے جا رہا تھا۔

"ہاں آپ کو بتاؤں آپ کے علم میں لاؤں تاکہ چار نصیحتیں آپ کی طرف سے شامل ہو جائیں۔ اور پھر آپ کہیں کہ جو بڑے کہتے ہیں وہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔" وہ صرف سوچ کر ہی رہ گیا۔ اب اس کی نظر فرش پر چلنے والی چیونٹی کی طرف تھی جو چینی کا باریک دانہ دھکیلنے کی کوشش میں بے حال تھی۔

"ہاں میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اکیلے زندگی گزارنا بہت مشکل، بہت ہی مشکل ہے اور یہ اس صورت میں اور بھی مشکل ہو جاتی ہے جب ایک بچہ آپ ہی کے رحم و کرم پر ہو۔ تم نے جتنی اپنی زندگی گزاری ہے۔ ابھی بہت آگے پڑی ہے اور اس کی زندگی ابھی شروع ہوئی ہے اسے ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ وہ بہت سادہ اور معصوم ہے ابھی بہت چھوٹا ہے۔ وہاں کی زندگی کو تم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔" اس کی

مسلسل خاموشی اور سپاٹ چہرے کو وہ کوئی بھی معنی پہنانے سے قاصر تھے۔ اپنے بیٹے سے بات کرنے کے لیے انہوں نے لمبی تمہید باندھی تھی۔ بیٹا بھی وہ جو ہمیشہ ہی ان سے نالاں رہا تھا۔ علم نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا تھا۔

"ارحمہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اتنی اچھی کہ آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کیا جاسکتا ہے۔" اب اس نے آنکھیں اٹھا کر براہ راست ان کو دیکھا تھا لب اب بھی خاموش ہی تھے۔

"ہاں صرف آپ آنکھیں بند کر کے لڑکیوں پر یقین کرسکتے ہیں۔ میں نہیں۔ سب لڑکیاں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں اچھے کپڑوں' بڑے گھروں' آسودگی اور لمبی گاڑیوں کی بھوکی۔" اس کے خیالات کی رو پھر بہکی تھی اور اس کے پتھریلے تاثرات کچھ اور بھی پتھریلے ہوئے تھے۔ 31 سالہ مرد' عورت ذات سے نفرت سے بھرا ہوا تھا۔

"اس نے کبھی کسی چیز کی خواہش نہیں کی۔" وہ پور پور شفقت پدری میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جھریوں سے بھرے چہرے پر کچھ آنسو' پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر رینگ آئے تھے۔ ان کے آنسو دیکھ کر ایک دم دل کو کچھ ہوا تھا۔ لیکن عورت کا ذکر اسے پھر سے الجھا گیا تھا۔

"کچھ لوگوں نے اس کا ساتھ مانگا تھا۔ لیکن وہ کبھی تیار نہیں ہوئی تھی۔ بہت صابر بچی ہے۔" گالوں پر پھیلے آنسو صاف کرتے ایک بار پھر انہوں نے اس کی طرف دیکھا تھا شاید کچھ بولے۔

"ہاں اسے علم جو تھا کہ آپ کا ایک بیوقوف بیٹا اپنی بھاگی ہوئی بیوی کا ماتم ابھی تک کر رہا ہے۔ سوچتی ہوگی کب تک کرے گا۔ آخر کو آنا تو یہیں ہے۔" ناجانے اسے خود پر زعم تھا یا خود ترسی ابھی تک وہ خود بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ سپاٹ چہرے اور خاموش لبوں کے ساتھ وہ سوچتا چلا جا رہا تھا۔

"بوڑھے بیمار شخص کی جائیداد اور فارن پلٹ بھاگی ہوئی بیوی کا شوہر' جو ایک بچے کا باپ بھی ہے بھلا کیا انکار کرے گا۔" اندر ہی اندر استہزائیہ ہنسی ہنسا تھا وہ اپنے اوپر۔

"اپنی آئندہ زندگی کا کیا لائحہ عمل ہے تمہارے پاس تم نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ کبھی اپنی سوچوں کے در وا نہیں کیے تم نے مجھ پر۔" بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کی کپکپاہٹ کو دوسرے ہاتھ کے سہارے روکا تھا انہوں نے۔

"کیوں در وا کرتا اپنی سوچوں کو آپ پر۔ آپ نے کیا ہی کیا ہے میرے لیے۔" بغاوت کچھ سال پہلے ہی نہیں آج بھی اس کی رگوں میں لہو کے ساتھ گردش کرتی تھی۔

"میری خواہش ہے کہ...." انہوں نے اس کی طرف دیکھا وہ ابھی تک سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ بدل گیا تھا بہت۔ اس کی خاموشی نے ان کو تھوڑا حوصلہ دیا تھا۔ وہ ابھی تک کیلنڈر کے ہندسوں میں الجھا ہوا تھا۔ ایک ثانیے کو لگا وہ ان کی کوئی بات سن ہی نہیں رہا۔

"قطب الدین ایبک" انہوں نے اس کا پورا نام لیا تھا ان کے پکارنے پر اس نے فوراً" ان کی طرف دیکھا تھا ان کی سوچوں کی نفی ہوگئی تھی۔ وہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھا۔

"تمہاری شادی ارحمہ کے ساتھ کردی جائے۔" انہوں نے ایک سانس میں جملہ مکمل کیا اس کی طرف سے کوئی دھماکا ہونے والا تھا۔ کیا یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پارہے تھے۔

"مرنے سے پہلے میں تم تینوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ ارحمہ ایک اچھی ماں ثابت ہوگی۔ سکون سے مرنا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنی زندگی کے بارے کچھ نہیں سوچا تھا کچھ بھی نہیں حالانکہ سوچنا چاہیے تھا۔ اسے دنیا کی ہر عورت سے نفرت تھی۔ ایک بار پھر تختہ مشق بننے جارہا تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ اس پر مشق کون کررہا ہے۔ کیلنڈر کے زرد صفحوں سے ہوتی ہوئی اس کی نظر اب انس کی ہنستی ہوئی تصویر پر آکر ٹھہر گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

شادی نہایت سادگی سے ہوئی تھی۔ رحمان اللہ نے تمام رشتہ داروں کو مدعو کیا تھا کسی کو بھی یقین نہ آیا کہ ایسا تھا اس کے بچے کے ساتھ آنے پر بہت سوں کی باتوں کی تصدیق ہو گئی تھی۔ "دیکھا شادی کر رکھی تھی وہاں۔ ناجانے اس نے چھوڑ دیا یا خود ہی چھوڑ گیا۔" مگر نہ اسے پروا تھی نا ہی رحمان اللہ کو' وہ تو اسی میں خوش تھے کہ اس نے ان کی بات کا مان رکھ لیا تھا۔ ان کی ساس نے اس شادی میں صرف اس کو دیکھنے کے لیے شرکت کی تھی اور دیکھنے کے بعد انہیں چپ لگ گئی تھی انہوں نے رحمان اللہ کی باتوں کو صرف ٹالنے کی حد تک سمجھا تھا مگر یہاں تو سب کچھ الٹا ہو گیا تھا اس نے بہت سارے آنسو ثمن کے گلے لگ کر بہائے تھے انس بے حد یاد آیا تھا۔ زندگی میں بہت سے فیصلے دوسروں کی مرضی سے کرنے پڑتے ہیں وہ کبھی انس کو بھول نہ پاتی مگر...... شاید سب ایسا ہی ہونا لکھا تھا۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

اس کے دل سے دعا نکلی تھی۔ سادہ سے کپڑوں اس کا سوگوار حسن ہر ایک کو اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔

"میں آپ کو ماما کہہ سکتا ہوں۔" علی اس کے پاس کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"مجھے دادا نے بتایا ہے کہ آپ میری ماما ہیں۔" ان تھوڑے دنوں میں وہ اس کے کتنا قریب ہو گیا تھا۔

"ماما کو ماما ہی کہو گے ناں بھانجے۔" ثمن نے اسے چوم کر ساتھ لگاتے کہا تھا۔ وہ معصوم بچہ جو رشتوں کو ترسا ہوا تھا کیسے سب کے پیچھے پیچھے پھرا کرتا۔

رحمان اللہ خوش تھے۔ ایک بیٹے کو کھو کر انہوں نے دوسرا بیٹا پا لیا تھا۔ ماضی کی غلطیاں ایک ایک کر کے ان کے سامنے آتی چلی گئی تھیں۔ وہ عورت جو ان کی بیوی تھی اس کی خدمت اور وفاشعاری کو انہوں نے کبھی سراہا نہیں تھا' مگر آخر حقیقت ان پر عیاں ہو ہی گئی تھی فہد نے کچھ نہ بتاتے ہوئے بھی سب ان کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ عورت کا کردار اس کی سب سے بڑی خوب صورتی ہے عرصے بعد تسلیم کر ہی لیا تھا۔ ان کا خود سے وعدہ تھا انہوں نے جو بگاڑا تھا ان کو ہی سنوارنا تھا۔ اگرچہ یہ اتنا آسان نہیں تھا' مگر وہ پر یقین تھے اگر نیت سچی ہو تو راستے خود بہ خود آسان ہوتے چلے جاتے ہیں۔

✡ ✡ ✡

کچھ عرصہ بعد

جیسے بہت کچھ خراب ہوا تھا انہیں اسے ویسے ہی ٹھیک کرنا تھا۔ پاکستان چھوڑنا ان کے لیے سوہان روح تھا' مگر وہ جانتے تھے کہ وہ ابھی واپس نہیں آسکتا سو وہ بھی اس کے ساتھ ہی آ گئے تھے۔ ان دونوں کا ویزا لگنے میں کچھ دیر ضرور لگی تھی' مگر بہر حال ابھی بہت دیر نہیں ہوئی تھی۔ اس کا گھر بہت بڑا نہیں تو چھوٹا بھی نہیں تھا اوپر تین بیڈ روم' باتھ' لانڈری اور نیچے کچن' لیونگ روم اور لان۔ وہ خوش تھے بہت عرصے کے بعد انہوں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔ ایک بیڈ روم میں وہ دونوں دادا پوتا تھے اور دوسرے میں وہ دونوں۔ انہیں ان دونوں کے درمیان موجود نظر آنے والی سرد مہری کو دور کرنا تھا۔

"ارحمہ بیٹا قطب کے لیے چائے لے آؤ اور میرے لیے بھی۔" وہ ان کے سامنے بیٹھا لیپ ٹاپ پہ مصروف تھا اور وہ اسٹاک ہوم میں بیٹھے پاکستانی ٹاک شو سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"جی اچھا ابا جی۔" کچن سے آتی اس کی آواز نے انہیں حوصلہ دیا تھا۔ کام کرتے کرتے اس نے نظر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا وہ بڑے سکون سے بیٹھے پوری طرح ڈسکشنز میں محو تھے۔ وہ بہت بدل گئے تھے۔ اس کی ناراضی نہ جانے کس سے تھی ان سے یا خود سے بہر حال وہ ابھی تک ان سے کھل کر بات چیت کرنے سے کتراتا تھا۔ کئی سالوں کی دوری نے ان کے درمیان جو فاصلے ڈال دیے تھے وہ اتنی جلدی پاٹے نہیں جاسکتے تھے۔

"مقطب بھئی اب علی کو لے آؤ میں اداس ہو رہا ہوں۔" وہ بار بار اسے مخاطب کرتے اسے بھی جواب دینا پڑتا۔

"جی اچھا۔" اس نے لیپ ٹاپ بند کیا۔

"پہلے چائے پی لو پھر لے آنا۔" انہوں نے ارحمہ کو چائے کے ساتھ اندر آتے دیکھ کر اسے روکا تھا۔ علی فریڈ کے ساتھ ان کے گھر میں تھا۔ انہیں چائے دے کر وہ خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ زندگی میں آنے والا سکون' زندگی کی بے سکونیوں' پریشانیوں اور تکلیفوں کو دور کرتے ہوئے کچھ اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔ ان دونوں کا بیڈ روم ایک تھا' مگر وہ دونوں اول روز سے اجنبیوں کی طرح رہ رہے تھے۔ صرف سونے کے لیے استعمال ہونے والے اس بیڈ روم میں انہوں نے بیڈ کے اپنے اپنے کونے سنبھال رکھے تھے۔ علی اور رحمان اللہ کے کام ختم کرنے کے بعد اس وقت بیڈ روم میں داخل ہوتی جب یا تو وہ سو چکا ہوا یا پڑھنے کے لیے دوسرے کمرے میں جا چکا ہوتا۔ تیسرا کمرہ اسٹڈی پلس ایکسر سائز روم پلس فالتو چیزوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

☆ ☆ ☆

سیڑھیوں سے نیچے اترتے اس کی سب سے پہلی نظر دھیمی آواز میں چلتے ٹی وی پر پڑی تھی۔ تو وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ علی اور ابا کے ساتھ باتیں کرتے اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔ مگ کچن میں رکھنے کے لیے نیچے آتے اس کا خیال تھا کہ وہ اب تک سو چکا ہو گا۔ اس کے قدم کچھ اور بھی دھیمے ہوئے تھے۔ سفید شرٹ ملگجے اندھیرے میں بھی چمک رہی تھی۔ ٹی وی کے بدلتے رنگ صوفے پر بے سدھ سوئے وجود پر ہر زاویے سے پڑ رہے تھے۔ اس کے بکھرے بالوں کو اس نے بہت غور سے دیکھا تھا اور شاید یہ اس کی پہلی تفصیلی نظر تھی جو اس نے اس پر ڈالی تھی صوفے پر سکڑا سمٹا وجود بے ترتیب سا تھا کچھ دیر ادھر کھڑے سوچتے اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کیا' صوفے پر پڑا کمبل ہولے سے اس پر پھیلا دیا اور لیونگ روم کی کھڑکی بند کر دی باہر ہونے والی ٹھنڈ نے اندر اچھی خاصی خنکی کر دی تھی۔ کچن میں جلتی لائٹ نے کمرے کا اندھیرا کافی حد تک دور کر دیا تھا۔ اس پر دیا جانے والا کمبل اس چھ فٹ وجود کو ڈھانپنے میں مکمل طور پر ناکام رہا تھا۔ ویسے بھی وہ ایک چھوٹا کمبل تھا جو ٹی وی دیکھتے لیا جاتا سو اس نے اوپر سے بڑا کمبل لا کر اس کے اوپر ڈال دیا۔ اوپر کمرے میں آتے وہ اسے ہی سوچ رہی تھی اس کا دھیان اس کی طرف کیوں تھا اس نے سر جھٹک کر سوچوں سے چھٹکارا پانا چاہا تھا اس کی شخصیت' رکھ رکھاؤ' بول چال' وہ انس کو بھول کر اسے کیوں سوچ رہی تھی۔ اس نے اس کی سوچ کو جھٹکتے خود کو ملامت کی تھی۔ پھر نہ جانے ان ہی سوچوں کے درمیان اسے کب نیند نے گھیر لیا تھا۔

صبح اس کی آنکھ علی کے کارٹونز کی آواز پر کھلی تھی۔ مندی مندی آنکھوں سے اس نے اسے "اس" کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف دیکھا تھا نہ جانے وہ دونوں کیا باتیں کرتے تھے اب بھی کر رہے تھے۔ دوسرا خیال کرماہٹ کا تھا اس بیڈ روم والے کمبل کو خود پر دیکھ کر وہ حیران ہوا تھا۔ اپنی بے خبری کی نیند پر اسے تھوڑی جھلاہٹ ہوئی تھی وہ ان ہی کپڑوں میں سو گیا تھا۔ "اب یہ سب بگاڑے گی۔" کارپٹ پہ بیٹھے ناشتہ کرتے علی کو دیکھ کر اسے کوفت ہو رہی تھی۔

"Qumi Qumi مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور آپ کو۔"

"ہاں' مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔" اس کے منہ میں نوالہ ڈالتے وہ پوری طرح اس کے کارٹونز میں مگن تھی۔ اب "Qumi" کے کردار ڈسکس ہو رہے تھے۔

"ڈیڈ بھی میرے ساتھ کارٹون دیکھتے ہیں پر کبھی کبھی' لیکن ان کو پھر بھی سارے کریکٹرز کا نہیں پتا ہے نا مزے کی بات۔" ڈیڈ کے نام پر اس کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک دوسرے میں مگن ان دونوں کو دیکھا اور اٹھنے کا ارادہ ایک بار پھر موقوف کر دیا۔

"جلدی چباؤ ورنہ کارٹون جیت جائیں گے اور علی ہار جائے گا۔" اس نے دھیمی آواز میں علی سے کہا تھا اور اس کے چبانے کی رفتار تسلی بخش ہوگئی تھی اس کو نوالہ منہ میں رکھ کر بیٹھ جانے کی عادت تھی۔ صوفے پر لیٹے لیٹے اس کے ہونٹوں پر لمحے بھر کے لیے مسکراہٹ چمکی تھی۔

"صاحب زادے اب اٹھ جاؤ، کچھ رحم ہم بوڑھوں پر کھاؤ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ چھٹی کا دن ہے کیا سارا دن سونے کا ارادہ ہے۔ ناشتا مل کے کریں گے یار۔" لان میں واک کرنے کے بعد رحمان اللہ اس کے سر پر کھڑے اسے پکار رہے تھے۔

"ڈیڈ آپ بھی ہمارے ساتھ کارٹون دیکھو۔" ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ ناشتے کا لقمہ علی کے منہ میں ڈالتے شاید وہ بھی وہی سوچ رہی تھی جو وہ سوچ رہا تھا۔ اس کی ہلکی مسکراہٹ اس نے دیکھی تھی۔

✲ ✲ ✲

"ایسے بچت نہیں ہو سکتی تمہاری۔" رحمان اللہ علی سے بڑھ کر اسے اس "بوٹ" پر بٹھانے کے شائق ہو رہے تھے۔ یہاں آکر جیسے ان کے اندر توانائی بھر گئی تھی ساری پژمردگی، غصیلا پن انہوں نے پاکستان میں ہی چھوڑ دیا تھا سامنے کھڑا نظر آنے والا شخص اپنے بیٹے کے ساتھ خود کی گئی زیادتیوں کی تلافی کر رہا تھا، اپنا غم بھلا رہا تھا یا واقعی وہ خوش تھا قریب کھڑی ارحمہ نے بڑے غور سے ان تینوں کو ایک دوسرے سے بحث کرتے دیکھا تھا۔

"نہیں مجھے نہیں بیٹھنا۔" اس کی سنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔

"ڈیڈ۔" اب وہ منہ بسور کر کھڑا ہو گیا تھا۔ دادا پوتے کو آج کل گھومنے پھرنے کا چسکا پڑا تھا اور ان دونوں کو بھی ساتھ گھسیٹنا ضروری ہو تا وہ دونوں نہ چاہتے ہوئے بھی ساتھ ہوتے انکار کی صورت میں ان کے ناک میں دم کر دیا جاتا اور انہیں ساتھ آتے ہی بنتی۔ "اَمیوزمنٹ پارک" میں بنی لمبی سلائیڈ اور اس پر بنی "بوٹ" میں بیٹھنے والا ایک جھٹکے سے یونہی جھیل میں گرتا، ایک لمحے کے لیے سانسیں رکتیں اور پھر سے چلنے لگتیں۔

"اب اس عمر میں کیا میں اچھا لگوں گا اس میں بیٹھتے۔" وہ منہ ہی منہ میں بدبدایا جو انہوں نے سن لیا تھا۔

"کیا ہوا تمہاری عمر کو میری طرح لاٹھی ٹیک کر چلتے ہو کیا۔" اگرچہ انہوں نے لاٹھی ٹیکنے کی صرف اصطلاح استعمال کی تھی وہ لاٹھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اسے بوٹ کی طرف دھکیل دیا جو پلیٹ فارم پر نئی سواری کا انتظار کر رہی تھی۔

"آنکھیں کھول کے رکھو۔"

"ڈیڈ دیکھیں وہاں سے سب کتنا اچھا لگتا ہے۔" وہ دونوں شور مچا رہے تھے اس سے زیادہ ایکسائیٹڈ تو وہ دونوں تھے اگلی نظر بوٹ پر بیٹھے قطب الدین ایبک پر پڑی تھی وہ پھر سے عجیب خوف کا شکار ہوئی تھی پہلی بار جب علی اس پر بیٹھا تھا اس کے ساتھ اس کا دل بھی غیر ہموار طریقے سے دھڑکنے لگا تھا اور اب.....

"دھیان سے۔" ان دونوں کے شور میں اس کا جملہ کہیں دب گیا تھا، مگر اپنی بے اختیاری پر وہ خجل ضرور ہوئی تھی۔ یہ اس کا پہلا اتفاق تھا سلائیڈ پر کشتی اور کشتی میں بیٹھا وہ کتنا عجیب محسوس کر رہا تھا شور مچاتے علی اور رحمان اللہ سے ہوتی اس کی نظر ادھر اس کی طرف اٹھی تھی اور پھر وہیں کی ہو کر رہ گئی تھی۔

"کیا وہ اس کے لیے بھی اسی طرح پریشان ہو رہی تھی جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے اسے علی کے لیے ہوتے دیکھا تھا۔" اس کے چہرے کی سراسیمگی نے اسے تقویت دی تھی اور پھر اسے دیکھتے دیکھتے وہ ایک جھٹکے سے جھیل میں گرا تھا کشتی کے گرنے سے اڑنے والا پانی اس کے چہرے کو گیلا کر گیا تھا۔ عجیب بے خودی کی کیفیت تھی جو اس پر طاری تھی۔ بوٹ سے باہر نکلتے وہ ان کے پاس آگیا۔

"اچھا تھا نا مزا آیا۔" علی اس سے پوچھ رہا تھا اور وہ اس سب میں صرف ان دو کالی آنکھوں کو ہی یاد رکھ سکا

تھا جو اس کی کشتی کے ساتھ ساتھ پھیلتی اور سکڑتی رہی تھیں صرف ان ہونٹوں کو یاد رکھ سکا تھا جو بے چینی سے بار بار بند ہو رہے تھے کھل رہے تھے۔ ان ہاتھوں کو جو دعا کے لیے اٹھے اور گر گئے تھے۔ کوئی تھا جو اس کے لیے پریشان ہوا تھا۔ پہلی بار اسے سوچتے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔ عورت کے وجود سے نفرت کرنے والا شخص اسے سوچ رہا تھا۔



"ہماری ٹیچر نے ایک دن کیک بنانا سکھایا تھا آج ہم دونوں مل کر بنائیں گے۔" علی اس کے ساتھ کھڑا بہت پرجوش تھا سفید ٹی شرٹ میں اس کی چمکتی آنکھیں ستاروں بھری لگ رہی تھیں۔ اسے کچھ عرصہ پہلے کا علی یاد آگیا' چہرے پر چھائی مردنی نے اسے اندر تک ہلا دیا تھا اور اب.... کتنا فرق تھا۔ اس علی اور اس علی میں "کیا آپ میری مدد کریں گی۔ آپ کو بنانا آتا ہے کیا؟" اس کے معصومانہ سوال پر اس نے سر ہلا دیا۔

"تو چلیں ابھی سب چیزیں گھر میں موجود ہوں گی۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے کچن کی جانب کھینچ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے جناب اچھا سا کیک بیک کریں گے ہم دونوں۔" اس کی مسکراہٹ نہ جانے کیوں اتنی پیاری لگتی تھی اس نے اس کے کالے گھوربالوں کو بکھیر دیا۔ کچن کاؤنٹر پر ایک ایک کر کے چیزیں رکھتے اس نے اس کی طرف دیکھا۔

"آٹا' انڈے' میدہ' چینی' دودھ' کچھ اور چاہیے۔"

"بیکنگ پاؤڈر اور مکھن اور ایک ایپرن بھی۔ میرے کپڑے گندے ہو جائیں گے ورنہ۔" بڑے انداز سے کہتے وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ کے جتنا ایپرن تو ہے نہیں اس لیے اسی سے گزارا کرو۔" اس نے اسے ایک بڑا سا ایپرن پہنایا جو اس کے پاؤں تک آگیا تھا۔ دونوں کی ہنسی ایک دم ہی نکلی تھی۔ چینی' انڈے اور مکھن مکس کر کے اسے دینے کے بعد علی نے ہی اس میں باقی چیزیں ملائی تھیں میدے کا کچھ حصہ اس کے منہ پر لگا تھا اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہنس ہنس کے بے حال ہو رہے تھے۔

ان دونوں کی ہنسی کو اس نے گھر میں داخل ہوتے سنا تھا ایسی جلترنگ جس سے اس کے کان نا آشنا تھے۔ کچن کے سامنے سے گزرتے کچن کا ابتر حال اس نے دیکھا تھا' لیکن کیک بہر حال اوون میں رکھا جا چکا تھا۔ ان کا بنایا کیک سب نے مل کر کھایا تھا۔

"آج تو مزا آگیا۔ کیا ذائقہ ہے میری بیٹی کے ہاتھ میں۔" رحمان اللہ نے کیک کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے تھے۔

"یہ کیک آپ کی بیٹی نے نہیں میں نے بنایا ہے۔" علی نے منہ بناتے ان کی تصحیح کی تھی۔

"اچھا بابا آپ نے بنایا تو بھی بڑا مزے کا ہے۔" ہنستے ہنستے اس کے سر پر چپت لگاتے وہ مزے سے چائے پینے لگے اس ساری کارروائی کے دوران وہ خاموش بیٹھا رہا تھا۔ وہ کافی کا عادی تھا اور چائے عجیب مزا دے رہی تھی۔ اسے ماں کی یاد آگئی۔ بہت عرصہ پہلے چھوڑی گئی چائے ایک بار پھر سے اس کی زندگی میں داخل ہو گئی تھی۔

"علی! آج کوئی خاص بات ہے کیا۔" دور پڑے پتھر پر نظریں جماتے اس نے سرسری سا ہی علی سے پوچھا تھا۔ علی جوش میں کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"ہوں تو اب سیکرٹ بتانے کا وقت آگیا ہے۔" اس نے سسپنس پیدا کیا۔

"آج مام کی ہیپی برتھ ڈے ہے۔ مجھے ثمن آنٹی نے بتایا تھا ان سے میری فون پر بات ہوئی تھی۔" وہ خود بھی اس دن کو بھول گئی تھی۔ انس کے بعد سے جیسے اس کا حافظہ اس کا اپنا نہیں رہا تھا خود سے لاپروائی کا عجیب انداز تھا۔

"ہوں تو یہ بات ہے۔" رحمان اللہ نے کچھ سوچتے [illegible] بھر اوہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"قطب ہمیں مارکیٹ لے چلو ہمیں اپنی بیٹی کے لیے گفٹ لینا ہے۔" اچانک پروگرام بناتے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "چلو پوتے ہم دونوں ذرا کپڑے چینج

لے آئیں۔" اسے ساتھ لیتے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔" اس کے منہ سے نکلنے والے لفظوں پر وہ حیرانی سے اسے تک رہی تھی۔ اس کا سنجیدہ چہرہ اور ان پر ٹکی دو آنکھیں نہ جانے کس موج میں تھیں۔

"تھینک یو۔" آہستگی سے کہہ کر وہ اپنے ہاتھ موڑنے لگی۔ عام سے حلیے میں نظر آنے والی وہ لڑکی عام لڑکیوں سے کتنی مختلف تھی اس کی جھکی آنکھوں پر لرزیدہ پلکوں کا رقص اس نے بڑی حیرت اور شوق سے دیکھا تھا۔ کیا تھی وہ اور وہ اس کی جانب کیوں جھک رہا تھا اس کا اپنا آپ شاید اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ ان کی آنکھوں کی تپش اس نے بھی محسوس کی تھی۔ وہاں بیٹھے رہنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ سامنے پڑے برتنوں کو ٹرے میں رکھتے وہ جلدی سے اندر آگئی۔ سنک کے سامنے کھڑے اسے انس یاد آیا تھا۔

لان میں بڑھنے والی ہلکی خنکی نیلا آسمان' لان کے سائیڈ پر پڑے بڑے بڑے پتھر اور پتھروں سے پرے نیچے اترتی ڈھلوان آسمان پر اڑنے والے پرندے سب ایک دم کیوں اچھا لگنے لگا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو اس کیفیت سے باہر نکالا تھا۔ دونوں ہاتھوں کو سر کے پیچھے رکھتے اس نے لان میں نئے لگنے والے پودوں کو غور سے دیکھا تھا۔ ان کے ہرے بھرے پتے بہار کی نوید دے رہے تھے۔ اس کے اندر کچھ تو بدلا تھا ہر چیز کے منفی پہلو پر نظر رکھنے والا شخص مثبت سوچوں کو سوچنے لگا تھا۔ عورت کے وجود سے نفرت کے باوجود وہ اس عورت کی خوبیاں گنتا اسے اندر ہی اندر سراہتا اور پھر سے اس کے خیال کو جھٹک کر مگن ہو جاتا ابھی بھی ایسا ہی ہوا تھا۔



زندگی سکون آشنا ہو رہی تھی۔ علی کی طرف سے ملنے والی خوشی نے اسے ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ شاید وہ اپنا ماضی بھول رہا تھا۔ یونیورسٹی میں اس کا یہ پیریڈ فری تھا اپنے آفس میں بیٹھے اس نے اپنے حالات کا موازنہ پہلے کے حالات سے کیا تھا اور پھر شکر کیا تھا۔ ہاں شاید پچھلے کچھ سالوں میں وہ شکر کرنا بھول گیا تھا۔ جو اسے پھر سے یاد آنے لگا تھا اس کی بھنور میں پھنسی کشتی باہر نکل آئی تھی۔ موجوں کا تلاطم تھم گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی بات چیت ہوتی۔ علی' رحمان اللہ کے ہوتے ہوئے' کھانے پینے کے دوران کبھی کبھار اس کا دل چاہتا اس سے باتیں کرے' مگر وہ اس سے کیا بات کرے گا۔ یہی سوچ کر ہر بار رک جاتا یا اسے یہ خیال آجاتا کہ اگر وہ بھی ویسی ہی عورت ہوئی جیسی.... اور اس سے آگے اس کی ساری سوچیں پژمردہ ہو کر اپنا منہ چھپا لیتیں۔

"باہر نکلو۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ تم کتنے بڑے سورما ہو۔ ہمارے ملک میں رہتے ہوئے ہمارے پیسوں پر عیش کرنے والے گھٹیا شخص' تم کیسے میرے بیٹے کو مجھ سے دور رکھ سکتے ہو۔" باہر ہونے والے شور سے اس کا کچھ تعلق ہو سکتا ہے یہ تو وہ مر کے بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ لمبے کوریڈور میں صرف دفاتر تھے آمنے سامنے کمروں اور ان کے سامنے لمبے کوریڈور میں عموماً" خاموشی ہوتی۔ باہر ہوتے شور کو سن کے اسی طرح کے کئی سر ہر دروازے پر نمودار ہو چکے تھے۔ ان ہی سروں میں ایک سر اس کے ریسرچ ہیڈ سرجان ٹموتھی کا تھا۔ وہ خالی ذہن تھا سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں کھو چکا تھا۔ سرجان نے ہی آگے بڑھ کر سانان سے کچھ کہا تھا وہ اسے "اس" کے حوالے سے جانتے تھے۔ نہ جانے وہ کیسے مانی تھی' لیکن مان گئی تھی۔ تماشے کے ایک پارٹ سے محظوظ ہو کر لوگ دوبارہ اپنے کمروں میں بند ہو چکے تھے۔ قدموں کو اٹھانا اس قدر مشکل بھی ہو سکتا ہے یہ آج اس نے دوسری بار جانا تھا۔ جیسے تیسے اپنے لاشے کو گھسیٹ کر جان ٹموتھی کے کمرے کے وسط میں لا کھڑا کیا تھا۔

ٹیبل کے سامنے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر وہ بیٹھی مسلسل بول رہی تھی۔ کیا بول رہی تھی وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اپنی تمام حسیات کو اس کی طرف متوجہ

کرنے کے لیے اسے بہت کوشش کرنی پڑی تھی۔
جس بات کو وہ سب سے چھپائے ہوئے تھا آج اس کا اشتہار لگنے والا تھا۔ وہ ساکت وجامد تھا لیکن وہ بول رہی تھی کاش کوئی اسے چپ کرواسکتا اس کی قوت گویائی ہی سلب ہو جاتی۔
"بہت سے لوگ نبھانہ کرسکنے پر الگ ہو جاتے ہیں تو کیا وہ بچوں کو دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔" جو کچھ اس نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ آج تک خود کو بھی خود سے نظریں ملانے کے قابل نہ کرپایا تھا تو کسی کو اس بارے کیا بتاتا۔ اس لیے جو وہ کہہ رہی تھی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ مر کے بھی نہیں بتاسکتا تھا کہ وہ کیوں اسے اس سے ملنے نہیں دیتا۔
"یہ شخص جو بہت مہذب بنا پھرتا ہے دنیا کے سامنے۔" اس نے اس کی طرف انگلی اٹھائی تھی۔
"اس کا مکروہ چہرہ کیسا ہے صرف میں جانتی ہوں۔ کیسا کیسا وقت گزارا ہے اس کے گھر میں' میں نے کیا آپ اس کا اندازہ لگاسکتے ہیں۔" اس نے آنسو بھری آنکھوں سے سرجان کی طرف دیکھا جن کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہو چکی تھیں۔
"نہیں لگاسکتے کبھی نہیں لگاسکتے۔" کہتے کہتے وہ سسکنے لگی تھی۔ اور وہ منجمد کھڑا تھا اس نے کیا کہا تھا وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اور وہ عورت مگرمچھ کے آنسو بہا کر کیا ثابت کرنا چاہتی تھی اپنے بے حیائی کو آنسوؤں کے پردے میں چھپاتی بے حس عورت۔
"اس شخص نے مجھے گھر پر محصور کردیا تھا۔ اچھے کپڑے نہ پہنوں' بنوں سنوروں نہیں' مسکرا نہیں سکتی تھی میں وہاں۔ سب صحیح کہتے تھے یہ مجھے برقع پہنادے گا اگر میں وہاں کچھ اور وقت رہتی تو یہ بھی کرلیتا یہ۔"
سرجان کی مذمت کرتی نظریں اس کے اندر تک اتر رہی تھیں لیکن اسے اپنی کوئی صفائی نہیں دینی تھی۔ وہ مجرم نہیں تھا مگر کٹہرے میں کھڑا تھا اور مجرم اس پر الزام لگارہا تھا اس نے سر جھٹک کر اس سچویشن سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار پھر اسے اذیت کے جہنم میں دھکیلنے کے بعد وہ وہاں سے جاچکی تھی نا جانے اس شرپسند عورت کو کیسے معلوم ہو جاتا تھا کہ اب وہ سکون سے ہے۔ شام تک اسی کمرے میں بیٹھے بیٹھے وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قاصر رہا تھا۔
"کیا ایک بار پھر وہ اسے نا بھولنے والی اذیت دینے والی تھی علی کو اس سے چھین کر۔" اور اس سے آگے سوچنا اس کے بس میں نہیں تھا۔
"یار آج بہت دیر ہو گئی تمہیں ہم تو انتظار کر کے تھک گئے۔" موبائل کی مسلسل بجتی بیل کو نظرانداز کرنا اب ممکن نہیں رہا تھا سو اس نے فون اٹھالیا تھا۔ دوسری طرف رحمان اللہ تھے۔
"آرہا ہوں۔"
"جب محبت جتانے کا وقت تھا اس وقت تو محبت جتائی نہیں اور اب...." تلخ سوچیں پھر سے اس کے اندر بھرنے لگی تھیں۔ گاڑی کی چابی اٹھاتے' وہاں سے نکلتے وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ شاید اسے علی کو بتانا ہوگا۔ اس کی ماں کے بارے' اس کے تقاضوں کے بارے۔ اب جب کہ وہ ارحمہ کے ساتھ بہت خوش تھا اس کا رونا' خاموشی بے چینی ختم ہو چکی تھی ایک بار پھر سے.... اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے کیسی گرہیں لگائی تھیں کہ اب منہ سے بھی کھل نہیں رہی تھیں۔ وہ ایک بار پھر سے اس کا سکون غارت کرنے کے بعد جاچکی تھی اور لامحدود سوچیں اس کا مقدر کر گئی تھی۔
"مجھے معاف کردو میرے بیٹے۔" سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑاتے اسے گھر جانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اور آیا تھا تو بہت دیر ہو گئی تھی۔
"کوئی اندازہ ہے کتنے پریشان بیٹھے ہیں ہم دونوں۔" گھر میں داخل ہوتے اسے بالکل علم نہیں تھا کہ اس کا واسطہ اس صورت حال سے پڑنے والا ہے۔ علی سوچکا تھا اور وہ دونوں جاگ رہے تھے۔
"فون تو بند نہ کرتے کم از کم بتا ہی دیتے۔"
"کیا بتادیتا.... یہ کہ اس کی ماں اس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے اور اس ملک میں اس سے اس کا حق

ل چھین نہیں سکتا۔ یا یہ کہ میں ایک بار پھر ناکام ہرا ہوں نامراد' اکیلے اس کی پرورش کرتے' اس کے لیے خود کو بھولتے یہ بھول گیا تھا کہ وہ کبھی بھی اس کو لے جاسکتی ہے۔" ان کے سامنے وہ پھٹ پڑا تھا اکیلے سہتے اب اس میں مزید سہنے کی تاب نہیں تھی۔ وہ لوں اپنی اپنی جگہ پر سن ہوگئے تھے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے اس نے ان دونوں کو بے حس و حرکت اپنی زاویے میں بیٹھے دیکھا تھا۔

"ابا جی پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا ئیں اوپر چلتے ہیں۔" انہیں تسلی دیتے ان کے کمرے میں چھوڑتے وہ اپنے بیڈروم میں آگئی۔ وہ ان ہی کپڑوں کے ساتھ بیڈ پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہا تھا بغیر آواز کے چلتا ٹی وی اور غیر مرئی نقطے پر جمی اس کی نظریں' اس کی پریشانی ایک پل میں اسے بھی پریشان کرگئی تھی وہ بھی تو علی کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

"اللہ کسی بھی انسان پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا...... پریشان نہ ہوں ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا علی ہمارے پاس ہی رہے گا۔" اس کے پاس بیٹھتے اس نے جیسے اسے تسلی دی تھی۔ خالی خالی نظروں سے وہ اس کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کا سب سے قیمتی سرمایہ اس سے چھن رہا تھا جو اس نے اپنی زندگی کی ساری خوشیاں دے کر پایا تھا۔

"اس عورت نے..... اس عورت کو تم جانتی نہیں ہو وہ ایک ناگن ہے..... اس نے مجھ سے محبت کا ڈھونگ رچایا اور دو دن کے بچے کو روتا ہوا میرے دروازے پر پھینک کر چلی گئی......" اس کا اپنا آپ جیسے اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ ناجانے اس کے سامنے کیوں بول رہا تھا مگر سچ سنبھالے سنبھالے وہ تھک گیا تھا۔ اس نے اس جواں مرد کو دیکھا جو خود کلامی کے سے انداز میں اسی سے مخاطب تھا۔ ابا کی زبانی ان کی اپنی اولاد سے سختی کا سن چکی تھی اور اب..... اس نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا..... کوئی عورت اس قدر بے حس بھی ہوسکتی ہے وہ بول رہا تھا اور وہ اسے سن رہی تھی۔ "اس سے شادی میری غلطی تھی

مگر ایک ایسا شخص جو اپنے گھر میں نامناسب رویوں کا شکار رہا ہو اسے ایسے ہی حالات کا ستایا فرد اپنے جیسا ہی تو لگتا ہے مجھے بھی وہ ایسی ہی لگی تھی لیکن وہ میرے جیسی نہیں تھی وہ تو ہوس کی پجاری تھی اپنی شرط جیتنے کے لیے اس نے مجھے میری ہی نظروں سے گرادیا۔" بولتے بولتے ناجانے وہ کب سویا تھا اور وہ اللہ سے دعا کرتے پریقین تھی کہ سب بہتر ہونے والا تھا۔

لیکن علی کو بتانے سے پہلے ہی کچھ ایسا ہوگیا تھا کہ وہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کام جو وہ نہیں کرسکا تھا کسی اور نے کردیا تھا۔ اس کی عزت کا جنازہ نکالنے کے بعد وہ کتنے سکون سے عیش کرتی رہی تھی اور وہ کچھ بھی نہیں کرسکا تھا۔ کچھ بھی نہیں کرسکا تھا وہی کام کسی اور نے سرانجام دے کر پایہ تکمیل تک پہنچادیا تھا۔



ڈینیل جسے اپنی گرل فرینڈ بتا رہا تھا وہ اس کی بیوی روزی تھی جس کے پیسے پر وہ خود بھی عیش کررہا تھا اور ساناں کو بھی کروا رہا تھا۔ دونوں دونوں ہاتھوں سے روپیہ لٹاتے اور جھوٹ پر جھوٹ بولتے وہ ذرا بھی نادم نہیں تھا۔ روزی نے کئی بار اسے ساناں کے ساتھ دیکھا تھا اور اسے سب کچھ بتادیا تھا مگر ساناں پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ ساناں کو روز شادی کا چکمہ دیتے اور روزی کو دھوکا دیتے وقت وہ شاید یہ بھول گیا تھا کہ روزی کوئی عام روتی دھوتی عورت نہیں تھی بلکہ ایک بااختیار عورت تھی اس نے ساناں پر تیزاب پھینک دیا تھا۔ ایک ہی جھٹکے میں اس کی ساری اکڑفوں نکال باہر کی تھی۔ اسے بے عزت کرنے کے بعد اس پر تیزاب پھینکتے نہ اسے دکھ تھا نہ ملال۔ اور ساناں اپنے چہرے کی بدصورتی کو قبول ہی نہیں کرسکی تھی بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ خوب صورتی کا مرقع' سانچے میں ڈھلا وجود' اب نہیں تھا۔ بدصورتی' ظاہری بدصورتی وہ برداشت نہیں کرپائی تھی اور خود کو ختم کرلیا تھا اس کی زندگی کا بھیانک اور سیاہ ترین باب خود بخود بند ہوگیا تھا۔

اسے اپنی اس دن کی بے اختیاری پر شرمندگی ہوئی وہ ناجانے اس کے سامنے کیا کچھ بولتا رہا تھا۔ وہ سب کچھ جو اس نے اپنے باپ اپنے عزیز دوست کو بھی نہیں بتایا تھا اسے بتادیا تھا۔ وہ اس کی کیا تھی ہاں شاید وہی اس کا سب کچھ تھی۔ راستہ تو جانے کب کا صاف ہوچکا تھا بے اختیاری میں اٹھنے والے قدم اب اختیار چاہتے تھے۔

ساناں کے پاس جینے کی کوئی وجہ نہیں رہی تھی وہ ہمیشہ غلط تھی اس نے تسلیم کرلیا تھا۔ زندگی کو کھلونا سمجھنے والی ساناں خود کھلونا بن گئی تھی۔ علی کو لینے کی اس سے ملنے کی کوشش اس کی خود کو سہارا دینے کی آخری کاوش تھی اس کے بعد اندھیرے اس کا مقدر بن گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"پلانک" لگاتے اس کا دھیان گنتی پوری کرنے پر تھا۔ اور وہ اپنی دھن میں اندر آتی اس کے ساتھ ٹکراتی' ہاتھ میں پکڑے کپڑوں کے ساتھ سامنے پڑے بیڈ پر ڈھیر ہوگئی تھی۔ کمرہ چھوٹا تھا جگہ تنگ تھی دروازے کے سامنے ہی صرف اتنی جگہ تھی کہ ورزش کی جاسکتی تھی عجیب مضحکہ خیز صورتحال تھی اس کے خیال میں وہ اس وقت گھر سے باہر تھا سو ہر جگہ دندناتی پھررہی تھی وہ اس کے ٹکرانے سے ایک طرف گرگیا تھا اور ابھی تک اس نے وہاں سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

بیڈ سے اٹھتے اس نے شرمندگی سے اسے دیکھا جس کا غصہ اس وقت عروج پر ہونا چاہیے تھا مگر وہ مزے سے نیچے لیٹا جیسے سچویشن انجوائے کررہا تھا سلیولیس شرٹ پسینے سے تر تھی۔ کسرتی جسم بہت زیادہ کسرت کا عادی دکھائی دیتا تھا بیڈ سے کھڑے ہوتے اس نے اس کی زیرلب مسکراہٹ دیکھی تھی وہ مسکرا رہا تھا۔

خجل ہوتے اس کا اس کمرے سے بھاگ جانے کو دل چاہا تھا ایک کمرہ دادا پوتے کے استعمال میں تھا دوسرا ان دونوں کے تصرف میں تھا اور یہ تیسرا کمرہ خالی تھا اس لیے اس نے سوچا تھا اس میں فالتو چیزوں کو رکھ دے۔

"وہ میں یہاں کپڑے رکھنے آئی تھی۔" اب وہ کھڑا کانوں سے ہیڈ فون اتار رہا تھا۔ ناجانے وہ کیا سنتا رہتا تھا۔ اس کے پاس سے گزرتے وہ الماری کی طرف گئی تھی کپڑے الماری میں ٹھونسنے کے انداز میں رکھتے اسے یہاں سے نکل جانے کی جلدی تھی۔

"کیا اس طرح گھورنا ضروری ہے۔" الماری کھولتے اس نے اس کی نظروں کو خود پر محسوس کیا تھا اور کپڑے رکھنے کی جلدی میں سارے کپڑے نیچے ڈھیر ہوگئے تھے۔ وہ بلاارادہ ہی مسکرایا تھا سرسری نگاہ سرسری نہیں رہ سکی تھی' بالوں کی ڈھیلی پونی' لمباقد' دبلا پتلا جسم' گھریلو حلیہ عام سے حلیے والی لڑکی میں کوئی خاص بات تھی شاید "سادگی" وہ دروازے کے وسط میں راستہ روکے کھڑا تھا۔

"میں تو بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں کیا آپ نہیں تھکیں۔" اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے وہ اس کا منتظر تھا ہولے سے سہلاتے اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ دونوں لان میں فٹ بال کھیلتے ارحمہ کے منتظر تھے اور ارحمہ کے قدم سے قدم ملاتے ہنستے قطب کو دیکھتے وہ دونوں حیران ہونے کے ساتھ خوش ہوگئے تھے۔

روشن صبحیں' خوشگوار شامیں ان کی منتظر تھیں۔ وقت خوشی کا ہو یا غم کا گزر ہی جاتا ہے اس کا بھی گزر گیا تھا۔

☆ ☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل	انعم فیاض
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

طیبہ عنصر مغل

محبت ہماری

"یہ کیا ہے بھئی!" اتنی دیر سے فریج کو ہر طریقے سے کھولنے کی کوشش ناکام ہونے پر اماں نے زور سے چلا کر کہا۔ فضا جو پاس ہی کھڑی دیکھ رہی تھی۔

"فریج ہے اماں!" کہہ کر ہنس دی۔

"اف توبہ! سوہا کی بچی ایک گلاس پی لیا تو کیا قیامت آجائے گی۔" فضا نے پیپسی کی بوتلوں کی قطار کو ندیدے انداز میں گھورتے ہوئے کہا۔

"تو اور منگوالونہ! یہ تو میرے پیسوں سے منگوائی گئی ہیں، خالص میری جیب خرچ کی قربانی ہے' یہ بہت ہی خاص لوگوں کے لیے ہے۔" سوہا نے فریج کے آگے ہاتھ پھیلا دیے۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارے....." فضا نے منہ پھلا لیا۔

"بے ادب لڑکی مجھے بھاڑ میں بے شک ڈالو، لیکن ان کے لیے ایک لفظ نہیں....." سوہا نے غصے سے فوراً "اسے ٹوکا" تو فضا پیر پٹختے ہوئے لاؤنج کی طرف چل دی۔ اور سوہا نے بھی فریج کو لاک لگا کر چابی کو ہوا میں اچھالتے ہوئے پکڑا اور مسکراتی ہوئی اندر کو چل دی۔



"اندھی نہیں ہوں میں اور نہ ہی پہلی بار دیکھا ہے' جو تم سے پوچھوں گی کہ فریج کا نام کیا ہے؟ میں تو پوچھ رہی تھی کہ یہ کھل کیوں نہیں رہا ہے؟" اماں نے فضا کی کھی کھی پہ دو ہتڑ لگا کر بریک لگوائی۔

"تو سیدھی طرح یہ پوچھیں نا۔ آپ بھی فہد مصطفیٰ کی طرح گھما گھما کے آسان سوال مشکل بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اور فریج کو کچھ نہیں ہوا' سوہا بی بی نے لاک لگا کر چابی چھپا دی ہے۔" فضا جلدی جلدی بتانے لگی' تاکہ اماں کی تفتیش میں اگر یہ بھی شامل ہو گیا کہ فہد مصطفیٰ کون ہے؟ تو وہ کیا کرے گی کہ امی تو پی ٹی وی کے علاوہ کچھ دیکھتی نہ تھیں۔ ہاں اگر طارق عزیز کا نام لے لیتی تو اماں جھٹ سے بوجھ لیتیں۔ (نسل کا فرق)

"اس نامراد کو بولو کہ چابی دے ڈالے' ورنہ میں۔۔۔" اماں نے دھمکی دی۔

"اماں میری پیاری اماں سوہا تو کالج چلی گئی ہے۔" فضا نے ڈرتے ڈرتے اماں کو بتایا' کیونکہ وہ اکثر چھٹی کر لیتی تھی' آج بھی چھٹی کر کے بیٹھی تھی۔

"لیکن اب فریج کیسے کھولوں۔ وہ نا ہنجار تو تین بجے سے پہلے آنے کی نہیں اور مجھے گوشت نکالنا ہے۔ تمہارے ابا کو کھانا بھی بھیجنا ہے۔ دیر ہو گئی تو بہت خفا ہوں گے۔ معلوم تو ہے بھوک کے بہت کچے ہیں۔" اماں نے پریشان ہوتے ہوئے کیبنٹ میں سے دال اور چاول کے مرتبان نکال لیے۔ وہ چاول پرات میں نکالنے ہی لگی تھیں کہ فضا نے گوشت کا پیکٹ کاؤنٹر پہ دھر دیا۔

"تم نے کیسے کھول لیا فریج؟ مطلب چابی تمہارے پاس تھی اور میں خواہ مخواہ کب سے ہلکان ہو رہی ہوں۔" اماں نے اسے گھورا۔

"اللہ معافی! اماں میں نے ہرگز چابی سے فریج نہیں کھولا اور نہ ہی چابی میرے پاس ہے۔" فضا نے کان پکڑے۔

"تو بی بی جادو سیکھ لیا ہے۔ اس سے کھول لیا ہے۔ ماں ہوں تمہاری' بناؤ مت۔" اماں کا طنز فضا کو ہضم نہیں ہوا۔

"جی اماں جادو سے! اس کے جادو سے۔" اس نے باریک نوک والی چھری اٹھا کر اماں کو دکھائی تو اماں کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔



"فضا کی بچی!" سوہا زور سے دھاڑی۔

"بہتان باندھنے والو! اللہ سے ڈرو۔ ابھی تو میں کنواری دوشیزہ ہوں اور تم بچی کی بات لے بیٹھیں۔" فضا جو مزے سے صوفہ کم بیڈ پہ لیٹے ڈائجسٹ کی ورق گردانی کرنے میں مصروف تھی۔ مسخرے پن سے بولی۔

"مجھے بتاؤ کولڈ ڈرنک کی پوری دو بوتلیں کم ہیں اور یہ تمہارے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔ مجھے بتاؤ موٹی کہ تم نے کیسے فریج کھولا اور دو اتنی بڑی بڑی بوتلیں کیسے ہڑپ کر ڈالیں۔" سوہا سر پکڑ کے فریج کے سامنے یوں بیٹھی تھی جیسے اس کا خزانہ لٹ گیا ہو۔

"کنجوس عورت! تم خود سوچو کہ چند گھنٹوں میں اتنی ساری کولڈ ڈرنک میں کیسے پی سکتی ہوں۔ اوپر سے یہ موٹی کس کو بولا؟" اس نے اپنے نازک سراپے پہ نظر ڈالی۔

"موٹی ہو گی تم۔ بھیا کے دوست آئے تھے اور پیٹ پوجا کے ساتھ۔ دو ڈیڑھ لیٹر کولڈ ڈرنک کی بوتلیں بھی ان ہی کی توندوں میں اتری ہیں۔ تم نے گنتی درست سے نہیں کی' میں نے تو بس تیسری والی کو بچے کھچے پزا کے ساتھ چکھا ہے۔" وہ ادائے بے نیازی سے اپنا کارنامہ سوہا کے گوش گزار کر رہی تھی۔

سوہا جو اس کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور قریب تھا کہ وہ فضا پہ جھپٹ پڑتی۔ لیکن فضا کی اگلی بات نے اس کے ابلتے ہوئے انڈے جیسے دل پہ ٹھنڈا ٹھار پانی ڈال دیا۔

"سوہا! کیپٹن شازل والی کہانی شائع ہوئی ہے اس بار ڈائجسٹ میں۔ اف کیا غضب کی پرسنالٹی بتائی ہے مصنفہ صاحبہ نے کہ۔۔۔" اس سے پہلے کہ فضا مزید

بتاتی سوہا نے ڈائجسٹ اس کے ہاتھ سے اچک لیا اور یونیفارم بدلے بغیر وہ بھی صوفہ کم بیڈ پہ ڈھیر ہو گئی۔ فضا نے اپنا کام کر دیا تھا۔ اب سوہا کو اپنے خسارے کا غم یاد کہاں رہنا تھا۔

اپر مڈل کلاس گھرانا جو متمول گھرانوں کی صف میں آتا تھا تو زیادہ تر اس میں اماں کے طریقے سلیقے کا کمال تھا۔ ابا ایک سرکاری ادارے میں اچھے عہدے پہ تھے۔ اور اماں کو ہر کام میں بچت کی عادت تھی۔ بچے بھی تین ہی تھے۔ اب تو بڑا جہاں زیب بھی ایم بی اے کر کے اچھے ادارے میں ملازمت کر رہا تھا' جبکہ فضا اور سوہا دونوں جڑواں تھیں۔ لیکن سوہا اپنے پانچ منٹ بڑے ہونے کا خوب فائدہ اٹھاتی تھی۔ دونوں ہی بی اے کی طالبہ تھیں اور ابا کی طرح دراز قد اور اماں کی طرح خوب صورت نقش و نگار کی مالک تھیں۔ آپس میں پیار اگر دل میں تھا تو لڑتی بھی خوب تھیں۔ ایک جیسے قدو قامت کا فائدہ جم کے اٹھاتی تھیں۔ بلا تکلف ایک دوسرے کے کپڑے استعمال کرتی تھیں اور اسی بات پہ تو تو' میں میں' بھی کرتی تھیں۔ بہت زیادہ شوق ایک جیسے تھے۔ ڈائجسٹ پہلے پڑھنے کی جلدی دونوں کو ہوتی تھی اور نتیجتاً" سر جوڑے اکٹھے پڑھ رہی ہوتی تھیں۔ بس ایک بات تھی جس پہ دونوں کی پسند میں مماثلت نہ تھی۔ تو وہ تھا آئیڈیل۔

فضا اگر ٹی وی اداکاروں کی مداح تھی' محض مداح' تو سوہا کو آرمی کے جوانوں سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کی فیملی کیا اس کی کسی دوست کی فیملی میں بھی دور' دور تک فوجی جوانوں کا نام و نشان نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم آج پھر اتنے لیٹ آئے شازل۔" اس نے پیار بھری مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ فوجی یونیفارم میں شازل کا دراز قد اور بھی دراز لگ رہا تھا۔ اتنی سخت ڈیوٹی کے باوجود اس کے چہرے پہ تھکن کے آثار نہ تھے۔ سرخ و سفید رنگت پہ مونچھوں تلے وہ دبی دبی مسکراہٹ اور آنکھوں میں والہانہ پیار لیے وہ سوہا کو لوٹ لینے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"جان من! ڈیوٹی بھی تو ضروری ہے نا اور ہم آرمی کے جوان تو ہر پل حالت جنگ میں ہی رہتے ہیں۔ اور تمہیں مجھ سے گلہ کیوں ہوا۔ سارا دن تو واکس ایپ پہ تمہارے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔ جہاں بھی رہوں رابطہ رکھتا ہوں۔" اس کے جذبے لٹاتی بھوری آنکھیں سوہا کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ سوہا نے شرما کر سر جھکا لیا۔ چلو اب ایک کپ چائے کا دو' پھر میں فریش ہو لوں تو ڈنر باہر کرتے ہیں۔"

"اٹھ جاؤ سوہا بی بی! چائے بنا کے دو سب کو' پھر رات کا کھانا بھی بنانا ہے۔" فضا اس کی بڑبڑاہٹ کو کان لگا کے سمجھنے کی کوشش میں ناکام ہوئی تو اس کو جھنجوڑ کر جگانے لگی۔

"تم بھی نا! فضا نہیں فتنہ ہونا چاہیے تھا تمہارا نام' ابھی تو شازل نے فریش بھی ہونا تھا۔" وہ شاید ابھی بھی اپنے خواب کے زیر اثر تھی۔

"اوہ! تو یہ بات ہے۔" فضا نے اس کے پہلو میں گرے ہوئے رسالے کو دیکھا۔ "محترمہ یہ خواب تھا اور شازل میاں ابھی ڈائجسٹ میں سے برآمد نہیں ہوئے اور ان کی ہیروئن فائزہ بھی اسی ناول میں موجود ہیں۔ لہٰذا آپ کی غیر ضروری مداخلت پہ شازل صاحب آپ کو گولی سے اڑا بھی سکتے ہیں۔"

"اڑا لو! اڑا لو مذاق' لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ عنقریب مجھے میرا آئیڈیل دستیاب ہو جائے گا۔" سوہا نے منہ بسورتے ہوئے اٹھ کر کپڑوں کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے کہا۔

"جی بالکل! آپ کی ٹھنڈی ٹھار کولڈ ڈرنکس سے متاثر ہونے والے کام کے لیے' نہیں بلکہ آپ ہی کے لیے تو آ رہے ہیں۔" فضا نے سوہا کو چڑایا۔

"جی تم دیکھنا ایسا ہی ہو گا۔ ویسے فضا ہمیں تو آج کل کالج سے فراغت ہے۔ آخر کب شروع ہو گی ہمارے شہر میں مردم شماری۔" چائے کے لیے پانی چولہے پہ رکھتی سوہا نے فضا کی طرف دیکھا تو فضا نے

اس کی آنکھوں میں امیدوں کے جلتے چراغوں کی لو کے سامنے چولہے میں جلتی آگ کی روشنی بہت کم لگی۔ وہ اس کی نسبت حقیقت پسند تھی' لیکن اس کو سوہا کا دل توڑنا بھی گناہ لگا۔ سو مذاق میں بات کو ٹالنا چاہا۔

"جب تک تمہاری کولڈ ڈرنکس کی ڈیٹ ایکسپائر نہیں ہو جاتی فوجی بھائی نہیں آنے والے میری سویٹ بہنا!"

"دفع ہو جاؤ! کبھی کوئی اچھی بات منہ سے نہ نکالنا۔" سوہا نے کھلکھلا کر فضا کو جھانپڑ رسید کیا۔ فضا نے اس کی کھلکھلاتی ہنسی میں اپنی ہنسی شامل کی اور دل میں اس کی مرادوں کے پورا ہونے کی دعا بھی.....



اماں کو تو ان دنوں نئی مصروفیت نے گھیر رکھا تھا۔ بقول فضا کے اماں آج کل بھیا کے لیے لڑکی شکاری کی مہم پر ہیں۔ روز ہی کہیں نہ کہیں چلی جاتی تھیں بوا حمیدن کے ساتھ۔ بھیا کے لیے دلہن تلاش کا کام اتنا مشکل بن گیا تھا کہ اماں کو اپنے بیٹے کے لیے کوئی لڑکی پسند نہیں آرہی تھی' تو کبھی کوئی گھرانہ اچھا نہ لگتا۔ فضا کو اماں پہ غصہ تو بہت آیا تو ایک دن وہ بھی اماں کے ہمراہ ہولی کہ اماں خواہ مخواہ لڑکیوں کو ری جیکٹ (رد) کر رہی ہیں۔ لیکن اس دن اس پہ بھی یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ اماں بھی ہرگز غلط نہ تھیں۔ بھلا ہو جدید ٹیکنالوجی کا۔ بوا حمیدن اپنے موبائل میں جو تصویریں لے کر آتی تھیں' وہ دیکھ کے بندہ سوچ میں پڑ جائے کہ اتنی آفت قسم کی لڑکی اب تک والدین کے گھر پہ کیسے رہ گئی' لیکن جب روبرو اس حسینہ کو اپنی گناہ گار آنکھوں سے (فضا کے بقول) دیکھا تو سوچا کہ بھیا سلام ہے ایڈیٹنگ کرنے والے کو یا فون میں اس سہولت کو ڈالنے والے کو چڑیل کو پری بنا دیتے ہیں۔

آج بھی وہ اماں کے ساتھ کامیاب معرکہ کر کے واپس آئی تھی۔ بالآخر بھیا کے لیے وہ گوہر نایاب مل ہی گیا تھا' جس کی تلاش میں سارا شہر چھان مارا تھا۔ گھر پہنچنے پہ ایک اور حیران کن خبر اس کی منتظر تھی۔ بالآخر سوہا بی بی کے خصوصی مہمان تشریف لے آئے تھے اور نہ صرف تشریف لائے تھے بلکہ بھیا نے ان کو ڈرائنگ روم کی زینت بھی بنا دیا تھا اور سوہا صاحبہ اپنی حق حلال کی پاکٹ منی سے خریدی گئی ٹھنڈی ٹھار کولڈ ڈرنک کے ساتھ ساتھ اماں کے فریز شدہ کباب بھی تل چکی تھیں۔

اب تو سوہا کے ساتھ ساتھ فضا کو بھی فوجی جوان کو دیکھنے کا تجسس در آیا تھا۔ جلدی جلدی ٹرالی سیٹ کر کے بھیا کے حوالے کر کے دونوں ڈرائنگ روم سے ملحق باتھ روم میں گھس گئی تھیں۔ اگلے مرحلے کا لائحہ عمل بھی طے کر لیا تھا کہ سوہا کو کیسے ڈرائنگ روم میں پہنچانا تھا۔

بلامبالغہ ٹشو پیپرز کے تین ڈبے ختم ہو چکے تھے اور اب فضا ٹشو رول پھاڑ پھاڑ کر سوہا کے حوالے کیے جا رہی تھی' لیکن سوہا کے آنسو اور ناک کا آبشار تھا کہ رک ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو اچھا تھا' اماں ہمسائیوں کے گھر عیادت کو گئی ہوئی تھیں۔ ورنہ اس بن بادل برسات کو بند کرنے کے لیے برانڈڈ چپل استعمال کی جاتی۔ اماں نے تو اس کام کے لیے برانڈڈ چپل (مطلب ٹوٹی ہوئی چپل) باقاعدہ سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔

تو ماجرا کچھ یوں تھا کہ باتھ روم کے بند دروازے میں سے جھری بنانے سے پہلے فضا نے سوہا کو خوب حوصلہ دیا کہ بے ہوش نہیں ہونا ایکٹنگ کرنی ہے بے ہوشی کی' تاکہ وہ جلدی سے بھیا کو بلائے اور با آواز بلند بتائے اور فوجی تو ہوتے ہی ملک و قوم کی خدمت کے لیے ہیں۔ یقیناً" مدد کو آئیں گے اور پھر پہلی نظر میں' ہی نک سک سے تیار اور ہلکے پھلکے میک اپ (نو میک اپ لک) والی سوہا کو فوراً" ہی دل نہ دیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

لیکن یہ کیا سوہا جس نے پہلے "فوجی جوان" کو دیکھنا تھا۔ وہ تو چند لمحوں کے لیے یا منٹ بھر کے لیے سکتے میں ہی چلی گئی تھی۔ فضا نے جلدی سے چٹکی کاٹی تو سوہا بی بی کا سکتہ تو ٹوٹ گیا' لیکن آنسوؤں کی جھڑی جو لگی تو تھمنے میں نہ آئی۔ فضا نے سوہا کو دھکیل کر اس وجیہہ جوان کو دیکھنے کے لیے سر آگے کیا اور آنکھ

بھری سے لگا دی۔ (بھئی دیکھنا تو بنتا ہے' لگتا ہے شازل سے بھی اوپر کی کوئی چیز ہے' جو سوہا بی بی کو پہلے سکتہ ہو گیا اور اب خوشی سے ساون کی جھڑی لگ گئی۔)

لیکن یہ کیا؟ دو سویلین کے ساتھ ایک عدد آرمی کا جوان' جو ادھیڑ عمر تھا اور اس کی وردی میں سے کوئلے کی کان کا گمان ہونا کچھ غلط نہ تھا' ایک درمیانے قد کا ادھیڑ عمر فوجی جو صرف وردی سے ہی ڈائجسٹ والا جوان تھا۔ منہ پہ کرختگی لیے بیٹھا تھا اور سوہا کی ٹھنڈی ٹھار کولڈ ڈرنک سے لے کر کسی بھی چیز کو نگاہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھ رہا تھا' گویا ہر چیز میں زہر ملا ہوا نہ ہو۔ بلکہ سویلین تو کھانے پینے سے شغل فرماتے ہوئے کوئی دسویں بار سوہا کے نام کو غلط حروف میں لکھ چکے تھے اور اب بھیا نے تنگ آ کر رجسٹر پہ اپنے ہاتھ سے سوہا کا نام لکھا تھا۔

شاید فضا کا انہماک ابھی بھی جاری رہتا یا وہ غور و خوض میں مصروف رہتی کہ ہو سکتا ہے کہ کمانڈوز کی طرح حلیہ بدلنے کو کالک مل کے نہ آئے ہوں' پر بھلا ہو سوہا کا کہ دھڑام کی آواز سے ہاتھ ٹب میں جمع کیے ہوئے پانی میں غوطہ لگانے لگی تو فضا کے ہاتھوں پاؤں پھول گئے۔ کھینچ کھانچ کے بیڈ روم تک لائی تو بی بی بے ہوش تو ہر گز نہیں ہوئیں۔ البتہ تب سے اب تک رونے کا شغل فرما رہی تھیں اور بالآخر اس شغل کا اختتام برانڈ ہی سے ممکن بنا۔

کافی دن سوگ کی کالی گھٹا نے سوہا بی بی کو اپنے گھیرے میں لیے رکھا اور شاید یہ آگے بھی جاری رہتا۔ مذاق تو نہیں تھا۔ لڑکی کا معصوم سا دل ٹوٹا تھا۔ فضا کی ہزار جتن کاوش بھی سوہا کی کھلکھلاتی ہنسی کو واپس نہیں لا پائی تھی اور تو اور فضا نے اس کی کولڈ ڈرنکس پہ ہاتھ صاف کرنا بھی چھوڑ دیا۔ اپنے سارے نئے جوڑے' میچنگ جوتے' ہر چیز اس کو دینے کی کوشش کرتی' لیکن سوہا کا تو ہر شوق جیسے مر گیا تھا۔ ڈائجسٹ کا ڈھیر جو ہر مہینے کی ابتدا میں ہی سوہا ختم کر کے دم لیتی تھی' اب ایک نگاہ غلط انداز بھی ان پہ نہ ڈالتی۔ خاموشی سے گھر کا کام کیے جاتی۔ مصروف نہ ہوتی تو گھنٹوں ایک ہی جگہ بیٹھ کر خلاؤں میں گھورتی رہتی۔

بہت دن تک فضا اس کا یہ انداز دیکھ کر دل جوئی کی کوشش کرتی رہی۔

اب تو اماں کو بھی تشویش ہونے لگی تھی' انہیں لگا کہ سوہا کو نظر لگ گئی ہے۔ وہ تھی بھی تو اتنی حسین اوپر سے اداسی نے اس کے چہرے پہ ایک عجیب سا حسن بکھیر دیا تھا۔ فضا کو حیرت ہوتی کہ خوشی سے نکھرتے ہوئے تو دیکھا تھا لوگوں کو۔ یہ کیسی سوگواری ہے۔ کیسا حزن ہے' جس نے سوہا کی خوب صورتی کو دوچند کر دیا تھا۔

"تمہیں اگر اپنے سوگ سے فرصت مل جائے تو دیکھنا کہ تمہارے آس پاس بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو تم سے جڑے ہیں' جو تمہاری مسکراہٹ کے لیے جتن کرتے ہیں' جو زندہ ہیں' خواب نہیں۔ حقیقت ہیں۔ تم کب اس بات کو تسلیم کرو گی کہ ہر خواب سچا نہیں ہوتا۔ بند آنکھوں سے دیکھے گئے سپنوں کی تعبیر بھی ضروری نہیں' سچ ہو۔ تم تو کھلی آنکھوں کے سپنوں کو سچ سمجھ بیٹھی۔ کبھی دیکھا کہ ہمارے اکلوتے بھیا کی شادی کی خوشیاں بھی مانند ہو رہی ہیں۔ تمہارے اس خود ساختہ جوگ سے اور سوگ سے۔ ہمارا بھائی جو ہم پہ جان لٹاتا ہے' اس کی خوشیوں کا کیا؟ اماں جو اتنی تندہی سے بھیا کے لیے لڑکی تلاش کرتی رہیں۔ اب کتنی بددلی سے تیاری کر رہی ہیں۔ ابا تک کو تشویش ہے کہ تم پہلے جیسی کیوں نہیں ہو۔ فرض کرو کہ اس دن آنے والا فوجی تمہاری خواہش کے مطابق بھی ہوتا' لیکن اگر وہ شادی شدہ ہوتا تو تم کیا کرتیں۔ تم بہت خود غرض ہو سوہا۔ بہت خود غرض....."

فضا غصے میں بولتی چلی گئی۔

"ہاں میں ہوں خود غرض! مجھے ویسا کیوں نہ ملے جیسا میں نے چاہا۔ آخر جو سب ہم پڑھتے ہیں وہ پورا سچ نہیں ہوتا تو جھوٹ بھی نہیں ہوتا۔ پر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ میری دوست فوزیہ کے گھر تو شازل جیسا ہی بندہ آیا تھا اس نے بتایا تھا مجھے فضا!"

"سوہا مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ تم حقیقت سے نظریں چرا رہی ہو۔ اگر فوزیہ کے گھر آیا بھی تو کیا

فوزیہ کو مل بھی گیا۔" سوہا نے اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

"دیوں لڑکیوں کے گھڑے ہوئے قصے اور مذاق پہ تم اتنا آگے چلی جاؤ گی، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ کبھی آنکھیں کھول کے اپنے آس پاس کے رشتوں کو دیکھو۔ ان حقیقتوں کو دیکھو اور تم تو اپنے ایمان سے بھی منکر ہو رہی ہو۔ اگر تمہاری قسمت میں لکھا ہے تو وہ تمہیں ضرور ملے گا، لیکن یہ یقین بھی رکھو کہ تمہیں ملے گا وہی جو تمہاری قسمت میں ہو گا۔" وہ رندھے ہوئے لہجے اور نم آنکھوں کو بے دردی سے صاف کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ آج سوہا جب پھوٹ پھوٹ کے روئی تو اسے رونے کے لیے فضا کا کندھا میسر نہیں تھا۔ لیکن آج اس نے تنہا رو کر سارے ملال آنسوؤں میں بہا دیے تھے۔



"یہ ابٹن کا تھال تم اٹھا لو۔ لیکن یہ بڑے دیے والا مہندی کا تھال میں نے ہی اٹھانا ہے۔" اس نے رعب سے فضا کو حکم دیا۔

"واہ! کیوں جی تم کیا اکلوتی بہن ہو۔ میں بھی اتنی ہی بہن لگتی ہوں میڈم یہ تھال میں نے اٹھانا ہے۔" فضا نے تنک کر جواب دیا۔

"گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور تم لوگ ہو کہ بچوں کی طرح لڑے جا رہی ہو۔" اماں نے لتاڑا۔

آج جہاں زیب کی مہندی کی تقریب تھی۔ تقریب تو قریبی ہال میں منعقد ہونا تھی، لیکن پورا گھر بھی روشنی سے بقعہ نور بنا جگمگا رہا تھا۔ ہر طرف سبز اور پیلے رنگ کی بہار تھی۔ لیکن سوہا اور فضا نے اپنے لباس گلابی رنگ کے بنوائے تھے۔ دبکے کے خوب صورت کام سے مزین فرشی غرارے اور بالوں کی چٹیا گوندھ کے موتیا اور چنبیلی کے ہار چٹیا پہ لپیٹ کر ماتھے پر چھوٹی چھوٹی بندیاں ان کو سب میں اتنی انفرادیت بخش رہی تھیں کہ دور سے ہی دولہا کی بہنیں پہچانی جا رہی تھیں۔

اور آخر کار فیصلہ پانچ منٹ کی بڑائی کی بنیاد پہ ہوا، رہا جیت گئی اور جہاں زیب جو کب سے سجی دھجی بگھی میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سکھ کا سانس لے کر اپنی بہنوں کو پیار سے دیکھا، جو اب بگھی میں اس کے ساتھ سوار ہو کر جانے لگی تھیں۔

گاتے بجاتے جب یہ لوگ ہال کے سامنے پہنچے تو دلہن والے بے صبری سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ فضا تو جلدی سے اتر گئی اور جہاں زیب کا بازو پکڑ کر آگے بڑھنے لگی۔ لیکن سوہا کا بڑا سارا مہندی کا تھال جو چھ منزلہ تھا۔ اوپر سے جلتے ہوئے دیئوں سے مزین۔ آج اس کی ضد اس کو مہنگی پڑ گئی۔ اس وقت جبکہ وہ بگھی سے اترتے ہوئے تھال سنبھالتے اپنے غرارے میں پیر الجھا بیٹھی۔ اس سے پہلے کہ وہ تھال سمیت زمین بوس ہو جاتی کہ کسی کے ایک مضبوط بازو نے اس کو سنبھال لیا۔ اس کے تو حواس ہی خطا ہو رہے تھے۔ زمین پہ خیریت سے قدم رکھتے ہی اس نے غرارے سے پاؤں چھڑایا، تب تک اس کا پیارا تھال اس "ہمدرد ناآشنا" نے تھامے رکھا۔ حواس بحال ہوتے ہی اس نے تھال اس شخص کے ہاتھ سے لینا چاہا تو اسے لگا کہ آس پاس کے سارے منظر کہیں گم ہو گئے ہوں۔ سامنے سفید کرتے شلوار اور گلابی پٹکا ڈالے جو اجنبی کھڑا تھا وہ اپنی وجاہت میں اتنا ہی یکتا تھا کہ "وقت رک سا گیا تھا" دوسری طرف بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی اس سجی سجائی گڑیا کو آنکھوں ہی آنکھوں میں نہار رہا تھا۔

"شازی! یار تم کدھر رہ گئے ہو۔" ایک اور لڑکے نے آکر اس نوجوان کو ہی کہا تھا، شاید اور پھر ذومعنی انداز میں دونوں کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ سوہا نے اپنا تھال جلدی سے سنبھالا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔ کسی کی نظریں اس کو اپنی پشت پہ بھی محسوس ہوتی رہیں، ارتکاز ہی ایسا تھا۔

"اوہ! بڑا والا تھال میں لوں گی۔ پانچ منٹ بڑی ہوں تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ پانچ منٹ لیٹ بھی پہنچو

ہر جگہ اور ہم آپ کے انتظار میں سوکھتے رہیں کہ..... محترمہ بڑے تھال والی آئیں گی تو ہم قافلہ آگے بڑھائیں گے۔ دلہن والے بھی انتظار میں ہیں۔ وہ تو بھلا ہو ڈھول پیٹنے والوں کا کہ ہال کے باہر اگر وہ اپنا یہ فریضہ پورا نہ کرتے تو ہم کس بہانے ادھر ہی انتظار کرتے۔" فضا جو شروع ہوئی تو رکنا بھول گئی اور اچھا ہی ہوا سوہا کو اپنے حواس کو معمول پہ لانے کا موقع مل گیا۔

"ویسے تم تھی کہاں؟" اب فضا کے لہجے میں تشویش تھی۔

"تم منہ بند کرو تو کچھ عرض کروں۔ شکر کرو کہ دانت تڑواتے بچی ہوں۔ بگھی سے اترتے ہوئے گرنے لگی تھی۔ بچ گئی۔" سوہا نے غصے سے دانت کچکچائے۔

"اچھا! تھال کی ڈیکوریشن تو خراب نہیں کردی۔" فضا کہتے ہوئے دیے چیک کرنے لگی۔

"فضا اب یہ تھال میں تمہارے سر پر ماردوں گی۔" سوہا روہانسی ہوئی۔ "مجھ سے نہیں پوچھ رہی کہ مجھے کچھ ہوا تو نہیں۔ کہیں لگی تو نہیں۔ تمہیں تھال کی پڑی ہوئی ہے۔"

"تم نظر تو آرہی ہو بالکل صحیح سلامت' ماشاء اللہ ہٹی کٹی۔"

"بس کرو..... چلو اب آگے بڑھو۔ جہاں زیب کے ساتھ۔" اماں نے ان کے سر پر آکر دھماکا کیا تو وہ جلدی سے جہاں زیب کے دائیں بائیں چلنے لگیں۔ مووی بن رہی تھی اور فوٹو بھی بن رہے تھے۔ لیکن سوہا اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کے نہ جانے کتنے ہنستے کھیلتے پل کسی نے اپنے موبائل فون میں بڑی محبت و عقیدت سے قید کرلیے تھے۔

ندا جوان کی ہونے والی بھابھی تھی۔ ان دونوں کی پسند کے ملٹی کلر کے غرارہ سوٹ میں پھولوں بھرے جھولے پہ بیٹھی بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ جہاں زیب کو اس کے ساتھ بٹھا کر رسموں کا آغاز کیا گیا۔ ایک شرمیلی مسکراہٹ نے ندا کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔

باری باری سب نے دولہا' دلہن کے ساتھ فوٹو سیشن کروایا تو سوہا کو پتا بھی نہ چلا کہ کب وہ اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔ ہوش تو تب آیا جب فضا نے چٹکی کاٹی کہ "یہ کون حضرت ہیں" سوہا نے مڑ کر دیکھا تو سٹپٹا گئی اور جلدی سے جاکر اماں کے پہلو سے چپک گئی۔ فضا بھی کھسک لی۔ پھر پورے فنکشن میں وہ کسی کی نظروں کے حصار میں رہی۔ جانے کیوں اسے یہ اچھا بھی لگ رہا تھا اور برا بھی۔ اپنی اس کیفیت وہ کوئی نام نہ دے سکی اور فنکشن اختتام پذیر ہوا تو تھکن نے برا حال کردیا تھا۔ سو گھر جاکر کچھ بھی سوچے بغیر نیند نے اپنی آغوش میں لیا تو آنکھیں موندلیں۔



شادی والے دن بھی دونوں بہنوں کی ڈریسنگ غضب کی تھی۔ گرین اور فان کلر کے امتزاج سے سجے انگرکھے اور چوڑی دار پاجامے پہنے بالوں کے آبشار کو گھونگھریالے لچھوں میں تبدیل کرکے خوب صورت میچنگ جیولری میں دونوں ہی خاص الخاص لگ رہی تھیں۔ آج بارات والے دن سوہا نے کافی محتاط انداز اختیار کیا ہوا تھا۔ خاص طور پر وہ اس شازی نامی بلا سے بچنے کی بھرپور کوشش کررہی تھی' لیکن خود اس کی نظریں بھی اسی پہ بار بار بھٹک رہی تھیں جو بلیک کلر کی شیروانی نما شرٹ اور پاجامے میں نظر لگ جانے کی حد تک پیارا لگ رہا تھا' لیکن آج وہ کچھ زیادہ مصروف تھا اور تھکا تھکا بھی لگ رہا تھا۔

فضا نے بھی آج نوٹس کیا کہ وہ سوہا کو چوری چوری نظروں سے دیکھ رہا ہے' لیکن سوہا کے چہرے پہ اس کو ہر بار لاپروائی کا تاثر ملا۔

"ویسے یار یہ بندہ میڈیا کی نظر سے کیسے بچا ہوا ہے۔" فضا نے سوہا کے کان میں سرگوشی کی۔

"تم جاکر پوچھ لو اور مشورہ بھی دے دو کہ ٹی وی پہ کام کرے۔ چائے' دودھ' پتی' پان والے جارہے ہیں ہم یہ تو پتا نہیں کیا کرتا ہے' جو بھی کرتا ہو گا تمہاری بات

مان ہی لے گا۔" سوہا نے مسکرا کر جواب دیا۔

"گڈ آئیڈیا! میں بات کرتی ہوں۔" وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اتنی ہی پرجوش تھی کہ جا کر ابھی مشورہ دے ڈالتی۔

"ارے ارے! آرام سے واپس بیٹھو اور خبردار جو کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو......" اس نے فضا کو کھینچ کر واپس بٹھایا۔ تو وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ خیر، خیریت سے شادی کا دن نپٹ گیا اور پریوں جیسی ندا بھابھی کو پورے اہتمام سے گھر میں لائی دونوں بہنیں مسرور تھیں تو ابا اور اماں بھی اللہ کے شکر گزار ہو رہے تھے۔

ولیمہ والے دن سوہا نے سفید تو فضا نے سیاہ لباس کا انتخاب کیا تھا۔ جدید تراش خراش کے سوٹ دونوں کو ہی بہت جاذب نظر بنا رہے تھے۔ لیکن اتنی خوب صورت تقریب سوہا کے علاوہ سب نے بہت انجوائے کی۔ سوہا کو آج ان نظروں کی تلاش تھی جو اس کی متلاشی تھیں پچھلے دو دن سے۔ لیکن آج نہ تو وہ نظریں تھیں، نہ نظر والا۔ اس کے اندر ایک عجیب بے چینی تھی اور وہ بے دلی سے فنکشن میں شامل رہی۔



شادی کی تقریبات کا اختتام ہو چکا تھا۔ زندگی معمول پہ آرہی تھی۔ بھیا اور بھابھی ہنی مون کے لیے شمالی علاقہ جات چلے گئے تھے۔ سوہا اور فضا کی گریجویشن مکمل ہو چکی تھی۔ فضا کا تو مزید پڑھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، لیکن سوہا نے ابا سے یونی ورسٹی میں داخلے کی اجازت لے لی تھی اور اچھے مارکس کی وجہ سے بہت جلد داخلہ بھی ہو گیا تھا۔ ان ہی دنوں جب اس کی کلاسز شروع ہوئیں تو گھر میں ان کی شادی کی چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔

فضا اور سوہا کے لیے رشتے تو بہت پہلے سے آرہے تھے، لیکن ابا نہیں چاہتے تھے کہ گریجویشن سے پہلے ان کی شادی کر دی جائے۔ اماں نے سوہا کو خود پیار سے سامنے بٹھا کر اس سے پوچھا کہ کیا وہ شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار ہے تو اسے بہت عجیب سا لگا۔

"اماں اگر میں کہوں کہ میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں، آپ فضا کی کر دیں۔ مجھے اپنا ماسٹرز مکمل کرنا ہے۔" اس نے سر جھکا لیا اور دل پہ گرتے آنسوؤں کو آنکھوں کی منڈیر سے دور دھکیلا۔

"بیٹا فضا کے لیے بھی اچھا رشتہ آیا ہوا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے تمہارا رشتہ مانگا ہے وہ تمہاری بھابھی ندا کے خاندان سے ہیں۔ ہمیں اس کے لیے ذرا سوچ سمجھ کر انکار کرنا ہو گا۔" اماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کے اس کے پاس سے اٹھ گئی تھیں۔ لیکن اسے سوچوں کے حوالے کر گئی تھیں۔ اسے بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ شادی سے انکار آخر کیوں کر رہی تھی۔ کیا اب بھی اس کے اندر کہیں "آئیڈیل" کی خواہش باقی تھی یا آئیڈیل کے بت کے چکنا چور ہونے پہ وہ دل برداشتہ تھی۔ لیکن اب وہ ایک خوابوں میں رہنے والی لڑکی کہاں رہی تھی۔ زندگی کی تلخ و شیریں سب حقائق کو تسلیم کرنے والی ایک میچور سوچ کی حامل لڑکی تھی۔

اماں نماز پڑھ کر بیٹھی ہی تھیں کہ ندا ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ "اماں سوہا آخر شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی۔ کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔" ندا نے اپنے سیدھے سبھاؤ میں اماں سے پوچھ لیا۔ پر اماں نے اس کو تاسفانہ انداز میں دیکھا۔

"ندا مانا کہ سوہا تمہاری نند ہے، لیکن یوں اس کے بارے میں اندازے مت لگانا بیٹا! میری بیٹی سوہا کیا اور فضا کیا دونوں ہی بہت حیا دار بچیاں ہیں اور ہم نے اپنے بچوں کو دوستوں کی طرح پالا ہے، اگر ایسا کچھ ہوتا تو وہ سب سے پہلے مجھے بتاتی۔"

"سوری اماں! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں تو بس یہ جاننا چاہتی تھی کہ ہو سکتا ہے وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو تو میری وجہ سے آپ اس پہ دباؤ نہ ڈال بیٹھی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا! تم اس کی بھاوج ہو۔ ہمارے بعد تمہارے دم سے ہی ان کا میکا ہے۔ یقیناً تم ان کا برا کبھی نہیں سوچو گی۔" اماں نے بہو کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

✵ ✵ ✵

"ندا آپی آپ نے اس سے پوچھا کہ وہ انکار کیوں کر رہی ہے۔" اس نے بے تابی سے ندا سے پوچھا۔

"نہیں' مگر اماں نے پوچھا تھا' ان کو تو اس نے یہی کہا کہ ابھی وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہے۔" ندا نے مصروف سے انداز میں اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اور تمہیں اگر وہ اتنی پسند آگئی تھی تو شادی کے دنوں میں ایک بار خود پروپوز کر دیتے۔"

"کر دیتا اگر مجبوری نہ ہوتی' اگر آپ کے ولیمہ والے دن مجھے آنا "فانا" ڈیوٹی پہ نہ جانا پڑتا تو اس دن پکا کر دیتا۔ لیکن اب میں قسمت کا مارا۔ بے چارہ کیا کرتا' جب ٹھیک اسی دن مجھے روانہ ہونا پڑا۔" اس نے منہ بسورا تو ندا کی ہنسی نکل گئی۔

"لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا' اگر آپ میرا ساتھ دیں تو؟" وہ ندا کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"نہ بابا' مجھے ان کاموں میں مت ڈالو۔ پتا چلے تمہارا تو مقصد پورا نہ ہوا اور مجھے بھی سسرال میں بدنام کروا دو۔" وہ جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "مجھے معاف رکھو۔"

"واہ' میں جو آپ کی شادی پہ گدھوں' گھوڑوں کی طرح کام کرتا رہا' یاد کریں' شازی پیکو کروا دو۔ شازی یہ دوپٹے ڈائی کروا لاؤ' شازی میک اپ کے سامان کی لسٹ ہے' کیسے کیسے زنانہ کام بھی نہیں کروا ڈالے اور اب میری باری آئی تو......" وہ خالص زنانہ انداز میں کاموں کی لسٹ گنوا رہا تھا۔

"اوکے! میں کروں گی' لیکن اس کے لیے مجھے فضا اور جہاں زیب کو اعتماد میں لینا ہو گا اور صرف ایک بار میں ہی تمہیں اس کو قائل کرنا ہو گا۔ دوبارہ مت کہنا' ڈن۔"

"جی آپی ڈن ڈنا ڈن ڈن۔" وہ کھل کے ہنسا۔

✵ ✵ ✵

"فضا یہ تمہیں کیا شاپنگ کا بھوت سوار ہوا اور وہ بھی عین کھانے کے وقت۔ ایک ہی چھٹی ہے میری اور مجھے بہت سارے کام کرنے تھے۔" وہ فضا پہ جھنجلا رہی تھی۔ جو اس کو شاپنگ کے لیے گھسیٹ لائی تھی اور اب ہر دکان میں گھس کر بغیر کچھ لیے نکل پڑتی تھی۔

"چپ کرو' آج چھٹی تھی' اسی لیے لے کر آگئی ہوں۔ کل تم نے مجھے کدھر دستیاب ہونا تھا اور رہا کھانے کا سوال تو مر کیوں رہی ہو' اتنے بڑے شاپنگ مال کا فوڈ کورٹ تو دیکھنے کے لیے ہی بنا ہے نا' چلو پہلے کچھ کھا لیتے ہیں' پھر شاپنگ کریں گے۔"

اب وہ برگرز کا آرڈر دے کر انتظار میں تھیں کہ فضا کو باتھ روم جانے کی سوجھی تو سوہا کے منہ کے زاویے ایک مرتبہ پھر بگڑ گئے۔ "یہ تمہیں ہر کام بے وقت ہی کیوں سوجھتا ہے فتنہ!"

"میرا خیال ہے باتھ روم کا معاملہ ہے' کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ سو میں چلی یوں گئی اور آدھے گھنٹے میں آئی۔" وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور سوہا بس منہ بنا کر رہ گئی۔

وہ خالی دماغی سے ٹیبل کی سطح کو گھور رہی تھی کہ السلام علیکم کی آواز پہ اس کا سر اٹھا تو جھکنا بھول گیا "کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔" سوہا نے بے ساختہ اس کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ مجھے جانتی ہیں یا یوں کہہ لیں پہچانتی تو ہوں گی۔" لیکن سوہا جواب دینے کی پوزیشن میں کہاں تھی۔ وہ تو اس لمبے چوڑے فوجی کے کندھوں پہ سجے ستاروں میں گم تھی۔

"دراصل ندا بھابھی اور فضا کے تعاون سے ہی یہ ممکن ہوا کہ میں آپ سے بالمشافہ ملاقات کر سکوں اور آپ سے اس اعتراض کی وجہ جان سکوں کہ آپ مجھ سے شادی کرنے سے کیوں معترض ہیں۔ دیکھیے مجھے جلدی جانا ہو گا ہمارے لیے سنڈے منڈے سب برابر ہوتا ہے۔ میں نے تو آپ کو ندا آپی کی شادی میں ہی پسند کر لیا تھا۔ بس ولیمہ والے دن فرض آڑے آگیا آج بھی اپنے فرض میں سے اپنے دوست کے تعاون

سے وقت نکال کر آپ کے سامنے حاضر ہوں اور بہ نفس نفیس آپ سے شادی کی درخواست کا خواستگار ہوں۔" سوہا کو تو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ زبان ہلنے کو تیار نہ تھی جبکہ سامنے بیٹھا اس کے خوابوں کے شہزادے سے بڑھ کر شخص اس کو شادی کی درخواست دے رہا تھا۔

"اے ہیلو میم! میں نے اگر آپ کو شادی میں بولتے نہ دیکھا ہوتا تو سمجھتا کہ خدانخواستہ آپ قوت گویائی سے محروم ہیں۔ اوہ سوری میں اپنا تعارف کروانا تو بھول ہی گیا۔" اور سٹپٹا کر اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ میرا نام کیپٹن شاہ زمان ہے۔ پیار سے سب مجھے شازی کہتے ہیں کیونکہ میرا نام کافی بزرگانہ ہے۔ آپ مجھے میری درخواست کا جواب ابھی دینا پسند کریں گی یا راستے میں؟"

"کیا مطلب؟ وہ اچھلی۔" میں کیوں راستے میں آپ کو جواب دوں گی۔" وہ حیرانی سے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ کر اس سے مخاطب ہوئی۔ وہ جو اس کی حیران آنکھوں کو محویت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آواز کی خوب صورتی پہ بھی فدا ہو گیا۔

"وہ اس لیے کہ مجھے جو وقت ملا تھا اس میں سے اب چند سیکنڈ بھی باقی نہیں بچے ہیں اور اب آپ کو ڈراپ مجھے ہی کرنا ہو گا آپ کے گھر۔ اس کے بعد مجھے اپنے ملک و قوم کی خدمت کے لیے بھی جانا ہو گا۔ ویسے بائی داوے! سامنے رکھے برگر ٹھنڈے اور کولڈ ڈرنکس گرم ہو رہی ہیں اور اب تو آپ اپنی ذاتی پاکٹ منی سے ہمارے لیے کولڈ ڈرنکس کا ٹھنڈا ٹھار اسٹاک بھی نہیں رکھتی ہوں گی گھر میں۔"

"لیکن فضا باتھ روم گئی ہے اس کو تو لوٹنے دیں ہم اکٹھے واپس چلی جائیں گے۔" سوہا جھینپ کر جلدی سے بولی۔ کیونکہ وہ جان چکی تھی کہ فضا موئی اپنے ڈھول میں کوئی بات نہیں رکھ پائی تھی اور ندا بھابھی کے ساتھ ساتھ وہ شازی کو بھی سب بتا چکی ہے۔

"فضا صاحبہ اب تک ندا آپی جو کہ میری کزن ہیں ان کے ساتھ گھر پہنچ کر لنچ اڑا رہی ہوں گی۔ اس لیے ان کا انتظار کرنا فضول ہے۔" سوہا کی آنکھیں ایک بار پھر حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ آپ اگر بار بار حیرت سے آنکھیں پھیلاتی رہیں تو میں ادھر ہی شہادت کے مرتبے پہ فائز ہو جاؤں گا جو کہ فی الحال میں نہیں چاہتا۔" اس کی آنکھوں میں شرارت کے جگنو چمک رہے تھے۔ "تو کیا خیال ہے؟ میں ہاں ہی سمجھوں۔"

سوہا نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا تو شازی نے اس کو روک دیا اپنا والٹ نکال کر بل ادا کیا تو تب تک سوہا اپنا بیگ اٹھا کر کھڑی ہو چکی تھی۔ اس کے ذہن میں فضا کے الفاظ گونج رہے تھے۔ "جو تمہاری قسمت میں ہوا تو مل کر رہے گا اور جو ملے گا سمجھ لینا کہ وہ ہی تمہاری قسمت ہے۔" سوچتے سوچتے وہ پارکنگ تک پہنچی تو شاہ زمان نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

"بیٹھنے سے پہلے مجھے بتا دیں سوہا کہ میں بامراد ٹھہرا کہ نامراد! اب اس کے لہجے میں عجیب سی بے تابی تھی۔ ڈر تھا کہیں وہ نہ بول دے تو پھر؟"

ایک شرط پر!" سوہا آج پھر سے پرانی والی سوہا بن چکی تھی۔ شرارتی لہجے میں بولی۔

"وہ کیا؟ مجھے سب شرطیں قبول ہیں بس ہاں کہہ دو۔" وہ جلد باز ہوا۔

"آج سے آپ صرف کاغذات میں شاہ زمان ہوں گے میرے لیے آپ "کیپٹن شازل" ہوں گے۔"

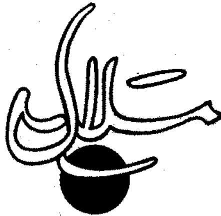
"ہرا۔ زبردست۔ منظور ہے۔" شازی سن سن کے تو کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ میں شازیہ خاتون ہوں۔ آپ کی مہربانی کہ آپ نے مجھے شازی نہیں کہا۔" اس کی آنکھوں میں خوشی کے جگنو چمک رہے تھے تو سوہا کی آنکھوں میں محبت کے دیپ جگمگا اٹھے۔

"تو کبھی کبھی قسمت ہمیں مالا مال کر دیتی ہے۔" سوہا نے سوچتے ہوئے اطمینان سے سیٹ کی بیک سے سر ٹکا لیا تھا اور شاہ زمان گاڑی چلاتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ "تمہیں دل لگی بھول جانی پڑے گی۔"



ناولٹ

نبیلہ ابر راجہ



سارا منظر وہی تھا۔

میں نچاں فراٹے مار کے اج تیرے نال فنکشن تے

وہ بڑی مہارت سے اعضا کی شاعری پیش کر رہی تھی۔ بشرطیکہ اسے اعضا کی شاعری کہا جاسکتا۔ وہی عامیانہ چیختا چنگھاڑتا بے سرا میوزک، اور وہی بے سروپا عامیانہ گانے کے بول۔

پیک پی کے تیریاں اکھاں دا
میں ڈاکر واراں لکھاں دا
جے توں نچدی رہویں

اس کے ساتھ ماموں منیر بھی پھرتی سے ہاتھ پاؤں ہلا کر کمر مٹکا رہے تھے۔ صابرہ بیگم ایک سائڈ پہ بیٹھی ہلکے ہلکے تالیاں بجا رہی تھیں۔ اس وقت ہمہ وقت اس کا ماتھے تک لیا دوپٹا لاپروائی سے گلے میں رسی کی طرح اٹکا ہوا تھا۔ دروازہ ہلکا سا بھڑا ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار دعا کی تھی کاش اس کی عقل کی طرح آج یہ دروازہ بھی بند ہوتا۔ اس نے اسد کی آنکھوں کے بدلتے تیور پوری توجہ سے نوٹ کیے تھے۔ اسد نے بھی اس کے ساتھ یہ سب منظر دیکھا تھا۔ سب کچھ تو وہی تھا۔ ہاں صرف کردار بدل گئے تھے۔ کہانی اور منظر نامہ وہی تھا۔ کیا تھا جو اس میں وہ نہیں تھی۔ لیکن نہیں نہیں وہ تو ہر جگہ تھی۔ آج وہ اس گھر کے گوشے گوشے میں موجود تھی۔

اسد کی آنکھوں کی حیرت اور ناقابل یقین تاثرات بتا رہے تھے کہ یہاں دال میں بہت کچھ کالا ہے۔

زندگی اور ہنسی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑتی تھی۔ اس کی چال میں بلا کا بانکپن اور غرور تھا۔ چلتی تو یوں لگتا جیسے ہر قدم میں رقص کر رہی ہو۔ بلا کا اضطراب تھا اس کی آنکھوں اور بدن کی ایک ایک جنبش میں۔ بے قراری اس کی ہر ادا سے عیاں تھی۔ اس نے رکنا اور ٹھہرنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔ سوتے میں بھی بے چین رہتی۔ ہنسی قل قل کرتی اس کے ہونٹوں کے جھرنے سے پھوٹنے کو بے تاب رہتی۔ یہ نگین حامد تھی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ حامد اور اسما بیگم کے ساتھ ساتھ اپنے بھائیوں کی بھی لاڈلی۔ اسی لاڈ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، ہر بات ـــــ منوالیتی اور نہ ماننے والی باتیں بھی منوانے میں کامیاب ہو جاتی۔ نگین اپنے خاندان اور سہیلیوں کے ساتھ ساتھ اپنے کالج میں بھی بہت مقبول تھی۔ کالج کے ہر فنکشن میں وہ لازمی حصہ لیتی۔ شادیوں اور دیگر محفلوں کی تو وہ جان تھی۔ اس کی سہیلیاں اسے اپنے گھر ہر فنکشن اور پارٹی میں مدعو کرتیں۔ نگین حامد بہت اچھا ڈانس کرتی تھی۔ اس نے یہ کسی سے سیکھا نہیں تھا۔ بلکہ خود سے ہی اس نے مہارت حاصل کی تھی۔ وہ جب چھوٹی تھی تو شوق شوق میں گھر میں سب کے سامنے ڈانس کرتی۔ ان کے گھر جو بھی آتا یا وہ کسی بھی رشتہ دار کے گھر جاتی اسے فرمائش کی جاتی کہ فلاں گانے پہ ڈانس کر کے دکھاؤ۔ اور وہ شروع ہو جاتی۔ سب خوش ہوتے اسے پیار کرتے تالیاں بجاتے تو وہ بہت خوش ہوتی جیسے اس نے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ بچپن کی وہ معصوم خوشی اس کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا جنون

بن چکی تھی۔اسے بہت اچھا ڈانس آتا تھا۔فلمی گانوں پہ جو رقص کیا جاتا اس پہ تو اسے کمال کا عبور حاصل تھا۔
حامد گردیزی پیسے والے خاندانی آدمی تھے، سب کاروباری دماغ کے منطقی شہسوار تھے۔وقت نے روشن خیالی بھی سکھائی تھی، اس لیے نگین کے اس شوق پہ کسی کو بھی اعتراض نہیں تھا۔ویسے بھی وہ کون سا گھر سے باہر جا کر سرِ عام یہ شوق پورا کرتی تھی، اس کی حد بندی خاندان، سہیلیوں اور ملنے جلنے والوں تک ہی تھی۔۔اسے بھی اس بات کا احساس تھا کہ اسے ہر حال میں اپنی حدود کی پاس داری کرنی ہے۔اپنے تین بھائیوں اور حامد صاحب کے سامنے اس نے کبھی بھی اپنے اس شوق کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔خاندان میں سب ہی اسے پیار کرتے تھے۔اس کی شوخ مزاجی اور بذلہ سنجی کے سب ہی قائل تھے۔وہ جہاں جس محفل میں بیٹھتی اسے کشت زعفران بنا دیتی۔



نگین میں بس ایک ہی خامی تھی کہ اسے پڑھنے لکھنے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا، حالانکہ اس کے خاندان میں سب لڑکے لڑکیاں تعلیم یافتہ تھے۔ ایک وہی تھی جس کی پڑھائی اور کتابوں سے جان جاتی۔ میٹرک میں اس نے دو سال لگائے، کالج میں اس نے آرٹس کے مضامین کا انتخاب کیا۔ اور اس میں بھی پہلے سال لڑھک گئی۔ خدا خدا کر کے دوسرے سال فرسٹ ائیر کلئیر ہوا۔ سیکنڈ ائیر میں آئی تو وہاں بھی یہی حال ہوا۔ پہلے سال تین سبجیکٹ میں سپلی آئی، اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا، اس سال چاہے وہ پاس ہو یا فیل، اس کے بعد مزید نہیں پڑھنا۔ اپنے اس فیصلے کا اعلان اس نے پورے گھر کے سامنے کر دیا تھا۔ سوائے اسما کے کسی نے بھی اسے ایک لفظ تک نہ کہا تھا۔ وہ اپنی مرضی کی مالک تھی، جو دل میں سماتا کر گزرتی۔

اسما بیگم کا بڑا دل تھا نگین بھی اپنی باقی کزنز کی طرح تعلیم حاصل کرے۔ انہوں نے دبے دبے الفاظ میں اسے ڈرایا بھی کہ اگر تمھارے پاس اعلیٰ تعلیم کا سرٹیفکیٹ نہ ہوا تو کوئی ڈھنگ کا رشتہ بھی نہیں آئے گا۔

اس بات کو بھی اس نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا تھا۔ نگین کو قسمت پہ بڑا یقین تھا۔ اس نے آج تک جو بھی چاہا یا جس چیز کی بھی خواہش کی تھی وہ اسے بغیر محنت کے آرام سے مل گئی تھی۔ نگین نے اپنے خیالوں میں اپنے لائف پارٹنر کے حوالے سے ایک خاکہ بھی بنا رکھا تھا۔ اسکا لائف پارٹنر بہت پڑھا لکھا نفیس، باوقار اور کھلے دل دماغ کا مالک تھا۔ اس نے اپنے اس تصوراتی خاکے میں اور بھی بہت سے رنگ بھر رکھے تھے۔ وہ سب رنگ نگین نے چھپا رکھے تھے۔ اپنے دل کے نہاں خانوں میں وہ رنگوں کی اس بارش میں روز بھیگتی۔

نگین اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی۔ یہ عمر خواب دیکھنے کی ہوتی ہے، اب وہ بھی ایک شہزادے کے خواب دیکھنا شروع ہو گئی تھی۔

اس کی بیسٹ فرینڈ سندس کی منگنی تھی، نگین خوب سج دھج کر منگنی میں شریک ہوئی۔ منگنی کی یہ تقریب، مشترکہ تھی۔ سندس اور اس کے منگیتر نے خود ایک دوسرے کو منگنی کی انگوٹھی پہنائی۔ بڑی عورتوں کے ادھر اُدھر ہوتے ہی اس کے منگیتر نے ایک انتہائی پیار بھرا سونگ سب کے سامنے گا کر اسے ڈیڈیکیٹ کیا۔ نگین کے دل میں تب سے ایک انوکھی سی خواہش پل رہی تھا۔ کہ اس کے منگنی اور شادی خوب دھوم دھام سے ہو، اور سندس کے منگیتر کی طرح اس کا منگیتر بھی ایک پیار بھرا گانا اسٹیج پہ سب کے سامنے اس کا ہاتھ پکڑ کر گائے۔

اسما بیگم خود ماں ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے اچھا سا لڑکا ڈھونڈ رہی تھیں۔ کیونکہ نگین نے ان سے صاف بول دیا تھا کہ اسے خاندان میں شادی نہیں کرنی۔ اس کا نظریہ بھی عجیب تھا، یہ کیا کہ کزن سے شادی کر لو، ساری عمر ایک ہی شکل دیکھ دیکھ کر گزارو۔ کم سے کم شادی جیسے اہم معاملے میں تو کوئی تھرل ہونا چاہیے۔ میں خاندان میں قطعی شادی نہیں کروں گی۔ لڑکا آوٹ آف فیملی ہو۔ نیا پن ہو گا یہ بھی۔ نگین اپنے خیالات کا اظہار اکثر و بیشتر گھر کی عورتوں کے سامنے کرتی رہتی تھی۔ وہ سب سن سن کر ہنستیں۔ نگین نے ابھی دنیا کو دیکھا اور پرکھا ہی کہاں تھا۔ اس کا بچپنا ابھی بھی اسی طرح قائم و دائم تھا۔ لاابالی اور لاپروا یہ لڑکی نگین حامد کو ایک دن یہ دنیا اپنی عینک اتار کر لازمی دیکھنی تھی۔

اب اپنی بیوی سے یہ خدمتیں کرواؤ، بہت ہو گئی ہے۔" وہ آفس سے آ کے بیٹھا ہی تھا، آج کا دن بہت مصروف گزرا تھا۔ حد سے زیادہ تھکن ہو رہی تھی۔ اس نے شبو کو چائے کے لیے آواز لگائی ہی تھی، جب فرخندہ بیگم تیز تیز بولتی، لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ اور حیدر کو قدرے ناراضی سے دیکھا۔

"امی، کیا کہہ رہی ہیں، کون سی بیوی کس کی بیوی؟ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔" حیدر کی حیرانی بہت فطری تھی۔

"نہیں ہوئی ناں شادی، اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ

اب کر لو شادی، اور سکون سے زندگی گزارنے دو مجھے۔" فرخندہ بیگم ہنوز روٹھے پن سے گویا ہوئیں۔
"امی میں نے کیا کیا ہے بھلا، جو آج آپ کی توپوں کا رخ میری طرف ہے۔" وہ شرارت سے ہنسا تو فرخندہ بیگم اور بھی چڑ گئیں۔
"اپنے بابا سے پوچھو جا کر، میرے اوپر غصہ کرتے ہیں۔ کہ تمہیں حیدر کی شادی کی ذرا بھی فکر نہیں ہے، تیس سال کا ہونے کو آیا ہے، اس کے ساتھ کے لڑکے دو، دو اور تین تین بچوں کے باپ بھی بن چکے ہیں۔ اور ہمارا بیٹا ابھی تک ویسا ہی لنڈورا پھر رہا ہے"۔ فرخندہ نے، رزاق صاحب کی باقاعدہ نقل اتار کر بتایا تو حیدر کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ "ہاں ہاں تم بھی اپنے بابا کی طرح میرا جی جلاؤ"۔ وہ روہانسی ہونے لگیں تو حیدر اٹھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔
"امی آپ کی جیسی مرضی، جو آپ کا دل کرتا ہے کریں"۔ اس نے فرخندہ کے کندھے پہ اپنا مضبوط بازو پھیلا دیا تھا۔ وہ تو خوشی سے نہال ہو گئیں۔
"تم سچ کہہ رہے ہو؟"۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا، کیونکہ وہ جب بھی اسے شادی کی بات کرتی تھیں وہ ٹال مٹول کرتا۔
"بالکل سچ"۔ وہ ہنسا۔
"تمہیں اگر کوئی لڑکی پسند ہے تو بتاؤ؟"۔ فرخندہ بیگم کے اس سوال پہ وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم چپ ہو گیا۔

حیدر رزاق کا تعلق، خوش حال، اور کھاتے پیتے خاندان سے تھا، وہ تعلیم مکمل کر کے جلدی ہی پریکٹیکل لائف میں آ گیا تھا، اور رزاق صاحب کے ساتھ ان کا کاروبار بخوبی سنبھال لیا تھا۔ حیدر کا پورا خاندان پڑھا لکھا تھا۔ سب ہی صاحب حیثیت تھے۔ لیکن دولت، جائداد ہونے کے باوجود بھی ان کے خاندان کا ناتا اپنی اخلاقی اقدار اور پرانی قدروں سے جوں کا توں قائم تھا۔ ان کے یہاں آج بھی والدین کے سامنے اونچی آواز میں بولنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ شادی بیاہ میں بھی بڑوں کی رضامندی اور خوشی ضروری تھی۔ جب تک حیدر کے دادا زندہ تھے، شادی بیاہ کے معاملات وہی طے کرتے تھے۔ ان کی موت کو چار سال گزر چکے تھے، ان کے بعد یہ شعبہ حیدر کے تایا جان نے سنبھال لیا تھا۔ جہاں بھی کسی لڑکے لڑکی کی شادی طے کی جاتی، کسی کو بھی اعتراض نہ ہوتا۔ بڑوں کے سامنے کسی کو دم مارنے کی بھی مجال نہ تھی۔
حیدر بہت سلجھا ہوا اور نفیس طبیعت کا دھیمے مزاج کا مالک تھا۔ مطالعہ، میوزک، اچھی شاعری، پینٹنگ، لانگ ڈرائیو، اس کے شوق تھے۔ اپنے جیون ساتھی کے حوالے سے اس کی بس اتنی سی خواہش تھی کہ وہ جو بھی ہو، اسے سمجھنے والی اور باذوق ہو۔ اس سے زیادہ کی اسے چاہ نہیں تھی۔ حیدر کا ذوق اور پسند ہر معاملے میں بہت اعلا تھی، وہ فرخندہ بیگم سے کہنا چاہتا تھا کہ لڑکی میری ہم مزاج ہونی چاہیے، لیکن پھر اپنے روایتی شرمیلے مزاج کی وجہ سے خاموش ہو گیا۔ اسے امید تھی کی امی اس کے لیے اس کی پسند کے مطابق ہی لڑکی کا انتخاب کریں گی۔ آخر کو وہ ماں تھیں، ماں سے زیادہ اسے کون سمجھ سکتا تھا۔ اور پھر ابھی تک ان کے خاندان میں سب کی شادی بیاہ کے فیصلے خاندان کے بڑے بوڑھوں نے ہی تو کیے تھے، اور کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو اپنی شادی سے ناخوش ہو۔ سب اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم تھے۔
فرخندہ، بہت خوش تھیں۔ حیدر کی طرف سے انہیں گرین سگنل مل چکا تھا۔
حیدر سے بڑی دو بہنیں تھیں، ان میں سے ایک چچا اور ایک بڑے تایا کی بہو تھی۔ حیدر ان کا اکلوتا بھائی تھا۔ دونوں کی بڑی آرزو تھی کی بھابھی چن کر لائی جائے۔ خاندان میں حیدر کے برابر کی سب لڑکیاں بیاہی جا چکی تھیں۔ اس کے لیے لازمی طور پہ خاندان سے باہر ہی لڑکی تلاش کرنی تھی۔ ابھی تک ان کے یہاں صرف دو کزنز کی شادی ہی خاندان سے باہر ہوئی تھی، یہ تجربہ بڑا خوش گوار رہا تھا حیدر کی ایک اور کزن

سبین کی شادی بھی خاندان سے باہر طے تھی۔اس کی شادی کی تیاری جاری تھی۔اب حیدر کی بار بھی یہی تجربہ دہرایا جارہا تھا۔

لڑکی تھی کہ چھلاوہ اس کے پاؤں میں تو جیسے پہیے لگے ہوئے تھے، یہاں وہاں ہر جگہ تتلی کی مانند اڑتی پھر رہی تھی، اس کی قلقل کرتی جھرنوں جیسی ہنسی فرخندہ بیگم کے کان میں رس گھول رہی تھی۔وہ تھی بھی بہت حسین۔اسکین کلر کے لانگ فراک میں کھلے بالوں کے ساتھ وہ بہت خاص محسوس ہورہی تھی۔

بلے بلے وے ٹور پنجابن دی

وہ باقی لڑکیوں کے ساتھ ڈھولک بجاتے ہوئے گانا گارہی تھی۔

یہ اسکن کلر کے فراک والی لڑکی کون ہے؟ یہ جو ڈھولک پہ گانا گارہی ہے؟" فرخندہ نے پاس سے گزرتی ایک رشتہ دار عورت سے پوچھا۔

"وہ لمبے بالوں والی،،، وہ نگین ہے، اپنی سبین کی دوست" عورت جواب دے کر آگے بڑھ گئی تھی۔

فرخندہ کی چھوٹی دیورانی کی سب سے آخری اور چھوٹی بیٹی سبین کی شادی تھی۔آج اس کی مایوں تھی، فرخندہ پورے گھر سمیت شریک تھیں۔شوخ اور الہڑسی نگین انہیں بہت بھائی تھی۔ہنستی مسکراتی، باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتی یہ لڑکی حیدر کے حوالے سے ان کی آنکھوں میں خوب بن کر سما چکی تھی۔حیدر کی دونوں بہنوں کو بھی نگین بہت اچھی لگی تھی۔اس نے سبین کی مہندی میں۔۔۔"گڈی تو منگا دے تیل میں پواندی آں" پہ کیا خوب ڈانس کیا تھا۔اس کے ساتھ خاندان کی سب عورتیں مل کر ناچی تھیں۔نگین نے تو بڑی بیاہی عورتوں کو بھی لڈی کے لیے ہاتھ پکڑ پکڑ کر اٹھایا تھا۔فرخندہ کی بڑی نند نے بھی اپنے بھاری بھرکم سراپے سمیت، نگین کے ساتھ مل کر گیا لڈی ڈالی تھی، سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا تھا۔فرخندہ نے تو اس کی ایک ایک بات نوٹ کی تھی۔یہ لڑکی اگر حیدر کا نصیب بن جاتی تو اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹوں کے پھول کھلا دیتی۔وہ بہت سنجیدہ اور کم گو نوجوان تھا۔نگین جیسی ہمسفر کا اس کی زندگی میں ہونا لازمی تھا۔

اج کالا جوڑا پاسا ڈی فرمیش تے

نگین، ڈھولک گھٹنے کے نیچے رکھے سبین کی مہندی پہ نغمہ سرا تھی۔فرخندہ نے بہانے سے حیدر کو مردانے سے اپنے پاس بلوایا تھا۔تاکہ اسے ایک نظر کسی طرح نگین کو دکھادیں۔ریڈ کلر کے کامدار گاؤن میں وہ دمک رہی تھی۔بہت سے کنوارے لڑکوں کی ماؤں بہنوں کی نظریں نگین پہ تھیں۔فرخندہ کو تو دھڑکا لگ گیا تھا۔کہ کہیں نگین کو کوئی اور نہ اچک کر لے جائے۔انہوں نے بہانے سے نگین کو پاس بٹھا کر اس کے خاندان کے بارے میں کرید کرید کر سوال پوچھے تھے۔سبین تو کھسک گئی تھی۔صبح اس کی بارات تھی۔

"مجھے تو دال میں کالا لگ رہا ہے"۔رات کو سب سو چکے تھے، سبین، نگین اور اپنی چند اور سہیلیوں کے ساتھ جاگ رہی تھی، اس کے ہاتھ پاؤں پہ پارلر والی لڑکی گھر آکر مہندی لگا رہی تھی۔

"کیا کالا لگ رہا ہے؟" سبین کی ایک کزن نے اس کے معنی خیز جملے پہ اسے دیکھا:

"چچی فرخندہ، نگین کے بارے میں مجھ سے اور امی سے پوچھ رہی تھیں"۔سبین نے شوخ نگاہوں سے پاس بیٹھی نگین کو دیکھا۔

"تمہاری چچی تو مجھ سے بھی پوچھ رہی تھیں کہ تمہارے والد صاحب کیا کرتے ہیں۔کہاں رہتی ہو، کتنی بہنیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔اس میں دال میں کالا ہونے والی کیا بات ہے بھلا؟" نگین بری طرح چڑ اٹھی۔

"پتا ہے، چچی نے اپنے بیٹے کو بھی مردانے سے بلایا تھا۔تمہیں کسی بہانے سے دکھانے کے لیے"۔سبین کی ہنسی رکنے میں نہیں آرہی تھی۔"جب تم لہک لہک کر کالا جوڑا گا رہی تھی۔تب حیدر بھائی وہاں آئے تھے۔سبین کا مشاہدہ غضب کا تھا"

"تم نے مجھے اسی وقت کیوں نہیں بتایا؟" نگین کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے سبین کے کزن کو کیوں نہیں دیکھا۔ دونوں کی دوستی کو تین سال ہونے کو آئے تھے۔ سبین اور وہ ایک ہی کالج میں تھیں۔ سبین اس سال سینئر تھی۔ وہ اب گریجوشن کر چکی تھی، جب کہ نگین مسلسل تین سال سے فیل ہو رہی تھی۔ اس کی علمی خامی ان کی دوستی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنی تھی۔

گزرتے دن کے ساتھ ان کی دوستی مضبوط ہو رہی تھی، اسما بیگم کو بھی ان کی دوستی اور میل ملاقات پہ اعتراض نہیں تھا، کیونکہ وہ ایک بار خود بھی سبین کے گھر آ چکی تھیں۔ انہیں نگین کی یہ دوست، ان کا گھر طور طریقے اور رکھ رکھاؤ بہت اچھا لگا تھا۔ سلجھا ہوا باوقار گھرانہ تھا، اس لیے نگین پہ انہوں نے سبین کے ہاں آنے جانے پہ کوئی بھی پابندی نہیں لگائی تھی، اور نہ ہی کبھی روکا تھا۔ دوسری طرف سبین کے گھرانے کو بھی نگین کا خاندان پسند تھا، تبھی تو وہ سبین کی شادی کے فنکشن میں آ گئے تھے۔

"کل دیکھ لینا۔ آرام اور تسلی سے، لگتا ہے فرخندہ چچی کے دل پہ اٹیک کیا ہے تم نے۔" سبین نے بے نیازی سے مشورہ دینے کے ساتھ اپنی چچی کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا تو نگین کو ہنسی آ گئی۔

"اگر تمہارا یہ کزن مجھے پسند آ گیا تو میں فوراً شادی کر لوں گی۔" نگین نے صاف لفظوں میں اپنا ارادہ بتایا تو سبین کے ساتھ بیٹھی اس کی دو اور کزنز نے عجیب نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں نگین کی یہ منہ پھٹ عادت اچھی نہیں لگی تھی۔ جو جی میں آتا بول دیتی، سوچے بغیر کہ اگلا اس کا کیا مطلب لے گا۔ سبین، اپنی دوست کی بچکانا معصومیت اور صاف دل سے بہت اچھی طرح واقف تھی، لیکن باقی ہر ایک کی اپنی سوچ اور دل تھا۔

"کل دکھانا مجھے بھی اپنا کزن" سونے سے پہلے نگین نے ایک بار پھر سبین کو یاد دہانی کروائی۔

"حیدر بھائی بہت اچھے ہیں۔ آج کل کے فلرٹی نوجوانوں سے بالکل الگ، نفیس اور سلجھے ہوئے ہیں۔ تمہاری شادی کسی قدردان انسان سے ہونی چاہیے، کوئی ایسا ویسا تمہارے پلے پڑ گیا تو خود بھی روؤ گی اور اس کی جان بھی عذاب میں ڈالو گی۔۔۔ حیدر بھائی عورت کا احترام کرتے ہیں، میں نے کبھی آج تک ان کی اونچی آواز نہیں سنی ہے۔ اللہ کرے تمہاری شادی ان کے ساتھ ہو جائے۔" سبین نے صدقِ دل سے دعا دی تھی۔

سبین پارلر سے تیار ہو کر اسٹیج پہ بیٹھی فوٹو سیشن میں مصروف تھی، نگین اس کے ساتھ ہی چپکی ہوئی تھی۔ رخصتی کے وقت حیدر سبین کے پاس آیا اور اسے تھام کر پھولوں سے سجی گاڑی میں بٹھایا۔ سبین کا اپنا کوئی بھی بھائی نہیں تھا، وہ صرف تین بہنیں ہی تھیں، سبین کو حیدر بھائی بہت پسند تھے۔ وہ بھی اسے ایک بھائی کا سا ہی برتاؤ کرتے، اس کی شادی میں انہوں نے ہر کام اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ اور سگے بھائی کی طرح ہی بخوبی یہ ذمہ داری نبھائی بھی تھی۔

سبین کی رخصتی کے موقعہ پہ، نگین دلہن کی طرف سے رواج کی مطابق اس کے ساتھ جا رہی تھی۔ پھولوں سے سجی گاڑی چلنا شروع ہوئی تو نگین اس کے کان میں گھس کے بولی۔

"تمہارے وہ حیدر بھائی تو نظر ہی نہیں آئے۔ میں نے تو ایک ایک لڑکے کو دیکھا، تم نے بھی کوئی اشارہ نہیں دیا۔"

نگین کی یہ ڈھٹائی نما معصومیت، میکا چھوڑنے کا تازہ تازہ غم لیے، افسردہ سبین کو ہنسا گئی۔ لیکن اس نے اپنی ہنسی کنٹرول کر لی۔ اس کے ساتھ ہی تو اس کی ایک سسرالی عورت بیٹھی ہوئی تھی، اس کی ہنسی کو جانے کس رنگ میں لیا جاتا۔

"جنھوں نے مجھے کار میں بٹھایا تھا، وہی تو حیدر بھائی تھے۔" سبین نے سرگوشی میں جواب دیا تو نگین چیخ ہی تو پڑی۔۔ "تو وہ تھے تمہارے حیدر بھائی، وائٹ کرتا شلوار والے۔۔۔ او۔۔" سبین کی

لگنے والی زوردار کہنی نے اسے باقی کی بات مکمل ہی نہیں کرنے دی۔اس نے ہاتھ دبا کر نگین کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو وہ کہیں جا کر دبک کر بیٹھی۔

نگین کو باوقار لڑکے پسند تھے اور حیدر کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد نگین کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حیدر باوقار اور سنجیدہ ہے۔اب تو اسے انتظار تھا کہ کب فرخندہ بیگم اس کے گھر آتی ہیں۔سبین کی شادی میں، نگین میں ان کی دلچسپی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی، سب کو ہی اس بات کا اندازہ تھا کہ جلد یا بدیر وہ نگین کا رشتہ مانگنے جائیں گی۔

فرخندہ بیگم، اپنی دونوں بیاہی بیٹیوں کے ہمراہ، حامد صاحب کے گھر موجود تھیں۔سبین بھی ان کے ساتھ آئی تھی۔نگین کی ہنسی کے جلترنگ ہر سو بج رہے تھے۔سبین نے لاکھ گھورا، سمجھایا کہ ”فرخندہ چچی کے سامنے فضول کی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ورنہ تمہارا امیج اچھا نہیں پڑے گا۔“شکر ہے، سبین کی یہ بات اس کے پلے پڑ گئی، اور اس نے سنجیدگی کے ریکارڈ توڑ ڈالے۔اسما نے جو اپنی لاڈلی کی یہ حالت دیکھی تو مہمانوں کے جانے کے بعد اسے پاس بٹھا لیا۔

”میری بیٹی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میں اور تمہارے پاپا تمہاری مرضی کے خلاف تمہارا رشتہ طے نہیں کریں گے، ابھی تو ہم نے فرخندہ بیگم کا بیٹا بھی نہیں دیکھا، کل ہی فون کر کے معذرت کر لوں گی، ایک اور فیملی بھی اپنے بیٹے کے لیے آنا چاہ رہی ہے۔“

”نہیں مما نہیں، آپ کو کس نے کہا کہ مجھے اس رشتے پہ اعتراض ہے، مجھے ادھر ہی، فرخندہ آنٹی کے بیٹے سے شادی کرنی ہے بس۔“ وہ تیز تیز بول رہی تھی۔تب ہی تو بڑی بھابھی جو سٹنگ روم کے باہر سے گزر رہی تھی اندر چلی آئیں۔”میرے لیے اب کسی اور فیملی کو بلوانے کی ضرورت نہیں ہے، میں نے سبین کی شادی میں، اس کے سب خاندان کو دیکھا ہے، مجھے تو یہ سب لوگ اچھے لگے ہیں، سبین کا کزن حیدر بہت گڈ لکنگ اور ڈیسنٹ ہے۔“ نگین نان اسٹاپ بولتی جا رہی تھی، اسما بیگم نے بے اختیار اپنے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا۔

”اچھا تو فرخندہ آنٹی کے بیٹے کا نام حیدر ہے۔“ بڑی بھابھی جو اس کی باتوں سے ہی کافی کچھ سمجھ چکی تھیں اسے چھیڑا تو تب کہیں جا کر اسے ہوش آیا، بڑی بھابھی نے بات مما سے کی تھی اور شوخ نگاہوں سے دیکھا اسے تھا۔اسما بیگم کی رائے حیدر کے گھرانے کے بارے میں مثبت تھی۔

”آنٹی مجھے تو اب حیدر کو دیکھنے کا شوق ہو رہا ہے۔“ بڑی بھابھی نے شرارتی نگاہوں سے نگین کو دیکھا تو وہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلی آئی، زندگی میں شاید پہلی بار اسے کچھ شرم آئی تھی۔اس کی کچھ دیر پہلے کی بے قراری نے اسما بیگم پہ اس کی دل کی حالت عیاں کر دی تھی۔نگین سدا کی بے صبری اور جلد باز تھی کہ مما کہیں حیدر کے گھر والوں کو بیچ میں ہی کال کر کے منع نہ کر دیں۔تب ہی تو وہ فوراً بولی تھی۔

حامد صاحب، ان کے تینوں بیٹوں سمیت سب کو ہی حیدر اور اس کا خاندان بہت پسند آیا تھا۔کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔نگین کے تینوں بھائی چاہتے تھے کہ ایک بار نگین بھی حیدر کو دیکھ لے اور اسے بات چیت کر لے، وہ چاہتے تھے کہ نگین کی رائے بھی لی جائے اور اس کی خواہش کا احترام بھی کیا جائے، انہیں اس بات کی ہرگز خبر نہیں تھی کہ ان کی لاڈلی بہن کو اس رشتے پہ اتنا سا بھی اعتراض نہیں ہے۔الٹا وہ اس بات پہ خوش تھی کہ حیدر ان کے گھر آ رہا ہے اور وہ اسے پاس سے دیکھے گی۔سبین کی بارات پہ تو اس نے حیدر کا جائزہ ہی نہیں لیا تھا۔اگر اسے پتا ہوتا کہ وہ اس کے اتنے پاس کھڑا ہے تو وہ اسے اچھی طرح دیکھ تو لیتی، اسے ابھی تک اس بات کا قلق تھا۔

چائے اور دیگر لوازمات سے بھری ٹرالی ایک سائڈ پہ کرتے ہوئے نگین بھی ڈرائنگ روم میں سب

کے ساتھ بیٹھ گئی۔
حیدر سمیت اس کی پوری فیملی آئی تھی۔فرخندہ آنٹی اوران کی دونوں بیٹیوں نے اسے اپنے ساتھ صوفے پہ بٹھایا ہوا تھا۔یہ خصوصی محبت شفقت کسی عام سی بندی کے لیے تو ہو نہیں سکتی تھی اسی لیے حیدر کو بھی پتا چل چکا تھا کہ یہی ہے وہ، جس کے قصیدے امی آج کل اٹھتے بیٹھتے پڑھ رہی ہیں۔اس تک یہ اطلاع بھی پہنچ چکی تھی کہ لڑکی کے گھر والوں کی خواہش پہ اسے خاص طور پہ مدعو کیا گیا ہے تاکہ وہ اور نگین ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لیں۔حیدر کا خیال تھا کہ امی اور بابا کو کہیں لڑکی والوں کی اس خواہش اعتراض نہ ہو۔لیکن حیرت انگیز طور پہ گھر والوں میں سے کسی نے بھی ایک لفظ تک نہ کہا۔رزاق صاحب فقط اتنا بولے" ہمارا مذہب بھی اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔" پھر یہ تو ساری زندگی کا معاملہ تھا وہ حیدر کا رشتہ لے کر آئے تھے۔

نگین کو سنجیدہ اور دھیرے دھیرے مسکراتا ڈیسنٹ سا حیدر اپنے تصوراتی خاکے کے ہو بہو معلوم ہوا تھا۔وہ وہی تو تھا، نگین جس کے خواب دیکھ رہی تھی۔
اسما بیگم اور حامد صاحب کو بھی حیدر دل و جان سے پسند آیا تھا۔اب تک ان کی لاڈلی بیٹی کے لیے جتنے بھی رشتے آئے تھے، وہ ان سب سے اچھا اور بہترین تھا۔سب سے بڑی بات وہ نگین کی بھی خواہش اور خواب بن چکا تھا۔ان کے خاندان میں لڑکی کو پسند کرنے اور پھر اپنی پسند مناسب طریقے سے والدین تک پہنچانے میں کوئی برائی نہیں سمجھی جاتی تھی۔سبین کی شادی تو انہیں ایک دوسرے تک ملانے کا بہانہ بنی تھی۔
"منگنی کا فنکشن مشترکہ ہوگا، آپ فرخندہ آنٹی سے کہہ دیں بس"۔نگین کے چہرے کے تاثرات بہت سدھرے تھے۔" کیسے بول دوں، خاندان سے باہر معاملہ ہے، پھر ان کے اور ہمارے گھر کا ماحول بھی قدرے مختلف ہے، میرا نہیں خیال کہ وہ مشترکہ فنکشن والے آئیڈیے کو پسند کریں گی، اور اگر فرض کرو وہ مان بھی جاتی ہیں تو یہ بات عمر بھر ان کے دل سے نہیں جائے گی کہ ہم نے اول دن سے ہی اپنی منوائی ہے، آگے چل کر یہ چیزیں فساد اور بگاڑ پیدا کرتی ہیں، اور میں نہیں چاہتی کہ حیدر جیسا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل جائے۔"
"مما بھلا اس میں حرج ہی کیا ہے، اور فرخندہ آنٹی اتنی چھوٹی سی بات پہ بھلا کیوں رشتہ توڑ دیں گی"۔ نگین کی عقل میں اسما بیگم کی بات سما ہی نہیں رہی تھی۔
"دیکھو نگین بلا وجہ کی بحث مت کرو، سبین تمہاری دوست ہے، تم ان کے گھر جاتی رہتی ہو، میں بھی کتنی بار گئی ہوں، ان کے ہاں ہر فنکشن میں عورتیں اور مرد الگ الگ ہوتے ہیں، ایک ساتھ انتظام نہیں ہوتا۔فرخندہ بیگم بھی پرانے خیالات کی مالک ہیں۔"
نگین کی شکل دیکھنے والی ہو رہی تھی۔وہ تو منگنی کے مشترکہ فنکشن کے رومانٹک خواب دیکھ رہی تھی، جہاں حیدر اس کا ہاتھ پکڑ کر سب کے سامنے اپنے ہاتھ سے انگوٹھی پہناتا، اور اس کی سب دوستوں کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کرتا، بیک گراؤنڈ سے رومانوی موسیقی کے سر بکھر رہے ہوتے۔یہ پہلا معصوم سا خواب تھا جو چھناکے سے ٹوٹا تھا۔
بالکل عام سے نان رومانٹک انداز میں منگنی ہوئی تھی، منگنی کا جوڑا، انگوٹھی اور دیگر چیزیں بہت مہنگی تھیں، لیکن انگوٹھی اسے حیدر کی جگہ اسما بیگم نے ہی پہنائی تھی۔
اس رات سب مہمانوں کے جانے کے بعد اس نے رات کو خوب اونچی آواز میں اداس دکھ بھرے گانے سنے

دعا نہ کام آئے
دوا بچا نہ پائے
صرف ہائے
دھڑکنیں کو بجتی دھڑم دھڑم ملال میں
دربدر گھومتی دھڑم دھڑم۔۔۔

بڑی بھابھی نے باہر سے گزرتے ہوئے، نگین کے کمرے سے برآمد ہونے والی اداس موسیقی کی آوازوں کو سنا تو ان کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔ جو غم زدہ گانے وہ سن کر زار زار رو رہی تھی، انہیں سن کر ہنسی آ رہی تھی۔ کیا چیز تھی یہ نگین بھی، ان کی اکلوتی نند اور تین بھائیوں کی لاڈلی بہن، ساری عمر اس کے لاڈ اٹھائے گئے تھے، ہر بات مانی گئی تھی۔ اس کی اپنی دنیا تھی اور رقص و موسیقی اس کی دنیا کا لازمی جزو تھی۔ کبھی کبھی بڑی بھابھی کو ڈر بھی لگتا تھا، کہ کہیں نگین اپنے اس جنونی شوق کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ حیدر کی فیملی ان سے قدرے الگ تھی، پرانے رسم و رواج، روایتیں ابھی تک ان کی زندگی کا لازمی جزو تھی۔ فرخندہ آنٹی نے بیٹے کی منگنی کے موقعے پہ بڑے فخر سے کہا تھا کہ ان کے ہاں ابھی تک اس دور میں خاندان کے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں بڑوں کی مرضی سے طے کی جاتی ہیں، اور آج تک ان کے ہاں محبت کی شادی جیسا کوئی سانحہ نہیں ہوا ہے۔ وہ محبت کو سانحہ کہہ رہی تھیں۔

بڑی بھابھی صنم نگین کے تایا کی بیٹی تھیں، انہیں نگین سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا، اس لیے فرخندہ آنٹی کا رشتے کے بعد جب آنا جانا شروع ہوا تو جانے کیوں ان کے دل میں ڈر سا بیٹھ گیا، یہ سچ تھا کہ حیدر اور نگین کے بیچ پیار محبت والا کوئی معاملہ نہیں تھا، اور فرخندہ آنٹی سبین کی شادی میں نگین کو دیکھ کر ان کے گھر اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ پر نگین کو سنجیدہ سا حیدر اس کا رشتہ آنے سے پہلے ہی بھا گیا تھا، ایسا اس کے ساتھ پہلی بار ہوا تھا، سارا قصور اس کے تصوراتی خاکے کا تھا، جس پہ حیدر سو فیصد پورا اتر رہا تھا۔ اوپر سے سبین کی تعریفوں کے پل کے ساتھ خود حیدر کی اپنی نفیس شخصیت کا رکھ رکھاؤ، نگین جیسی نا پختہ لڑکی کے سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ نگین بہت شوخ، لاابالی غیر ذمہ دار تھی، اور حیدر اس کے بالکل الٹ، وہ تو بولتا بھی بہت کم تھا، صنم بھابھی، نگین کے اچھے نصیب کے لیے دعا گو تھیں۔

گاڑی کا دروازہ بڑی زور سے اسے لگا تھا
کی آواز بڑی واضح تھی۔ اس کا ہاتھ جہاں کا تہاں
رہ گیا۔ کچھ لمحے بعد اسے ہوش آیا تو وہ
اترا، جہاں وہ اپنی تکلیف ضبط کرنے کی کوشش
بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ دو بار پہلے بھی وہ ا
پارک میں دیکھ چکا تھا، وہ صبح سویرے جاگنگ
لیے جاتا تھا، ایک دن شام میں وہ اسے ایک اد
عورت کے ساتھ نظر آئی، اس کے ہاتھ میں
شیلڈن کا کوئی ناول تھا، جسے وہ پورے انہماک
ساتھ پڑھ رہی تھی۔ حیدر بنچ کے پاس سے گزر

"ثانیہ بیٹا گھر نہیں چلنا کیا۔ اٹھو بھی
اب"۔ مشفق صورت عورت بنچ پہ بیٹھی کتا
پڑھتی لڑکی سے مخاطب تھی، اس نے نہ چاہتے
بھی مڑ کر دیکھا تھا۔

حیدر تو بالکل نارمل انداز میں دروازہ کھول
گاڑی سے نیچے اتر رہا تھا، جانے کہاں سے آ
ٹکرا گئی تھی۔ غلطی اس کی بھی نہیں تھی اس کے د
ہاتھ سامان کے شاپرز سے بھرے ہوئے تھے، وہ
انداز میں انہیں گھر تک پہنچانے کی فکر میں تھی
اپنے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے حیدر کی گاڑ
دروازہ اس کے مزاج پوچھنے پہ تل گیا۔

"ایم سوری! میں دیکھ ہی نہیں پایا آپ کو، آ
میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں، اور یہ سامان بھی
دوں"۔ وہ سچ مچ شرمندہ ہو رہا تھا۔

"غلطی میری اپنی ہے، سارا سامان ایک ساتھ
جانے کے چکر میں دیکھ ہی نہیں پائی کہ کوئی گاڑی
ہے بھی کہ نہیں"۔ تکلیف کے عالم میں بھی اس
ادب آداب اور رکھ رکھاؤ کو ہاتھ سے جانے نہ
تھا۔ ایک لمحے کے لیے حیدر ٹھٹکا تھا، مگر صرف
ہی لمحے کے لیے۔

اس نے زمین پہ گرے ہوئے شاپرز میں
سامان اٹھایا، اس میں بہت سی کتابیں بھی تھیں
خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ اس نے ثانیہ کا

سامان اس کے گھر تک پہنچایا۔۔جہاں اس کی مشفق سی والدہ سفید دوپٹا ماتھے تک اوڑھے عصر کی نماز ادا کر کے اسی کو کال کرنے کی فکر میں تھیں۔اسے آہستہ آہستہ آتا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے پہ پریشانی نمودار ہوئی،

"امی پریشانی کی بات نہیں ہے، گاڑی کا دروازہ ٹانگ پہ لگا ہے، اور یہ حیدر ہیں، ہمارے گھر سے تیسرا گھر ان کا ہے"۔ثانیہ نے لگے ہاتھوں تعارف بھی کروا ڈالا۔

"السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ؟" حیدر کو مناسب نہیں لگا تھا کہ ان کی خیریت پوچھے بغیر چلا جائے۔

"مجھے پتا ہی نہیں بیٹا کہ آپ بھی ہمارے پڑوسی ہیں۔اصل میں یہاں آئے ہوئے ابھی اتنا ٹائم نہیں ہوا ہے ہمیں، اور پھر ڈر بھی لگتا ہے"۔ثانیہ کی طرح اس کی امی بھی انتہائی باوقار اور سادہ سی تھیں۔اس کے ناں ناں کرنے کے باوجود انہوں نے اسے چائے کے ساتھ ٹھیک ٹھاک پیٹ پوجا کروا کے بھیجا تھا۔واپسی پہ ثانیہ اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی، حیدر جانے کیوں پلٹا تھا، اسے ایک نظر دیکھ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے نکل گیا تھا۔

"شادی کے بعد حیدر بھائی کے ساتھ سب شوق پورے کر لینا، پھر تو وہ تمہیں دیکھ کر ایک نہیں ہزار رومانٹک گانے تمہارا ہاتھ پکڑ کر گائیں گے"۔صنم بھابھی سے اب اس کی اتری صورت مزید برداشت نہیں ہو رہی تھی، تب ہی تو اسے چھیڑ رہی تھیں، اس کا نتیجہ بڑا مثبت برآمد ہوا، نگین سب کچھ بھول کر ویسے بھی اس کی شادی قریب تھی، وقت کم اور کام زیادہ تھے، نگین نے تو کسی بھی قسم کی مدد کروانے سا صاف منع کر دیا تھا،

"مجھے مارکیٹ یا کسی بھی جگہ ساتھ چلنے کا مت بولیے گا، جو شاپنگ کرنی ہے خود کریں، میں اپنی شادی کے دن حسین ترین دلہن نظر آنا چاہتی ہوں،، بازاروں میں گھوم پھر کر مجھے اپنی اسکن کا ستیا ناس نہیں کروانا" اسما بیگم لاڈلی بیٹی کو دیکھ کر رہ گئیں۔انہیں پتا تھا نگین کو کسی کی بھی لائی گئی کوئی بھی چیز پسند نہیں آتی اور یہ تو اس کی شادی کی شاپنگ تھی، لیکن وہ اپنی ضد پہ اڑی ہوئی تھی مجھے مارکیٹ نہیں جانا،؛اس کے بیڈ روم کا سب فرنیچر حامد صاحب اور تینوں بھائیوں نے مل کر پسند کیا تھا۔باقی چھوٹی موٹی چیزیں، اسما بیگم نے اپنی بہوؤں کے ساتھ مل کر لی تھیں۔البتہ کپڑے اور جولری لینے کے لیے نگین ایک بار ان کے ساتھ مارکیٹ گئی۔اس کے بعد اس نے باہر نہ جانے کی جیسے قسم کھائی تھی۔

اور جب اسے مایوں بیٹھایا گیا تو وہ کمرہ نشین ہی ہو گئی۔اس نے کسی سے سن لیا تھا کہ مایوں کی دولہن شادی سے پہلے باہر نکلے تو اس پہ روپ نہیں آتا۔وہ حیدر کے سامنے سولہ سنگھار سمیت جا کر پہلی نظر میں ہی اس کے دل میں گھر کرنا چاہتی تھی۔

منگنی کے برعکس شادی خوب دھوم دھام ڈھول باجوں کے ساتھ ہوئی،

سبین اور حیدر کے خاندان کی دیگر عورتیں اسے حیدر کے کمرے تک پہنچا کر جا چکی تھیں۔گھونگھٹ میں تو نگین کا دم جیسے گھٹنے لگا تھا، روایتی شرمیلی دلہن کی اداکاری کرتے کرتے اب وہ تھک چکی تھی، اس لیے سب کے جانے کے بعد اس نے سب سے پہلے بھاری بھر کم کامدار دوپٹے سے جان چھڑائی۔اور پہلی فرصت میں سجے سجائے کمرے کا جائزہ لیا۔ایک ایک چیز بہت عمدہ اور مکمل تھی، بس کمی تھی تو صرف کسی رومانٹک گانے کی۔اس کے دل میں دور کہیں یہ آرزو انگڑائی لے کر بے دار ہوئی تھی کہ حیدر اپنے کمرے میں اس کا استقبال کرے تو سب کچھ بہت سحر انگیز لگنا چاہیے، بیک گراونڈ میں کوئی اچھا سا گانا چل رہا ہو تو کیا ہی بات ہو۔اس نے اٹھ کر بھاری لباس سمیٹا اور حیدر کے کمرے میں رکھا ہوا میوزک سسٹم آن کر دیا۔ایں یہ کیا یہ سی ڈی تو ساری

پرانے گانوں سے بھری ہوئی تھی۔

یہ میرا دیوانہ پن ہے
جس نے میرے دل کو درد دیا
مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

اف یہ کیسے گانے تھے، اس کا تو دل ہی دہل گیا۔ اس نے ایک اور سی ڈی نکال کر لگائی۔

میری زندگی کے مالک میرے دل پہ ہاتھ رکھ دے
تیرے آنے کی خوشی میں میرا دم نکل نہ جائے

"شکر ہے تھوڑا ڈھنگ کا گانا تو ملا۔" وہ قدرے سکون سے مڑی تھی۔ دروازے پہ آہٹ ہوئی اور حیدر نے اندر قدم رکھا۔ نگین سر جھاڑ منہ پھاڑ کھڑی تھی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتی۔ حیدر نے تو دلہنوں کی شرم و حیا کے اتنے قصے فرخندہ بیگم اور اپنی بہنوں سے سن رکھے تھے، پر یہ کیسی دلہن تھی۔

"واؤ آپ تو بہت ہینڈسم لگ رہے ہیں۔ میں بھی سب سے اچھے اور مہنگے پارلر سے تیار ہوئی ہوں، میری سب فرینڈز کہہ رہی تھیں کہ میں بہت حسین ہوں۔" اسے بتاتے ہوئے وہ بہت مسرور تھی۔ حیدر کے دل میں اندر ہی اندر ملال کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ نان سٹاپ اس کی سنے بغیر بولے جا رہی تھی۔

"اور آپ کے پاس اتنا فضول میوزک کلکشن ہے، سب رونے دھونے والے گانے۔۔ آپ کوئی اچھے اچھے سے سونگز پلے کرتے میرے لیے، خوب رومانٹک۔۔۔۔" نگین اس کا ہاتھ پکڑے ایسے باتیں کر رہی تھی جیسے یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات نہ ہو، اور وہ اس کی بہت قریبی گہری دوست ہو۔ وہ اتنی بے تکلف ہو گئی تھی جتنا بے تکلف کبھی اس کا سب سے گہرا دوست اسد بھی نہ ہوا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اپنی پسند ناپسند کے قصے سناتی وہ اس کے بازو پہ ہی سر رکھ کر سو گئی تھی۔

حیدر کی رات جاگتے ہوئے گزری تھی۔ اسے اپنی ماں بہنوں کی پسند پہ پورا بھروسا تھا کہ وہ اس کے مزاج کے مطابق لڑکی کا انتخاب کریں گی۔ لیکن ان کی منتخب کردہ لڑکی اس کی شخصیت سے بالکل الٹ نکلی تھی۔ وہ تو اس کی پسند کا عشر عشیر تک نہ تھی۔ اس کی خوبصورتی میں کلام نہ تھا، پر حیدر بھی اپنے نام کا ایک تھا، اسے ظاہری اور جسمانی خوبصورتی سے زیادہ ذہنی خوبصورتی اور ذہانت متاثر کرتی تھی۔ نگین سے باتوں کے دوران اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی شریک سفر میں ذہانت کا شدید ترین فقدان ہے۔ وہ حقیقت کی دنیا سے بہت دور کسی فلمی دنیا میں جی رہی تھی اور خود کو بھی کسی فلم کی ہیروین سے کم سمجھنے پر راضی نہیں تھی۔

یہ تھی حیدر رزاق کی شریک سفر اور یہ تھی اس کی شادی۔ نگین اس کے بازو پہ سر رکھے نیند کی وادی کی سیر کرتے سوتے ہوئے بھی مسکا رہی تھی۔ حیدر نے آرام سے اس کا سر ہٹا کر تکیے پہ رکھا، اور اٹھ کر ٹیرس پہ گیا۔ دونوں بازو ریلنگ پہ رکھے نیچے جھانکتے وہ اداس بہت اداس تھا۔ میوزک سسٹم ابھی بھی آن تھا، یہ نگین کا کارنامہ تھا۔ اس نے بجھے دل کے ساتھ اندر آ کر اسے بند کیا اور ٹیبل پہ رکھا سگریٹ کیس اٹھا کر دوبارہ ٹیرس پہ آ گیا۔

پوری گاڑی جیسے دھماکے سے لرز رہی تھی۔ نگین اپنے پسندیدہ گانوں کی سی ڈی گاڑی میں ساتھ لے کر آئی تھی۔

دم بم دم بم
کھینچ میرے ہمدم
نینوں کا دم کھینچے گی تو بھولے گی تو سارے غم
دم بم دم ڈوری تو میں پتنگ

حیدر دانتوں میں ہونٹ دبائے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک گانا چل رہا تھا۔ ساتھ نگین ان کا پس منظر بھی بتا رہی تھی۔

آنٹی پولیس بلالے گی تو یار تیرا کر لے گا ہینڈل

"پتا ہے اس سونگ پہ میں نے اپنی کزن کی شادی پہ اتنا فٹ ڈانس کیا تھا کہ مت پوچھیں۔
اور پتا ہے میرے ایک کزن کی دوسری شادی تھی

ب میں نے اس گانے پہ ڈانس کر کے ان کی خوب داد لگائی تھی۔" وہ حالیہ چلنے والے اپنے فیورٹ گانے کا پس منظر بتا رہی تھی۔ "پلیز حیدر غور سے سنیے! انتا انت گانا ہے یہ۔" اس نے جیسے اسے التجا کی تھی۔

"الٹی لگے کبھی بائیں لگے
نینوں کی بلٹ دل پہ ٹھائیں لگے
اوہ رجہ آئی ہیلی کاپٹر پہ چڑھ کے جوانی
ریڈیو پہ تیری مشہور کہانی
اوہ بینڈ جوانی اوہ تیری بینڈ جوانی
اوہ نہیں چاہیے مجھ کو تیری سکینڈ ہینڈ جوانی

حیدر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ اس کی شادی کو ساتواں روز تھا، فرخندہ بیگم نے اسے زبردستی نگین کو گھمانے پھرانے کے لیے بھیجا تھا۔ موسم بہت آفت ہو رہا تھا۔ مری میں ان کے قیام کو دوسرا روز تھا، حیدر تو اس کے ساتھ چند گھنٹے میں ہی بور ہونا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن وہ تو اس کے ساتھ ایک ایک لمحے کو انجوائے کر رہی تھی۔ وہ اتنا بولتی تھی کہ اسے حیدر کی طویل خاموشی محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی ہر بات اپنی پسند سے شروع ہو کر اپنی ہی پسند پہ ختم ہوتی تھی۔ مال روڈ پہ ہلکی ہلکی بارش ہونا شروع ہو چکی تھی۔ نگین اپنے ساتھ کوئی خاص گرم کپڑے لے کر نہیں آئی تھی، حیدر نے اسے مری سے ہی گرم ٹوپی اور شال لے کر دی۔ واپسی پہ وہ بہت مسرور تھی۔

"آپ کتنے رومانٹک ہیں ناں۔۔۔ پتا ہے میں جب اپنے لائف پارٹنر کے بارے میں سوچتی تھی ناں تو دعا کرتی تھی وہ بہت رومانٹک ہو۔۔۔ کیونکہ میں بہت رومانٹک ہوں۔" وہ اسے بتاتے ہوئے جیسے کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ ان کے واپس ہوٹل پہنچنے تک ہلکی بوندا باندی باقاعدہ بارش کا روپ دھار چکی تھی۔

"آ جائیں رومانٹک سونگز سنتے ہیں؛ موسم اتنا انت ہو رہا ہے، بارش تو میری کمزوری ہے؛ اور پتا ہے میرے پاس ڈھیر سارے لو ڈ میٹ ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک، یہ سنیں آپ"۔ چائے کا گرم کپ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بھی نگین کی توجہ گانے کی طرف تھی۔ کپ چھلک گیا تھا، چائے حیدر کے کپڑوں پہ گری تھی، لیکن مگن نگین کو احساس تک نہ ہوا تھا۔ وہ اسے رومانوی گانے سنانے پہ بضد تھی۔

برسات کے دن آئے
ملاقات کے دن آئے
ہم سوچ میں تھے جس کی
اس رات کے دن آئے

وہ گنگناتے ہوئے خود بھی کسی مورنی کی طرح مست تھی، ہاتھ کی انگلیوں اور پیروں کی جنبش سے اس کے اضطراب کا اندازہ لگانا چنداں آسان نہ تھا۔

بھیگی بھیگی راتوں میں ہم تم تم ہم

وہ رقص کے انداز میں لہرا کر کھڑکی کا پردہ ہٹانے کے لیے اٹھی، تو جیسے حیدر کے ذہن میں جیسے یکلخت بجلی کڑکی۔ وہ نامحسوس انداز میں اپنا شوق پورا کر رہی تھی۔ حیدر کو اس سے اپنی پوری زندگی خسارے کا سودا معلوم ہوئی تھی۔

نگین رات کو حسب معمول اس کے بازو پہ سر رکھے اس کی نائٹ شرٹ کے بٹنوں سے کھیل رہی تھی جب حیدر نے اسے نرمی سے پرے کر کے کروٹ بدلی۔

"پلیز مجھے سکون سے سونے دو"۔ حیدر کے لہجے میں چھپا غصہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی محسوس نہیں کر پائی تھی۔

حیدر کے ساتھ اس کی شادی کو تیسرا ماہ چل رہا تھا، جب نگین کا رزلٹ آؤٹ ہوا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی وہ پوری شان سے فیل ہوئی تھی۔ حیدر کو تو شاید پوری عمر نہ پتا چلتا اگر وہ اسے خود سے ہنس ہنس کر نہ بتاتی۔

"پتا ہے اس بار بھی انگلش میں میرے دس نمبر ہیں۔ لیکن مجھے تو اتنا سا بھی دکھ نہیں ہے، مجھے آپ کے ساتھ شادی کا شوق تھا بس۔۔۔"

"تم صرف میٹرک پاس ہو؟"۔ حیدر ایک بار اور تصدیق کرنا چاہ رہا تھا کہ شاید اس کے کانوں کو دھوکا ہوا ہو۔

"جی ہاں اس میں بھی دو سال فیل ہوئی تھی۔ مجھے نہیں شوق پڑھنے وڑھنے کا۔ شکر کیا ہے جان چھوٹ گئی ہے۔" نگین نے سادگی سے بتایا۔ حیدر پہ تو جیسے ایک اور قیامت گزری تھی۔ خود تو وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اور وہ جاہل ناکارہ لڑکی اس کے پلے باندھ دی گئی تھی۔ جس کو دنیا جہان کی کچھ خبر نہیں تھی۔ اس کی معلومات فلموں اور اداکاروں تک محدود تھی۔ حیدر کے سینے کی گھٹن کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ جیسے کسی پڑھے لکھے بندے سے بات کرنے کو ترس گیا تھا۔ نگین کے پاس باتیں کرنے کے لیے تھا ہی کیا بھلا۔ یہ گانا اس میں کرینہ کپور نے کیا غضب کا ڈانس کیا ہے، وہ سلمان خان کی نئی فلم جس میں وہ سونم کپور کے ساتھ ہیرو آیا ہے کتنا ینگ لگ رہا ہے، مجھے پریم رتن دھن پایو پہ اتنا اچھا ڈانس کرنا آتا ہے، عامر خان نے نئی فلم میں کتنے پیو لو سین کیے ہیں، اف میرا تو دل ہی دھک کرنے لگا تھا۔" بس نگین کے پاس یہی باتیں تھیں، اور حیدر کو لگ رہا تھا وہ کسی دن پھٹ پڑے گا، اور اس دن سب پردے ہٹ جائیں گے۔

نئی شرٹ پہن کر وہ شیشے کے سامنے کھڑی خود کو ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ پنک کلر کی شارٹ ایمبرائیڈڈ شرٹ اس کے سانچے میں ڈھلے وجود پہ ڈھول پہ منڈھے چمڑے کی طرح فٹ تھی، کہیں سے اتنا سا بھی فالتو گوشت نہیں تھا۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" وہ بل کھا کر حیدر کی سمت پلٹی، جو اپنے لیپ ٹاپ کو کھولے اس میں پوری طرح محو تھا۔

"ہونہہ اچھی لگ رہی ہو۔" وہ خاصے توقف کے بعد اس کی سمت دیکھے بغیر بولا۔

"آپ نے تو میری طرف دیکھا تک نہیں پھر آپ کو کیسے معلوم کہ میں اچھی لگ رہی ہوں۔" شادی کے بعد آج پہلی بار اس نے خاصی عقل والا سوال پوچھا تھا۔

"میں بزی ہوں۔" حیدر کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی سرد ہو گیا تھا۔

"آپ تو ہر وقت ہی بزی ہوتے ہیں، میں جو بات بھی کرتی ہوں اس پہ آپ بس ہوں یا ہاں میں جواب دیتے ہیں، میرا بھی دل چاہتا ہے آپ میرے ساتھ لمبی لمبی باتیں کریں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ اس کے لبوں سے پھسلا۔ وہ حیدر کی نائٹ شرٹ کو [illegible] سے دیکھ رہی تھی۔

"اور آپ ٹی شرٹ کیوں نہیں پہنتے، اتنی اسمارٹ باڈی ہے آپ کی، پتا ہے، اگلے ویک کو میں نے میں پارٹی رکھی ہے، سب فرینڈز کو انوائٹ کیا ہے، آپ میرے ساتھ مارکیٹ چلنا، پارٹی میں [illegible] کے لیے میری پسند کا کوئی اچھا سا سوٹ لینا، میں آپ کے لیے فٹ سی ٹی شرٹ بھی لوں گی، اللہ نے اچھی فزیک دی ہے، نظر بھی تو آنا چاہیے ناں، میری سب فرینڈز اتنی تعریفیں کرتی ہیں آپ کی، کہ تمہارا ہزبینڈ ایک دم ہیرو لگتا ہے، اور آپ اپنا ہیر کٹ بھی تھوڑا چینج کریں ناں، وہ شاہ رخ [illegible] کی نئی مووی ہے ناں، آپ اس کا ہیر [illegible] دیکھنا۔۔۔"

"پلیز اسٹاپ اٹ۔۔۔ چپ ہو جاؤ پلیز، سر درد کر دیا ہے تم نے۔" حیدر کے دماغ کو ایک دم ہوا لگا تھا، وہ خاصی اونچی آواز میں جیسے چلا کر [illegible] تھا۔ نگین ہکا بکا اس کی شکل دیکھے جا رہی تھی، [illegible] رفتار سے دھڑکتا اس کا دل سینے میں جیسے بھاگ [illegible] تھا، اس نے حیدر کا یہ لہجہ اور ایسی آواز پہلی [illegible] تھی۔

"اچھا نہیں بولتی اب میں، پرامس۔" نگین بہت جلدی خود کو سنبھالا تھا، اس کا دل بہت صاف [illegible] سادہ تھا، وہ یہی سمجھی تھی کہ شاید کوئی بزنس پرابلم [illegible] اسی وجہ سے حیدر غصے میں ہے۔ تب ہی تو وہ [illegible] چاپ اس کے ایک بازو کو پکڑ کر لپٹ گئی تھی۔

"نہیں نہیں تم بولو کوئی ضرورت نہیں مجھ پہ یہ ا[illegible] کرنے کی، زندگی جہنم بنا دی ہے تم نے میری [illegible] میں تمہارے ساتھ کیا بات کروں، گھٹیا فلموں

ادب کی باتیں، اس کے سوا تمہیں آتا کیا ہے، انٹر فیل ہو تم، ، اقبال، فیض، غالب کا پتا ہے تمہیں؟ ورڈز ورتھ، کیٹس، شیلے، مائیکل شولوخوف، شیکسپئر، خیام، رومی، صادقین، گل غلام علی، مہدی حسن، طلعت محمود، فریدہ خانم کے بارے میں کیا جانتی ہو تم۔ ان کی باتیں کروں تم سے؟ تمہارے ساتھ بیٹھ کر چیپ میوزک سنوں اور واہ واہ کروں۔ گھٹیا قسم کے تھرڈ کلاس فلمی ڈائیلاگز بولوں تم سے،،، ہاں بولو ناں اب چپ کیوں ہو۔ حیدر نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پرے کیا تھا اور اسے دور ہو کر صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ تم بہت حسین ہو، لیکن یقین کرو کہ تم کبھی بھی خوبصورت نہیں محسوس ہو، میرا اور تمہارا مینٹل لیول بالکل الگ ہے"۔ وہ اور بھی بہت کچھ بول رہا تھا، لیکن نگین سن ہی کہاں رہی تھی، اس کے کان تو بس سائیں سائیں کر رہے تھے، بھلا حیدر کیوں اسے یہ سب بولے گا، وہ تو اس کا محبوب شوہر اور آئیڈیل ہے، لیکن وہ بھول گئی تھی کہ وہ حیدر کی آئیڈیل نہیں ہے۔ حیدر نے آج دل بھر کر اپنی بھڑاس نکالی تھی۔ نگین سے اس کے تلوار کے تیز گھاؤ جیسے جملے برداشت نہیں ہو رہے تھے، لیکن اس نے خود کو کنٹرول کر لیا تھا۔

"جب میں آپ کو پسند نہیں تھی تو پھر آپ نے شادی کیوں کی مجھ سے، انکار کر دیتے"۔ بڑی دیر کے بعد وہ اپنے آنسو چھپا کر بولی تھی۔

"اگر مجھے اتنا کچھ پہلے سے معلوم ہوتا تو کبھی بھی تم سے شادی کے لیے حامی نہ بھرتا"۔ حیدر نے بے رحمانہ سچ بولا۔

حیدر تو سو چکا تھا، پر نگین کی آنکھوں سے نیند روٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔

فرخندہ آنٹی کو بتا کر وہ میکے آئی ہوئی تھی، یہاں آئے ہوئے بھی ایک ہفتہ ہو چکا تھا، پر اس دوران ایک بار بھی حیدر نے اسے کال کر کے اس کا حال نہیں پوچھا تھا۔ فرخندہ کو جانے کیوں نگین کے میکے جانے سے کسی خطرے کی بو آ رہی تھی، اس سے پہلے وہ ایک بار بھی ایک دن سے زیادہ میکے نہیں رکی تھی۔ اور ادھر حیدر بھی اپنی دنیا میں مگن تھا، شادی کے بعد وہ اور بھی کم گو ہو گیا تھا۔ وہ نگین کو گھمانے پھرانے بھی نہیں لے کر جاتا تھا، آفس سے آ کر کھانا کھا کر سو جاتا، نگین کے پاس اپنی مصروفیات تھیں سارا دن ان سے مزے مزے کی باتیں کر کے ہنساتی، نگین کے رویئے سے انہیں سب کچھ نارمل لگتا تھا، پر حیدر بجھا بجھا سا رہتا۔

"نگین نے اس بار کچھ زیادہ دن نہیں لگا دیے میکے میں۔ سب ٹھیک تو ہے ناں؟" حیدر آفس سے آ کر بیٹھا ہی تھا، جب فرخندہ بیگم نے اس سے پوچھتا ہوا سوال کیا۔

"مجھے نہیں پتا" اس نے مختصر جواب دے کر ان کے خدشات کی تصدیق کر دی۔

"کیا مطلب وہ تمہیں بتا کر نہیں گئی، کیا کوئی جھگڑا ہے تم دونوں میں"۔

"امی آپ نے میری پوری زندگی کو داؤ پہ لگا دیا ہے، شادی جیسے اہم معاملے میں میں نے آنکھ بند کر کے آپ کی پسند پہ بھروسا کیا تھا، اور کیا ملا مجھے، اسے اچھا تھا میں اپنی پسند اور معیار کے مطابق لائف پارٹنر کا انتخاب کرتا"۔ حیدر نے پہلی بار شکوہ کیا تھا۔

"کیا ہوا ہے حیدر بیٹا، نگین اتنی اچھی ہے، اتنے اچھے خاندان سے ہے، بہت صلح جو اور محبت کرنے والی ہے، اتنی ہنس مکھ ہے، میں تو یہ سوچ کر اسے بہو بنا کر لائی تھی کہ وہ ہمارے گھر میں خوشیاں بھر دے گی، کیا کیا ہے اس نے؟ تم نے تو مجھے بھی شش و پنج میں ڈال دیا ہے"۔

"امی وہ جاہل ہے، انٹر فیل ہے، کچھ نہیں آتا جاتا اسے، میں اس کے ساتھ کمفرٹیبل نہیں ہوں، آپ کی اولاد ہوں میں، میں نے تو یہ سوچ کر اپنی شادی کے سب معاملات آپ کے ہاتھ میں دیے تھے کہ آپ مجھے جانتی ہیں، میرے مزاج کے مطابق لڑکی چنیں گی، لیکن آپ تو ------"۔ انتہائی دلسوزی سے

کہتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"اف ڈرا دیا تھا تم نے، میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھی، انٹر فیل ہے تو کیا ہوا، تم اسے خود پڑھا لو، یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے، اب تم اپنے ابا کو ہی دیکھ لو، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، پر میں مڈل پاس بھی نہیں، اپنے ماموں وقاص کو دیکھ لو انجینئر ہے وہ اور تمہاری مامی میٹرک پاس ہے، اور ایسی کتنی مثالیں دے سکتی ہوں تمہیں، میاں بیوی کی برابر ایک جیسی تعلیم سے تھوڑی گھر بنتے ہیں، اس کے لیے عورت میں سلیقہ برداشت اور خلوص ہونا چاہیے، رشتوں کا احترام آتا ہوا سے، گھر بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے، نگین اپنے والدین کے گھر میں ہل کر پانی بھی نہیں پیتی تھی، اور اب میں اسے دیکھتی ہوں، سارا دن تمہارے چھوٹے چھوٹے کام کرتی ہے، ایک دن میں نے اسے کہا کہ حیدر کو گرم گرم چپاتی پسند ہے، تب سے وہ خود کچن میں کھڑے ہو کر خود بناتی ہے، کتنی بار تو میرے سامنے اس کا ہاتھ جلا ہے، وہ مجھ سے کرید کرید کر تمہاری پسند اور ناپسند کے بارے میں پوچھتی ہے"۔ فرخندہ بیگم نے اس کے اعتراضات کو اہمیت نہیں دی تھی، حیدر جھنجلا کر ان کے پاس سے اٹھ گیا۔ وہ اس کا نقطہ نظر سمجھ نہیں سکتی تھیں۔

"حیدر کے کزن کی شادی تھی، فرخندہ بیگم نے نگین کو بہانے سے خیر خیریت پوچھنے کے لیے کال کی تو اگلے دن وہ چلی آئی، ہشاش بشاش، ہنستی مسکراتی، اس کے چہرے سے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ کچھ ہوا ہے۔ حیدر نے اسے دیکھ کر کسی بھی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ نہ کوئی گرمجوشی، وہ اس کے سامنے ہوتے ہوئے بھی جیسے سامنے نہیں تھی، وہ حسب معمول اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ نگین کروٹ لے کر لیٹی، اس نے اپنی طرف کا بیڈ لیمپ آف کر دیا تھا۔ وہ بے آواز رو رہی تھی، گزشتہ پورا ہفتہ اس نے حیدر کی کال اور میسج کا انتظار کیا تھا۔ اور جب وہ گھر آئی تھی تب بھی حیدر نے اسے نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا، حالانکہ میکے میں سب نے ہی اس بار اس کی اتری صورت کو نوٹ کیا تھا، سوال کرنے پہ اس نے سب کو ٹال دیا تھا۔ فرخندہ آنٹی نے باتوں باتوں میں اسے عاصم کی شادی کا بتایا تو اس نے گھر واپسی کا فیصلہ کیا۔

اجنبی بنا حیدر اس کی طرف سے مکمل طور پہ لاپروا تھا، نگین نے سوتے ہوئے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ جیسے وہی اس کا آخری سہارا ہو۔

"اچھی کتابیں اور عمدہ میوزک میری کمزوری ہیں، نئی نئی جگہیں دیکھنا، کچھ کھوجنا میری ہابی ہے"۔ ثانیہ اپنے دھیمے لہجے میں اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ "میکسم گورکی، موپاساں، اور ان کے ساتھ مائیکل شولوخوف کا ناول وار اینڈ پیس میرا فیورٹ ناول ہے، گون ودھ دا ونڈ اور رومن ہالی ڈے کتنی بار دیکھ کر بھی دل نہیں بھرا میرا، مارلن منرو کی لائف پہ جتنی بار بھی کچھ لکھا گیا وہ میں نے پڑھا، اور کیا آپ نے ان ڈیسنٹ پرپوزل دیکھی آپ نے، ڈیمی مور نے اچھی ایکٹنگ کی اس میں"۔ حیدر سحر زدہ سا ثانیہ کو بولتے ہوئے سن رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ بولتی جائے، تب ہی تو اس نے ثانیہ کی بات کو کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"میں تو ایک ہفتے سے کلیات غالب بار بار پڑھ کر سر دھن رہی ہوں، امیر خسرو کا کلام بھی بہت خوب ہے، میری اور آپ کی پسند حیرت انگیز طور پہ ملتی ہے"۔ ثانیہ نے بولتے ہوئے اس کی آنکھوں کے ساتھ جیسے اس کے دل میں بھی جھانکا تھا۔

"کاش ہمارے ستارے پہلے مل جاتے، تو آج میری زندگی میں کوئی حسرت تو نہ ہوتی، کاش کاش"۔ حیدر دل میں خود سے مخاطب تھا۔

"سنیں مجھے مارکیٹ جانا ہے لے جائیں گے؟"۔ نگین نے بڑی لجاجت سے سوال کیا تھا، پاس ہی فرخندہ بیگم بھی بیٹھی تھیں، انہیں شاید نگین کا یہ انداز پسند نہیں آیا تھا، جبھی تو انہوں نے ایک ترچھی نگاہ حیدر

الی تھی۔
''کیوں نہیں لے کر جائے گا تم جا کر تیار ہو جاؤ''۔
''ہاں آدھے گھنٹے تک لے جاؤں گا'' حیدر کے
اس اب انکار کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ نگین ٹھیک
آدھے گھنٹے بعد اس کی گاڑی میں بیٹھی اس کے
ساتھ جارہی تھی۔
''مجھے سعید بک بینک جانا ہے، آپ ساتھ جائیں
گے یا گاڑی میں ہی بیٹھیں گے؟''۔ اس نے اترنے
سے پہلے پوچھا۔
''سعید بک بینک سے کیا لینا ہے؟''۔ حیدر حیران
ہوا۔
''بکس لینی ہیں''۔ نگین نے سنجیدگی سے جواب دیا
اور گاڑی سے اتر گئی۔
ٹہلتا ہوا وہ بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ وہ شاعری
کی کتابیں دیکھ رہی تھی، جو کتاب، ٹائٹل اور عنوان
سے پسند آرہا تھا، وہ اسے لینے کے ارادے سے الگ
کر رہی تھی، شاعری کے بعد اس نے اردو ناولز اور
فسانوں کی کتابیں خریدیں، وہاں دنیا بھر کے
یبوں کی کتابیں انگلش زبان میں بھی موجود تھیں، پر
گین انہیں حسرت سے دیکھ کر رہ گئی، اسے بھلا کہاں
لش آتی تھی۔ حیدر نے بل کی ادائیگی کر کے اس کی
ریدی گئی کتابیں اٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ رکھی۔
''یہ کتابیں، اور شاعری تمہیں سمجھ آجائے
ی؟''۔ حیدر نے گاڑی چلاتے ہوئے اس سوال
یا۔
''مجھے اپنی اردو زبان بہت اچھی طرح سے سمجھ میں
تی ہے''۔ جواباً وہ سرد سے لہجے میں بولی۔
''اچھا تو پھر اس شعر کی تشریح کر دو۔
''آہ کو یک عمر چاہیے اثر ہونے تک
ون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک
یدر فاتحانہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔
''مجھے شعر اور شاعری دونوں سمجھ نہیں آتی، کیونکہ میں
ے کبھی ان میں دل چسپی ہی نہیں لی۔ لیکن جب مجھے
شعر کی سمجھ آجائے گی تو میں بتا دوں گی''۔ حیدر

نے بے ساختہ امنڈنے والے قہقہے کا گلا گھونٹا تھا۔
''جب سمجھ ہی نہیں تو اتنی ڈھیر ساری بکس کیوں
لی؟''۔ نگین نے بے بسی سے نظر چرائی تھی۔

ویک اینڈ پہ حیدر رات کو لیٹ ہی سوتا تھا، اسے ہالی
ووڈ کی پرانی کلاسک فلمیں پسند تھیں، رات کو وہ لازمی
فلم دیکھتا تھا، جب کہ نگین اپنے سیل فون پہ اپنے
فیورٹ گانے سنتی تھی، لیکن جب سے وہ کتابوں کا پورا
بنڈل خرید کر لائی تھی تب سے اس نے گانے سننے
بند کر دیے تھے۔ وہ کب سوتی تھی حیدر کو اس کا علم نہیں
تھا، لیکن اس نے حیدر کے بازو پہ سر رکھ کر سونا چھوڑ
دیا تھا۔ ہمہ وقت کھوئی کھوئی اور سوچوں میں گم
رہتی۔ فرخندہ بیگم نے بھی اس کی خاموشی کو نوٹ کیا
تھا، تب ہی تو انہوں نے نگین کو عاصم کی شادی میں
دو دن پہلے ہی اس کی طرف بھیج دیا تھا، کہ وہاں جا کر
اس کا موڈ اچھا ہو جائے گا، دل ہی دل میں وہ حیدر
سے بھی ناراض تھیں۔

حیدر اور فرخندہ عاصم کی مہندی والے دن شام کو
آئے تھے۔ عاصم حیدر کے تایا کا بیٹا تھا، اس کی
بہنیں جی بھر کر اپنے ارمان پورے کر رہی
تھیں۔ شادی سے دس دن پہلے ہی ڈھولکی رکھ دی گئی
تھی، روز رات کو گانا بجانا ہوتا، جب سے نگین آئی
تھی، تب سے محفل سج سی گئی تھی، اسے شادی بیاہ کی
مناسبت سے بہت سے گانے یاد تھے، ڈھولک دے
کر اسے ہی سب کے درمیان میں بیٹھایا جاتا تھا، اور
وہ ایک کے بعد دوسرا گانا پورے شوق سے گاتی، اس
کے مشاق ہاتھ ڈھولک پہ خوب تھاپ دیتے
تھے، سماں سا بندھ جاتا تھا۔ خاندان کی بڑی
بوڑھیاں اور بیاہی عورتیں بھی اس کے ساتھ مل کر
ٹپے اور ماہیے گاتیں۔ سب سے آخر میں وہ روایتی
رقص کرتی تو حیدر کی کزنز اپنے اپنے سیل فون میں
اس کی فوٹو بناتیں۔ عاصم کی شادی کو اس نے یادگار
بنا دیا تھا۔

عاصم کی مہندی کا فنکشن ہال میں تھا، جہاں پورے میوزک سسٹم کا انتظام تھا۔ ہر طرف سے خوشی کے گیتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

نگین نے ریڈ کلر کا لانگ کامدار فراک پہنا ہوا تھا، اور بڑی نک سک سے تیار ہوئی تھی۔ لڑکیاں بالیاں فرمائش کر رہی تھیں کہ نگین بھابھی فلاں گانے پہ ڈانس تو کریں۔ آخر میں جب حیدر کی تین چار کزنز اس کا ہاتھ تھام کر اسٹیج کے درمیان لائیں تو اسے ماننا ہی پڑا۔ حیدر کا ایک پندرہ سال کا کزن بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے آ گیا۔

حیدر کسی کام سے اس طرف آیا تھا، فون پہ بات کرتے کرتے اس کی نگاہ اسٹیج پہ پڑی تو پھر واپس پلٹنا بھول گئی۔

گورے گورے پیراں وچ نچدے نہ پین ہوے
لاواں جھڈ وبام سو ہنیے

پندرہ سال کا سنی نگین کا ہاتھ پکڑے خاص انداز میں اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دے رہا تھا۔

اوہ بے بی ڈول میں سونے دی
اوہ بے بی ڈول میں سونے دی

کان پھاڑ میوزک بج رہا تھا۔ اور اس کی نصف بہتر پوری دنیا کو فراموش کیے ناچ رہی تھی، حیدر کے اور بھی بہت سے کزنز لطف لینے کے لیے آ گئے تھے۔ حیدر کے دماغ کا فیوز بھک سے اڑا تھا، آن کی آن میں وہ نگین کی طرف لپکا، اس کے بعد جو ہوا سب نے دیکھا، اس نے نگین کو کتنے ہی تھپڑ لگا تار جڑے تھے۔ حیدر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نگین نے سرعام اس کی عزت کا جنازہ نکال دیا ہو۔ پوری محفل کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ نگین کس طرح وہاں سے روتی ہوئی نکلی اور کیسے گھر پہنچی اسے ایک ایک بات یاد تھی۔ سب کے سامنے اپنی اہانت اور ذلت کو بھول بھی کیسے سکتی تھی وہ۔

رزاق صاحب اور فرخندہ بیگم نے حیدر کو کتنا ڈانٹا باتیں سنائیں

"نگین فیملی فنکشن پہ سب کے ساتھ خوشی منا رہی تھی، ایسا کون سا گناہ کبیرہ کر دیا تھا اس نے جو سب کے سامنے تم نے اس پہ ہاتھ اٹھانے کی گھٹیا حرکت کی"۔ رزاق صاحب کا لہجہ پہلی بار بیٹے کے سامنے بلند ہوا تھا۔

فرخندہ بیگم بھی بہو کی طرف دار تھیں، حیدر کے اس اقدام کو انہوں نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ نگین کو چپ لگ گئی تھی۔ فرخندہ بیگم نے اسے ساتھ لگا کر پیار کر کے حیدر کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن ہال میں سب کے سامنے ہونے والی اپنی بے عزتی کو وہ اتنی آسانی سے فراموش کرنے والی نہیں تھی۔ اگلے دن اس نے روتے ہوئے پپا کو کال کی، وہ اسے ساتھ لے گئے تھے۔ نگین کا دل بری طرح ٹوٹا تھا۔ حیدر کو اس کے جانے کے بعد عجیب سا سکون محسوس ہوا تھا، اس نے اپنے دل کو ٹٹولا وہاں کسی بھی قسم کا احساس زیاں نہیں تھا۔ الٹا اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے نگین نے خود اس کے گھر سے جا کر اسے کسی بڑی زحمت سے بچا لیا ہے۔

نگین نے واپس جانے کی ایک ہی شرط رکھی تھی کہ حیدر اپنے نامناسب رویے کی معذرت کرے، معافی مانگے تو وہ اسی صورت میں آئے گی۔ ادھر حامد اور اسما بیگم بہت غصے میں تھے، وہ حیدر سے باز پرس کرنا چاہتے تھے، پر نگین نے انہیں سختی سے روک دیا تھا۔ نگین ان کی لاڈلی بیٹی تھی، اس کے دکھ پہ وہ بھی دکھی تھے۔

حیدر نے نگین سے معذرت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

"میں نے اسے گھر سے نہیں نکالا وہ خود گئی ہے، میں اسے منانے نہیں جاؤں گا"۔ اس نے صاف منع کر دیا تھا۔

رزاق صاحب اور فرخندہ بیگم کتنی بار اسے منا کر گھر واپس لانے کے لیے گئے، پر نگین کی بھی ایک ہی ضد تھی جب حیدر اس کے پاس آ کر اس سے معافی مانگے گا وہ تب ہی جائے گی۔ ورنہ نہیں۔ اب تو اسے گئے ایک سال ہونے والا تھا، حیدر معذرت کرنے کے لیے

راضی نہیں تھا، نگین بھی میکے میں اپنی ضد پہ قائم تھی۔

"پڑوس میں نئی فیملی آئی ہے، بہت اچھے لوگ ہیں، میں نے ابھی شام کی چائے پہ گھر بلایا ہے انہیں۔"

چلیں اچھا ہے آپ کا دل بھی بہل جائے گا۔" حیدر مسکرایا، تو فرخندہ نے شاکی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "میری چھوڑو اپنی سوچو، نگین کو نہیں لاتا تو اس کی زندگی تباہ مت کرو۔" ایک بار پھر وہی تکلیف دہ موضوع چھڑ چکا تھا۔ اس نے شکر کیا جب ڈور بیل بجی اور فرخندہ بیگم اٹھ کر وہاں سے گئیں۔ ڈرائنگ روم میں ساتھ والے پڑوسی آچکے تھے، صابرہ بیگم اور ان کے ساتھ ثانیہ کو دیکھ کر اسے خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ بیٹے کے چہرے پہ پھیلتی مسکراہٹ نے فرخندہ بیگم کو عجیب سے احساس سے دوچار کیا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ نیا ہونے جا رہا ہے۔

آنے والے دنوں میں وہ اور ثانیہ بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ حیدر کو یوں محسوس ہو رہا تھا اس نے اپنے دل کی مراد پالی ہے۔ اس نے صاف اور کھلے الفاظ میں ثانیہ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا، وہ اب پہلے کی طرح لاعلمی میں مارا نہیں جانا چاہتا تھا۔

صابرہ بیگم اس علاقے میں کچھ عرصہ پہلے ہی شفٹ ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنے خاندان کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ بیوہ ہیں۔ شوہر کے مرنے کے بعد انہوں نے دوبارا شادی نہیں کی، ان کے ساتھ ان کا بھائی بھی تھا، ثانیہ کے ماموں منیر کا اپنا چھوٹا سا بزنس تھا، ایک ٹانگ سے معذور تھے، اسی لیے ان کی شادی نہیں ہو پائی تھی، صابرہ بیگم کا ایک بھائی اور بیٹی ثانیہ کے علاوہ دنیا میں اور کوئی بھی نہیں تھا، وہ کراچی میں رہائش پزیر تھیں، ان کے بھائی منیر نے انہیں مشورہ دیا کہ گھر اور کاروبار کسی چھوٹے اور پرسکون شہر میں منتقل کر کے سکون کی زندگی گزارتے ہیں، اسی لیے وہ اسلام آباد شفٹ ہوئی تھیں۔

دونوں گھرانے بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے، ثانیہ، حیدر کے آئیڈیل کی ہو بہو تصویر تھی، اب تو رزاق صاحب کو بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ بیل منڈھے چڑھ کے رہے گی، کیونکہ نگین اپنی ضد پہ قائم تھی، دوسری طرف حیدر کو اس کی ناراضی کی اتنی سی بھی پروا نہیں تھی، وہ ثانیہ کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر چکا تھا، رزاق صاحب کی طبیعت اچانک ہی خراب ہوئی تھی، انہیں ایمرجنسی میں ہاسپٹل لے جانا پڑ گیا، فرخندہ نے نگین کو فوراً اطلاع دی تھی، نگین حامد صاحب کے ساتھ ہاسپٹل میں آئی اور وہیں سے اپنے سسر کا حال چال پوچھ کر چلی گئی، نگین اور حیدر کا آمنا سامنا نہیں ہوا، لیکن فرخندہ بیگم کی زبانی اسے بھی علم ہو چکا تھا کہ نگین ہاسپٹل آئی تھی۔

رزاق صاحب کو اجل اچک کر لے گئی، انہیں ہاسپٹل سے زندہ واپس آنا نصیب نہیں ہوا تھا، نگین ان کی موت کے وقت، سعودیہ میں عمرہ کرنے گئی ہوئی تھی۔

رزاق صاحب کی میت اٹھتے وقت اس کے گھر سے صرف اس کے دو بھائی آئے تھے، باقی سب سعودیہ میں عمرہ کر رہے تھے۔

اب تو فرخندہ بیگم کے دل میں بھی نگین کی طرف سے میل آگیا تھا۔ ایک چھوٹی سی بات پہ خواہ مخواہ اپنا گھر تباہ کرنے پہ تلی بیٹھی تھی۔ ان کے خیال میں وہ تھوڑا جھک جاتی تو شائد حیدر ثانیہ کی طرف مائل نہ ہوتا۔

ثانیہ اور صابرہ بیگم ان کے گھر کا لازمی جزو سا بن گئی تھیں، پھر بہت جلدی وہ حیدر کی دوسری بیوی بن کر اس کے گھر کے ساتھ ساتھ اس کے دل پہ بھی قابض ہو گئی۔

ثانیہ اور حیدر کی شادی پہ سب سے زیادہ دکھ سبین کو ہوا تھا۔ نگین اس کی بہت اچھی دوست تھی، حیدر نے اسے سمجھنے اور فیصلہ کرنے میں بہت جلد بازی سے کام لیا تھا۔ باقی دوسری طرف نگین نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ اس نے اپنی ادھوری تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا تھا۔ انگلش کے مضمون میں وہ سدا سے کمزور تھی، اب اسے جنون لاحق ہو چکا تھا کہ یہ زبان ہر حال میں سیکھنی ہے۔ حامد صاحب نے اس کی ذہنی

حالت کے پیش نظر اس کے لیے خاص طور پہ انگلش کا ٹیوٹر رکھوایا تھا، انٹر میں دو سال فیل ہونے کے بعد اس نے تیسری بار کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اور اب اسے مزید آگے بڑھنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔

اس نے دن رات محنت کی تھی، جس کا پھل اسے کامیابی کی شکل میں ملا۔ وہ گریجویشن کے پیپرز دے رہی تھی، جب سبین نے روتے ہوئے اسے حیدر کی دوسری شادی کی اطلاع دی۔

نگین کے سینے میں سناٹا پھیل رہا تھا، دل کو ابھی تک خوش فہمی تھی کہ کچھ بھی ہو حیدر کی زندگی میں اس کے سوا اور کوئی بھی نہیں آسکتا، یہ صدمہ بھی اسے جھیلنا تھا، پپا اور اسما بیگم نے کتنا کہا کہ حیدر سے خلع لے کر تم بھی اپنی زندگی شروع کرو، نگین نے ان کی یہ ضد پوری کرنے سے انکار کر دیا تھا، الہڑ شوخ، لاابالی ہر پل قہقہے بکھیرنے والی نگین اس کے دل میں مر چکی تھی، فلموں، گانوں اور رقص سے اس کی دلچسپی دم توڑ چکی تھی، اپنے میوزک کا سب ذخیرہ اس نے اپنے ہاتھوں سے تباہ کیا تھا، شادی بیاہ کے سب فنکشنز میں اس نے آنا جانا ختم کر دیا تھا، پہلے وہ بہت زیادہ بولتی تھی، اب وہ عادت بھی چھوٹ گئی، اسما بیگم اپنی لاڈلی بیٹی کو اس حال میں دیکھ دیکھ کر روتیں، وہ پچھتا رہی تھیں کہ انہوں نے نگین کی شادی کرنے میں بہت جلد بازی سے کام لیا، اور کتنے قدر دان گھرانے تھے، جو اس چاند کو اپنے آنگن میں سجانے کے آرزو مند تھے۔

نگین نے گریجویشن کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا، اب وہ یونیورسٹی میں انگلش لٹریچر کی طالبہ تھی، انگلش کو وبال جان تصور کرنے والی نگین نے یہ زبان سیکھ لی تھی، اسے اب بخوبی علم ہو چکا تھا کہ ورڈز ورتھ، شیلے، کیٹس، بائرن، شیکسپیر، ٹیگور، منٹو، منشی پریم چند، فیض، ناصر کاظمی، پروین شاکر، صادقین کون ہیں، اب وہ ان کی ادبی خدمات پہ بے تکان بول سکتی تھی، اس کی اداس آنکھوں اور چہرے پہ پھیلے حزن نے یونیورسٹی میں کتنے ہی لوگوں کو متاثر کیا، ذکا آفریدی اس کی اداسی کی وجہ جاننا چاہتا تھا، لیکن نگین کے ہونٹوں پہ چپ کا قفل تھا، اس نے اپنی ماں کو اس کے گھر رشتے کے لیے بھیجا تو تب اسے علم ہوا کہ یہ کانچ سی لڑکی کتنا بڑا بوجھ اٹھا کر پھر رہی ہے، ذکا سچ مچ اس کا ہاتھ تھامنا چاہتا تھا، لیکن نگین کسی انتظار میں تھی، اس نے ذکا کو مایوس لوٹایا تھا۔ لیکن وہ مایوس نہیں تھا۔

ثانیہ کے ساتھ اس کی شادی پریوں کی کہانی کی طرح خواب ناک ثابت نہیں ہو پائی تھی، ثانیہ نے بہت جلد اپنے اصل رنگ ڈھنگ دکھا دیے تھے۔ شادی کے کچھ دن تو بڑے سکون میں گزرے، اس کے بعد صابرہ بیگم اور ماموں منیر بھی ان کے گھر آ گئے، ثانیہ کا کہنا تھا کہ وہ اکیلے گھر میں گھبراتے ہیں، یہاں رہیں گے تو امی کو بھی کمپنی مل جائے گی، فرخندہ کو وہ امی ہی کہتی تھی، رزاق صاحب کی موت کے بعد انہوں نے الگ تھلگ رہنا شروع کر دیا تھا۔ حیدر کو بیوی کا مشورہ اور اقدام بہت اچھا لگا، لیکن آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ ثانیہ کے ماموں اور ماں تو اس کے گھر کے سکون کو غارت کرنے پہ تلے ہوئے ہیں۔ گھر میں اونچی آواز میں ٹی وی چلتا، موسیقی سے دونوں بہن بھائی کو بہت لگاؤ تھا، طرح طرح کے کھانوں کی فرمائشیں کی جاتیں، حیدر ثانیہ کے ساتھ جہاں بھی جاتا وہ دونوں پہلے تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھتے۔

فرخندہ بیگم کو رزاق صاحب کے پاس جانے کی بہت جلدی تھی۔ ایک رات سوئیں تو پھر اٹھیں ہی نہیں۔ تینوں بہنیں اپنے اپنے گھر والی تھیں کچھ دن تک آتی رہیں پھر وہ بھی اپنی زندگی میں مصروف ہو گئیں۔ ویسے بھی ثانیہ کو اپنے گھر میں کسی کا زیادہ آنا جانا پسند نہیں تھا۔ حیدر بہت جلد اس کی پسند ناپسند سے واقف ہو چکا تھا۔ ثانیہ کو حیدر کے کھانے پینے کپڑوں کی خاص پروا نہیں تھی، یہ سب کام اس نے نوکروں پہ چھوڑ رکھے تھے، کھانا تو شاذ و نادر ہی وہ گھر میں بناتی، ناشتے کھانا سب باہر سے آتا، اس

شادی کے بعد ایک بار بھی حیدر کے ساتھ بیٹھ کر اس کے پسندیدہ موضوعات پہ گفتگو نہیں کی تھی۔ اونچی اونچی آواز میں بولتی وہ تو کوئی اور ہی تھی۔ احساس زیاں نے حیدر کو بہت تیزی سے گھیرا تھا۔ نت نئے ہوٹل کے کھانوں اور شریک کی بے نیازی اور بے اعتنائی کی وجہ سے حیدر کی صحت بہت تیزی سے گری تھی، بلڈ پریشر اور سر درد نے اسے گھیر لیا تھا۔

یہاں تک بھی سب گوارہ تھا، اگر اس کا عزیز ترین دوست اسد کراچی سے اس کے گھر نہ آتا۔

حیدر کو ایک ضروری کام سے دوسرے شہر جانا تھا، وہ تیار ہو کر ائیر پورٹ کی طرف جا رہا تھا، جب اسد نے کال کر کے اپنے آنے کا بتایا۔ وہ اسلام آباد میں ہی تھا۔ حیدر نے دوسرے شہر جانے کا ارادہ کینسل کر دیا۔ وہ اب اسد کے ساتھ اپنے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ ثانیہ کو بتانے کا خیال اس کے ذہن سے نکل چکا تھا۔

ثانیہ، ماموں منیر اور صابرہ بیگم تینوں کا رنگ اسد کو دیکھ کر اڑ چکا تھا۔

"بنے میاں، بہت اونچا ہاتھ مارا ہے تم نے"۔ اسد نے طنزیہ نگاہوں سے ماموں منیر کی طرف دیکھ کر انہیں مخاطب کیا، تو وہ جھینپ سے گئے۔

"آپ یہاں زہے نصیب"۔ صابرہ بیگم نے جس مخصوص انداز میں اسد کو مخاطب کیا تھا، وہ یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ اصل میں ہیں کیا۔

"الماس بیگم دنیا گول ہے، دیکھ لیں"۔ اسد صابرہ بیگم کو الماس کہہ کر مخاطب کر رہا تھا، حیدر کی سمجھ سے سب باہر تھا، وہ باری باری ان سب کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔

"میرے دوست تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے، تم نے ہیرے کی جگہ پتھر چنا ہے"۔ اسد کا ایک ایک لفظ سفاک سچائی سے بھرپور تھا۔

صابرہ بیگم کا اصل نام الماس تھا، اس کا تعلق اس بازار سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی تھیں۔ ثانیہ یعنی نیلم اس کے بڑھاپے کا اکلوتا سہارا تھی، بنے میاں الماس کا ناکارہ اور ہڈ حرام بھائی تھا، وہی گاہک لاتا تھا، نیلم شارٹ کٹ سے دولت کمانا چاہتی تھی، اس کے لیے اس علاقے سے نکلنا ضروری تھا، اس کے قدر دان بہت تھے، جمع پونجی سے اور ایک بااثر عاشق کی بدولت نیلم شہر کے پوش علاقے میں شفٹ ہو چکی تھی، اب وہ اپنی الگ شناخت بنانا چاہتی تھی، نیلے پیلے لوگوں کو وہ منہ نہیں لگانا چاہتی تھی، اور اپنے حسن کی پوری پوری قیمت وصول کرنا اس کی زندگی کا مقصد تھا، اس خاطر سب سے پہلے اس نے امیروں والی زبان سیکھی، ٹیوٹر بہت تھے، ساتھ ساتھ ہائی سوسائٹی کے سب آداب اسے یاقوت نے سکھا کر گوہر نایاب بنا دیا۔ یاقوت نے امیروں کی جیب سے پیسے نکلوانے کے ہر فن میں اسے طاق کر دیا تھا۔

نیلم اب ہائی سوسائٹی کی کال گرل تھی، اس کی قیمت ادا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی، اپنے ایک دوست کے ذریعے اسد نیلم سے متعارف ہوا، اسد کا یہ دوست نیلم پہ بری طرح عاشق ہو چکا تھا، لیکن نیلم کا کوئی ایک عاشق تو تھا نہیں لائن لگی ہوئی تھی، ہر کوئی اسے حاصل کرنا اس کے ساتھ وقت گزارنے کا خواہش مند تھا، وہ کوئی عام کال گرل نہیں تھی، دنیا جہاں کے لٹریچر، آرٹ اور فنون کے بارے میں اس کی معلومات بے حد وسیع تھی۔ اسد کا دوست شیری نیلم کو صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھنا چاہتا تھا، اس مقصد کے لیے اس نے نیلم کو اس کی منہ مانگی رقم ادا کی تھی، لیکن نیلم اسے خسارے کا سودا سمجھتی تھی، اس کے تعلقات باقی لوگوں سے بھی اسی طرح قائم تھے، شیری نے ایک دن اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا، وہ اسے جان سے مارنا چاہتا تھا، اس موقعے پہ بنے میاں اور الماس بیگم نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا، انہوں نے شیری کو شدید زخمی کر دیا، وہ قریب المرگ تھا، الماس بیگم نے نیلم اور بنے میاں سمیت سب کچھ سمیٹ کر کراچی شہر کو الوداع کہہ دیا، شیری کو اپنے خیال میں انہوں نے مار

دیا تھا، شیری کی زندگی باقی تھی، اس کے باپ نے پانی کی طرح پیسہ بہایا تھا، تب کہیں جا کر شیری کے نیم مردہ وجود میں پھر سے حرکت پیدا ہوئی۔ صحت مند ہونے کے بعد اس نے ہر جگہ نیلم اور الماس سمیت بنے میاں کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کراچی میں ہوتے تو ملتے ناں۔

الماس اور نیلم ایک ہی تجربے سے بہت خوف زدہ تھیں، انہیں شیری کی طاقت کا اندازہ تھا، اس نے انہیں تلاش کر کے ان کی تکہ بوٹی ایک کر دینی تھی۔ اسی لیے انہوں نے اپنا رہن سہن نام اور حلیہ تک بدل ڈالا تھا، اب انہیں شیری آسانی سے تلاش کر کے پہچان نہیں سکتا تھا۔

یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا، بہت جلد ان کی شرافت کا سکہ جم گیا۔

ان کے گھر کام کرنے والی نوکرانی نے تیسرے گھر میں رہنے والی فیملی کے بارے میں دل چسپ باتیں بتائیں، ثانیہ اور الماس کا ہی آئیڈیا تھا کہ اگر حیدر کو پٹا لیا جائے تو باقی زندگی سکون سے بیٹھ کر کھاتے گزرے گی، وہ اس میں کامیاب ہی نہیں اگر اسد بیچ میں نہ آتا۔

حیدر کو ان سے گلوخلاصی کرنی مشکل تھی، اسد نے قدم قدم پہ اس کا ساتھ دیا۔ اس نے دھمکی دی تھی چپ چاپ حیدر کی زندگی سے نکل جاؤ ورنہ شیری کو یہاں لانا مشکل نہیں ہے، یہ حربہ کاری کر رہا تھا، الماس اور نیلم اس کا گھر چھوڑ کر جا چکی تھیں، حیدر نے مالی طور پہ کافی نقصان برداشت کیا تھا پر صد شکر کہ وہ مزید دھوکا کھانے سے بچ گیا تھا۔

اس کی تینوں بہنیں اور سب خاندان والے توبہ تلا کر رہے تھے۔

حیدر اب نگین سے معافی مانگنے اور اور اسے گھر واپس لانے کے لیے تیار تھا۔

"ٹھیک آٹھ سال بعد ہاں ٹھیک آٹھ سال بعد وہ اس سے معافی مانگنے آیا تھا۔ وہ اس کا آئیڈیل نہیں تھی پر اب بن چکی تھی، اس کے پسند کے سانچے میں پوری طرح ڈھل چکی تھی۔ نگین کالج میں انگلش لٹریچر کی لیکچرار تھی اب، آٹھ سال میں اس نے خود کو دریافت کر لیا تھا، اپنی کمزوری کو اپنی خوبی بنا لیا تھا، یہ آٹھ سال اسے کندن بنا گئے تھے۔ گزرنے والے آٹھ سالوں میں اس نے حیدر کے نکاح میں رہ کر بھی کسی بیوہ کی طرح زندگی گزاری تھی۔ اس نے ہر شوق اور بناؤ سنگھار سے پیچھا چھڑا لیا تھا، لیکن آج سجنے سنورنے بلکہ سولہ سنگھار کرنے کا موقعہ تھا۔

اسے یقین تھا ایک دن وہ ضرور اس کے پاس آئے گا، اس نے ہر سجدے میں رب سے رو رو کر التجا کی تھی، وہ ایک بار اس کے سامنے آئے۔ اور وہ آ چکا تھا۔ نگین نے سب گھر والوں سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ حیدر جب بھی آئے اسے پہلے جیسی ہی عزت اور احترام دیا جائے، اس وقت سب گھر والے اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، سامنے پڑی ٹیبل طرح طرح کے کھانوں سے بھری تھی، پر حیدر کی بے تاب نگاہ دروازے پہ جمی تھی جہاں سے نگین نے آنا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں اس کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہو رہی تھی، اس نے اپنا سب سے بہترین سوٹ زیب تن کیا، اس کے لمبے بال آج بھی ویسے ہی گھنے اور چمکدار تھے، اس کی جلد ویسی ہی بچوں کی جلد کی مانند نرم و ملائم تھی، یاقوتی ہونٹوں کی وہی جان لیوا سرخی ابھی بھی قائم و دائم تھی، سفید، ہموار دانتوں کی لڑی ہنسی بکھیرنے کو بے تاب تھی، آٹھ سالوں نے نگین پہ کوئی بھی خاص اثر نہیں ڈالا تھا، بس وہ سنجیدہ اور کم گو ہو گئی تھی۔

نگین کے نپے تلے قدم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے، حیدر اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا، وہ پہلے کی طرح تروتازہ اور فریش لگ رہی تھی، بلکہ اس کی خوب صورتی میں وقت نے اضافہ ہی کیا تھا۔ اس کے چہرے پہ وقار اور تمکنت تھی۔ اس نے دھیمے انداز میں اندر آ کر حیدر کو سلام کیا، جو اسے ابھی تک یک ٹک دیکھے جا رہا تھا، اس کے سر کے آگے کے بال اڑ چکے تھے، آنکھوں کے نیچے پڑے

حلقے اس کی بری صحت کی چغلی کھا رہے تھے۔ وہ پرانے حیدر کا عکس تک نہ تھا وہ جس پہ مر مٹی تھی۔
انہیں تنہا چھوڑ کر سب کمرے سے جا چکے تھے۔

"نگین مجھے معاف کر دو، میں غلطی پہ تھا، تم اپنی جگہ ٹھیک تھیں، میں تمہاری قدر ہی نہیں کر پایا تمہیں پہچان ہی نہیں سکا، امی ٹھیک کہتی تھیں، تم خاندانی اور خالص عورت ہو، ہنسی مذاق شوخی شرارت تمہاری عمر کا تقاضا تھا، بس میں ہی صبر نہ کر پایا، کاش میں میں اتنی جلد بازی نہ کرتا، لیکن تم فکر مت کرو، میں اپنی غلطی کا ازالہ کرنے آ گیا ہوں، میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ میرے انتظار میں تم نے اپنی زندگی کے آٹھ سنہرے سال گزار دیے۔ میں اب باقی ہر پل تمہاری محبت اور وفا کے سائے میں گزارنا چاہتا ہوں، میرا گھر میرا دل تمہارے انتظار میں ہے، تم چلو میرے ساتھ۔" حیدر اسے پیار سے تکے جا رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ ابھی اسے بانہوں میں بھر کر حدیث دل اسے سناتا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑنے کے لیے آگے بڑھا، نگین ایک طرف ہو گئی۔ وہ اسے راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہوئی تھی۔

"اب آپ جا سکتے ہیں، میں نے اسی پل کا آٹھ سال انتظار کیا اور کسی اور کو بھی انتظار میں رکھا، مسٹر حیدر آپ ایک انتہائی خود غرض اور خود پسند انسان ہیں۔ آٹھ سال پہلے میں بہت امیچور اور لا ابالی تھی، آپ مجھے پیار سے سمجھا بجھا کر اپنی پسند کے سانچے میں با آسانی ڈھال سکتے تھے، لیکن آپ نے دوسرا راستہ چنا۔ لیکن میرا راستہ بھی مشکل کر دیا ---لیکن خیر اگر آپ ایک پل کے لیے بھی شرمندہ ہوئے ہوں یا آپ کو مجھ سے اتنی سی بھی محبت ہے تو مجھے ڈائیورس پیپرز بھجوا دیجیے گا، ورنہ مجھے عدالت سے خلع لینی پڑے گی۔" وہ ایک ایک لفظ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بول کر جا چکی تھی۔

حیدر گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا، ونڈ اسکرین کے شیشے دھندلا رہے تھے، نہیں بلکہ اس کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں، واپسی کا سفر بہت تکلیف دہ تھا، کاش وہ نگین کے سامنے پھر سے واپس نہ جاتا، حیدر کو کبھی نہ ملنے والی نگین سے محبت ہو چکی تھی، اور اس نارسائی نے اب اسے عمر بھر رلانا تھا۔

ذکا آفریدی کو کال کر کے اس نے گنگناتے ہوئے فون بند کیا تھا، وہ آٹھ سال سے اس کے انتظار میں اور ایک امید کے سہارے بیٹھا ہوا تھا کہ ایک نہ ایک دن تو نگین اسے مل کر رہے گی، وہ نگین جس کی اداس آنکھوں سے آفریدی کو محبت ہوئی تھی۔ آٹھ سال بعد اپنی اس محبت کو پانے کا وقت بالآخر آ ہی گیا تھا۔ اس کے پاکیزہ اور خالص جذبے جیت چکے تھے۔

مصباح علی سیّد

مہرِ خورشید

ازمیر اور مریم آسٹریلیا کے شہر وکٹوریہ میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی روائیبہ شادی کے گیارہ سال بعد پیدا ہوئی۔ وہ ایک خوب صورت اور معصوم لڑکی ہونے کے ساتھ والدین کی بے حد لاڈلی ہے۔ وہ اس کی سرپرائز سالگرہ آسٹریلیا کے مشہور نیشنل گرین فورسٹ میں شاندار طریقے سے مناتے ہیں۔ سارا پروگرام جندب ترتیب دیتا ہے۔ جندب کا ہاسٹل ازمیر کے فلیٹ کے بالکل قریب ہے۔ اکثر اوقات وہ ان کے ہاں آتا رہتا ہے۔ ان چاروں کے درمیان دوستی اور خلوص کا رشتہ ہے۔ میرزکا فیصل آباد کے نواحی گاؤں میں مانے ہوئے زمیندار ہیں۔ ان کی والدہ فالج کی مریضہ ہیں۔

میرزکا کے دو بیٹے خیام زکا' حنبل زکا ہیں۔ خیام کی شادی آئمہ سے ہو چکی ہے۔ حویلی میں آئمہ کی حکمرانی ہے۔ آئمہ کے دو بچے ہیں۔ ازلان' اعشال' ازلان لاابالی اور شرارتی ہے جب کہ اعشال رکھ رکھاؤ والی زمیندار لڑکی ہے۔

زینب حویلی میں جدی پشتی خدمت گزار کی حیثیت سے ہے' لیکن دل حنبل زکا کی وجاہت میں بری طرح جکڑا ہوا ہے اور اسی بنا پر وہ اپنے لیے آنے والے رشتے ٹھکرا دیتی ہے۔ ایک دن ان ہی کے طبقے سے تعلق رکھنے والے اصغر نے اسے چھیڑا۔ حنبل نے نہ صرف دیکھا بلکہ بے تحاشا پیٹا۔ اس واقعے نے زینب کو مکمل طور پر حنبل زکا کا اسیر کر دیا ہے۔



شہروز کمال سبرینہ کا شوہر ہے۔ دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ رنگین مزاج بھی ہے۔ سبرینہ سے اس کی پسند کی شادی ہے، لیکن اوپر تلے چار بیٹیوں کی پیدائش نے اسے سبرینہ سے متنفر کردیا ہے۔ اسے بیٹے کی شدید خواہش ہے۔ اکثر سبرینہ اس کے طنز و طعنے کے حصار میں رہتی ہے۔ بیٹیاں باپ کے سخت رویے سے خوف زدہ ہیں۔ باپ کے قریب جانے سے بھی ڈرتی ہیں یہ جرم بھی شہروز سبرینہ کے کھاتے میں ڈالتا ہے....

اب آگے پڑھیں۔

مکمل ناول

پانچویں قسط



گہرے سبز رنگ کا ٹھنڈا پانی اور وہ پانی کی گہرائی میں چھپ چھپ کرتا بھاگتا جارہا تھا۔ اس کی مطلوبہ چیز بہت دور بہتی آگے بڑھ گئی۔ وہ اس کے پیچھے تھا۔ پانی گھٹنوں سے ہو کر اس کے پیٹ تک آگیا' مگر وہ لمبے سانس لیتا مزید گہرائی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کے کندھے پانی میں ڈوبنے لگے تھے اور پھر پانی کی سطح پر صرف ایک سر تیرتا دکھائی دینے لگا۔ ایک مجسّے کا سر۔ مجسّے نے گھوم کر چہار اطراف دیکھا تھا۔ تاحد نگاہ پانی ہی پانی تھا۔ اس کا گوہر نایاب. بحرالکاہل کے سبز پانیوں میں اتر گیا تھا۔ اس نے چیختے' چلاتے ہوئے زور زور سے ہاتھ پاؤں مارے۔ سبز پانی میں سفید جھاگ کے کتنے بلبلے بنے' چھٹے اور دائرے بناتے سارے سمندر میں پھیل گئے۔ اس کی گھٹی گھٹی آواز سے پانی میں اک ارتعاش پیدا ہوا تھا۔ جو اسے بے طرح ڈسٹرب کررہا تھا ارتعاش نے شور برپا کیا تو یک لخت اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بیڈ پر چت لیٹا تھا۔ لمبے لمبے سانس کھینچتے ہوئے کتنی دیر تک چھت کو گھورتا رہا۔

"اوہ.... یہ خواب۔" اس نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر پسینہ صاف کیا اور سرک کر کہنیوں کے بل تھوڑا سا اوپر ہوا۔ اپنا سر بیڈ کراؤن سے ٹکالیا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اس کا موبائل بے تحاشا تڑپنے کے بعد اب بے دم تھا۔ اسکرین کی چمک آہستہ آہستہ کم ہورہی تھی۔ رضا حیات اسے بہت دیر سے کال کررہے تھے۔ تقریباً" آٹھ مسڈ کالز تھیں۔ وہ اس سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ اتنا تو اندازہ تھا اس وقت جندب کس ذہنی کیفیت سے گزر رہا ہوگا۔ بات کر کے لفظوں سے کچھ تسلی دے سکیں' مگر اس نے کال ریسیو تو کیا کال بیک تک نہیں کی۔ آسٹریلیا میں اس وقت دن کا پہلا پہر تھا' مگر جون کے مہینے کی شدید برف باری نے زندگی منجمد کر رکھی تھی۔ وہ برف باری میں بھی کبھی اس طرح گھر پر نہیں رہا تھا اور دن میں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' مگر آج کے دن پر کسی سیاہ چادر نے بکل ماردی تھی۔ ظالم مارگلہ نے صرف جہاز نہیں گرایا تھا بلکہ اسے. بحرالکاہل میں پٹخ دیا تھا اس نے بے بسی سے اپنا سر بیڈ کراؤن پر مارا۔ بالکل کسی ہارے شہسوار کی مانند۔ آنکھیں بند ہوگئیں منہ خود بخود کھل گیا۔ دو ننھے قطرے پلکوں کی نوک سے تیزی سے ٹوٹ کر دامن میں گرے موبائل پھر سے تھرکنے لگا۔

"بھلا وہ اب ڈیڈی سے کیا بات کرے' کون سی تسلی سنے۔" چند لمحے چمکتے موبائل کو ہاتھ میں اٹھائے رکھا پھر بیڈ کی پائنتی پر پھینک کر خود اوندھے منہ تکیے پر جاگرا تھا۔



آئمہ بیگم دوپہر کے کھانے کی تیاری چیک کرنے کے بعد کچن سے نکل رہی تھیں۔ ان کے مزاج سے خاصی برہمی جھلک رہی تھی۔ کیوں کہ زینب نے کچن میں خوب پھیلاوا مچا رکھا تھا۔ زینب پورے مہینے کی چھٹی کے بعد آئی تھی۔ نقاہت زدہ بیمار بیمار سی۔ اس کی بے دلی سے پھیلی بدنظمی پر آئمہ نے اسے اچھا خاصا لتاڑا تھا۔ آج کل ویسے ہی [illegible] وقت بے بات شدید غصہ آجاتا تھا۔ ایک تو ہر روز خاندان کے کسی گھر سے دعوت نامہ آجاتا۔ حنبل اور ردائیہ کے ساتھ جانے کے لیے بطور خاص انہیں کہا جاتا۔ اوپر سے خیام ذکا کو جرمنی جانا پڑ گیا تھا۔ وہاں کا پارٹنر کام کو آگے بڑھانے کے لیے انہیں کب سے بلا رہا تھا۔ شادی ختم ہوتے ہی خیام نے اپنی سیٹ بک کروالی تھی۔ پہلے ہی اندر سے کچھ گھائل تھیں اوپر سے خیام چلے گئے۔ وہ اپنے اس چڑچڑے پن کی وجہ سمجھ رہی تھیں' لیکن قابو کرنا بس سے باہر تھا تب ہی زینب یا خالہ گلزاری کی شامت آجاتی۔ اعشال فطرتاً" تنہائی پسند تھی اس کے گھر ہونے نہ ہونے سے خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ ازلان میٹرک کے پیپرز دے کر ایسے فارغ تھا جیسے کتابوں سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہ پڑا ہو۔ سارا دن ردائیہ کے آگے پیچھے منڈلاتا۔ اپنی اکلوتی چاچی ہونے کے ناطے خوب حق جتاتا تھا۔ کبھی اس کے کمرے میں کیرم لے جاکر سیٹ کرلیا۔ کبھی کارڈز' کبھی اپنے کمرے میں لے جاکر شطرنج لگالی۔ ماں جان کے

پاس بیٹھے ہیں تو اوٹ پٹانگ باتیں۔ وہ بھی تنگ آکر کہہ دیتی تھیں۔

"شادی حنبل کی ہوئی ہے' مستی تمہیں چڑھی رہتی ہے....."

"دادی انجن کھسکا ہے تو ڈبے آگے چلیں گے....."

وہ اور اونچا قہقہہ لگاتا۔ ماں جان اسے ڈپٹتی کمرے سے باہر کی راہ دکھاتیں۔ باہر کھلا صحن اور صحن میں کرکٹ۔ وہ دونوں ہی کرکٹ کے شیدائی تھے۔ بات بات پر میچ کی شرط لگالیتا تھا۔

"اچھا پھر آوٹ کرکے دکھاؤ....."

"چلو.....!"

خیام کے چلے جانے کے بعد حنبل ذکا کی مصروفیات مزید بڑھ گئی تھیں۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ڈیرے سے ہوتے ہوئے مل کے لیے نکلا تھا۔ آدھے راستے میں اسے کچھ فائلز یاد آگئیں اس کا دل تھا آج شہوز کمال سے قطعی بات کرلے کیوں کہ وہ بہت دن سے اس کے پیچھے تھا بطور خاص اپنے گھر ان سب کی دعوت کی۔ آئمہ وہاں جانا نہیں چاہتی تھیں' لیکن پھر اس خیال سے وہاں کیا باتیں ہوں' وہ بھی ساتھ گئی تھیں۔ وہاں جاکر انہیں سبرینہ کی بجھی شکل پر زبردستی بچھائی گئی مسکراہٹ اور شہوز کی دوغلی فطرت پر بہت افسوس ہوا۔ پورے دل سے سبرینہ کی خوشیاں مانگی تھیں۔ تب بھی شہوز نے حنبل سے فیکٹری کی بات کی تھی۔ گاڑی ٹرن کرتے ہوئے حنبل نے اسے کال کی۔

"اپنے وکیل کو ٹائم دے دیں' میں کچھ دیر بعد ملتا ہوں آپ سے....."

وہ تیز قدموں سے اندر داخل ہوا تھا۔ لاؤنج کے صوفے کے پیچھے کھڑی زینب آئمہ کے کندھے دبارہی تھی۔ حنبل پر نظر پڑتے ہی اک خجالت چہرے پر پھیل کر معدوم ہوئی۔

"خیریت.....؟"

آئمہ کے پوچھنے پر وہ "جی..... ایک کام تھا۔" کہتا تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ وہ کچھ ہی دیر میں باہر نکلا اس کے ہاتھ میں نیلے کور والی فائل تھی۔ اس کے قدم خارجی دروازے کی جانب تھے چلتے چلتے ایسے ہی پوچھ لیا۔

"روائیبہ کہاں ہے.....؟"

"کمرے میں نہیں تھی.....؟" آئمہ کے سوال کے بدلے سوال پر وہ استہزائیہ مسکرایا۔

"کمرے میں نہیں ہے' تب ہی پوچھا ہے۔" اس کی نگاہ پانی کے جگ پر گئی۔ ایک گلاس میں انڈیل کر صوفے پر بیٹھ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی۔ گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔

"ابھی تو ادھر ہی تھی....." آئمہ نے خود کلامی کی۔

"شاید ازلان کے کمرے میں ہو....." گلاس نیچے کرتے ہوئے اس کی بھنوئیں استعجابیہ خفیف سی ہوئیں۔ زینب منمنائی تھی۔

"نہیں جی' اب وہ کمرے میں نہیں ازلان صاحب کے ساتھ پچھلے صحن میں ہیں۔" خالی گلاس ٹیبل پر رکھنے سے کانچ کے کانچ سے ٹکرانے کی آواز ابھری۔

"اتنی گرمی میں وہ باہر کیا کررہے ہیں....." حنبل کو حیرت ہوئی۔

"کررہے ہوں گے کچھ' ہزار اوٹ پٹانگ کام ہیں ان کے....." آئمہ ازلان کے بچپنے سے بے طرح عاجز آچکی تھیں اوپر سے روائیبہ بھی ویسی ہی مل گئی۔ ساری اکتاہٹ لہجے میں انڈی۔ "تمہیں کوئی کام ہے اس سے....." حنبل سے پوچھتے ہی زینب سے کہا تھا۔

"جاؤ بلا کرلاؤ' بی بی کو....."

زینب کے مڑنے سے پہلے ہی اس کے قدم لاؤنج کے صحن کی جانب کھلتے دروازے کی سمت اٹھے۔

"نہیں میں دیکھ لیتا ہوں۔"

سارے صحن میں آخری جولائی کی چمکیلی دھوپ پھیلی تھی۔ اس نے لمبی قمیص کے اگلے پچھلے پلو کو آپس میں باندھ کر قدرے اونچا کر رکھا تھا۔ دوپٹے کا گولا بنا وکٹوں کی جگہ پر رکھا تھا۔ اس کی میرون شال برابر درخت کی شاخ پر جھول رہی تھی۔ حنبل کے سمجھانے پر اس نے جینز' اسکرٹس' کیپری' لینا ترک

کر دیا تھا۔ مشکل سے ہی سہی، مگر وہ اب مفلر کی جگہ دوپٹا آگے گرہ لگا کر لٹکا لیتی تھی۔ چادر ایک کندھے پر۔ کبھی کبھی اس کی ٹھوری سے آگے کو گرہ لگے دوپٹے کا پیچھے سے بند حصہ اٹھا کر سر پر جما لیتی۔ شادی کے لیے اس کے کپڑوں کی خریداری حنبل نے خود آئمہ کے ساتھ جا کر کی تھی۔ کئی کپڑوں کو دیکھ کر تو آئمہ خود حیران تھیں۔

"وہ یہ پہن لے گی...." لمبی سی کڑھائی والی قمیص' بڑا سا دوپٹا۔ ان کی حیرانگی بجا تھی۔ وہ نارمل سی ٹاپ اور کیپری زیادہ پہنتی تھی۔ اسکرٹ پہنتی تو بالکل سادہ اور ہلکی۔

"کیوں....؟" حنبل فوراً" بولا۔ "گھر میں گھر والوں کی طرح ہی رہا جاتا ہے۔"

بہت حد تک حنبل کے بنا اصرار ہی وہ سمجھ گئی تھی۔ اس وقت بھی ان ہی کپڑوں میں سے ایک ہلکے ارغوانی رنگ کے کاٹن کے قمیص شلوار میں ملبوس تھی۔ جس کے دامن اور گلے پر زرد دھاگے کا نفیس سا کام تھا۔ درخت کے نیچے بیٹ تھامے زور سے چلائی تھی۔

"تھرو سیدھی رکھنا' ورنہ یہاں سے ہی بیٹ ماروں گی۔"

وہ بیٹ پر گرپ جمائے ایسے رخ تھی حنبل کو آتے ہوئے نہ دیکھ سکی۔ اذلان کے جھٹکے سے گیند پھینکنے پر اس نے زور سے ٹپ کیا اور بھاگ کر رن لینے لگی تھی جب حنبل کے بڑھتے قدموں پر نگاہ گئی کھلا چہرہ یک لخت سپاٹ ہو گیا تھا۔ قدم ڈھیلے۔ ان کی شادی کو تقریباً" ایک ماہ بیت چکا تھا' مگر ابھی بھی وہ اسے دیکھ کر بالکل گم صم ہو جاتی تھی۔ سہمی ہرنی کی طرح آنکھیں پٹپٹاتے وحشت چھپانے کی کوشش میں ناکام۔ وہ مسلسل اس پر نگاہ جمائے آگے بڑھا۔ زمین سے جھک کر اس کا دوپٹا اٹھایا۔ چادر شاخ سے کھینچ کر اسے تھمائی۔

"اوڑھو...." بھنوؤں سے گرہ لگے پلو کی جانب اشارہ کیا تھا۔ "کھولو اسے...." اس نے فوراً" بیٹ پھینک کر' دوپٹا' شال اوڑھی اور پلو پر لگی گرہ کھول دی تھی۔

"یہاں بہت سی آبادی سن سٹروک کی نظر ہو جاتی ہے۔" اس کی نگاہیں روائیبہ کے پسینے سے شرابور چہرے پر جمی تھیں۔ ہئیر بینڈ سے بالوں کی لٹیں نکل کر گردن اور ماتھے پر چپکی ہوئی تھیں۔ میک اپ اور ہر طرح کی جیولری سے آزاد بھیگا چہرہ....

"حالت دیکھو اپنی.... کوئی کہہ سکتا ہے' یہ مہینے بھر کی دلہن ہے۔" گلابی ہونٹ دانتوں کی زد میں آگیا۔ گہرے آنکھوں کی بھوری پلکیں اٹھائے اسے تکے جا رہی تھی۔

"اب ایسے کیا دیکھ رہی ہو.... چلو اندر' باہر بہت گرمی ہے۔" وہ تیزی سے برآمدے کی جانب بڑھی۔ اذلان موقع دیکھ کر سر کھجاتے فرار ہونے کی کوشش میں تھا حنبل نے اسے غصیلی نگاہ سے دیکھا تھا۔

"کم از کم موسم ہی دیکھ لیا کرو۔"

"سوری چاچو' بکچوئلی...."

"ہاں بس ٹھیک ہے...." اس نے اس کی وضاحت وہاں ہی روک دی تھی۔ "دس منٹ کے اندر تیار ہو جاؤ' تم میرے ساتھ شہر چل رہے ہو.... آج ایک ڈیل ہے' کام سمجھو کیسے ہوتا ہے...." وہ اس کی منمناتی حجتیں سننے کے بجائے حکمیہ انداز میں کہہ کر برآمدے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

وہ لاؤنج کے صوفے پر آئمہ کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ گردن اٹھائے کوئی بات کر رہی تھی۔ اسے اندر آتا دیکھ کر چپ کر گئی۔ نگاہیں کھسیاہٹ سے دوسری جانب کر لی تھیں۔ وہ بالکل سامنے ہی آ بیٹھا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ جمائی ایک بازو صوفے کی بیک پر پھیلا لیا۔ بے شک اس کے بارے میں سوچنے کا تاثر نہیں دے رہا تھا' مگر پورے دل سے خوش ضرور تھا۔ "چلو کم از کم موڈ سمجھ تو جاتی ہے۔"

اس نے آئمہ کو اذلان کو لے جانے کا ارادہ بتایا۔ آئمہ اندر تک خوش ہو گئی تھیں۔ ان کی دلی خواہش تھی اسے کاروباری معاملات سمجھنے چاہئیں' وہ بھی

حنبل کی طرح مضبوط بنے اور جب وہ ڈھنگ سے تیار ہو کر آیا۔ بے ساختہ نکلا۔

"ماشاء اللہ....."

"واہ... یہ وہی ازلان ہے 'پیٹھو گرم والا....'"

اعشال حنبل کی اسٹڈی سے نکل رہی تھی دیکھ کر چونکی۔ روائیبہ نے بھی قدرے حیرانگی سے دیکھا تھا۔ کافی بہتر اور جاذب لگ رہا تھا۔ اس نے تفاخر سے گردن اٹھاتے کالر اچکائے۔

"اچھا چلو جلدی.... دیر ہو رہی ہے۔" رسٹ واچ پر وقت دیکھتے حنبل اٹھ کھڑا ہوا اس نے روائیبہ سے اسے کہتے سنا تھا۔

"چاچی۔ کیا لاؤں.... کچھ منگوایا ہے شہر سے...."

اس نے نفی میں بھنوئیں سکیڑی تھیں۔ وہ شرارت سے بولا۔

"نیا بیٹ ہی منگوا لو.... کھڑوس کی پٹائی کے کام آجائے گا۔"

حنبل نے تند نگاہ اٹھائی وہ فوراً "دب گیا۔" "آپ کو تھوڑی کہا ہے...."

"آگے بڑھو....." حنبل کہہ کر بڑھا وہ ابھی بھی ہانک لگا رہا تھا۔

"پنک روز پسند ہیں ناں.... وہ لے آؤں....؟"

آئمہ نے جان چھڑانے کے انداز میں ماتھے پر ہاتھ مارا تھا۔



جوس پروسیسنگ یونٹ کی کاغذی کارروائی آج بہت حد تک مکمل ہو گئی تھی۔ رقم شہروز کمال نے آن لائن بینکنگ کے ذریعے حنبل کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دی۔ حنبل اس یونٹ کی فروخت میں قطعاً" خوش نہیں تھا، مگر جرمنی کے بزنس کی وجہ سے مصروفیت بہت ہو جاتی تھی۔ کوالٹی کنٹرول نہ ہونے پر برسوں میں بنایا میر فوڈ انڈسٹری کا نام خطرے میں پڑ جاتا۔ ابھی چاولوں کی مل، فصلوں کی پیداوار کے ساتھ لائیو اسٹاک فارمنگ نے اسے گھما کر رکھ دیا تھا۔

میرز کا اپنے الیکشن میں مصروف خیام جرمنی۔ آج اس نے ازلان کو بہت سے لوگوں سے ملوایا تھا۔ سارا دن خاصا مصروفیت میں گزرا۔ انتہائی مصروفیت میں بھی اس کا چاچی نامہ ختم نہیں ہوا تھا۔ شام ڈھلے وہ واپسی پر تھے جب حنبل نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"تمہیں چاچی اور کھیل کے علاوہ کچھ اور سوجھتا ہے یا نہیں....."

"بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔" اس نے تلخ منہ بنایا تھا "ایک تو آپ کو یاد دہانی کروا رہا ہوں' آپ کی حسین بیگم' آپ کی راہ دیکھ رہی ہوگی' جلدی چلیں اور آپ ہیں خوش ہونے کے بجائے غصہ کر رہے ہیں۔"

اس نے میوزک پلیئر کی بے ہنگم آواز مزید تیز کر دی۔

"میرا خیال ہے' ہم گھر ہی جا رہے ہیں۔" حنبل نے گیئر بدلتے ہوئے میوزک بھی کچھ کم کیا۔

"میں بھی یہی کہہ رہا ہوں' جب جا ہی رہے ہیں تو ذرا رومانٹک موڈ میں چلے جائیں' آخر وہاں آپ کی نئی نویلی...." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر مست سیٹی بجاتے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔

"تم باز نہیں آؤ گے۔" حنبل نے گاڑی فلاور شاپ کے سامنے روکتے اسے گھرکا اور اس نے استعجابیہ۔ بھنوئیں اچکائیں۔

"کیا ہوا... کیوں روک دی...."

"اسے کیا کہہ کر آئے تھے....؟" حنبل اپنی جانب کا دروازہ کھول سن گلاسز درست کرتا فلاور شاپ میں داخل ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے ہاتھ میں پنک گلابوں کا مہکتا خوب صورت سا بوکے تھا۔

"اوہ ہ...." بوکے پکڑ کر ڈیش بورڈ پر رکھتے اس نے لمبا اوہ کہا تھا۔ حنبل دھیما سا مسکرا دیا۔

گاڑی ڈرائیو وے پر رکی تھی۔ دونوں دروازے کھلے۔ ازلان نے باہر نکلتے ہوئے بوکے فوراً" اٹھا لیا تھا۔ حنبل نے اسے خفیف سا گھرکا۔ "کسی کی پرسنل چیزیں نہیں اٹھاتے۔"

ازلان نے ناک پھولوں سے جوڑ کر لمبا سانس کھینچا اور قدم تیز اندر کی جانب بڑھاتے کہہ گیا۔ "اور

جوائنٹ فیملی سسٹم میں ایسے پرسنلز نہیں چلتے۔"
حنبل ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوا تب تک وہ بوکے اسے پیش کرچکا تھا روائیبہ کو حیرت ہوئی۔ "تمہیں یاد تھا...!"
"مجھے نہیں بی بی... تمہارے کھڑوس کو یاد تھا۔"
مدہم سرگوشی کرکے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا لیکن اس سرگوشی سے جو مسکان اس کے چہرے پر پھیلی وہ حنبل ذکا سے چھپ نہیں سکی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا۔ وہ فضول شخص کوئی الٹی سیدھی ہانک کر گیا ہوگا۔



لمحے ہاتھ سے چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر پانی کی گہرائی میں اترتے جارہے تھے۔ گہرائی بھی ایسی تھی جو ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ رضا حیات دو ماہ سے جندب کو پاکستان بلا رہے تھے۔ اس کے ایگزیم ختم ہوچکے تھے۔ ان کا دل تھا وہ واپس آجائے یہاں آکر سیٹل ہو مگر اس نے فی الحال آنے سے انکار کردیا اور ادھر ہی ایک جاب ڈھونڈ لی تھی۔ روائیبہ کے منع کرنے پر اسے کبھی فون نہیں کیا۔ میرڈین اور اسمتھ کے کہنے پر بھی اس نے صاف کہا تھا۔
"وہ اپنی زندگی میں خوش ہے مجھے اسے تنگ نہیں کرنا۔" اس کی بھرپور کوشش تھی وہ کبھی اسے یاد نہ آئے مگر لاشعور میں خود بخود اس کے لیے دعا نکل جاتی تھی۔



اوطاق اور ڈیرہ کئی دن کی گہما گہمی کے بعد آج قدرے ویران تھے۔ پولنگ صبح آٹھ بجے شروع ہوچکی تھی۔ گھر کے تینوں مرد کل سارا دن اور رات حویلی نہیں آئے تھے۔ ووٹوں کے سلسلے میں مصروف رہے۔ شادی کے بعد یہ پہلی رات تھی جب حنبل ذکا گھر نہیں تھا۔ شادی سے پہلے کاروباری مصروفیت کی وجہ سے کبھی کبھار باہر رک جاتا تھا مگر شادی کے بعد باہر نائٹ اسٹے وہ چھوڑ چکا تھا۔ رات الیکشن کی وجہ سے رکنا پڑا اور نہ میرزکا کا موڈ بہت خراب ہوجاتا۔ وہ پہلے ہی خائف تھے۔ ایک ووٹ خیام کا ضائع جائے گا۔ دوسرا روائیبہ کا۔
ایمبیسڈر سے مل کر اس کی آسٹریلیا سے کلیرنس کروالی تھی۔ از میر، مریم اور حنبل کے ڈاکومنٹس کے ذریعے اس کی پاکستانی شہریت کے لیے اپلائی تو ہوچکا تھا مگر شناختی کارڈ اور ووٹ کے لیے اس کی عمر اٹھارہ سال سے کم تھی۔ جس کا میرزکا کو بڑا قلق ٹھہرا۔ ماں جان کے ووٹ کے لیے وہ انہیں خود لے کر جانا چاہتے تھے مگر حنبل کو غصہ آگیا۔
"اگر ایک ووٹ نہیں ڈلے گا تو کیا آپ ہار جائیں گے... آپ کی پوزیشن بہت اسٹرونگ ہے۔"
"اوہ... لوگ ایمبولینس میں آکر ڈال جاتے ہیں۔"
میرزکا کے جواب پر حنبل نے مضمحل گردن جھٹکی تھی۔ "حد ہے..." وہ اس لیے منع کررہا تھا ان کی طبیعت پچھلے دو ہفتوں سے خاصی خراب ہورہی تھی۔ بار بار بلڈ پریشر، شوگر خطرناک حد تک اوپر نیچے ہورہا تھا اور الیکشن سے ایک دن پہلے انہیں تیز بخار بھی چڑھ گیا۔ حنبل نے فون پر میرزکا سے کہہ دیا تھا۔
"ماں جان ووٹ نہیں ڈالیں گی... آپ ہارتے ہیں، تو ہار جائیں..." میرزکا کی پہلے تو آنکھیں پھٹیں پھر اس کے فون بند کرنے کے خدشے سے فوراً بولے۔
"اوہ... اچھا بات سن..."
"جی..."
"آئمہ اور اعشال... انہوں نے ڈالا ہے کہ نہیں..."
"میں انہیں ہی لینے جارہا ہوں۔"
تقریباً دن کے دو بجے تھے کھانے کے اوقات کی وجہ سے رش قدرے کم تھا تب حنبل خود انہیں لینے حویلی آیا تھا۔ حویلی کی باقی ملازمائیں بھی آج ہدایت اللہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر ووٹ ڈالنے گئی تھیں۔ میرزکا کو آئمہ کے میکے کی طرف سے خدشہ ہوا تھا شاید وہ نہ دیں کیوں کہ سلوی نے کہلوایا تھا وہ مخالفین کو دے گی۔ تب آئمہ نے میرزکا کے سامنے کہا تھا۔

"بابا جان' ایسا کیسے ہو سکتا ہے.... وہ دے گی اور آپ کو ہی دے گی۔" وہ اگلے دن بہن کے پاس گئی تھیں اور گرج کر بولی تھیں۔

"حنبل ذکا دنیا کا پہلا اور آخری مرد نہیں' جو اس پر تمہاری زندگی ختم ہو جائے گی۔" سلویٰ چپ رہی۔

"تم نے ووٹ اسے نہیں دینا' اپنی بہن کے مقام کو دینا ہے' مجھے اپنا گھر اور مقام بہت عزیز ہے' سمجھیں.... اور ویسے بھی خیام نے بہت اچھا رشتہ بھائی کو بتایا ہے' بہت جلد تمہارا ہو جائے گا۔"

سلویٰ نخوت سے بہن کو گھورتی رہی' مگر چار و ناچار ووٹ ڈالنے اپنے بھائیوں کے ساتھ گئی تھی۔

آئمہ اور اعشال حنبل کے ساتھ لاؤنج سے نکل رہی تھیں جب وہ منمناتے ہوئے بولی۔

"حنبل مجھے بھی جانا ہے۔"

سب کے سامنے اسے حنبل کہہ کر مخاطب کرنے پر ہمیشہ کی طرح منہ میں تلخ گھونٹ آیا تھا' مگر پی گیا۔

"تمہارا تو ووٹ ہی نہیں ہے' کیا کرو گی جا کر...."

"مجھے دیکھنا ہے' ووٹنگ کیسے ہوتی ہے۔"

"باہر بہت گرمی ہے' رش ہے اور کیا کیسے؟ جسٹ ایک سلپ دیتے ہیں' انگوٹھا لگاتے ہیں' اسٹیمپ لگا کر بکس میں ڈال دیتے ہیں.... پھر کبھی دیکھ لینا۔"

وہ جلدی میں تھا دھوپ کا چشمہ جماتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گیا۔ اذلان کچھ دیر پہلے ہی گھر آیا تھا اور پر کمرے میں کسی کام سے گیا تھا۔ وہ بھی تیزی سے زینہ اترتے اس کی معصومانہ فرمائش سن چکا تھا اس کے لجلجائے انداز پر آنکھوں سے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ چلے گئے اتر کر پاس آیا۔

"چاچی.... کیا دیکھنا ہے۔"

"ووٹنگ...."

"اچھا...." کہتے کچھ دیر کے لیے صوفے پر ٹک گیا۔ "ذرا انہیں چلے جانے دو' پھر میرے ساتھ چلنا۔"

وہ اس وقت ایک بائیک پر آیا تھا۔ کچھ دیر تو سوچا کیسے لے کر جائے گاڑی تو ہے نہیں' لیکن پھر اسے صحیح سے چادر اوڑھنے کی نصیحت کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ویسی ہی سیاہ چادر جیسی آئمہ اور اعشال باہر آتے جاتے لیتی تھیں اوڑھ کر آگئی۔ باہر نکلتے ہوئے اس کی نگاہ اذلان کی جیب پر گئی۔ وہاں سے سیاہ پستول جھانک رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ آگے بڑھ کر اس کی جیب سے نکالنے لگی۔ وہ جھکائی دے کر سائیڈ پر ہو گیا۔

"اوہو.... الیکشن پر یہ سب کچھ چلتا ہے' مخالف کے سب لڑکے لے کر پھر رہے ہیں' میں بھی تھوڑا رعب ڈالنے کے لیے لے کر جا رہا ہوں۔"

"تم یہ نکالو.... ورنہ میں ابھی حنبل کو کال کر دوں گی۔" اسے پتا تھا وہ حنبل سے ڈرتا ہے۔ وہ کافی دیر منمنایا' لیکن اس کے اصرار پر یہ کہتے ہوئے۔

"صرف تمہاری خاطر اپنے جذبات کی قربانی دے رہا ہوں' چاچی...." پھر خود ہی قہقہہ لگا کر بولا۔

"میں نے تو آج تک چڑیا کا بچہ نہیں مارا' بندہ کہاں سے ماروں گا۔" وہ بھاگ کر واپس رکھ آیا تھا۔

وہ اسے جس لیڈیز پولنگ پر لے آیا تھا اسے قطعاً" اندازہ نہیں تھا اس بار اعشال اور آئمہ کا نام ادھر کی لسٹ میں ہے' علاقے میں مشہور ہونے اور خاص کر نمائندے کے گھر کا فرد ہونے کے سبب نمائندے کی طرح ہی پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ اسے بھی سرسری پوچھ گچھ کے بعد اسکول کے اگلے احاطے تک جانے دیا تھا۔ حنبل ذکا تو آئمہ اعشال کے ساتھ بیلٹ پیپرز کی تقسیمی قطار تک گیا تھا۔ جب یہ آگے کی جانب بڑھ رہے تھے وہ برآمدے سے باہر نکل رہے تھے وہ سیاہ کلف لگا قمیص شلوار' خاکستری واسکٹ' سیاہ دھوپ کا چشمہ لگائے لمبے ڈگ بھرتا آئمہ' اعشال کے ساتھ چلتا آرہا تھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی چونک گیا۔ یک لخت اس نے اپنا چشمہ اتارا تھا۔ آئمہ' اعشال لمحہ بھر کے لیے رکیں پھر تیز تیز گیٹ کی جانب بڑھ گئیں۔ اذلان روائیبہ سے قدرے پیچھے تھا۔ حنبل کے رکتے ہی الٹے پیروں گھوم کر باہر نکل گیا وہ اکیلی رہ گئی تھی گرے آنکھیں اٹھائے' تحیر بھرا منہ کھولے اسے تک رہی

تھی۔ اس نے خشم آلود نگاہ سے دیکھ کر چشمہ واپس لگایا۔

"ہو گیا شوق پورا۔" کہہ کر قدم اٹھایا وہ بھی ساتھ پلٹی۔ گیٹ کے پاس بیٹھے دو سپاہی کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے۔ ایک' اپنے ہاتھ ملتے ہوئے دوسرے کو بتانے لگا۔

"یہ انگریزنی' حنبل چیمہ کی بیوی ہے۔۔۔"

اگر اس وقت گھر کی خواتین ساتھ نہ ہوتیں تو وہ یہ بھی بھول جاتا سپاہی یونیفارم میں ہے وہ اسے یوں آنکھیں پھاڑ کر تکنے کا مطلب بتاتا جیسی واہیات نگاہ سے وہ دیکھ رہا تھا حنبل کم از کم اس کی آنکھیں تو نکال ہی دیتا اس کا خون بری طرح کھول گیا تھا۔ اس نے خود پر کنٹرول کرتے ہوئے گرج کر کہا تھا۔

"تیز چلو۔۔۔"

وہ گولی کی طرح چلتی گیٹ پار کر کے سبز کاہی لینڈ کروزر کی جانب بڑھی آئمہ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھیں اعشال پیچھے' وہ اعشال کے برابر بیٹھ گئی۔ حنبل نے بیٹھ کر جتنی زور سے دروازہ بند کیا تھا۔ ان تینوں کو جھرجھری آئی۔

روائیبہ نے وحشت زدہ ہرنی کی طرح تحفظ پانے کے لیے پاس بیٹھی اعشال کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اعشال نے کوفت زدہ نگاہ اس پر اٹھائی۔ پھر سرد مہری کا تاثر دیتے۔ غیر محسوس طریقے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال کر جھولی میں رکھ لیا۔ وہ بھی سمٹ کر بیٹھ گئی۔ راستے میں حنبل نے کئی بار ازلان کو کال ملائی' مگر آج تو اس نے سارا دن حنبل سے بچنا تھا۔

☼ ☼ ☼

جیت جانے کے بعد منائی جانے والی خوشی بھی اس کی اکارت جانے والی تھی حنبل کی تند نگاہوں سے بچتے ہوئے اس نے ایک کال روائیبہ کو کر کے کہا تھا۔

"خدا کے واسطے اس موت کے فرشتے کو پسٹل کا مت بتا دینا۔۔۔ میری روح قبض کر لے گا۔"

اس نے سنتے ہی جاندار قہقہہ مارا۔

"ڈر گئے۔۔۔!"

"ظاہر ہے' میں کون سا اس کی بیوی ہوں' جس سے بابے کو محبت ہو گئی ہو' تمہیں تو کچھ نہیں کہا ناں' گھوریوں سے میرے سانس سکھار کھے ہیں۔"

مٹھائی تقسیم' ڈھول شور شرابے کی بیچ جیسے ہی ازلان اس سے ٹکرایا۔ اسے سائیڈ پر لے جا کر تنبیہہ کرنا نہیں بھولا تھا۔

"آئندہ میری بیوی کو' میری اجازت کے بغیر کہیں نہیں لے کر جاؤ گے۔۔۔ اوکے۔"

ازلان نے لمبا سا تین چار بار سر "اوکے" میں ہلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

پرسوں سے ماں جان کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ بی پی کا لیول بہت بگڑ رہا تھا۔ رات کے وقت غنودگی چھانے لگی۔ حنبل نے انہیں فوراً" اسپتال پہنچایا تھا۔ میرز کا بھی اپنی نئی مصروفیات ترک کر اسپتال پہنچے۔ ڈاکٹرز کی انتھک کوشش کے باوجود وہ زیادہ دیر جانبر نہیں رہ سکیں۔

حویلی پر ایک بار پھر غم کا بادل ٹوٹ کر برسا تھا۔ حنبل نے شدید دھچکا لگنے کے باوجود خود کو مضبوطی سے سنبھال رکھا تھا' مگر روائیبہ کا بہت برا حال تھا۔ دیکھنے والوں کو یوں گمان ہوتا تھا اسے ماں جان کے علاوہ دنیا میں کسی سے محبت نہیں تھی۔ ایمبولینس سے اترتی ڈیڈ باڈی دیکھ کر وہ نیم پاگلوں کی طرح جھپٹی تھی۔ آج سے پہلے اس نے کبھی کوئی میت نہیں دیکھی تھی۔ اپنے ماں باپ کی بھی نہیں۔ یقیناً" اس وقت اس کی نگاہوں میں ازمیر اور مریم کی ڈیڈ باڈیز گھوم رہی تھیں۔ تمام سلے گھاؤ پھر سے تار تار ہو گئے۔

دن میں کئی کئی گھنٹے ان کے خالی کمرے میں بیٹھی سسکتی رہتی' گھر کی ہر چیز سے دل بالکل اچاٹ ہو گیا تھا۔ رات کے وقت معمول کے مطابق حنبل ان کے کمرے کے پاس سے گزرتا تو قدم خود بخود پل بھر کے

لیے رک جاتے۔ ایک دکھ بھری سانس خارج ہوتی پھر اپنے کمرے میں چلا جاتا' لیکن روائیبہ کا مسئلہ الگ تھا۔ بھلے اس نے بہت وقت ان کے ساتھ نہیں گزارا تھا' مگر جتنا گزارا تھا وہ بھولنا مشکل ہو گیا۔ اس کا زندگی کی خوشیوں پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ حنبل اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا کئی بار رسان سے اسے سمجھایا۔

"یہ جو زندگی ہے نا' یار... اک راہ گزر کا نام ہے' اونچی نیچی پگڈنڈیوں سے بنی' اس میں ہمیں بہت سے ہم راہی ملتے ہیں' مختلف شکلوں کے' مختلف رشتوں میں' مگر ہر کسی کی مدت سفر ایک نہیں ہوتی' آہ..." اس نے سرد ہنکارا بھرا "کسی کا سفر جلد ختم ہوتا ہے' کسی کا تادیر' کوئی ہمیں چھوڑ جاتا ہے' کسی کو ہم چھوڑ جائیں گے... ہم انسانوں کا بس ایسا ہی سفر ہے۔"

کہتے کہتے اس کی اپنی آواز نمکین ہو گئی تھی۔ کچھ توقف کے بعد پھر سے گویا ہوا۔ "روائیبہ ہم مخلوق ہیں نا' اپنے پروردگار کے حکم پر صبر ہی کر سکتے ہیں اور صبر تو صدمے کے اولین لمحوں میں ہوتا ہے جو رو دھو کر' گلے شکوے کر کے کیا جائے' وہ صبر تو نا ہوا... وہ تو جبر ہے اور جبر کا کوئی صلہ نہیں ہوتا۔"

اس کے پیار بھرے دلاسے پر یک دم اس کے بہت سے آنسو ٹوٹے۔ اس نے اس کی پشت تھپتھپا کر کہا تھا۔

"چلو اٹھو' منہ ہاتھ دھو کر آؤ' بالکل اچھی نہیں لگ رہی ہو..." اس کے کسمسا کے اٹھنے پر اس نے مزید فرمائش کی تھی۔

"یار کافی بنا لاؤ... اور ہاں..." وہ سر ہلا کر مڑی اس نے یاد دہانی کروائی۔ "اور پلیز کالی سیاہ مت بنا لانا' میرے کپ میں تھوڑی سی کریم ضرور مکس کر دینا۔"

زندگی کو روٹین پر لاتے کچھ وقت لگ رہا تھا۔ حنبل چاہتا تھا۔ روائیبہ بھرجائی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارے' گھر کی ذمہ داریوں کو سمجھے تاکہ دھیان بٹ جائے' مگر آئمہ اسے ذمہ داریوں میں کیا ڈالتیں۔ انہیں خود وہ معصوم اور چھوٹی لگتی تھی بالکل اپنی اعشال جیسی۔ البتہ ازلان تھا جو بے تکی ہانک کر اس کا دھیان بٹا دیتا۔ یہی بے تکلفی آئمہ کو غصہ چڑھا دیتی' مگر وہ سنے تب نا۔

لاؤنج میں بہت دیر بیٹھے میچ دیکھتے ہوئے وہ تنگ آ گیا تھا۔ گھر پر آج اکیلا ہی تھا۔ آئمہ' اعشال کے ساتھ میکے گئی ہوئی تھیں۔ حنبل' میرزکا اپنی مصروفیات میں' ملازمین کی کھٹوپٹر سے تنگ آ کر چاچی کا خیال آیا۔ ہلکی سی ناک دے کر دروازہ کھولا۔ وہ سامنے کارپٹ پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ رکھے تھے۔ آنکھیں موندے سر بیڈ کی پٹی پر ٹکا رکھا تھا۔ بند آنکھوں میں چلتے پھرتے ایک دوسرے سے ہنسی مذاق میں جھگڑتے ازمیر اور مریم دکھائی دے رہے تھے۔ لمبی پلکوں سے دو موتی ٹوٹ کر گالوں پر پھسلتے گردن تک چلے گئے۔

"چھی ذرا سیاں جی کے نام لکھ دو۔" اس کی بے تکی ہانک پر اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ مضحکہ خیز شکل بنائے اس کے قریب بڑھ رہا تھا۔

"اوہو' اتنی اداسی' چاچو کو گئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے' جو نیر بہائے جا رہے ہیں۔" اپنے مقابل گھٹنا ٹیک کر بیٹھنے پر وہ فوراً" دوپٹا درست کرتی اٹھی اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"نو... نو... ایکچوئلی میرے سر میں درد تھا۔" اس نے پیشانی مسلتے ہوئے بہانہ تراشا۔

"او چھوڑو چاچی' باہر آؤ' اتنا زبردست میچ لگا ہوا ہے' عمر اکمل کے شارٹس دیکھو' واٹسن کو بھول جاؤ گی۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگا' مگر اس نے اپنے ہاتھ سمیٹ لیے۔

"تم دیکھو' میرا موڈ نہیں ہے۔"

"واہ موڈ نہ ہو گیا' واپڈا کا سوئچ ہو گیا' آن' آف ہی ہوتا رہتا ہے۔ اچھا چلو اب اٹھو بھی نا..." اسے اداس سی چاچی بالکل بھی بھلی نہیں لگ رہی تھی۔ قدرے اندازہ تھا وہ خود کو ابھی تک سب کے بیچ اجنبی محسوس کرتی ہے' اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

"اٹھو... ایسا کرتے ہیں' تمہیں تمہارے اس کھڑوس سے ملوا لاتا ہوں۔" وہ اس کے ہاتھ کو

نظرانداز کرتے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ازلان نے فوراً" اپنے ہاتھ پیچھے باندھ لیے تھے۔

"ازلان' یہ کھڑوس کیا ہوتا ہے۔" اس کے تعجب بھرے لہجے پر ازلان کا قہقہہ چھوٹ گیا وہ بھی کھسیا گئی شاید کچھ غلط پوچھ بیٹھی۔

"بالکل تمہارے میاں جیسا ہوتا ہے۔" وہ سرور سے سر دھنتے بے تحاشا امڈ کے آنے والی ہنسی کے درمیان کہہ رہا تھا۔

"شادی کے بعد لڑکوں کے دانت ہی اندر نہیں جاتے' ایک تمہارے ہزبینڈ ہیں' تین ماہ ہو گئے شادی کو اور مسکراتے ایسے ہیں جیسے قرضہ لے کر دانت لگوائے ہوں' ہنسنے سے بے چارے گر جائیں گے' اتنے اسمائلنگ فیس پر کھڑوس سا مزاج ہاہاہا...." اس کی اس قدر مزاحیہ وضاحت پر وہ منہ پر ہاتھ رکھے ہنستے ہوئے آگے کو جھکتی چلی گئی۔

"یہ ہوئی نا بات...."

اپنی کوشش میں کامیاب ہو کر وہ اسے زبردستی کھینچتا کمرے سے باہر لے آیا تھا۔ اس کے اصرار پر کچھ ہی حیل و حجت کے بعد وہ اپنی شال سنبھالتی ہوئی اس کی جیپ میں آ بیٹھی۔ ازلان کا پلان تھا آج چاچی کو سرسبز کھیت دکھائے جائیں۔ آئمہ تو گھر تھیں نہیں جن سے اجازت لیتا اور چاچو کا حکم تھا ان کی اجازت ضروری ہے تو کیوں نہ ڈیرے پر جا کر اجازت لے لی جائے۔

اس کی جیپ سبز کھیتوں کی طرف دوڑ رہی تھی تار کول کی پرانی بنی سڑک کے دونوں اطراف سنبل کے اونچے اونچے درخت تھے۔ تیز گرمی نے سرخ پھول جھاڑ کر پتوں کو سبز اور زرد کر رکھا تھا۔ کہیں کہیں سفیدے کے درخت بھی تھے' لیکن ان پر کوالہ نہیں تھے۔ وہ تو آسٹریلیا میں ہوتے ہیں ناں.... آسٹریلیا تو بہت دور رہ گیا تھا۔

سڑک کے دوراہے پر حنبل زکا کا ڈیرہ دائیں جانب تھا۔ اس نے جیپ ڈیرے کی جانب موڑی۔ چاچو کی اجازت بہرحال ضروری تھی۔ جیپ ڈیرے کے سامنے' مگر کچھ فاصلے پر رکی تھی دونوں نیچے اتر آئے۔

کھلے خاکستری احاطے کے درمیان سرخ اینٹوں سے بنی لمبی راہ داری تھی جس کا اختتام گول اینٹوں سے بنے اونچے سے چبوترے پر ہو رہا تھا۔ چبوترے کے ایک جانب دریائی گول پتھروں سے مصنوعی آبشار بنی تھی اور دوسری جانب بڑ کے بڑے بڑے درخت تھے جن کے ٹھنڈے سایوں نے چبوترا ڈھانپ رکھا تھا۔ سائے میں کئی چارپائیاں بچھی تھیں ان پر کئی مرد پنڈال کی صورت بیٹھے تھے۔ درمیان میں دو تین حقے رکھے تھے۔ کچھ آدمی زمین پر اکڑوں بھی بیٹھے تھے حلیے سے غریب مزارعے لگتے تھے۔ ان سب کے بیچ حنبل زکا ایسے کھڑا تھا اس نے بائیں بازو کو موڑ کر آدھ کھلی مٹھی پیٹ اور کمر کے درمیان رکھی تھی جس سے اس کی کلف شدہ قمیص کا چاک قدرے اوپر کو اٹھا تھا اس کونے سے اس کا سفید بنیان کا کنارہ جھانک رہا تھا۔ عجیب ہی شخص تھا۔ جس طرح کی گیدرنگ میں ہوتا اس کا مکمل حصہ لگتے ہوئے چھا جاتا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے سامنے کھیتوں کی جانب اشارہ کرتے کسانوں کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ ایک عمر رسیدہ کسان حقے کی نے منہ میں دبائے بہت غور سے اس کی بات سننے لگا۔ پچھلے کھیتوں کی طرف گردن پھیرتے ہوئے وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکا۔

اس نے ازلان اور روائیبہ کو جیپ سے اترتے دیکھا تھا۔ اس نے ہاتھ نیچے کیا قمیص خود بخود درست ہو گئی۔ سب سے معذرت کر' بازو پشت پر باندھ' تیز تیز ان ہی کی جانب بڑھا۔ چارپائیوں پر بیٹھے افراد نے لمحہ بھر اس کے تعاقب میں دیکھا' پھر اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔

"تمہارا دماغ ٹھکانے پر ہے' ازلان' اسے ڈیرے پر کیوں لائے ہو۔" اس نے آواز دبا کر تند لہجے میں اسے گھر کا تھا۔ وہ یک دم سٹپٹا ہی گیا۔ روائیبہ کے لیے بھی اس کا لہجہ غیر یقینی سا تھا پٹ سے آنکھیں پھیل گئیں۔

"سوری چاچو.... وہ.... وہ چاچی فصلیں...."

"کیا فصلیں....؟" اب اس کی جواب طلب نگاہ

روائیہ پر تھی۔ وہ بونٹ پر ہاتھ رکھے ہونق زدہ تھی اس کی کرختگی پر کانپی گرے آنکھیں لبالب پانی سے بھر گئیں۔ بمشکل تھوک نگل کر بولی تھی۔

"مجھے فیلڈز دیکھنے تھے۔ سوری اگر برا لگا۔" آنسو چھلک کر گالوں پر گرے وہ مڑ کر جیپ میں بیٹھنے لگی تھی جب ازلان سے اسے کہتے سنا تھا۔

"ازلان گاڑی کو پچھلے کمروں کی جانب لے جاؤ۔"

اب اس کا لہجہ بالکل ہموار ہوچکا تھا۔ ہلکی سی اسے تنبیہہ کی۔ "اور کمرے میں ہی بیٹھی رہنا میں آتا ہوں۔۔۔ اور تم۔۔۔" اب دانت جما کر سختی سے ازلان کو دیکھا تھا "اسے بٹھا کر باہر آؤ میرے پاس۔۔۔"

انہیں سنا کر وہ مڑ گیا تھا۔ "ہاں جناب" میں سر ہلاتا ازلان اس کے مڑتے ہی ایسے منہ بنانے لگا جیسے کڑوے بادام بھر گئے ہوں۔۔۔

ڈیرے پچھواڑے تین بڑے بڑے کمرے بنے تھے، یہ جگہ عام طور پر مہمان خانے کا کام کرتی تھی۔ کسی جھگڑے یا اجنبی مہمان کی صورت اگر ڈیرے پر رہنا پڑتا تو وہ خود بھی وہاں رک جاتا تھا۔ ان کمروں کے آگے بڑا سا اینٹوں کا صحن تھا۔ دیوار کے ایک جانب ٹریکٹر، ٹرالی، تھریشر اور کئی زرعی مشینیں کھڑی تھیں، روائیہ کو اندر چھوڑنے کے بعد ازلان باہر جانے کے لیے مڑا تھا وہ بھی تیزی سے باہر آگئی اور اسے رکنے کی منتیں کرنے لگی۔ وہاں کے سناٹے سے وہ خوف زدہ تھی۔

دونوں خاصی دیر دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے رہے۔ حنبل کے انتظار میں لمحے خاصے کوفت زدہ لگے۔ پھر اس نے ایک ایک چیز کا اس سے تفصیلی پوچھا تھا۔ یہ سب چیزیں اس نے پہلی بار قریب سے دیکھی تھیں۔ اس سے پوچھتی ان کے قریب چلی گئی تھی۔ وہ دونوں ٹریکٹر کے قریب کھڑے تھے جب نظروں ہی نظروں میں جانے کیا شرط لگائی۔ وہ یک لخت چڑھ کر اس پر بیٹھ گئی، ازلان بھی ساتھ لٹک گیا ڈرائیونگ اس نے مریم سے سیکھ رکھی تھی۔ سسٹم میں تھوڑا سا فرق تھا فورا" سمجھ آگیا۔ شومئی قسمت چابی بھی لگی تھی۔ اس نے گھمائی اور خوب ہنستے ہوئے اپنے بہترین ڈرائیور ہونے کا ثبوت دینے لگی۔ اس نے اینٹوں کے صحن میں بمشکل آدھا چکر ہی لگایا تھا جب ازلان کی نظر حنبل پر پڑی۔ وہ صحن کے دروازے سے ان ہی کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"اف عزرائیل۔۔۔ چاچی بریک لگاؤ۔" روائیہ کا پاؤں بریک پر تھا مگر خوف کے مارے دبا ہی نہیں۔ اسے پورا یقین تھا اب تو یقینا" مارے گا، حنبل کی سرخ شکل دیکھ کر اسے کھڑوس کی تشریح سمجھ آگئی۔

"اب اور کتنا ایڈونچر رہ گیا ہے، تم لوگوں کا۔۔۔"

اس کے قریب پہنچتے ہی ٹریکٹر "چھک" سے رکا۔ وہ دانت جمائے نگاہیں ازلان پر جمائے شدید غصے میں لگ رہا تھا۔

"سوری چاچو لاسٹ غلطی۔۔۔ قسم سے۔۔۔"

وہ منمناتا، چھلانگ مار نیچے اتر گیا۔ روائیہ کی تیز چلتی سانسوں کے ساتھ آنکھیں پھیلتی جارہی تھیں۔ غصہ تو اسے اچھا خاصا تھا۔ مگر اس کی ڈبڈبائی آنکھیں اور ہونق پن نے اس کے خون کا درجہ حرارت قدرے کم کیا۔ روائیہ کے چہرے پر نظریں جمائے وہ بالکل خاموش تھا۔ وہ تھوک نگل نگل کر بولی۔

"سوری۔۔۔ میں نے ہی ازلان کو روک لیا تھا۔۔۔ وہ، ایکچوئلی مجھے خاموشی سے ڈر لگ رہا تھا ہم کافی ٹائم تمہارا انتظار کرتے رہے۔ مگر تم۔۔۔"

"ہاں۔۔۔" وہ یک لخت بات کاٹ کر بولا۔ "مگر تم نے سوچا میاں صاحب تو آنہیں رہے چلو ہل چلا کر ان کا ہاتھ ہی بٹادوں۔۔۔" حنبل نے اپنے ہاتھ پیچھے باندھ لیے تھے۔ اس کی منمنائی شکل پر غصہ اور اپنی بے بسی پر رونا آرہا۔

"جاؤ تم۔۔۔ اور سیدھے گھر ہی جانا، اسے میں خود لے آؤں گا۔۔۔" حنبل کا سارا غصہ شرمسار کھڑے ازلان پر نکلا، اور وہ بھی ایسا بھاگا پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

"چلاؤ اب، مادام۔۔۔" وہ اب اس کی طرف گھوما تھا۔ وہ اسٹیئرنگ پکڑے جوں کی توں بیٹھی تھی۔ حنبل کو حیرت ہوئی کہ بڑی ڈھیٹ ہے، ابھی تک نہیں

اتری' چلواسی بہانے ذرا کانفیڈنس تو چیک کروں۔
"چلاؤ نا گیئر بدلو اور فل اسپیڈ پر دوڑاؤ' میں بھی تو دیکھوں کتنی جفاکش ہے میری بیگم۔" اس کی حالت ایسی تھی جیسے کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ اس نے ایک بار پھر زور سے کہا۔
"چلاؤ....."
اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہوتی حنبل نے ہنسی دبا کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ اسے سہارے سے نیچے اتارنے کے لیے۔ وہ کھسیاہٹ کے ساتھ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ جمپ لگا کر نیچے اتر آئی۔ اس کے ہاتھ برف کی طرح ہو چکے تھے۔
"آئندہ جب بھی اس قسم کے ایڈونچرز کو دل کرے' تو مجھے بتا دینا' ٹریکٹر' ٹرالی' ریڑھا' بیل' کچھ بھی چلانا ہو' میں لا کر گھر میں کھڑا کردوں گا' مگر خدا کے لیے....." اس نے دونوں ہاتھ عاجزی سے اس کے سامنے جوڑے تھے۔ "دوبارہ ادھر مت آنا' لوگ میرا مذاق ہی نہیں اڑائیں گے' تالیاں بھی بجائیں گے۔"
اس کی گہری نگاہیں اس کے خفت سے سرخ پڑتے چہرے پر تھیں۔ وہ تیز تیز پلکیں جھپک کر خجالت چھپانے کی کوشش میں تھی۔ حنبل کو حیرانگی ہوئی۔ پہلے خود ہی الٹے کام کرتی ہے' منع کردو تو روح فنا ہو جاتی ہے' حالانکہ جتنا غصہ اس کی حرکتوں پر آتا تھا وہ بمشکل ہی کنٹرول کرپاتا' اوپر سے ماں جان کا فرمان۔
"اس کے ساتھ نرمی سے پیش آنا۔"
یہ شادی کے شروع دنوں کی بات تھی۔ سب ماں جان کے کمرے میں بیٹھے ہلکی پھلکی باتیں کرتے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ باتوں میں ہی زنیرہ نے شوخی سے کہا۔
"ہاں بھئی روائیبہ' کیسا لگا میرا بھائی تمہیں.....؟"
بے ساختہ سب کی نگاہیں اس پر اٹھنے سے ہاتھوں میں پکڑا کپ لرز گیا کچھ چائے چھلکی' نگاہیں بے تاثر' سپاٹ سی تھیں۔
"کیا ہوا چاچی' بھائی کا پوچھا ہے' بھوت کا نہیں جو سفید پڑ گئی ہیں۔" اذلان کے مستی میں کہے جملے پر سب کے چہروں پر استہزائیہ ہنسی دوڑ گئی۔ حنبل جی بھر کر کڑوا ہوا۔ "کیا میں بہت ظالم ہوں' یا خوف ناک جو ایسے ری ایکٹ کر رہی ہے' کیا جاتا مسکرا دیتی اور زیادہ شرمندگی تو تب ہوئی جب اگلے ہی دن ماں جان نے اس سے علیحدگی میں پوچھا تھا۔
"حنبل' تم خوش تو ہو؟"
"کیوں' آپ کو نہیں لگتا۔" ان کے سوال کے جواب میں سوال پہ وہ پھیکا سا مسکرائیں۔
"وہ نہیں لگتی....."
"یہ تو پھر آپ اس سے پوچھیں۔" وہ گہرے توقف کے بعد آہستگی سے کہنے لگا۔
"جانے مجھ سے کھنچی کھنچی کیوں رہتی ہے۔"
"بچے ابھی وہ کم عمر ہے....." انہوں نے حنبل کو اپنے پاس بٹھالیا۔ "تم نرمی کا سلوک کیا کرو' پھر اس کے ساتھ سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہوا' چیزوں کو سمجھنے میں کچھ وقت لگے گا' تمہاری بیوی ہے وہ تم پیار سے اسے اپنے قریب کرلو۔"
"تو آپ کا کیا خیال ہے' میں سختی کرتا ہوں اس پر۔" وہ استہزائیہ میں پھیکا سا مسکرایا اور ماں جان کے شانوں پر کمبل برابر کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔
"آپ بے فکر رہیں' کچھ نہیں کہتا آپ کی لاڈلی کو۔" ماں جان سے کی بات کانوں میں گونجتے ہی مسکراہٹ ہونٹوں پر آن رکی۔ تھوڑا سا اس کی جانب سر جھکاتے ہوئے پوچھا۔
"تم مجھے دیکھ کر ڈر کیوں جاتی ہو..... بہت ڈراؤنا ہوں میں؟" وہ بھنویں اچکائے بے چارگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ حنبل نے آگے بڑھ کر اس کی پھیلتی چادر درست کی۔
"ہماری فیملی کی خواتین ایسے باہر نہیں نکلتیں' یہ جگہیں مردوں کی ہوتی ہیں۔" اس نے پلکیں گرادیں۔
"اب پلیز رونے مت لگ جانا۔ بتاؤ' کیاں دیکھنا تھا' کیوں آئی تھیں۔" اس کے دھیمے لہجے پر روائیبہ نے نفی میں سر ہلایا۔
"کچھ نہیں..... گھر جانا ہے....."

"اچھا....." اس نے تعجب سے زور دیتے اچھا کہا
"کچھ نہیں تو کیا یہاں میری سی۔ آئی۔ ڈی پر نکلی تھیں۔" وہ خاموشی سے نچلے ہونٹ اندر سے چباتی رہی "چلو جو دیکھنا ہے، آج دیکھ لو، مگر بار بار ادھر مت آنا، پلیز..... مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔" وہ نرمی سے کہتے پچھلی جانب سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے چل رہی تھی۔

"فصلیں دیکھنی ہیں....." اس نے خود سے قیاس کیا روائیبہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے مڑ کر اس کی شال کھینچ کر ماتھے تک آگے کی۔

"یار! اسے سنبھالنے کی کوشش تو کیا کرو....."

کھیتوں کے درمیان بنی کچی پکی پگڈنڈیوں پر وہ آگے پیچھے چل رہے تھے۔ حنبل دو قدم آگے تھا۔ اس نے روائیبہ کا ایک ہاتھ پکڑ لیا تنگ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے اسے خاصی مشکل پیش آرہی تھی۔ ایک تو درختوں کی شاخیں پگڈنڈی پر جھکی تھیں۔ دوسرے کھیتوں کو پانی لگا ہوا تھا۔ مبادا شاخیں ہٹاتے ہوئے پانی لگے کھیت میں گر گئی تو اسی لیے وہ آگے راستہ بناتے ہوئے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ کھیتوں سے نکل کر قدرے پکی سڑک پر آگئے تھے۔ سرسبز گاؤں شہر کے قریب ہونے کی بنا پر خاصا ترقی یافتہ تھا۔ بچوں کا اسکول، چھوٹا سا اسپتال، بجلی کی سہولت کے ساتھ کہیں کہیں اب گیس پائپ بھی بچھ چکی تھی۔ حنبل چلتے چلتے اسے زیر تعمیر گرلز کالج کے بارے میں بتانے لگا کہ اس کے لیے اس نے بہت دھوپ دوڑ کی ہے۔ اس علاقے کی معلومات بہت دلچسپی سے سن رہی تھی دور ایک کسان رکوع کی طرح جھک کر کچھ کاٹتا آگے بڑھتا جارہا تھا پھر کٹی فصل کا بنڈل بنا کر رکھتا، پھر شروع ہو جاتا۔ روائیبہ نے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اتنی محنت سے یہ سب چیزیں اگائی جاتی ہیں۔"

"تو اور....." حنبل نے مسکرا کر نگاہ کا رخ پھیرا "اور تم نخرے کر کے ضائع کر دیتی ہوں۔"

ٹیوب ویل کے پاس لگے پیپل کے درخت کے نیچے وہ رک گئی۔ حنبل نے ٹیوب ویل کی منڈیر سے پشت ٹکالی تھی۔ دور سے چکی کے چلنے کی ہک ہو گائے بھینسوں کی آوازیں، پرندوں کا شور، ٹھنڈے پانی سے اٹھتے چھینٹے اور اونچے اونچے درختوں کو چھو کر گزرتی ہوا سب اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے اس کی شال بار بار پھسلتی۔ حنبل نے کئی بار کھینچ کر آگے تک کی۔ روائیبہ نے ٹھوڑی کے نیچے سے دونوں کنارے مٹھی میں دبوچ لیے اس کا سنہرا کتابی چہرہ سیاہ چادر میں ملفوف بہت دلکش لگ رہا تھا۔ اک بھڑ اڑ کر روائیبہ کے بازو پر بیٹھنے لگی تھی حنبل نے اتنی زور سے انگلیوں کی پشت سے اسے جھٹکا اس کے سارے پر ٹوٹ گئے اور پھڑپھڑا کر مرگئی۔ بس یہی وہ لمحہ تھا جب بھڑ کے ساتھ روائیبہ کا سارا خوف بھی مر گیا تھا۔ جو شخص معمولی سی تکلیف وہ چیز لمحے میں مار سکتا ہے تو یقیناً" خوفناک چیزوں سے حفاظت ضرور کرے گا۔

"چلو..... چلیں....."

اس نے مسکرا کر درخت سے پشت ہٹائی

"اوہوں۔" کرتے اس کے پاس منڈیر پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ پھر چلو میں کچھ پانی بھر کر حنبل پر اچھالا، وہ جواباً" مسکرایا تھا۔ پھر وہ بار بار اس پر اچھالنے لگی۔ جیسے ہر خوف ہی پانی میں ڈھل گیا ہو۔ ان تین ماہ میں حنبل نے اسے ایسا فری وقت دیا بھی نہیں تھا اور تھوڑے سے وقت نے اسے سمٹے خول سے باہر نکال دیا۔ اس نے پھر پانی پھینکا تھا۔

"میں نے گرایا نا، تو تم رونے لگ جاؤ گی....." اس نے اس کے کندھے پکڑ کر ڈرانے کے انداز میں زور سے ہلائے۔ وہ گردن پیچھے سے آگے کی جانب پھینکتے ہوئے دہری ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلتی خوشی آج دیدنی تھی۔ ڈھلتی دوپہر کا وقت تھا۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اکا دکا کوئی دور سے گزرتا تو اتنی دور سے درخت کی اوٹ میں بیٹھے وہ آسانی سے دکھائی نہ دیتے۔

"حنبل.....؟" اس نے آہستگی سے پکارا۔

"ہوں....."

"ٹروتھ اینڈ ڈیئر کھیلیں..." اس کے معصومیت سے کہنے پر اس نے اثبات میں سرہلایا۔
"ٹروتھ"۔ حنبل نے لیا۔
"تمہیں سب سے اچھا کیا لگتا ہے...." روائیبہ کے استفہامیہ دیکھنے پر وہ ستائشی مسکرایا۔
"تم...."
"سچ...." اس کی آنکھیں حیرت کی غماز تھیں۔
"ہاں... کوئی شک ہے...." وہ مسکرا رہا تھا۔
"کتنی...."
وہ چند پل خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر گہرا سانس بھرتے سامنے دیکھنے لگا۔
"روائیبہ ڈیئر پسند کی کوئی حد نہیں ہوتی سب سے دور تک دیکھو کیا دکھائی دے رہا ہے؟" اس کے سوال پر وہ فوراً بولی۔
"سب کچھ...."
"زمین دکھائی دے رہی ہے....؟"
"ہاں...."
"آسمان....؟"
"وہ بھی...."
"جتنی دور دیکھو زمین اور آسمان کے کنارے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن قریب جانے پر پتا چلتا ہے ان میں بہت فاصلہ ہے کوئی آج تک یہ فاصلہ ناپ نہیں سکا۔ بس ایسے ہی پسند ہو نظر آتے ہوئے بھی پیمائش مشکل۔" اس کی گہری بات روائیبہ کے اوپر سے گزر گئی۔ فوراً اکتا کر بولی تھی۔
"مجھے ڈیئر لینا ہے...."
"کیا ڈیئر دوں....؟"
اس کے پوچھنے پر وہ سامنے جامن کے درخت کی جانب اشارہ کرتے بولی تھی۔
"اس درخت پر چڑھنے کا۔"
"حد ہو گئی ہے یار...." وہ یک لخت منڈیر سے پشت ہٹا کر سیدھا ہوا "رحم کرو مجھ پر کیوں میرا تماشا لگانا ہے...."
اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے بھی نیچے اتار لیا تھا۔ "چلو اب.... دیر ہو جائے گی۔"
وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر پگڈنڈی کی جانب لے آیا تھا۔ پگڈنڈی سے گزر کر ڈیرے کا پچھواڑہ اور دوسری جانب اس کی کالی لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھنے ہی لگی تھی جب اس کی نگاہ سڑک کے پار کچی دیواروں کے بنے مکان کے کونے سے سیاہ دھواں نکلتا دیکھا۔ اس کے اشارہ کرتے پوچھا تھا۔
"ادھر کیا ہے؟"
"کمہار کی بھٹی...." اس نے گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے کہا۔
"بھٹی....؟" اسے سمجھ نہیں آئی۔
"پوٹر ورک شاپ" وہ اسے بتاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھنے لگا۔ "چلو بیٹھو" وہ رخ موڑ ادھر ہی دیکھتی رہی۔ پھر لجاجت سے کہا تھا۔
"پلیز، مجھے وہ دیکھنی ہے...."
اس نے پل بھر سوچا پھر معنی خیز مسکرا کر نیچے اتر آیا۔ "چلو یار آج یہ بھی سہی آؤ۔"
اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے وہ تیز تیز آگے بڑھا۔ سیلن زدہ لکڑی کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا اندر صرف کمہار تھا۔ اس نے روائیبہ کو ہاتھ کے اشارے سے آگے بلایا اور ساتھ شال اور بال اچھی طرح درست کرنے کا بھی کہا تھا۔
چھوٹے سے کچے صحن میں بہت سے ظروف سوکھ رہے تھے۔ ایک جانب گیلی مٹی کا ڈھیر تھا۔ جیسے باریک پلاسٹک کی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں شاید آگ لگا کر برتن پکانے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ بھٹی والے کمرے کے آگے چھوٹی سی پر چھتی کے نیچے ساٹھ باسٹھ سالہ فربہی مائل آدمی لمبی بنیان اور تہ بند باندھے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں مٹی کا ایک برتن گھوم رہا تھا۔ حنبل کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر کمہار کے چہرے پر تحیر کا نقشہ ابھرا۔ اس کے پاؤں سے گھومتا چاک رک گیا تھا۔ اپنی تہ بند سے ہاتھ پونچھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ ماتھے تک لے جا کر حنبل کو سلام کیا۔ اس نے سر کے خم کے ساتھ وعلیکم السلام کہا

تھا۔
بوڑھی آنکھوں میں حیرت اور خوشی ملی جلی تھی۔
حنبل ذکا کے پاس اکثر اپنے مسئلے لے کر جاتا تھا۔ نہ صرف اس نے سنے تھے بلکہ ممکن مدد کے ساتھ حل بھی کیے تھے لیکن اس طرح اس کی بھٹی پر کبھی نہیں آیا تھا۔
"خیر چیمہ صاحب..." اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ یہاں کیوں آئے ہیں' اس نے اس کے شانے کو نرمی سے تھپکا۔
"کچھ نہیں یار... بیٹھو کوئی بات نہیں..." کمہار کی تسلی نہیں ہوئی تھی وہ حیرت سے کبھی روائیبہ' کبھی حنبل کو دیکھتا۔ روائیبہ چہرے کے پاس سے اپنی شال مٹھی میں دبوچے چاروں طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ پھر کپڑے سمیٹتی ہوئی چاک کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے انگلی کے ساتھ آدھ تیار گلدان کو چھوا تھا۔
"بی بی جی... اے بھجے ڈھلی نئیں' گیلی اے' تھاڈے ہاتھ گندے ہوجان گے..." کمہار کا ایک لفظ جو اسے سمجھ آیا ہو۔ اس نے فرمائشی انداز میں حنبل کو دیکھا تھا۔
"حنبل... مجھے بھی یہ بنانا ہے' پلیز..." اس کے لجاجت بھرے انداز پر حنبل کی مبہم مسکراہٹ مشکل میں پڑ گئی۔
"کیا چیز ہے یہ لڑکی' بچوں کی طرح فرمائش درخت پر چڑھنا ہے' ٹریکٹر چلانا ہے' اب برتن... کوئی بعید نہیں ایلیے لگتے دیکھے تو یقیناً" وہ بھی لگانے ہوں گے..." حنبل کے ہونٹ ہلکی سے مسکان سے وا ہوئے۔
"تم وہیل کیسے چلاؤ گی..."
"ایسے..." اس نے برجستگی سے کہتے ساتھ شال کو گلے سے پیچھے کی جانب سمیٹ کر۔ اپنی ٹانگ نیچے گڑھے میں لگے پہیے کی جانب بڑھادی۔ گویا وہ کمہار کو برتن بناتے بغور دیکھ چکی تھی۔ گلدان کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہلکا ہلکا پہیہ گھمانے لگی۔ گلدان چاک پر گھومنے لگا۔ اپنے زمیندار مہمان کی مہمان نوازی کے لیے کمہار بھٹی سے باہر نکل چکا تھا۔ حنبل کچھ دیر کوفت سے روائیبہ کو دیکھتا رہا۔ پھر پنجوں کے بل اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ مضبوطی سے اس کے مٹی سے بھرے نرم ہاتھوں پر رکھ دیے۔ بظاہر ڈولتے گلدان کو سہارا دینے کے لیے مگر اس کی نگاہیں روائیبہ کے چمکتے گالوں پر تھیں جو خوشی سے تمتما کر سرخ ہوچکے تھے۔ روائیبہ کی پوری توجہ گلدان پر تھی اور حنبل کی اس لڑکی پر۔ اس نے مدھم آواز میں پوچھا تھا۔
"بہت خوش ہو..."
اس نے نچلا ہونٹ اوپر کے دانتوں سے خوب اچھی طرح جکڑے اثبات میں زور زور سے سرہلایا تھا۔
"اتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر خوش ہوجاتی ہو۔"
"ہاں" کہتے خوشی اس کی آنکھوں میں ناچ رہی تھی۔ اچھے بھلے گلدان کی شکل ٹیڑھی میڑھی ہوگئی تھی۔ اس نے احتیاط سے اسے چاک سے الگ کیا۔ ہاتھوں میں گھما گھما کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
"مجھے لگتا ہے' میں اچھی پوٹریس (کمہارن) بن سکتی ہوں' کیوں حنبل۔" اس نے تائیدی نگاہ اٹھائی۔ وہ خفیف سے مسکرایا۔
"اف خدایا' کیا میری ایک کمہارن سے شادی ہوئی ہے۔" پھر توقف سے استہفامیہ دیکھا تھا۔
"اور اب یہ کیا کررہی ہو...؟" وہ اس کی بات نظر انداز کر' قریب سے لکڑی کا تنکا اٹھا کر' گیلے گلدان پر کچھ لکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ اچھا خاصا جھنجلایا۔
"آئی ایکسٹریملی لو یو۔" (میں تم سے بے تحاشا محبت کرتی ہوں) اس نے لکھتے ہوئے ابرو اٹھا کر حنبل کو دیکھا... "تم بھی اس پر کچھ لکھو...؟ اس کی فرمائش پر وہ جزبز ہوا تھا۔
"یار' کیا بچپنا ہے' میری کوئی ایج ہے ان حرکتوں کی..."
"ایج سے کیا ہوتا ہے' پلیز۔ میری خاطر..." وہ اصرار کرنے لگی۔

"مادام' محبت لکھی نہیں جاتی' محسوس کی جاتی ہے' بالکل خلوص' اعتبار کی طرح۔۔۔ جیسے کوئی چیونٹی کے رینگنے کی آہٹ نہیں سن سکتا' بالکل اسی طرح محبت بھی رینگتی دل میں اتر جاتی ہے۔" حنبل کے ہاتھ پر ایک چیونٹی چل رہی تھی تب ہی اسے چیونٹی کا خیال آیا تھا۔ چیونٹی پکڑ کر زمین پر چھوڑ دی۔

"کیا میں تمہیں۔۔۔ اچھی لگتی ہوں؟" اس کے ڈر ڈر کر پوچھنے پر حنبل نے بے یقینی سے آنکھیں سکیڑیں "یقیناً" یہ سوچتے ہوئے "اس بے وقوف لڑکی کو ابھی تک یقین نہیں آیا۔ اس کی خاموشی پر وہ فوراً سنبھلی۔

"ایم۔ سوری۔۔۔ آئی مین' گزارہ' گزارہ ہو جائے گا' ناں۔۔۔ ہم دونوں کا۔۔۔"

"کیا ثبوت چاہیے تمہیں۔۔۔" حنبل کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ تھی "پتا ہے روائیبہ' میں اپنے سے وابستہ ہر رشتے سے بہت محبت کرتا ہوں' اور اس محبت میں روائیبہ حنبل سب سے آگے ہے' پہلی صف میں۔" اس نے کہتے ساتھ ہاتھ میں پکڑے لکڑی کے تنکے کی جانب اشارہ کیا "لاؤ یہ مجھے دو۔"

"ان لو آل ویز بی پازیٹیو" (محبت میں ہمیشہ مثبت رہو)

روائیبہ کے لکھے جملے کے نیچے اس نے اپنا جملہ لکھا اور مسکراتے ہوئے اپنی پوروں پر لگی مٹی اس کے گال پر لگاتے اٹھ کھڑا ہوا "اب خوش۔۔۔"

وہ آج حقیقتاً "خوش تھی' توقع سے بڑھ کر حنبل کا خوب صورت روپ دیکھا تھا۔ اسے اپنی سوچ پر حیرت تھی جسے وہ جابر سمجھتی رہی وہ تو بڑا مہربان نکلا۔ حنبل کو دیکھتے اس نے گال صاف کیا۔ تب ہی کمہار واپس آیا تھا اس کے ہاتھ میں میٹھی لسی کے دو گلاس تھے اس نے انہیں وہ پیش کیے۔ روائیبہ گلدان لے کر چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ دونوں نے لسی پی۔ اس گلدان کی قیمت پوچھی۔ لیکن کمہار وہ تحفتاً" دے رہا تھا۔ اس کے لیے یہ بہت اعزاز کی بات تھی کہ حنبل چیمہ اس کے غریب خانے پر اپنی بیوی کو لے کر آئے ہیں۔ شاید اس خوب صورت تحفے کی قیمت حنبل کبھی بھی ادا نہ کر سکتا۔ "خدا حافظ" کہہ کر کمہار سے مصافحہ کرتے چند نیلے نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیے' یہ قیمت نہیں تھی صرف خوشی کا اظہار تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کئی دنوں سے اسی شش و پنج میں تھی کہ سلویٰ سے کیسے بات کرے شہروز کمال نے اسے بچپن کی سہیلی کے سامنے بے طرح سے شرمندہ کر ڈالا تھا۔ نا صرف شادی میں لے کر گیا بلکہ اپنے کاروباری مقصد کے لیے حنبل سے بہترین روابط بڑھا چکا تھا۔ ناچاہتے ہوئے بھی دعوت پر اسے خوب اہتمام کرنا پڑا تھا۔ اور اب کئی ماہ گزر جانے کے باوجود سبرینہ کی شرمندگی کسی طور ختم نہیں ہو رہی تھی۔ اسے سلویٰ سے بہت ضروری کام تھا۔ کچھ ماہ پہلے سلویٰ نے اپنے گاؤں میں کسی مزار کا بتایا تھا۔ کہ بہت پہنچی ہوئی ہستی تھے' وہاں جا کر دعا مانگو ہو ہی نہیں سکتا قبول نہ ہو۔ کئی بار سبرینہ نے ارادہ کیا لیکن گھر کی مصروفیات اور پھر شہروز کا مزاج موقع بننے ہی نہ دیتا تھا۔ اس نے بہت دیر سوچنے کے بعد آخر سلویٰ کو کال ملا ہی لی۔ سلام کے بعد اس کا حال پوچھنے پر وہ استہزائیہ ہنسی تھی۔

"تمہارا کیا خیال تھا' اس سفید چھپکلی کی جلن میں خود کو روگ لگا لوں گی' ایسی سی چیزیں میں مری ہوئی بھی دیکھنا پسند نہ کروں۔۔۔ اور ویسے بھی میری منگنی ہو گئی ہے۔۔۔ لعنت بھیجی میں نے اس کمینے پر۔۔۔ تم سناؤ تم کیسی ہو؟"

"جیسی تھی' ویسی ہی۔۔۔" سبرینہ کے بے چارگی سے کہنے پر اس نے یاد دہانی کروائی۔

"تمہیں اس مزار کا بتایا تو تھا' آئی ہی نہیں تم۔۔۔"

"یہی پوچھنے کے لیے فون کیا ہے' کیا واقعی شہروز ٹھیک ہو جائیں گے۔۔۔ آج کل کسی ماڈل کے چکر میں ہے۔۔۔"

"خیر اس جیسی چیزیں دعاؤں سے ٹھیک نہیں ہوتیں' کالا جادو ہی اثر کرے گا۔ تمہیں اپنی مراد بہ

چاہیے' وہ ہو جائے گا..... جا کر دعا تو مانگو.....''
''کرنا کیا ہوگا.....'' سبرینہ نے پوچھا۔
''اوہو' کتنی بار بتایا ہے' چاندی کے دیے مزار کے باہر ہی ملتے ہیں وہ خرید کر جلا دینا' چادر چڑھا دینا' جو منت مانو گی بعد میں آ کر پوری کر جانا..... بس.....''
''میں جلد آؤں گی.....''
خود پر خواہشیں حاوی کر کے ہم عقیدے جیسی آہنی بنیاد کو کچا دھاگا بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ ہوتا سب کچھ نیتوں پر ہے' جتنا نیت پر ایمان مضبوط ہوگا' اتنی ہی مضبوطی سے مراد تقدیر میں آملے گی۔ بیٹے کی آمد سبرینہ کی زندگی میں سکون ثابت ہوگی یہی نیت اس کا ایمان مزار تک لے جانے پر آمادہ ہوئی۔

چل کر آئی تھی کھیتوں میں ہل چلانے۔'' اس نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھاتے صوفہ بیک سے کمر ٹکائی ذو معنی نگاہوں سے روائیبہ کو تک رہا تھا۔ بدلے میں اس نے خائف نگاہ اٹھائی۔ آئمہ کچھ دیر تو انہیں دیکھتی رہیں پھر سمجھ گئیں روائیبہ کا بازو پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔
''ہم عورتیں حویلی میں رہتی ہیں' یوں مردوں کے ساتھ جا کر نہیں بیٹھتیں۔ ہوں۔'' حنبل نے تائیدی سر ہلاتے کہا تھا۔
''بالکل..... اب بھرجائی کی بات پر عمل بھی کرنا' یہ نہ ہو روز پہنچ جاؤ' مجھے تنگ کرنے۔'' اس کے مسرور لہجے پر روائیبہ کا کھلتا رنگ آئمہ کو مسکرانے پر مجبور کر گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ مسکراتے چہرے لے کر جب حویلی میں داخل ہوئے آئمہ تب تک آچکی تھیں۔ روائیبہ کو گھر میں نہ پا کر خاصی فکر مند ہوئی تھیں زینب سے پوچھا اس نے کہا تھا۔ ''اذلان صاحب کے ساتھ باہر گئی تھیں' مگر وہ تو آگئے۔''
اس کے ساتھ اذلان کا بے تکلف انداز آئمہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ کتنی بار ڈپٹا تھا۔ ''حد میں رہا کرو' وہ تمہاری چاچی ہے' کوئی سہیلی نہیں۔''
''چاچی بعد میں بنی ہے' پہلے سہیلی بنی تھی۔''
اس کا جواب آئمہ کو آگ لگا دیتا اب یہ سن کر کہیں لے کر گیا تھا' تو اسے کہاں چھوڑ آیا فوراً'' اذلان کے پاس گئیں۔ اس نے لاپروائی سے کہہ دیا تھا۔
''گئی ضرور تھی میرے ساتھ' مگر اب چاچو کے ساتھ ہے۔'' وہ عجیب مخمصے میں تھیں جب وہ دونوں اندر داخل ہوئے تھے۔
''کہاں لے گئے تھے' میں پریشان ہوگئی تھی۔'' انہوں نے حنبل کو خفگی سے گھورا تھا۔ وہ سرشار سا آگے بڑھا۔ اور دھپ سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بتانے لگا تھا۔
''میں نہیں لے کر گیا تھا' آپ کی لاڈلی دیورانی خود

اک سنہرا دن مدھر رات پر ختم ہو چکا تھا۔ ایک کے بعد ایک خوب صورت دن ان کے دامن میں آنے لگا۔ حنبل ذکا کو یوں چند گھنٹے اس کے ساتھ گھومنا اچھا لگا تھا۔ زبردستی سے باندھا گیا رشتہ چاہت و خلوص کے تعلق میں گوندھ چکا تھا۔
جرمنی میں لگائی جانے والی فوڈ فرم کے سلسلے میں فوڈ پروسیسرز کے ساتھ اسلام آباد میں میٹنگ تھی۔ اسے تین چار دن کے لیے وہاں جانا تھا۔ بھرجائی سے اجازت لے کر وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس نے بائے ایئر جانے سے انکار کیا تھا۔ حنبل کے ساتھ اس کی لینڈ کروزر میں ہی گئی تھی۔ دیوہیکل مارگلہ ہلز کو دیکھ کر اس پر وحشت طاری ہونے لگی۔ لیکن حنبل کی ہم راہی اسے جلد ہی معمول پر لے آئی۔
میٹنگ کے بعد اس نے اسے اسلام آباد کی مختلف جگہیں دکھائی تھیں۔ ان کا قیام بھوربن کے سبز مخملیں پہاڑوں کے بیچ بنے پرل کانٹینینٹل کی سفید عمارت میں تھا۔ بے شک وہ آسٹریلیا کے رین فورسٹ' ڈریم لینڈ فیری بیچ یا برسبن جیسے تفریحی مقام نہیں تھے لیکن سبز پہاڑوں کو چھو کر معطر ہوا کھڑکیوں سے اندر آتی روح کو اندر تک سرشار کر رہی تھی۔ وہ

ہوٹل کی کھڑکی میں کھڑے تھے۔ حنبل نے کافی آرڈر کی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ویٹر نے کافی کے لیے دستک دی وہ خود جاکر اس سے ٹرے لے آیا اور کپ لاکر کھڑکی کی سلیب پر رکھ دیے۔ وہ کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگائے پہاڑوں کی کھائیوں میں دیکھنے لگی۔ سفید بادلوں کی پرتیں دھوئیں کی صورت گہرائی میں اتر رہی تھیں۔

"حنبل، ہم بادلوں سے اوپر ہیں....."

"ہاں..... اسے اچنبھا ہوا۔" کیوں یقین نہیں آرہا' دھکا دوں۔" اس نے اس کے دونوں کندھے پکڑ کر زور سے جھلائے۔

لمحہ بھر کے لیے وہ ڈری پھر زور سے ہنستے ہوئے سر اس کے کندھے سے ٹکالیا۔ ہوا کے جھونکوں سے اس کے بال حنبل کے چہرے سے ٹکرائے تھے۔ اس نے مٹھی میں سمیٹ کر نرمی سے جھٹکے۔

"نہیں اب برتھالو....."

وہ "اوکے" کہتے ہوئے مسکائی بھاپ اٹھاتا کپ ہاتھوں میں اٹھالیا۔ حنبل نے اپنا کپ تھامتے ہوئے دوسرے پٹ سے ٹیک لگالی۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جمی تھیں۔ روائیبہ نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"حنبل.....!"

لبوں سے کپ کو چھوتے حنبل کی بھنوئیں ناگواری سے خفیف سی سمٹی تھیں۔ اسے روائیبہ کے منہ سے اپنا نام پکارنا کچھ خاص پسند نہیں تھا۔ اور خاص کر جب وہ سب گھر والوں کے بیچ اسے "حنبل" کہہ کر پکارتی اور گھر والے استہزائیہ جس طرح حنبل کو دیکھتے اسے خفت محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے آج اس نے کہہ ہی دیا۔

"یار گھر والوں کے سامنے میرا نام مت لیا کرو۔"

"کیوں۔" اس کی آنکھوں میں تحیر ابھر کر معدوم ہوا "تمہارا نام گھر والوں نے نہیں رکھا تھا۔" اس کی برجستہ حیرانگی پر حنبل کو اچھو لگتے لگتے بچا۔ اپنی ہنسی کو بمشکل کنٹرول کرتے نرمی سے کہا تھا۔

"ہمارے ہاں خواتین شوہروں کے نام نہیں لیتیں' ایک تم ہو..... منہ اٹھائے' حنبل، حنبل پکارتی ہو..... آپ کہا کرو..... تم بھی اچھا نہیں لگتا....."

"تم بھی تو مجھے تم کہتے ہو.....؟" روائیبہ کو اس کی تصحیح پر بہت حیرت ہورہی تھی۔

"تم مجھ سے چھوٹی ہو..... بہت چھوٹی....."

"اتنی بھی نہیں ہوں....." اس کے منہ پھلانے پر وہ دھیما سے مسکرایا۔

"اچھا کہو..... کیا کہہ رہی تھیں....."

"بھول گئی....." اس نے خفگی سے رخ کھڑکی کی جانب پھیرلیا اور گھونٹ گھونٹ کافی پینے لگی۔

"اچھا.....!!" وہ اسے چڑانے کے لیے استعجابیہ بولا تھا "بھول گئی ہو' ٹھیک ہے' تم باہر دیکھو میں سونے لگا ہوں۔"

"حنبل....." وہ قدرے ڈپٹتے ہوئے بولی تھی "میں کچھ بتانے لگی تھی....."

"تو بتاؤ....."

"پتا کیا..... کھڑکی کے پٹ سے پشت جماتے ساری اس کی جانب متوجہ ہوگئی تھی۔ "شروع شروع میں تم مجھے بہت روڈ' ریزرو لگتے تھے' جیسے کوئی غصے والا مغرور شخص ہو' بہت غصہ آتا تھا تمہیں دیکھ کر' دنیا کا براترین بندہ۔"

"براترین۔" کہنے پر حنبل نے اسے گھر کا۔ اونہوں..... حد ادب' شوہر ہوں تمہارا۔

"ہاں آں..... میں شادی سے پہلے کی بات کررہی ہوں' میں سوچتی تھی یہ اس گھر میں کیوں رہتا ہے....."

"اچھا....." اس نے بھنوئیں استفہامیہ اچکائیں "اب کیسا لگتا ہوں۔"

"اب تو ویسے نہیں لگتے....." اس کا لہجہ یک لخت مٹھاس بھرا ہوگیا تھا۔ پھر اپنے دونوں ہونٹ آپس میں مس کرکے کھولے۔

"پتا نہیں پہلے مجھے کیوں اتنا خوف آتا تھا' اور شادی کے بعد مجھے ایسے لگتا تھا کہ شاید میں آپ کو بہت بری

لگتی ہوں' آپ مجھے ماریں گے۔"

"کام ویسے تم نے سارے مار کھانے والے ہی کیے ہیں۔" حنبل کی نگاہ کے سامنے ٹریکٹر پر چڑھی روائیبہ گھوم گئی۔ "لیکن دیکھ لو' میں نے بڑا برداشت کیا ہے تمہیں۔"

"کیوں.....؟" اس کے بے خودی سے نکلے کیوں پر اس کی پتلی سی ناک دو پوروں میں بھینچ گئی۔

"محبت ہو گئی ہے تم سے..... اس لیے۔"

"محبت....." گہرے آنکھیں پوری پھیل گئیں۔

"ویسے یہ محبت ہوتی کیا ہے؟"

اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کاؤچ پر لے آیا۔ "پتا نہیں یار..... شاعر محبت کو باد نسیم کہتے ہیں' مصنف کہتے ہیں پہلی شعاع' اور میں کہتا ہوں پاگل پن' دماغ کا فتور" وہ اس کے ہاتھ تھامے اس کی معصوم آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس' نگاہوں کی لو سے روائیبہ کے رخسار تپ کر سرخ ہو گئے حنبل نے نرم تاثر سے مسکراتے لمبی سانس بھری۔

"یار جب یہ دل پر دستک دیتی ہے ناں' اچھے بھلے آدمی کی مت (عقل) مار دیتی ہے۔" حنبل کے خیالوں میں اپنے کمرے کے ڈریسنگ ٹیبل پر سجا بے ڈھنگا گلدان گھوم گیا جسے روائیبہ نے مختلف رنگوں سے پینٹ کیا' گندہ جملوں میں گلیٹر بھرے اور گلدان کے اندر بہت سی افشاں بھر کر ڈریسنگ ٹیبل پر سجا رکھا تھا۔ حنبل کے کھوئے کھوئے لہجے پر اسے لفظوں کے مطلب سمجھ آئے تھے ورنہ تو اس کے اوپر سے گزر گیا تھا سب۔ اس نے یک ٹک اسے دیکھتے ایک بات پوچھی تھی۔

"تمہیں اتنی مشکل باتیں کہاں سے یاد ہوتی ہیں۔"

"جسے تم جیسی بیوی مل جائے' ایسی باتیں خود بخود آجاتی ہیں۔" اس نے سکون سے کہہ کر ہاتھ بڑھایا لائٹ آف کی کروٹ لیتے ہوئے لیٹ گیا۔

"اور اب سو جاؤ' صبح جلدی واپسی ہے ہماری۔"

☆ ☆ ☆

وہ تقریباً" دوپہر ڈھلے گھر پہنچے تھے۔ آئمہ بیگم بہت چپ چپ تھیں۔ حال احوال پوچھنے کے دوران بھی چہرے پر الجھنوں کا جال سا تھا۔ اعشال نے حنبل سے خیر خیریت پوچھی پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اذلان پورے جوش سے مل کر ایک ایک بات کی تفصیل روائیبہ سے پوچھ رہا تھا البتہ حنبل آئمہ کے پاس بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے' طبیعت ٹھیک ہے آپ کی....." ان کے سرسری سے "ہاں" پر حنبل کو تشویش ہوئی۔

"لگ تو نہیں رہی' سب خیریت ہے' ناں....."

"ٹھیک ہے چاچو..... میری ماں کو شوق ہے' ہر بات سر پر سوار کرنے کا۔" اذلان کے لاپروا جواب پر آئمہ نے اسے تیز نگاہ سے دیکھا تھا۔

"اگر تم کسی کام کے ہوتے' تو مجھے ایسے شوق پالنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

اذلان کو معلوم تھا آئمہ ایک بار شروع ہو جائیں تو اس کی اگلی پچھلی سب کھول کر رکھ دیتی ہیں' اسی لیے اس نے روائیبہ سے اس کا ٹیب مانگا۔ ان کی تصاویر دیکھتے وہاں سے اٹھ جانے میں عافیت جانی اور آئمہ حنبل کو خیام کے بارے میں آہستہ آہستہ بتا رہی تھیں۔ وہ آنکھیں سکیڑے ان کی بات پوری توجہ سے سننے کا تاثر دیتا رہا۔ دراصل خیام جب سے جرمنی گئے تھے ان کا بی پی اور شوگر لیول میں تیزی سے اتار چڑھاؤ آرہا تھا۔ پچھلے مہینے ایک دن کے لیے اسپتال بھی ایڈمٹ ہونا پڑا آج جب انہوں نے بتایا کہ بی پی گڑبڑ ہو رہا ہے تو آئمہ بے حد پریشان ہو گئیں حنبل کے یہ کہنے پر۔

"آپ پریشان مت ہوں' میری بات ہوئی ہے خیام بھائی سے' اب کافی بہتر ہے ان کی طبیعت۔" آئمہ کی روہانسی آواز تلخ ہو گئی۔

"آخر تمہیں ضرورت کیا تھی' پردیسوں میں کاروبار کرنے کی' یہاں کوئی کمی تھی....."

"اوہو بھرجائی....." وہ تسلی دیتے ہوئے بولا تھا۔

"ہم وہاں شفٹ تھوڑی ہو رہے ہیں' وہاں پر صرف

میر فوڈ انڈسٹری کا ایک یونٹ لگایا ہے' سارا مال یہاں سے جائے گا' وہاں تو جسٹ ٹیسٹ اور پیکنگ کا کام ہو گا' آپ یہ دیکھیں پاکستان کی ایکسپورٹ کتنی بڑھ جائے گی۔ ہماری لائیو اسٹاک فارمنگ تین گنا بڑھ گئی ہے..... اور خیام بھائی اگلے مہینے واپس آجائیں گے۔ پھر صرف مال بھجوانے کے بعد وزٹ ہوا کریں گے۔ کبھی میں جاؤں گا' کبھی وہ..... آپ پریشان مت ہوں۔"

ان کی تسلی کر کے وہ باہر مہمان خانے میں آگیا تھا جہاں میرزکا اپنے کچھ دوستوں کے رخصت ہونے کے بعد کھاتے دیکھ رہے تھے۔ مصروفیت کی وجہ سے گھر والوں کو وہ بہت کم وقت دے پا رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی مسکرائے اور پھر دونوں باپ بیٹا بیٹھ کر بہت دیر تک جرمن بزنس کی قیام پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔



اس رات وہ جب حویلی آیا روائیبہ برآمدے میں کھڑی اس کی منتظر تھی۔ آج سارا دن حنبل کا بے حد مصروف گزرا تھا چیمبر آف کامرس کے تمام ایکسپورٹرز تاجروں کی لاہور میں میٹنگ تھی حنبل اپنے ساتھ اذلان کو لے گیا تھا۔ آج کل وہ اسے پوری طرح سے کاروباری تربیت دینے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ کیوں کہ اذلان کی تعلیمی دلچسپی بالکل صفر ہو چکی تھی۔ حنبل نے اسے بہت سمجھانے کے بعد یہی فیصلہ کیا وہ پرائیویٹ آسان مضامین میں ایف اے کرے اور اپنا سارا وقت اس کے ساتھ کاروباری معاملات میں دے۔

چاولوں کی مل اور فوڈ پروسیسنگ یونٹ کے بہت سے معاملات اس پر چھوڑ کر جانچ رہا تھا کہ وہ کیسے ان سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج اسی لیے وہ اسے اپنے ساتھ لاہور میٹنگ میں لے گیا اور وہاں جا کر ہی اسے احساس ہوا تھا بہتر کاروبار کرنے کے لیے تعلیم کا بہتر ہونا بھی ضروری ہے۔ راستے میں اس نے حنبل سے کہا تھا کہ اسے کامرس کالج میں ایڈمیشن لینا ہے اور یہ بات حنبل کے لیے بہت خوش آئند تھی۔

گاڑی ڈرائیو وے پر رکتے ہی دونوں دروازے کھلے۔ بہترین ڈنر سوٹ میں ملبوس وہ دونوں باہر نکل آئے۔ رائل بلو پینٹ کوٹ میں حنبل زکا ہمیشہ کی طرح باوقار لگ رہا تھا۔ برآمدے کی جانب تیزی سے بڑھتے ہوئے اپنی ٹائی ناٹ خوب ڈھیلی کرنے کے بعد کالر کا اوپر والا بٹن تک کھول چکا تھا۔ اسے برآمدے میں کھڑا دیکھ کر آنکھوں میں اچنبھا ابھر کر معدوم ہوا۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"تم ابھی تک جاگ رہی ہو اور یہاں باہر کیوں کھڑی ہو؟"

"میرا دل گھبرا رہا تھا' تم نے بہت دیر کر دی۔" وہ اس کے ساتھ اندر کی جانب بڑھتے ہوئے بتا رہی تھی۔ اذلان ہاتھ سے اشارتاً" سلام کر کے سیدھا کمرے میں چلا گیا تھا۔ حنبل کے بھی قدم اپنے کمرے کی جانب تھے۔ کھانے کا پوچھنے پر اس نے انکار کر دیا صرف اتنا کہا تھا۔

"زینب سے کہو' کافی دے جائے۔" چند قدم چل کر مڑ کر پوچھا۔ "اور تم نے کھا لیا.....؟" اس نے چند ثانیے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ فوراً" سمجھ گیا جھوٹ بول رہی ہے۔

"اچھا پھر کھانا لگواؤ یا ایسا کرو کمرے میں منگوا لو بہت تھکاوٹ ہو گئی ہے۔" زینب اس سارے عرصے میں بہت عجیب سی ہو گئی تھی۔ کاٹ دار نظروں سے دیکھتی رہتی اور سارے کام روائیبہ اور حنبل کے کرنے کو تیار بھی رہتی تھی۔ اب بھی کہنے کی دیر تھی دس منٹ میں کھانا گرم کر کے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔

وہ ڈھیلے ڈھالے آرام دہ لباس میں کاؤچ پر بیٹھا برائے نام کھانا کھا رہا تھا۔ جب کہ روائیبہ کھانے کے ساتھ پوری دلچسپی سے اس کی تمام روٹین سننے کے بعد اپنی بوریت کا بتا رہی تھی۔

"تم اذلان کو بھی ساتھ لے گئے تھے' میرا بالکل دل نہیں لگا۔"

"محترمہ اذلان آپ کو انٹرٹین کرنے کے لیے نہیں

گھر کے معاملات میں دلچسپی لیا کرو تاکہ تمہارا دل لگے۔۔۔ ویسے بھی وہ اب ایڈیشن لینے والا ہے۔" وہ کہتے ہوئے کاؤچ پر پھیل کے بیٹھ گیا "اور تمہاری مہانی ہوگی اسے پھر سے کھیل کود کی طرف مائل مت کرنا۔۔۔ آگے ہی بڑی مشکل سے اسے عقل آرہی ہے۔" آخری جملہ منہ میں بدبداتے ہوئے اس نے سر بیک پر ٹکالیا آنکھیں موندھ لیں۔ روائیبہ پھولے رخسار کے نیچے مٹھی دبائے نروٹھے پن سے اسے تکتے سوچ رہی تھی۔

"بھلا میں نے اسے کھیل کود پر لگا رکھا ہے۔"

دفعتاً" سناٹوں میں لپٹ کر بانسری کی آواز پر وہ چونکی تھی رخسار سے ہٹاتے حنبل کو کہا تھا۔

"تمہیں فلوٹ کی آواز آرہی ہے۔۔۔"

"کیوں میں بہرہ ہوں جو نہیں آئے گی۔۔۔" اس کے لہجے میں اکتاہٹ در آئی۔ "پتا نہیں اس لڑکے کا کیا مسئلہ ہے' سارے دن کا تھکا ہوا ہے' بجائے آرام کرنے کے' دوسروں کا بھی دماغ خراب کررہا ہے۔" حنبل کی بند آنکھیں ـــــ تھکے لہجے پر روائیبہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کون۔۔۔ ازلان' ازلان بجارہا ہے یہ۔۔۔"

"اور کوئی پاگل ہے' اس گھر میں۔۔۔؟" جمائی روکتے ہوئے حنبل کی خمار آلود آواز نکلی تھی۔

"واؤ۔۔۔ وہ اتنی اچھی بجالیتا ہے' اس نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا' آئی کانٹ بلیو۔۔۔ (میں یقین نہیں کرسکتی) چلو آؤ اس کے پاس جاکر سنتے ہیں۔" وہ کہتے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا مطلب ہے' چل کر سنتے ہیں باہر کوئی کنسرٹ ہورہا ہے۔" اس نے ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا اس کی کلائی پکڑ کر واپس بٹھالیا۔ "بیٹھ جاؤ۔۔۔"

"یو نو واٹ۔۔۔ حنبل میوزک مجھے بہت پسند ہے اور جو جندب ہے ناں۔۔۔ وہ اتنا میلوڈک وائلن بجاتا ہے' تم سنو تو مدہوش ہوجاؤ۔ وہ کہتا ہے اس نے میری خاطر وائلن بجانا سیکھا ہے۔" حنبل نے سرعت سے اٹھا کر اسے دیکھا وہ آہستہ آہستہ اپنے خیالوں میں بول رہی تھی۔

"یہ فلوٹ سن کر مجھے اس کا وائلن یاد آگیا۔۔۔ جندب میرا بہت اچھا فرینڈ ہے' پتا نہیں کب تک اور کتنا ناراض رہے گا۔"

"کیوں۔۔۔ کیوں ناراض ہے وہ تم سے۔۔۔؟" وہ سیدھا ہو بیٹھا تھا ساری نیند بھاگ گئی تھی۔

"میں نے اسے فون کرنے سے منع کردیا تھا ناں' ایکچوئلی وہ باربار مجھے شادی سے منع۔۔۔" منع لفظ پر بے دھیانی میں منہ سے نکلے جملے کا اسے احساس ہوچکا تھا۔ حنبل پوری سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ گڑبڑا کر ادھرادھر دیکھنے لگی۔ حنبل کی گہری نگاہوں میں اسے جملہ جوڑتے اچھی خاصی دشواری ہونے لگی۔ ہونٹ کا کونا دانتوں میں دبائے ہچکچاہٹ سے بولی۔

"یو نو واٹ' وہ چاہتا تھا میں اپنی ایجوکیشن مکمل کرلوں۔ شادی تو بعد میں بھی ہوسکتی ہے۔۔۔" وہ کچھ توقف کے بعد تھوک نگل کر بولی تھی۔ "ہم میں صرف فرینڈشپ تھی' بس۔۔۔ اسی لیے وہ میرا خیال کررہا تھا۔۔۔" وہ اب وہاں سے اٹھنا چاہتی تھی آہ' نگی سے کھڑی ہوئی "نیند آرہی ہے سوئیں۔۔۔"

حنبل اس پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا ایک بار پھر ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھالیا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا رکھا تھا۔

"بیٹھو۔۔۔ میری بات سنو۔۔۔"

وہ اس کے پاس بیٹھ گئی تھی بالکل اس بچے کی طرح جو ناکردہ چوری پکڑی جانے پر خواہ مخواہ خجالت محسوس کرے۔

"مائی ڈیئر وائف' ایک بات دل پر لکھ لو' شادی سے پہلے تمہاری زندگی میں کون تھا' کیوں تھا' کیا تھا مجھے اس سے کوئی غرض نہیں' ہاں شادی کے بعد یعنی اب میں کہاں ہوں مجھے اس سے مکمل دلچسپی ہے' پہلے جو بھی تھا وہ ختم' لیکن اب تم پوری طرح مجھ سے سنسیئر (مخلص) رہو میں یہ چاہتا ہوں اور میں اپنی سنسیئرٹی (اخلاص) میں پاگل پن کی حد تک جذبات

رکھتا ہوں۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بات کرتے اس کے نرم ہاتھ کی پشت کو اپنے بھاری ہاتھ سے آہستہ آہستہ تھپک رہا تھا۔ بات مکمل کر کے دھیما سا مسکرایا۔ "چلو اٹھو اب سوتے ہیں۔" وہ گولی کی طرح اٹھی حنبل بھی اٹھ چکا تھا' لیکن اٹھتے ہوئے ایک کال ازلان کو ملا کر ڈپٹا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے' بند کرو اسے' ڈسٹرب ہو رہا ہوں میں۔" اسے خود بھی پتا نہیں چلا اس کا لہجہ خواہ مخواہ میں کیوں تلخ ہو گیا تھا۔ ازلان بھی فوراً" کھڑکی کے پاس سے ہٹا اور بانسری سائیڈ ڈرا میں رکھ دی۔

☼ ☼ ☼

اکتوبر کے آخری ہفتے چل رہے تھے موسم خاصا بہتر ہو چکا تھا۔ اترتی شام میں وہ پچھلے صحن میں بیٹھی تھیں۔ آئمہ کا موڈ آج بہت اچھا تھا۔ ان کی باتوں سے لگتا تھا انہیں خیام بہت یاد آ رہے ہیں۔ اپنی شادی کے مختلف قصے روائیبہ کو سنا رہی تھیں۔ روائیبہ کی گود میں ایک بڑا سا البم کھلا رکھا تھا۔ وہ اسے مختلف رسموں اور رشتہ داروں کے بارے میں بتاتی رہیں جو وہ پوری دلچسپی سے سن رہی تھی۔ اعشال بھی ان کے پاس ہی بیٹھی تھی' لیکن ان کی باتوں میں دلچسپی لینے کے بجائے اس نے موبائل پر فیس بک اکاؤنٹ کھول رکھا تھا۔ ازلان کی پوسٹ پر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"میرے عزیز جان دوستوں جیسے چاچو کے ساتھ حادثہ پیش آگیا ہے' سب دوستوں سے ان کی صحت یابی کے لیے دعاؤں کی درخواست......" کمنٹس میں اللہ خیر کرے' کب؟ کیسے......؟ جیسی تحریریں تھیں' لیکن اس نے کسی کمنٹ کا جواب نہیں دیا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اعشال کی سانس رکی۔

"یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔" اس کی بڑبڑاہٹ پر آئمہ اور روائیبہ نے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"کیا ہوا۔" آئمہ کے استفسار پر وہ الجھ کر بولی۔

"پتا نہیں کیا کہہ رہا ہے...... کیا ہوا چاچو کو......" بتاتے ہوئے ازلان کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ وہ دونوں بھی چونکی ہو گئیں۔

جرمنی کے فوڈ یونٹ کے لیے حنبل نے یہاں سے سامان بذریعہ شپ لوڈ کروا دیا تھا۔ شپ وہاں پہنچنے والی تھی۔ یونٹ کے مالکانہ حقوق کے سلسلے میں جرمنی میں کچھ قانونی کارروائی رہتی تھی جس کے لیے حنبل کا جرمنی جانا بہت ضروری تھا۔ جرمنی کا بزنس آئمہ کی سمجھ سے بالکل باہر تھا۔ وہ تو اسی بات پر حیرت زدہ تھیں۔

"اتنی دور شپ کے ذریعے گوشت جائے گا' راستے میں سڑ نہیں جائے گا' کچھ دیر فریزر سے باہر رہ جائے تو خراب ہو جاتا ہے۔" آئمہ کی حیرانگی پر حنبل کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"میری بھولی بھرجائی ایسے ہی فریش تھوڑی جائے گا۔ اسے پراپر طریقے سے خشک کر کے' کیمیکلز لگا کر وہاں پہنچایا جائے گا اور فوڈ کی ترسیل کے لیے شپ میں بڑے بڑے سرد خانے ہوتے ہیں' گوشت کی کوالٹی میں ذرا بھی فرق نہیں پڑتا' یہ بہت پرافٹ ایبل بزنس ہے اور ہم کون سا اکیلے کر رہے ہیں میر فوڈ انڈسٹریز کے ستر فیصد شیئرز ہیں باقی تیس فیصد تو دو اور کمپنیوں کے ہیں۔"

آئمہ کو اس کی بات ذرا برابر سمجھ نہیں آئی تھی' یہی کہتیں۔

"تم اور تمہارا بھائی جانے......"

خیام نے اسے دو ماہ کے لیے جرمنی بلایا تھا اس سلسلے میں وہ آج لاہور ایمبیسی گیا ہوا تھا۔ ازلان اس کے ساتھ تھا جب حادثہ پیش آیا عادتاً" اسپتال میں اس نے اپنا اسٹیٹس اپ لوڈ کر دیا۔ یہ ایک گھنٹے پہلے اسٹیٹس تھا۔

"یعنی کہ ایک گھنٹہ ہو چکا......" اعشال اس کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے بے طرح پریشان تھی فون ریسیو ہوتے ہی وہ پھٹ پڑی۔

"یہ کیا بکواس تم نے ڈالی ہے' کیا ہوا ہے چاچو کو......"

ازلان کے بتاتے ہی وہ زور سے بولی تھی۔ "کیا۔

"ایکسیڈنٹ... کیسے ہیں چاچو...؟" صدمے سے اعشال کی تو جو حالت تھی سو تھی روائیبہ ساری لرز گئی۔ کب اس کی گود سے البم پھسل کر گرا اسے نہیں معلوم تھا۔ البتہ درختوں کے گھونسلوں میں دبک کر بیٹھے پرندے اس کی دل خراش چیخ "حنبل..." پر دہل ضرور گئے تھے۔ آئمہ اعشال نے سرعت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ بے طرح سے آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے بمشکل سانس کھینچ رہی تھی۔ اس کا سر مسلسل نفی میں ہل رہا تھا۔

"میری ممی کہاں ہیں... ڈیڈی کہاں ہیں... مجھے حنبل کے پاس جانا ہے، حنبل پلیز مجھے لے جاؤ حنبل... حنبل..." آئمہ خود اچھی خاصی بوکھلا گئی تھیں اسے اپنے ساتھ لپٹانے کی کوشش کرنے لگیں، مگر وہ چھوٹ چھوٹ جا رہی تھی۔

"مجھے حنبل کے پاس جانا ہے۔ پلیز... پلیز..."

"نہیں کچھ نہیں ہوا... وہ ٹھیک ہیں۔ اذلان انہیں لا رہا ہے۔" رندھی آواز میں کہتی اعشال آہستہ آہستہ آگے بڑھی تھی۔ "پلیز ایسے مت روئیں، میرے چاچو کو کچھ نہیں ہو سکتا۔" یہ پہلی بار تھا جب اعشال کو روائیبہ کے ساتھ پورے دل سے ہمدردی ہوئی تھی۔ اعشال اس کے کندھے سے لگ گئی وہ دونوں رو رہی تھیں جب زینب عقب سے پکاری۔

"بڑے صاحب آپ سب کو اندر بلا رہے ہیں۔" اسے کسی معاملے کا نہیں پتا تھا حیرت سے انہیں لپٹ کر روتے دیکھ رہی تھی۔ "عجیب ہی خردماغ لوگ ہیں، کبھی بات تک نہیں کرتے تو کبھی لپٹ کر رونے لگ جاتے ہیں۔"

آئمہ نے اسے سر سے "اچھا" کا اشارہ کیا وہ تینوں لاؤنج میں آ گئی تھیں۔ جہاں میرزکا بیٹھے تھے۔ تینوں کے چہرے اور آنکھیں دیکھ کر انہیں تشویش ہوئی۔ انہیں سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"پتا چل گیا ہے، تمہیں..." روائیبہ پھر سے سسکنے لگی۔ آئمہ نے اس کی پشت سہلاتے میرزکا کو "جی..." کہا تھا۔

"ہوا کیا ہے... کہاں ہے وہ... کیسا ہے...؟"

"کچھ نہیں، بس تھوڑی سی ہاتھ پر چوٹ لگی ہے۔" روائیبہ تیز "حنبل حنبل" دھڑکتے دل کے ساتھ میرزکا کو سن رہی تھی۔ اعشال نے اپنے آنسو روکتے بمشکل پوچھا تھا۔

"کیسے...؟"

"بیٹے وہ گاڑی سے نکل رہا تھا، ساتھ ہی کوئی لڑکا بائیک پر تیزی سے ٹکرا کر گزرا، اذلان بتا رہا تھا بائیک کی کوئی چیز ہاتھ پر لگی ہے، دو چار کٹ شٹ لگے ہیں ہم لوگ پریشان مت ہو، پٹی ہو گئی ہے، پہنچنے والے ہی ہوں گے۔"

ان دونوں کے قدم لاؤنج میں رکھتے ہی تینوں خواتین میکانکی انداز میں کھڑی ہو گئی تھیں۔ دیکھنے میں بے حد پریشان غم زدہ سی۔ روائیبہ کے چہرے پر پل بھر کے لیے نگاہ رکی بے حد سرخ چہرہ، گلابی نم آنکھیں۔ اس کے یک لخت کھڑے ہو کر آگے بڑھنے کے انداز سے لگتا تھا۔ وہ روتے ہوئے اس سے لپٹ جائے گی۔ سب کے بیچ میں اس کا یہ فعل کم از کم حنبل ذکا کو قطعاً اچھا نہ لگتا۔ وہ جوں ہی اس کے قریب ہوئی اس نے نرمی سے کہنی پکڑ کر غیر محسوس طریقے سے اسے ایک جانب کیا۔

"کیا ہو گیا آپ سب لوگوں کو، خیریت...؟" وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا ٹانگ پر ٹانگ چڑھالی۔ اس کا دایاں ہاتھ سفید پٹی میں بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ روائیبہ کی نگاہیں اس کے زخمی ہاتھ پر جمی تھیں۔ اپنے جبڑے سختی سے بھینچے، تیز تیز پلکیں جھپکتے آنسو روکنے کی کوشش میں سرخ پڑتی جا رہی تھی۔ اس کی ایسی شکل خود حنبل کے لیے خاصی تکلیف دہ تھی مگر وہ کمال طریقے سے نظرانداز کر رہا تھا۔ اعشال حنبل کے بالکل ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی اور کندھے پر سر ٹکاتے رونے لگی۔

"آپ اپنا خیال کیوں نہیں رکھتے، چاچو..."

"بیٹا کیا ہو گیا تمہیں۔" اعشال کے شانوں پر ہاتھ

پھیلاتے اسے اپنے قریب کرلیا۔ "تم لوگ تو ایسے رو رہے ہو' جیسے میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے ہیں۔" سنتے ہی روائیبہ نے سختی سے پلکیں موندیں' اعشال نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"اللہ نہ کرے چاچو آپ کو کبھی کچھ ہو۔" اس نے کہتے ہوئے پھر سے کندھے پر سر ٹکالیا۔ "میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔۔۔ پلیز اپنا خیال رکھا کریں۔"

"میں جانتا ہوں۔ میرے گھر والے مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔" کہتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے روائیبہ کو دیکھا تھا۔ وہ نم آنکھوں کو ادھر ادھر گھماتے بہت بے چین لگ رہی تھی۔ اس کا اپنی فکر میں بے قرار ہونا کم از کم حنبل کے اندر تک ان دیکھا سکون اتار رہا تھا۔

"اور تم نے جانے دیا' پکڑ کر دو لگائے نہیں اس لڑکے کے۔۔۔" آئمہ کو اس لڑکے پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"میں نے اسے کیا کہنا تھا' وہ خود بے چارہ بری طرح سے ٹکرایا تھا۔ اس کے تو بہت زیادہ چوٹیں لگی ہیں' ہم ہی اسے اٹھا کر اسپتال لے کر گئے تھے۔"

"اچھا ہوا لگیں۔۔۔" اس کی چوٹ کا سن کر یک لخت اعشال کو سکون آیا۔ "کیوں اندھا بن کر چلا رہا تھا۔"

"ایسے نہیں کہتے بیٹا۔" حنبل نے ہلکی سی سرزنش کی۔ "چھوٹے چھوٹے حادثات ہوتے رہتے ہیں سڑکوں پر' یہ اللہ کا کرم ہے کہ معمولی سا زخم آیا ہے' صرف دو اسٹیچ لگے ہیں' اگر پورا کٹ جاتا۔ پھر۔۔۔؟ اسٹیچ کا سن کر روائیبہ نے زخمی سانس کھینچی تھی۔ آئمہ نے تفکر سے کہا۔

"اسٹیچ لگا ہے۔۔۔؟"

"ظاہر ہے بلڈ روکنے کے لیے اسٹچنگ تو ہونی تھی۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا' مزید اس کی روندھی صورت قابل برداشت نہیں تھی۔ کمرے میں ہوتا تو تسلی دے دیتا۔

"میں اب آرام کروں گا' آپ لوگ بھی آرام کریں۔"

"کھانا۔۔۔؟" روائیبہ سے تو ایک لفظ بھی بولا نہیں جا رہا تھا آئمہ نے ہی پوچھا تھا۔ جواب اس کے بجائے ازلان نے خاصے شوخ انداز میں دیا تھا۔

"چاچو کی ایک پرانی گرل فرینڈ مل گئی تھی' اس نے کھلا کر بھیجا ہے۔" اس نے بھنوئیں اچکا کر اسے دیکھا تھا وہ کھلکھلا رہا تھا۔ اتنی دیر سے چھائے افسردہ ماحول کو ازلان ہی نارمل کر سکتا تھا۔ اس نے آرام سے کندھے اچکاتے کہا تھا۔

"مجھے تو وہ گرل ہی لگ رہا تھا' بالوں کی پونی بنا رکھی تھی۔"

ایم بی سی میں اس کا ایک پرانا کلاس فیلو کام کرتا تھا۔ خوب ٹپ ٹاپ' ایلیٹ کلاس کا' اس نے بہت اصرار سے انہیں کھانا کھلا کر بھیجا تھا۔ ازلان پر سے اس کی نگاہ روائیبہ پر گئی وہ ویسے ہی خاموش بیٹھی تھی۔ جیسے کچھ نہ سنا ہو۔ پھر وہ کمرے کی جانب بڑھ گیا اس نے اپنے پیچھے آئمہ کو زینب سے کہتے سنا تھا۔

"گرم دودھ میں ہلدی ڈال کر' حنبل کو دے کر آؤ۔۔۔"



وہ بیڈ پر نیم دراز تھا آنکھیں بند تھیں۔ ہلدی ملا دودھ ویسے ہی سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔ بہت دیر روائیبہ کا انتظار کرنے کے بعد کچھ دیر پہلے ہی اس کی آنکھ لگی تھی۔ وہ خواہ مخواہ بہت دیر لاؤنج میں بیٹھی اپنا موڈ بہتر کرنے کی کوشش میں ہلکان رہی۔

سب ایک ایک کر کے اٹھ گئے۔ آئمہ میگزین پڑھ رہی تھیں۔ وہ بھی ان کے پاس بیٹھی رہی وہ کوئی ایک آدھ بات کرلیتیں پھر میگزین میں کھو جاتیں۔ خاصی دیر بعد آئمہ نے ہی احساس دلایا تھا۔

"میں تو آج دن میں زیادہ سو گئی تھی' اس لیے نیند نہیں آرہی' تم جاؤ لیٹ جاؤ' حنبل بھی انتظار کر رہا ہوگا تمہارا۔۔۔"

وہ کسمساتے ہوئے اٹھی دروازے کی ناب گھما کر اندر آگئی۔ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے وہ ایسے نیم دراز تھا۔ جیسے ابھی ابھی آنکھ لگی ہو۔ اس کا دایاں ہاتھ بیڈ سے کچھ نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ آگے بڑھی۔ نرمی سے اس کا ہاتھ اٹھا کر بیڈ پر رکھا۔ حنبل کی فوراً" آنکھ کھل گئی تھی اس نے جمائی روکتے ہوئے اسے دیکھا پھر ذرا سا کھسک کر اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنادی۔ وہ بیٹھی، حنبل نے بازو اس کے گھٹنے پر ٹیک دیا اس کی نگاہ اس کے زخمی ہاتھ پر تھی۔ حنبل نیند سے بوجھل گلابی آنکھیں قدرے سکیڑے اسے تک رہا تھا۔ روائیبہ کا چہرہ آہستہ آہستہ سرخ ہوتے نم آلود ہونے لگا۔

"کیا ہو گیا یار' کیوں ایسے ری ایکٹ کر رہی ہو۔"

روائیبہ نے گلے میں اٹکی نمی گھونٹ کی صورت اندر انڈیلی پھیکی آواز میں کہا تھا۔

"حنبل میں تم سے بہت محبت کرنے لگی ہوں' مجھ میں دوبارہ کسی کو کھونے کا حوصلہ نہیں ہے' پلیز' اپنا خیال رکھا کریں۔" اس کی نرم پوریں کھردری پٹی پر سرک رہی تھیں۔ حنبل دھیما سا مسکرایا۔

"جس کے ساتھ پر خلوص دعائیں ہوں' اسے کچھ ہو سکتا ہے بھلا....."

"درد ہو رہا ہے؟" روائیبہ نے نگاہ ترچھی کیے اس کی آنکھوں میں جھانکا اس کی آنکھیں نفی میں مسکرائیں۔

"اب نہیں ہو رہا....." وہ کہنیوں پر وزن ڈال کر تھوڑا سا اوپر کو کھسک کر بیٹھ گیا۔ "اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان مت ہو جایا کرو۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرو۔"

"نہیں ہے مجھ میں ہمت..... پلیز مجھے چھوڑ کر جرمنی مت جاؤ..... میں نہیں رہ سکتی اکیلے۔" کئی دنوں سے اندر کھٹکتی فرمائش بالآخر اس کی زبان پر آگئی تھی۔ جس دن سے اس نے سنا تھا حنبل دو ماہ کے لیے جرمنی جا رہا ہے۔ اسے وسوسے ستانے لگے تھے۔ خواب میں ڈر کر آنکھ کھل جاتی تھی اور اب چھوٹے سے حادثے نے اس کی نفسیات کو بالکل توڑ موڑ دیا۔

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو' جیسے میں ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں' دو تین ماہ کی بات ہے' پتا بھی نہیں چلے گا....."

"تمہارے نزدیک دو' تین ماہ کم ہوتے ہیں.....؟"

"کم آن' یار....." اس کے متاسف لہجے پر حنبل نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ "میرڈ ہو تم' اپنے اندر میچورٹی پیدا کرو..... بزنس کے سلسلے میں مردوں کو بہت سی جگہ جانا پڑتا ہے اور جرمنی تو اب آنا جانا لگا رہے گا' اگر تم ایسے ہی ہلکان ہوتی رہو گی' پھر تو ہو گئے سارے کام....." اس کے نروٹھے پن پر حنبل نے پیار بھری خفگی سے دیکھا "چلو اب اٹھو' ادھر سے آکر لیٹو' مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ کہہ کر کروٹ بدل لیٹ گیا۔

حنبل اسے اپنے ساتھ ضرور لے جاتا اگر وہاں رہائش کا مسئلہ نہ ہوتا۔ ان کے فلیٹ سے فوڈ یونٹ خاصی دور تھا۔ پھر کام کے سلسلے میں سارا دن باہر گزر جاتا تھا۔ پیچھے کوئی ایمرجنسی ہو سکتی ہے' وہ اکیلی کیسے ہینڈل کرے گی۔ میرزکا اور آئمہ کا بھی یہی خیال تھا اسے سب کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اب روز روز تو عورتیں ساتھ ساتھ نہیں پھرتیں۔ جیسے جیسے اس کے جانے کے دن قریب آرہے تھے وہ خاموش ہوتی جارہی تھی۔ جس دن اس کے ہاتھ کے ٹانکے کھلے اگلے دن اس کی فلائٹ تھی۔

اس شام وہ جلد گھر آگیا تھا۔ وہ سب کے بیچ چپ چپ بیٹھی تھی۔ کھانا بھی برائے نام کھایا پھر خاموشی سے اٹھ کر پچھلے صحن کے برآمدے میں نکل آئی کچھ دیر بعد حنبل بھی ادھر آگیا تھا۔ وہ دائیں رخسار کو ہتھیلی پر ٹکائے ستاروں میں کچھ کھوج رہی تھی۔ وہ عقب سے بولا تھا۔

"خیریت..... یہاں کیوں آئیں.....؟"

"ویسے ہی....." اس نے رخ پھیرے بنا کہا تھا۔

حنبل نے کرسی کھینچ کر اس کے سامنے رکھی اور جم کر بیٹھ گیا۔ اس نے نگاہ ترچھی کر کے اسے دیکھا پھر آسمان دیکھنے لگی۔

"تمہیں کیا چیز ڈسٹرب کر رہی ہے.....؟"

وہ چلا کر جواب دینا چاہتی تھی۔ "تم..... پچھلے دو ماہ..... اگر یہی جانے کا سلسلہ چند ماہ پہلے ہوتا تو شاید اسے محسوس بھی نہ ہوتا بلکہ شکر کرتی سانسیں خشک کرنے والا کھڑوس چلا گیا" لیکن ان دو ماہ میں تم کیسے اتنے قریب آگئے کہ اب تمہارے جانے سے سانسیں خشک ہو رہی ہیں اور پوچھ رہے ہو ڈسٹرب..... ہونہہ....." اس کی خاموشی پر حنبل نے استفسار کیا۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے..... آواز نہیں آئی۔" اس نے تند نگاہ حنبل پر گرائی اور کاٹ دار لہجے میں بولی تھی۔

"مجھے کوئی چیز ڈسٹرب نہیں کر رہی، تمہیں جہاں جانا ہے جاؤ، جہاں رہنا ہے رہو اور صبح کا انتظار کیوں کر رہے ہو، ابھی چلے جاؤ، مجھے کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" آخری جملہ ادا کرتے آواز خود بخود دونی ہو گئی تھی اور حنبل کا جاندار قہقہہ چھوٹ گیا۔ بازو گھٹنوں پر سیدھے کرتے ہوئے کچھ آگے ہو کر بیٹھا۔

"اوہ تو یہ بات ہے....." جواباً روائیبہ نے خفگی سے گھورا تھا۔

"یار، تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے.....؟"

"زندگی پر نہیں ہے....." اس نے چبا کر کہا تھا۔

"مائی ڈیئر یہ جو زندگی اور موت ہے ناں، یہ خود ایک دوسرے کی بہت بڑی محافظ ہیں، ایک نے جہاں ختم ہونا ہے، دوسرے نے وہاں ہی آکر ملنا ہے، راستے، اسباب یہ خود واضح رکھتی ہیں..... ان کے لیے پریشان ہونا چھوڑ دو..... ہاں سروائیو کیسے کرنا ہے یا موت کے بعد کیا ہوگا اس کی فکر کرو....." اس نے اس کی بات بالکل توجہ سے نہیں سنی۔ وہ اسے ذومعنی دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں اگر تم، جرمنی کی حسیناؤں کی وجہ سے ڈسٹرب ہو تو یار مجھ غریب سے یہ ایک حسینہ نہیں سنبھالی جا رہی باقیوں کا اچار ڈالنا ہے....." اس کی کھا جانے والی نگاہوں پر وہ فوراً "اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا اچھا سوری..... یہاں سے اٹھو ٹھنڈ بڑھ رہی ہے۔" وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر کمرے میں لے گیا تھا۔

اس ساری رات ہوا کی خنکی میں ان دیکھا سناٹا رچا رہا تھا۔ حالانکہ تمام رات ان کے کمرے کی دیواروں نے ان کی محبت بھری سرگوشیاں سنی تھیں جس میں حنبل کے جذبے شامل تھے، روائیبہ کی مسکراہٹیں شامل تھیں اور بہت سی نصیحت شامل تھیں اپنا بہت خیال رکھنے کی اور بطور خاص حنبل نے کہا تھا۔

"چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان مت ہونا اور نہ ہی ر رو کر مجھے پریشان کرنا۔"

سورج کی تمازت ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ گرم راتیں برفانی ہواؤں کی چادر میں سمٹنے کو تھیں جب سرد ر کی یخ بستہ ہوائیں تن من پر برف ریزے برسانے ک آنا چاہتی تھیں۔ ان کی شدت سے بچانے والا سائبان جا رہا تھا۔ وہ اکیلے جانا نہیں چاہتا تھا مگر مجبور تھا۔ بہت حد تک اندر سے دکھی بھی تھا، مگر کسی پر اپنی یہ کمزوری ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اس کا مصمم ارادہ تھا جلد از جلد کام نپٹا کر آجائے گا اور اگر واقعی زیادہ دیر لگی تو اسے ضرو بلا لے گا۔ کیوں کہ وہ خود اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔



گیلے بال شانوں پر پھیلائے وہ بیڈ پر اکڑوں بیٹھی تھی گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ان پر ٹھوڑی ٹکائے یک ٹک اسے آئینے کے سامنے تیار ہوتا دیکھ رہی تھی اس نے بھی آئینے میں کئی بار اس پر اچٹتی نگاہ ڈالی مگر نظرانداز کرتا رہا۔ رسٹ واچ کلائی پر باندھی والٹ، پاسپورٹ، موبائل پاکٹ میں رکھے۔ ٹائی ناٹ درست کرتے ہوئے گردن کے گرد کلون چھڑکا۔ پھر کچھ اسپرے اس پر بھی کر دیا۔ اس نے "اونہوں" کرتے چہرہ ٹھوڑی سے اٹھالیا۔

"اللہ حافظ بھی نہیں کہوگی....." وہ خفگی بھری نگا سے دیکھتے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جلدی آجاؤ گے ناں....."

"ہاں، لیکن اس شرط پر، روؤگی نہیں، فون پر تنگ نہیں کروگی۔"

"چاچو دیر ہو جائے گی، آجائیں...." ازلان کی تیسری ہانک پر حنبل نے غصے سے دروازے کو دیکھا۔

"آؤ۔" اس کے شانوں کے گرد بازو پھیلائے اسے دروازے کی جانب لے کر بڑھا۔ سب سے فرداً "فرداً" ملنے اور خاص طور پر بھرجائی کو روائیبہ کا خیال رکھنے کا کہہ کر میرزکا سے ملا تھا۔

"پاپا اس کا خیال رکھنا بہت بونگی ہے یہ...."

"تم بے فکر رہو اپنے گھر میں ہے...."

میرزکا کی تھپکی پر وہ ان سے الگ ہوا۔ زینب کچن کی کھڑکی سے اسے جھانک رہی تھی اس کی شادی کے بعد اس نے اپنے دل کو بارہا سمجھایا تھا۔ نہ وہ اس کا تھا نہ ہو سکتا، لیکن پھر بھی روائیبہ آنکھوں میں گرم ریت کی طرح رڑکتی تھی۔ خارجی دروازے کے ساتھ لگی روائیبہ کی آنکھوں کی نمی اسے اپنے جلے دل پر ٹھنڈے چھینٹے کی طرح محسوس ہوئی۔

"چلو ہمیشہ کے لیے نہ سہی وقتی ہی سہی، پسند کی چیز دور ہو جائے کیسا دکھ ہوتا ہے، ذرا تمہیں بھی تو پتا چلے...."

"اللہ حافظ...." وہ روائیبہ کے قریب سے گزرتے ہوئے آہستگی سے بولا تھا صرف ایک نگاہ اٹھا کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے اور ناک بہت سرخ ہو رہے تھے۔ اپنی نگاہ بدل کر وہ تیزی سے گزر گیا۔

"حنبل....!" وہ اس کا بازو کھینچنے کو بڑھی آئمہ نے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

"پاگل...." انہوں نے اسے پیار بھری سرزنش کی۔ "مردوں کو پیچھے سے آواز نہیں دیتے" بدشگونی ہوتی ہے۔ اللہ خیر رکھے، جلد آجائے گا...."

انہوں نے زینب کو اشارے سے پانی لانے کو کہا تھا اور زینب کا جی چاہا آج اسے یخ برف پانی دے جیسے اس کے دل میں ٹھنڈ پڑی ہے ویسے ہی روائیبہ پی کر ٹھنڈی پڑ جائے، بالکل منجمد۔

خاکستری چناب سورج، چاند کے عکس سے اپنا تن بھرتا رہا، ان کی چمکتی کرنوں کو خود میں بھر کر اک سنہرے خواب میں روز کروٹ بدلتا۔ بہت سے مہاجر آبی پرندوں نے اس کے کناروں پر ڈیرے ڈال لیے۔ ان کے دیس میں سرد رتوں کا راج تھا زندگی بچانے کو گرم مرطوب پانی کی طرف بہتے چلے آئے۔ کہیں سردی منجمد کرتی ہے تو کہیں حرارت جھلسا دیتی ہے۔

✲ ✲ ✲

حنبل کو جرمنی گئے تقریباً "ایک ماہ سے اوپر ہو چکا تھا۔ یہ وقت جیسے روائیبہ نے گزارا وہ ہی جانتی تھی۔ اس کے چہرے کی رعنائی میں اچھا خاصا پھیکا پن آچکا تھا۔ کھاتی پیتی ہنستی بولتی تھی، مگر لہجے میں کھوکھلاہٹ بستی جا رہی تھی۔ حالانکہ آئمہ نے اس دوران اس کا بے حد خیال رکھا تاکہ حنبل کی دوری کا احساس نہ ہو، لیکن کسی دوسرے کی محبت اپنے کی کمی کب پوری کرتی ہے؟ حنبل ذکا بھی وہاں کی بے تحاشا مصروفیت کے باوجود اسے بھولا نہیں تھا۔ ایئر پورٹ پر پہنچتے ہی سب سے پہلے اسے فون کیا تھا جو اسے جہاز کا خدشہ تھا تاکہ وہ دور ہو اور پھر ہر روز کچھ وقت نکال کر خیریت پوچھ لیتا اور جب بھرجائی سے بات ہوتی وہ اس کی خوب تسلی کر دیتی تھیں۔

بہت دیر سے اس کا چنگھاڑتا موبائل بالآخر آئمہ بیگم نے اٹھایا۔ بے ڈھنگے گلدان جس پر کچھ کندہ تھا اس کی ڈی پی کے ساتھ "مائی ڈیر کالنگ" جگمگا رہا تھا۔ آئمہ نے مسکرا کر دیکھا اور فون کان کو لگالیا۔ رسمی حال احوال پوچھتے وہ گردن اچکا کر کچن کی جانب جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں جہاں سے کھٹ پٹ کے ساتھ روائیبہ اور ازلان کی شوخ آوازیں آرہی تھیں۔ صبح وہ میرزکا کے ساتھ ڈیرے پر گیا تھا۔ چند گھنٹوں میں ہی اس کا دل اوب گیا اور گھر کی راہ لی۔ یہاں آتے ہی ایک فرمائش۔

"مجھے چکن پاستا اور اورنج سوفلے چاہیے...."

آئمہ نے اسے اچھا خاصا لتاڑا تھا۔

"جو کچھ زینب بنا رہی ہے ناں، انسان بن کر کھالو۔" روائیبہ آئمہ کے برابر بیٹھی میگزین میں

کپڑوں کی ڈیزائننگ پر رائے دے رہی تھی۔ ہاتھ مار کر میگزین بند کرتے ہوئے اٹھی۔

"چلو میں بنا دیتی ہوں' تمہیں....." اسے ویسے ہی ازلان کا کام کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ نا صرف اس کا ہم مزاج تھا بلکہ ایک بہترین دوست کی طرح پیش آتا تھا اس سے تو شروع میں بھی کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ روائیبہ کے پیچھے کچن کی جانب بڑھتے ازلان کو آئمہ نے ڈپٹا تھا۔

"وہ چاچی ہے تمہاری' کوئی نوکرانی نہیں ہے' جو آرڈر دو بنا دے....." روائیبہ نے گردن پھیر کر انگلیوں سے بلانے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ بھی در گزر کر اس کے پیچھے ہولیا۔ آئمہ گہری نگاہوں سے انہیں دیکھتی کڑھتی رہیں اور جب حنبل کا فون آیا تو صاف کہہ دیا۔

"کیا بتاؤں کہاں ہے' تمہارا بھتیجا چاچی کا دیوانہ ہے اور چاچی بھتیجے کی' کھانا چاچی کے ساتھ' پینا چاچی کے ساتھ' کھیلنا چاچی کے ساتھ' نہ وہ ٹک کر بیٹھتا' نہ وہ ٹکنے والی....." آئمہ کا خفا لہجہ سن کر یقیناً" اس نے ازلان کے فارم ہاؤس پر جانے کا پوچھا تھا کیوں کہ وہ جواباً" کہہ رہی تھیں۔

"ہاں' ہاں جاتا ہے' آج بھی کافی دیر سے ڈیرے گیا ہوا تھا' اب آیا ہے تو بس چاچی کا جادو چڑھ گیا..... ابھی بات کرواتی ہوں اس سے....." انہوں نے زور سے زینب کو آواز دی تھی۔

"بی بی کو بلاؤ' حنبل کا فون ہے....." روائیبہ سوفلے کا باؤل پکڑے کچن سے باہر نکل رہی تھی سنتے ہی باؤل ازلان کو تھمایا۔

"پکڑو اسے....." وہ تیزی سے فون کی جانب بڑھی تھی۔ فون پکڑتے ہوئے لمحے کے دسویں حصے میں اسے اپنا دماغ سن سا محسوس ہوا پل بھر کے لیے آنکھیں دھندلائی تھیں۔ پھر اپنے سر کو جھٹک کر وہم پر قابو پاتے اس نے فون پکڑا وہیں۔ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"ہیلو....."

"وعلیکم ہیلو..... بڑے جادو شادو کرنے آگئے ہیں تمہیں' کتنی دیر سے فون کر رہا ہوں' کہاں غائب تھیں۔"

"کہیں نہیں....." وہ مسکرائی۔ اس کی نگاہ سامنے ازلان پر ٹکی تھی مزے سے سوفلے کا چمچہ بھر بھر منہ میں ڈالتے آئمہ کو چڑا رہا تھا اور آئمہ اسے گھرکتی ہی کہہ رہی تھیں۔

"اب اسی سے ہی بنوانا' تمہیں کوئی' کچھ نہیں بنا کر دے گا....."

"ارے کہاں غائب ہو گئیں۔" اس کی خاموشی پر حنبل کی آواز ابھری۔

"ہاں' ہاں سن رہی ہوں....." وہ سٹپٹا گئی۔ وہ اس کی مصروفیات پوچھتے ہوئے یقیناً" کچھ ایسا کہہ رہا تھا جس سے اس کے چہرے کے رنگ سرخی میں ڈھلنے لگے۔ وہ چند پل وہاں ٹکی۔ پھر "ہوں ہاں" کرتے اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھی تھی آئمہ دیر تلک اس کی پشت کو دیکھتیں اور ازلان آئمہ کو۔



وہ آج سر شام ہی گھر واپس چلی گئی تھی۔ بہت عرصے سے وہ دن رات حویلی میں ہی رہ رہی تھی۔ کئی کئی دن کے بعد گھر کا چکر لگاتی۔ آج خالہ گلزاری بطور خاص اس کی منتیں کر کے گئی تھی۔ "زینب تجھے رب کا واسطہ آج جلدی گھر آجائیو (آجانا)۔"

زینب کے ماتھے کی تیوری سے اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ اسے ماں کی بات ناگوار لگی۔ اور یقیناً" وہ آج بھی نہیں آئے گی۔ تب ہی خالہ گلزاری نے آئمہ سے زینب کو سمجھانے کے لیے کہا تھا۔ آئمہ نے خالہ کو "تم فکر نہیں کرو' میں بھیج دوں گی....." کہہ کر ٹال دیا جب زینب ان کے کندھے دبانے کے لیے پیچھے کھڑی تھی آئمہ نے بہت آرام سے اسے کہا تھا۔

"زینب تو ہر معاملے میں بہت اچھی ہے' پھر رشتے پر آکر کیوں ماں باپ کی زندگی عذاب کر رہی ہے وہ مرنے سے پہلے تیرے فرض سے فارغ ہو جائیں

اچھا نہیں ہے۔"

لفظ "مرنے" پر پل بھر کے لیے روائیبہ کی آنکھیں بند ہوئیں۔ منہ کھل گیا۔ اسے حیرت تھی کوئی کیسے اس کے منہ پر اس کے ماں باپ کے مرنے کی بات کرسکتا ہے' اسے زینب پر بھی حیرت ہوئی وہ برداشت کیے آرام سے کندھے ہی دبائے جارہی ہے۔ اور آئمہ ابھی بھی کہہ رہی تھیں۔

"دیکھ اگر تجھے کوئی پسند ہے' مجھے بتادے' اور اگر تیری ماں کو پتا ہے' پھر بھی نہیں مان رہی' تو میں اسے منالوں گی..... حنبل کو بہت اچھا قائل کرنا آتا ہے' وہ بات کرے گا' خالہ گلزاری سے....." حنبل کے نام پر جہاں روائیبہ کے رخساروں پر خون دوڑ گیا وہاں زینب نے خاموش آہ بھری سر مزید جھکالیا۔

"زینب تم واقعی کسی کو پسند کرتی ہو' مجھے بتاؤ..... ایم یور فرینڈ۔" روائیبہ مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

"اگر تجھے بتادیا' ناں..... تیری پسند کو آگ لگ جائے گی....." اس نے ایک پر سوچ نگاہ روائیبہ پر اٹھائی پھر کندھے زور زور سے دبانے لگی۔

"آہستہ دبا۔ توڑے گی....." آئمہ نے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ مارا۔ اعشال قدرے فاصلے پر بیٹھی ڈرامہ دیکھتے ہوئے ان کی فضول بحث پر تنگ ہورہی تھی۔ اس نے استہزا میں نگاہ اونچی کرکے زینب کو دیکھا۔

"کبھی پسند سے بھی پوچھا ہے' اسے تم پسند ہو' یا نہیں؟ جیسے تم ہر کسی میں نقص نکالتی ہو' تم میں بھی تو کوئی نکالتا ہوگا....." زینب نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گھٹی آواز میں بولی تھی۔

"آج چلی جاؤں گی' جلدی....." اور واقعی ہی وہ وقت پر گھر پہنچ گئی تھی۔ خالہ گلزاری کی بہن آج پھر رسم کے ساز و سامان کے ساتھ آئی بیٹھی تھی۔ اس دن کی بدمزگی کے بعد سب نے زینب کو خوب لعن طعن کی۔ پھر اکٹھے ہوکر بہن کی طرف معذرت کرنے گئے تھے۔ تب تو زینب کو بے حد برا لگا تھا اور رشتے کے لیے کسی صورت بھی راضی نہیں ہورہی تھی۔ بلکہ گھر سے بھاگ جانے' زہر کھالینے جیسی دھمکیاں دینے لگی۔ لیکن اب چند مہینوں سے اس کے مزاج میں فرق آگیا تھا۔ جب اس نے روائیبہ اور حنبل تعلقات میں آئے روز خوشگوار تبدیلی محسوس کی' اسے اپنی حیثیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔

"جب حنبل مقدر میں لکھا ہی نہیں پھر کوئی ہو نہ ہو کیا فرق پڑتا ہے۔" اس سے پہلے کہ حنبل اسے سمجھائے اسے خود ہی سمجھ آگئی۔ کچے اور پکے گھروں میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ موسموں کی شدت سے کچے گھر چٹختے ہیں' پکے تو ویسے ہی رہتے ہیں پھر کیوں اپنے ماں باپ کو تنگ کرکے ان کا کچا گھر چٹخائے۔ کچے کمرے میں بچھی چارپائیوں پر خالہ کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ خالہ نے واری صدقے جاتے اسے لال دوپٹا اوڑھایا اور کانچ کی چوڑیاں ہاتھ میں ڈال دیں۔ صحن میں بچھی چارپائیوں پر جہاں مرد بیٹھے تھے قمرالدین بھی ان میں تھا۔ وہ دور سے ہی تیکھی نگاہوں سے اس کے جھکے سر کو دیکھے جارہا تھا۔



سردیوں کی ٹھٹھرتی شامیں' کالے بادلوں کی میت میں مست ہورہی تھیں۔ بے بس پنچھی چھپنے کے لیے آشیانہ چاہتے تھے۔ سرد ممالک سے آئے مہاجر پرندوں کے لیے اب یہ ٹھکانے بھی دشوار ہونے لگے۔ یخ ہواؤں کا گزر درختوں میں ایسی سنسناہٹ پیدا کرتا وہ اندر تک کانپ جاتی۔ تنہائی سے اسے پہلے ہی خوف آتا تھا۔ کچھ سرد موسم نے مزاج میں قنوطیت بھرنی شروع کردی۔ گھبراہٹ سے اس کی بھوک پیاس سب اڑتی جارہی تھی۔ رات کھانے کے چند نوالے بمشکل کھائے تھے وہ ہی اسے بہت بھاری لگ رہے تھے۔ کمرے میں ٹہلتے طبیعت بہتر کرنے کی کوشش میں تھی۔ آج بہت دنوں بعد ممی ڈیڈی بے حد شدت سے یاد آرہے تھے۔ گھبراہٹ سے اس کا دل چاہا وہ رونے لگ جائے۔ پھر اس نے حنبل کو فون کرنے کے ارادے سے اپنا سیل اٹھایا نمبر ڈائل کرتے ہوئے

کھڑکی کھول کر کھڑی ہوگئی۔ برآمدے کے ستونوں کے ساتھ لگی تمام لائٹس آن تھیں۔

وہ ماربل کے اسٹیپ پر بیٹھا' پوری محویت سے بانسری بجارہا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے ساز میں خاصا نکھار آگیا تھا۔ روائیبہ کی ستائشی نظریں اس پر ٹک گئی تھیں۔

"زندگی سے کتنا بھرپور ہے یہ..... لمحوں کو انجوائے کرنے والا' من کا موجی..... ایک حنبل ہے..... احساسات سے عاری' سوائے بزنس' پیسے کے کچھ یاد ہی نہیں....." غیرارادی ایک شکوہ دماغ میں کلبلایا تھا۔ اس کے کانٹیکٹ پر معمولی سے ٹون جانے گئی بھی تھی یا نہیں اس نے رابطہ منقطع کیا۔ سیل جرسی کی جیب میں رکھ' شال لپیٹتی باہر نکلی۔ سارا گھر سناٹے میں ڈوبا تھا۔ لاؤنج میں چھوٹے چھوٹے نائٹ بلب جل رہے تھے۔ البتہ برآمدے سے خاصی روشنی اندر آرہی تھی۔ وہ بنا آہٹ کے بلی کی چال چلتی اس کے عقب پر کھڑی ہوئی۔

"ہاؤ....."

گہرے سناٹے میں ابھرتی اس کی "ہاؤ" ازلان اچھا خاصا اچھلا ہاتھ سے بانسری بھی گر گئی۔ منہ کھول کر پہلے اس نے اپنا تنفس درست کیا پھر تیز نگاہوں سے چاچی کو گھورا تھا۔ وہ "ڈر گئے' ڈر گئے" کہتے بے تحاشا ہنستے رکوع کی صورت آگے کو دہری ہوتی چلی گئی۔ اس کے بھورے بال آگے کو پھسل کر شانوں پر جھول گئے۔ اس کے ہاتھ اپنے گھٹنوں پر تھے اسی حالت میں ہنستے ہوئے سر اٹھا کر ازلان کو دیکھا تھا۔ وہ اچھا خاصا کچکچا رہا تھا اگر اس وقت اعشال ہوتی تو یقیناً" وہ اس کے آگے کو جھولتے بال پکڑ کر نوچ دیتا یا بانسری اس کے نکوستے دانتوں پر مارتا مگر اس وقت کرختگی سے کہا تھا۔

"شرم تو نہیں آتی' اگر میرا دل بند ہوجاتا..... تو.....؟"

"اچھا۔ سوری' سوری۔" اس نے سیدھے ہوتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر معافی مانگی "ایکچوئلی میرا دل نہیں لگ رہا تھا' بور ہورہی تھی۔"

"اسی لیے بدروح بن کر چکرانے کے لیے آگئیں..... ہاں....." وہ ابھی تک گھور رہا تھا۔

"اچھا سوری' ناں....." وہ اس کے مقابل پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی ہاتھ گود میں رکھ لیے "چلو اب سناؤ؟"

"کیوں' نوکر ہوں تمہارا..... جاؤ میں نہیں سناتا' مجھے غصہ آگیا ہے۔" اس کے خفگی سے موڑے چہرے کو روائیبہ نے ہاتھ سے اپنی جانب کیا "بس ناں' سوری۔ سنادو..... پلیز۔"

"شرط پر۔"

"کیا۔؟"

"انعام کیا دوگی۔؟"

"چاکلیٹ۔"

"نہیں۔"

"اچھا جو تم کہو گے۔"

"پرامس۔"

اس نے قطعیت سے کہا تھا۔ "پکا پرامس۔ اب سناؤ۔"

تلی سے بانسری سے سر نکلتے ہی اس کی جیب میں تھرتھراہٹ ہوئی تھی۔ روشن اسکرین دیکھ کر اس کا چہرہ بھی دمک گیا تھا۔ اس نے مسکراتی آنکھیں پھیلاتے ہوئے گلابی ہونٹ اوپر کے دانتوں میں دبایا۔

"حنبل۔" اس نے کال ریسیو کرتے ازلان کو بتایا تھا۔

"ہاں خیریت تم نے کال کی تھی۔" اس کے چھوٹتے ساتھ پوچھنے پر وہ زور سے ہنسی۔

"ہاں' ہاں خیریت' ویسے ہی باتیں کرنے کو دل کر رہا تھا۔"

"اچھا۔ تو کرو۔" اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ازلان نے جان بوجھ کر تنگ کرنے کی نیت سے اسپیکر کے قریب آکر زور سے سر لگایا تھا۔

"پیچھے ہٹو' مجھے بات کرنے دو۔" روائیبہ نے اپنا چہرہ پیچھے کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اسے پرے دھکیلا۔

"کون ہے' کسے کہہ رہی ہو۔؟" حنبل کی آواز میں

استعجاب تھا۔

"کس نے ہونا ہے..... ایک ہی پاگل ہے....." وہ مسلسل ازلان کو گھرک رہی تھی۔

"اس وقت!!!" حنبل نے اپنی کلائی پر وقت دیکھا تھا۔ "وہاں تو گیارہ بارہ ہو رہے ہوں گے" وہ کس کام سے آیا ہے اس وقت؟" اس کا استعجاب کچھ کاٹ دار تھا لیکن اس کی سمجھ میں ہرگز نہیں آیا۔

"وہ نہیں آیا میں آئی ہوں۔ باہر لان میں۔"

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے' اکیلی اس وقت باہر کیا کام ہے۔ چلو اندر اپنے کمرے میں..... اٹھو۔"

"اکیلی کہاں ہوں....." وہ کسمسا کر سمٹی تھی "ازلان ہے نا باہر..... مجھے نیند نہیں آرہی....."

"ازلان کی بچی۔" وہ درشتی سے چبا کر بولا تھا۔ "میں نے منع کیا تھا ناں' رات باہر مت نکلنا۔ تمہیں خود عقل نہیں ہے..... اٹھو اب....." وہ لمحے توقف سے حکمیہ بولا تھا۔ "اٹھی ہو یا نہیں۔"

"اٹھ رہی ہوں....." وہ بے زاریت سے منہ بناتے اٹھنے لگی لمحے کے لیے اس نے کانوں میں سائیں سائیں محسوس کی' بدن نم اور ٹھنڈا پھر فوراً ٹھیک ہوگئی تھی۔

"حنبل آپ کو کیا مسئلہ ہے' میرا اکیلے دل گھبرا رہا تھا۔ بھرجائی بھی سوگئی ہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوگئی تھی۔ ازلان نے پیچھے ناگوار سامنہ بنایا تھا۔ زندگی میں پہلا مداح ملا وہ بغیر سراہے کیسے جاسکتا ہے۔

"ہاں اور باہر آسیب ہیں' پکڑلیں گے تمہیں' سمجھیں۔" حنبل اسے ابھی تک ڈپٹ رہا تھا۔ "اب اندر آئی ہو یا نہیں۔؟"

"آگئی ہوں یار....." وہ بیڈ پر ابھی آلتی پالتی مارے بیٹھی ہی تھی کہ اسے کھڑکی کے باریک پردے پر کوئی سایہ گزرتا محسوس ہوا وہ آنکھیں سکیڑے ادھر ہی متوجہ تھی۔

"ہاں اب بتاؤ' کیا باتیں کرنا تھیں۔" دفعتاً دروازے پر ناک ہوئی۔ وہ کچھ چونکی۔

"ہاں۔ کچھ نہیں۔ اب نیند آگئی ہے۔" اسے ٹالتے ہوئے فون بند کیا اور دروازہ کھول دیا تھا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے وہم جان کر سر جھٹکا۔ دروازہ بند کرکے مڑی ہی تھی کہ پھر سے دستک ہوئی۔ اب کے دستک آہستہ آہستہ مگر مسلسل ہو رہی تھی۔ اس نے بہت آہستگی سے لاک کھولا۔ اور دم بخود رہ گئی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

سحر ش فاطمہ

ٹوٹے خواب کی کرچیاں

''زبیدہ کہاں ہو بھئی؟'' مولوی اکرام علوی مسجد سے لوٹتے وقت پھل خرید کر اپنے گھر پہنچے تو اپنی بیگم کو آواز دینے لگے۔

چپلیں اتار کر انہوں نے صحن میں رکھے پانی کے گھڑے کے پاس رکھے اسٹیل کے گلاس کو اٹھایا اور پانی بھرا۔ کندھے پہ چھوٹا سا کپڑا ہمہ وقت موجود ہوتا تھا۔ گرمی اس قدر تھی کہ پانی پی کر بھی پیاس نہیں بجھ رہی تھی۔

''کہاں چلی گئی ہیں یہ زبیدہ بھی..!''

مولوی صاحب پاس ہی رکھے چارپائی پہ بیٹھ گئے، اچانک سے انہیں آوازیں آئیں۔

''کہا بھی تھا ناں کہ بابا کے آنے سے پہلے گھر آنا ہوتا ہے لیکن تم تو سنتی ہی نہیں ہو اب تمہارے بابا آگئے ہوں گے ڈانٹ مجھے ہی پڑے گی''

زبیدہ جلدی جلدی بولتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئی تو سامنے مولوی صاحب کو بیٹھا پایا

''آ..آپ؟ بہت جلدی نہیں آگئے؟'' زبیدہ نے پریشان کن چہرے پہ زبردستی مسکراہٹ لا کر سوال کیا

''میں کب سے آیا ہوا ہوں آپ دونوں کہاں تھیں؟'' اور یہ شہلا کے کپڑوں پہ مٹی کیوں لگی ہوئی ہے؟''

شہلا گھبرا گئی۔

''وہ میں اصل میں یہ پاس والی گلی ہے ناں جہاں کوثر رہتی ہے میری دور پرے کی رشتے دار بس وہیں گئی تھی اب بچی وہاں بکری کے بچوں سے کھیلنے لگ گئی میں نے روکا بھی نہیں کہ بھلے کھیلتی رہے بس اسی لیے کپڑے خراب ہوگئے اور ہمیں دیر بھی ہوگئی''

زبیدہ نے وضاحت دے کر گہری سانس لی

''ٹھیک ہے ان کے کپڑے بدلوائیں اور میرے لئے سکنجبین بنائیں میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں''

مولوی صاحب کی بات سن کر زبیدہ نے سر اثبات میں ہلایا اور چھوٹی سی شہلا کو لے کر مشترکہ کمرے میں چلی گئی۔

''اماں آپ نے بابا سے جھوٹ کیوں بولا؟'' وہ دونوں ہاتھ کمر پہ جما کر زبیدہ کی طرف متوجہ ہو کر ایک خاص انداز میں دیکھ کر بولی۔

''بس چپ کر! ایک تو تمہاری وجہ سے میں پھنس جاتی ہوں اور تم مجھے ہی آنکھیں دکھا کر سوال پوچھ رہی ہو؟''

''میں نے تو بس ایک سوال کیا ہے مجھے حیرانی ہو رہی ہے کہ آپ نے جھوٹ کیوں بولا، بتا دیتیں ناں بابا کو سب کچھ؟'' وہ جب پریشان ہوتی یا غصہ تو اُس کا اندازِ گفتگو یہی ہوتا تھا۔

''تم بس چپ رہو زیادہ ٹرٹر کرنے کی ضرورت نہیں'' شہلا کے کپڑے تبدیل کروا کر اچھے سے منہ دھلوا کر پڑھائی سے لگا دیا اور خود کچن کی جانب چلی گئی۔ مولوی اکرام علوی کا یہ چھوٹا سا گھر جس میں دو کمرے ایک کچن اور صحن ہی تھا، شہلا چھوٹی تھی تو ساتھ سلاتے تھے۔

☆☆☆

شہلا جس متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی وہاں

لڑکیوں کو پڑھانا تو گناہ نہیں تھا البتہ ایک معقول سی پڑھائی کے بعد دینی تعلیمات دی جاتی تھیں تا کہ انہیں پڑھنا لکھنا بھی آئے اور سمجھ بوجھ بھی۔

شہلا کی عمر کوئی زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن اُسے باہر گلیوں میں کھیلنے کی اجازت نہیں تھی پھر بھلے وہ گھر میں ہی کھیلے، اپنی سہیلیوں کو بلوائے، ماں کی نگرانی میں کھیلے لیکن باہر نہ جائے۔

لیکن یہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ جس میں بس کھیلنے کا دل کرتا ہے وہ بھی سب کے ساتھ، عمر یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کس کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ بس عمر کو تو کھیلنا ہے اپنے آپ کو خوش رکھنا ہے۔ یہ وہ معصوم سی خوشی ہوتی ہے جو اُس وقت ایسی خواہش لگتی ہے کہ بس یہ مل گیا تو سب کچھ مل گیا لیکن جب عمر بڑی ہو جاتی ہے تو یہی خواہش زحمت لگنے لگتی ہے۔

☆☆☆

باہر گلیوں میں شور و غل ہو رہا تھا۔ شہلا بار بار نظریں اٹھا اٹھا کر آدھ کھلے دروازے کی اوٹ سے باہر جھانکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔



''شہلا۔ اپنا دھیان پڑھائی پہ لگاؤ تو زیادہ اچھا ہوگا''
زبیدہ اُسی کے ساتھ بیٹھی مٹر کے دانے چھیل رہی تھی۔
شہلا نے بے زاری سے نظریں جھکائیں اور پینسل سے آڑی ترچھی لکیریں لگانے لگی۔
''اماں..''
''ہاں کیا ہوا؟''
''مجھے بھی باہر جانا ہے کھیلنا ہے سب کے ساتھ''
شہلا نے ساری معصومیت چہرے پہ لا کر کہا۔
''بیٹا......'' زبیدہ نے لمبی سانس خارج کی۔
''آپ کو اپنے بابا کا پتا ہے ناں؟ میں ایسے باہر نہیں بھیج سکتی۔ مجھے بھی باہر جانا ہوگا آپ کے ساتھ اور اتنے کام ہیں گھر میں''
''مجھے اُس دن کی طرح کرکٹ کھیلنی ہے۔ اُس دن بھی تو آپ نے بابا سے جھوٹ بولا تھا ناں......''
شہلا کی بات سن کر زبیدہ کو جھٹکا لگا۔
''چپ..کہا ہے ناں یہ بات نہ کیا کرو۔ کرکٹ کھیلنے کا سوچنا بھی مت وہ بھی باہر جا کر۔ اتنا ہی شوق ہے ناں میں بابا سے کہہ دوں گی وہ تمہارے ساتھ کھیل لیں گے''
''لیکن اُس دن بھی تو آپ نے مجھے کھیلنے دیا تھا ناں''
شہلا نے للچائی نظروں سے دروازے کو دیکھا۔
''تب میں ساتھ تھی۔ ابھی مجھے بہت کام ہیں مجھے تنگ مت کرو''
''میں بس ایک باری لوں گی.......... اگر میں اُس ایک باری میں ہی آؤٹ ہوگئی ناں تو پھر میں مزید نہیں کہوں گی کھیلنے کو میں بس گھر آ جاؤں گی ابھی تو کھیلنے دیں''
''کیوں ضد کر رہی ہو؟ جب بابا نے کہا ہے تو؟ میں اُن سے کہہ دوں گی وہ تمہارے شوق کی خاطر تمہارے ساتھ گھر پر ہی کھیل لیں گے بس؟''
زبیدہ اپنی جانب سے کوشش کر رہی تھی لیکن شہلا مان کے ہی نہیں دے رہی تھی......
''مجھے باہر جا کر کھیلنا ہے ناں گھر پہ نہیں...... مجھے سب کے ساتھ کھیلنا ہے باہر'' اداس چہرے کے ساتھ شہلا نے کہا تو زبیدہ نے لمبی سانس لی......
''ٹھیک ہے......بس ایک بار کھیلو گی......اور پھر ضد نہیں کرو گی''
شہلا کو جیسے ہی باہر جا کر کھیلنے کا عندیہ ملا اُس کی باچھیں کھل گئیں......
''پکا اماں''
''اور ہاں سر پر دوپٹا اچھے سے باندھو کھیلتے ہوئے سرکنا نہیں چاہیے اور میں بھی ساتھ چلوں گی۔''
شہلا اسی میں خوش تھی کہ باہر جا کر کھیلنے کا موقع مل رہا ہے ایسے میں زبیدہ کی ہر بات مان بھی لے تب بھی اُسے فرق نہیں پڑنا تھا......
وہ دوپٹا اچھے سے باندھ کر خوشی خوشی باہر نکلی جہاں میدان میں لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے دوسری جانب لڑکیاں اپنے کچھ مخصوص کھیلوں میں مصروف تھیں......
زبیدہ نے جا کر اُن لڑکوں سے بات کی اور اجازت طلب کی پہلے تو وہ لوگ نہ مانے کہ بھلا ایک لڑکی وہ بھی چھوٹی سی ہمارا مقابلہ کرے گی؟ پہلے آپس میں چہ مگوئیاں کیں لیکن پھر یہ لوگ مان گئے اور پہلی باری شہلا کو ہی دی...... اُس نے بلا سنبھالا اور پر جوش انداز میں سامنے سے آتی گیند کا استقبال کیا......
گیند کے آتے ہی بلے کو ایسا گھمایا کہ گیند کافی دور چلی گئی......
جو لڑکا گیند پھینک رہا تھا اُسے امید نہ تھی کہ یہ دھان پان سی لڑکی پہلی گیند کو کھیل لے گی......
''ابھی تو ہلکے رفتار سے گیند پھینکی تھی تبھی اچھا کھیل لیا اب دیکھنا تیزی سے پھینکوں گا''
شہلا کو بس کھیلنے سے مطلب تھا......اُس لڑکے نے جینز سے گیند کو رگڑا اور پوری قوت سے گیند پھینکی شہلا نے بلا گھمایا اِس بار بھی گیند یہ جا وہ جا..........
زبیدہ نے خوب تالیاں بجائیں...... تیسری گیند پہ اُس لڑکے نے رفتار تو ویسی ہی رکھی لیکن آخری وقت میں سوئنگ بال کر دیا جس سے شاید شہلا ناواقف تھی

اور بلے کو گھمایا لیکن بال پیچھے کھڑے لڑکے کے پاس آ گئی......
اینٹوں سے بنی وکٹ پہ گیند مار کر پیچھے کھڑے لڑکے نے کہا۔
''آؤٹ ہے''
''ارے ایسے کیسے آؤٹ؟ شہلا تو یہیں کھڑی ہے کون سا اِس نے رنز لینے کے لیے بھاگنا شروع کیا تھا کہ آؤٹ کر دیا؟''
''خالہ ہمارے گیم کا الگ ہی اصول ہے...... جو وکٹ پہ کھڑا ہے وہ جب چاہے آؤٹ کر سکتا ہے''
اُس وکٹ والے لڑکے نے ہی جواب دیا۔
''بڑا عجیب اصول ہے''
''یہی نہیں خالہ جو کھلاڑی آؤٹ ہوتا ہے پھر وہی گیند کی باری لیتا ہے اور جس نے آؤٹ کیا ہوتا ہے وہ بلا سنبھالتا ہے''
اب یہ بھی انہی کا بنایا ہوا کوئی اصول تھا جس کی معلومات یہی لڑکے دے رہے تھے......
شہلا کو اِس سے غرض نہ تھی کہ کیا ہوا کیسے ہوا بس اُس نے کھیلا کافی تھا......
اب باری شہلا کی تھی گیند پھینکنے کی اور جس لڑکے نے آؤٹ کیا تھا وہ بلے کے ساتھ پہنچ گیا......
''ہونہہ اِس چھٹکی کو میں نے تین ہی گیند میں آؤٹ کر دیا یہ مجھے کیا کرے گی؟''
وہ لڑکا اپنی ہی سوچ میں تھا جب کہ شہلا نے ایک بار پھر سے اپنا دوپٹا کس کے باندھا...... گرمی بے حد تھی دھوپ سے پسینے بھی بہہ رہے تھے سب کے لیکن کھیل کی تو کیا ہی بات تھی۔
اب گیند شہلا کے ہاتھ میں تھی...... اور جیسے ہی اُس نے تیز رفتاری گیند اچھالی اُس لڑکے نے اپنے بلے کو گھمایا اور گیند شہلا کے مقابلے کافی دور گئی......
اب دوسری باری تھی گیند پھینکنے کی...... اُس نے آنکھیں بند کیں اور کھول کر گیند کو دیکھا پھر اسی قوت اور رفتار سے گیند پھینکنے لگی تھی لیکن تھوڑا اُس نے انداز بدل دیا ایسے میں بلے باز نے بلا گھمایا تو لیکن گیند خود ہی وکٹ پہ لگ گئی۔
''آؤٹ...... آؤٹ'' زبیدہ چلائی......
وکٹ والا لڑکا بوکھلایا لیکن اُس نے بھی آؤٹ ہونے کا ہی عندیہ دیا...... شہلا بھاگتی ہوئی خوشی خوشی زبیدہ کے پاس گئی۔
''دیکھا دیکھا آپ نے اماں...... اُس نے مجھے تین گیندوں میں ہرایا تھا میں نے دو میں ہی ہرا دیا''
''جی میرا بیٹا میں نے دیکھا مجھے تو پتا ہی نہیں تھا تم اِتنا اچھا بھی کھیل لیتی ہو'' زبیدہ اُس کی بلائیں لے رہی تھی اور ساتھ ہی ماتھے پہ پیار کیا......
لڑکے اب ہنس رہے تھے اور ایک ہی فقرہ اچھال رہے تھے۔
''لڑکی سے ہار گیا''
جہاں ایک طرف خاموشی تھی تو دوسری طرف ہنسی مذاق بھی ہو رہا تھا تو تیسری جانب وہ لڑکیاں جو اپنے ہی کھیل میں تھیں اُن میں سے ایک لڑکی نے آ کر مبارک باد دی......
''مبارک ہو بھئی ہمیں بھی تو سکھاؤ کیسے کھیلتے ہیں اتنا اچھا''
''ارے نہیں نہیں یہ تو بس ایسے ہی شوق میں نکل آئی تھی اِسے باقاعدہ کھیلنا نہیں آتا بس یونہی''
زبیدہ اب کیا جواب دیتی جو وہ ہاں کر دیتی تو مولوی صاحب کا ڈر لگ جاتا۔
''کیوں خالہ اتنا اچھا ـــ تو کھیلا اِس نے، اور جیسا اِسے آتا ہمیں بھی یہی سکھا دے'' اُس لڑکی نے التجا بھری نظروں سے کہا۔
''اصل میں مولوی صاحب کو پسند نہیں یوں باہر کھیلنا لیکن میں اُن سے پوچھ کر بتا دوں گی...... ٹھیک ہے؟''
''چلیں ٹھیک ہے''
جہاں پہلے وہ کسی لڑکی کا کرکٹ کھیل کر جیت کر خوش ہوئیں وہیں دوسری بات سن کر اداس لیکن تیسری سے ایک امید سی بندھ گئی تھی......
شہلا اور زبیدہ گھر چلی گئیں......

وہ ابھی گھر پہنچی ہی تھیں فوراً کپڑے تبدیل کیے اور اپنے اپنے کاموں میں جُت گئیں......

"کہاں ہو دونوں زبیدہ، شہلا؟ شرم نام کی کوئی چیز نہیں تم دونوں میں.........." مولوی صاحب کی گرجتی ہوئی آواز آئی......شہلا کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے......

"جی جی..............کیا ہوا؟"

زبیدہ اور شہلا دونوں ہی صحن میں آ گئیں۔

"کیا ہوا؟ مجھ سے پوچھ رہی ہو کیا ہوا؟ شرم تو نہ آئی بیٹی کو اُن لڑکوں کے بیچ کھلاتے ہوئے؟"

مولوی صاحب گھر کی جانب جا رہے تھے تب ہی محلے کے اک حضرت نے انہیں آنکھوں دیکھا حال گوش گزار کر دیا......

"بچی ضد کر رہی تھی میں کیا......"

"میں کیا ہاں؟ میں نے جب منع کیا ہوا تھا کہ باہر بچی کو نہیں بھیجنا ہے پھر بھی؟"

مولوی صاحب بہت طیش میں آ چکے تھے

"میں بھی تو باہر تھی ناں شہلا کے ساتھ اور اتنی بچیاں بھی تھیں تو ہماری بچی.............." زبیدہ ممنائی۔

"ارے وہاں لڑکوں کے بیچ اپنی بیٹی کو کھیلنے لے گئیں.........وہ واہیات لڑکے میری بیٹی کو کس نظر سے کس کس زاویئے سے دیکھ رہے ہوں گے اتنا تو سوچنا چاہیے تھا ناں نیک بخت"

"جی آپ کی بات صحیح ہے بس ہو گئی ناں غلطی میں مانتی ہوں شہلا کو سمجھایا بھی تھا لیکن اتنی ضد کی کہ میں اِسے لے ہی گئی اور پتا ہے وہاں جو جو لڑکیاں تھیں وہ سب متاثر ہوئیں کہا کہ ہمیں بھی سکھاؤ ہمارے ساتھ کھیلو......میں نے انہیں بھی کہا کہ مولوی صاحب سے پوچھ کر بتاؤں گی"

ایک سانس میں ہی زبیدہ نے جو کہنا شروع کیا تو پوری بات کہہ دی۔

"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟ اب لڑکیاں یہ سب کریں گی؟ باہر جا کر ہی کھیلنے کے میں خلاف ہوں اور آپ مزید بڑھاوا دے رہی ہو بچی کو نا سمجھ کو؟"

"اس میں کیا حرج ہے شہلا کے بابا؟ کیا ہم نے یہ سب بچپن میں نہیں کیا؟"

"آپ، ہمارے زمانے میں یہ سب خرافات نہیں تھیں جو آج ہیں کیسے اُس زمانے کا اور آج کے زمانے کے اونچ نیچ کا موازنہ کر سکتی ہیں؟" مولوی صاحب کو اپنی ہی بیگم کی بات اس قدر بُری لگی کہ سامنے کھڑی اپنی بیٹی کو ایک نظر دیکھا اور کہا

"میں ایک باپ ہوں لیکن ایک مرد بھی ہوں آپ ماں ہو ساتھ میں عورت بھی ہو کیسے اپنی بیٹی کو کھلا چھوڑ سکتی ہو؟"

"اچھا اب بس بھی کریں ناں میں سمجھ گئی میری غلطی تھی اب شہلا کو بھی سمجھا دوں گی"

زبیدہ کو ندامت ہو رہی تھی لیکن شہلا افسردہ ایک کونے میں کھڑی ماں باپ کی باتیں سن رہی تھی......

"اچھا اگر وہ لڑکیاں گھر آ کر کرکٹ کھیلنا چاہتی ہیں تو مجھے اعتراض نہیں لیکن میرے آنے سے پہلے پہلے سب چلی جائیں گی ٹھیک ہے ناں؟"

شہلا نے جیسے ہی مولوی صاحب کی بات سنی خوشی سے مسکرا اٹھی ہاں باہر کھیلنے کی اجازت نہیں ملی لیکن کرکٹ گھر میں کھیلنے کی اجازت پھر بھی مل گئی تھی......

☆☆☆

اب روز وہ باہر کھیلنے والی بچیاں مولوی صاحب کے گھر آنے لگیں..........اب روز ہی اِن کے گھر میں شور وغل ہوتا......زبیدہ اپنی بیٹی کی خوشی میں خوش تھی......فرق واضح تھا باہر کھیلنے کا اور گھر کا لیکن شہلا اب اِسی بات میں خوش تھی کہ کم از کم ایک بار اُس نے باہر کھیل لیا......

وقت گزر رہا تھا شہلا اپنے اسکول میں بھی کرکٹ کھیلنے لگی باقاعدہ دوسرے اسکولوں میں جا جا کر مقابلے میں کھیلتی......مولوی صاحب ناراض بھی ہوتے لیکن بیٹی کی جیت کو دیکھ دل پگھل بھی جاتا تھا......وقت اتنا آگے چلا کہ وہ ہر سال اسکالرشپ بھی لیتی تھی اور

کرکٹ بھی بہت اچھا کھیل رہی تھی...... جب میٹرک مکمل کیا تو کالج کا شوق ہوا۔

''بس بہت ہوگیا.......... تمہیں میں نے جتنا پڑھانا تھا پڑھا دیا اب بس کل سے مدرسے جانا شروع کردو باقاعدہ''

شہلا کالج جانے کی ضد میں تھی لیکن مولوی صاحب نے جو فیصلہ کیا اب اِس میں زبیدہ بھی نہیں بول پارہی تھی۔

''بابا صرف دو سال اور دے دیں...... بس اُس کے بعد میں پڑھائی کا نہیں سوچوں گی بس مجھے انٹر تک پڑھنے دیں بابا''

شہلا بہت آس لے کر بول رہی تھی......

''نہیں...... اتنی پڑھائی کافی ہے —— اب آگے کیا کرنا ہے پڑھ کر؟''

''اماں آپ ہی کچھ بولیں ناں.......... میں اسکالرشپ پہ جانا چاہ رہی ہوں مجھے تو اب کسی بھی کالج میں داخلہ مِل جائے گا بابا سے کہیں ناں'' شہلا زبیدہ کے پاس آئی اور ہاتھ پکڑ کر کہا

''بیٹا.......... بابا اب غلط تو نہیں کہہ رہے ناں اور تم نے کون سا کوئی نوکری کرنی ہے بس پڑھ لیا۔ اب مدرسے جاؤ وہی صحیح رہے گا''

زبیدہ مولوی صاحب کے آگے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن بیٹی کا دل دیکھ دیکھ وہ بھی چاہ رہی تھی پڑھ لے دو سال کی تو بات تھی۔

''بابا.......... دیکھیں میں نے آپ کی ہر بات مانی ہے ناں آپ نے بھی میری مانی تو ایک یہ بات کیوں نہیں مان رہے آپ؟''

''بیٹا اور کتنا پڑھنا ہے اور کیوں پڑھنا ہے؟ ابھی تو چلو دو سال ہیں پھر کہو گی مجھے مزید دو سال پڑھنا ہے پھر یونیورسٹی کا کہہ دو گی........ ایک دفعہ کہہ دیا ناں اب آگے پڑھنے کی ضرورت نہیں''

مولوی صاحب کی بات سن کر شہلا کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

''بابا میں نے کوئی غلط بات نہیں کی نہ ہی کوئی قیمتی چیز مانگی ہے......'' شہلا کی گلوگیر آواز سن کر زبیدہ کا بھی دل بھر آیا۔

مولوی صاحب دروازے کی طرف آئے اور کہا۔

''میں باہر جا رہا ہوں کھانے پہ نہیں ہوں گا...... اللہ حافظ'' اور وہ باہر نکل گئے......

''اماں.......... بابا ایسا کیوں کر رہے ہے, مجھے پڑھنا ہے آگے.......... بس دو سال کی تو بات ہے بابا کو کہیں ناں''

''میرا بچہ میں اب کیا کہوں؟ انہیں گھر آنے دو, دو چار دن صبر کر جاؤ میں بات کروں گی اُن سے''

زبیدہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر موقع دے کر مولوی صاحب سے بات کی۔

''شہلا کو اجازت دے دیں...... دیکھیں وہ کتنی اداس ہوگئی ہے بس دو سال کی تو بات ہے پھر تو اُس کے بیاہ کی عمر ہو جائے گی کم از کم اِن دو سالوں میں تو وہ اپنی من مرضی کی زندگی گزار لے''

زبیدہ کی بات سن کر مولوی صاحب اٹھ بیٹھے......

''ہم نے کب اُسے روکا ہے کسی بھی کام سے...... بس جہاں غلط لگتا ہے وہاں منع کرتے ہیں بلکہ ہر چیز کی اجازت دی گھر میں رہ کر لیکن یہ کیا بات ہوئی اب دوسرے کسی محلے میں جا کر کیسے بڑے ادارے میں پڑھے گی پتا نہیں وہاں کا ماحول کیسا ہوگا؟''

''شہلا کے بابا.......... وہ اب بڑی ہوگئی ہے اپنا برا بھلا سمجھتی ہے اور آپ اُسے محض اِس وجہ سے روک رہے ہیں تو یہ وجہ ایسی نہیں کہ بلا وجہ منع کیا جائے...... بیٹی کے دِل میں ایک بات آ جائے گی, وہ تا عمر یہ بات اُسے کھلتی رہے گی کہ اِس وجہ سے اُس کے باپ نے اُسے مزید آگے پڑھنے سے روکا کیا آپ یہی چاہتے ہیں کہ آپ کی بیٹی اب آپ سے کسی بھی قسم کی فرمائش نہ کرے ہنسنا کھیلنا بند کردے؟ اس کی معصوم سی خواہشیں جو پوری ہو سکتی ہیں ہم بحیثیت ماں باپ اُن کا گلا گھونٹ دیں؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں زبیدہ؟ بخدا ہم نے ایسا کچھ نہیں سوچا بس چاہتے ہیں کہ ہماری بیٹی کو برے

معاشرے کی نظر نہ لگے بس...''

مولوی صاحب نے فکر انگیز انداز میں کہا جس پہ زبیدہ نے بھی کچھ پل کے لیے سوچا اور بولی۔

''مجھے پتا ہے، لیکن اس طرح ہم اپنی ہی بیٹی کو مزید باغی بنا دیں گے آج جو ہماری وہ ہر بات مانتی ہے وہ اِسی لیے کہ ہم بھی اُس کی مانتے ہیں جس کے بدلے تھوڑا بہت جو کسی حد تک ممکن ہو ہم اس کی اجازت دے دیتے ہیں وہ اُس میں بھی خوش ہو جاتی ہے...... پر مزید آگے پڑھنے کی خواہش کوئی بری تو نہیں اور ابھی اُس کی عمر ہی کیا ہے چھوٹی ہے پڑھنے کی اجازت دے دیں ناں''

''ٹھیک ہے کل صبح میں ہی اُسے یہ خوش خبری سنا دوں گا.......... اب کیا اجازت ہے سونے کی؟''

مولوی صاحب نے بھی مسکرا کر کہا جس پہ زبیدہ نے بھی مسکرانے پہ ہی اکتفا کیا اور دونوں سو گئے......

اگلے دن ناشتے کے وقت مولوی صاحب نے شہلا کو جب داخلہ لینے کی اجازت دی وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی اور مولوی صاحب کے گلے سے لگ گئی......

''آج میں آپ کے لیے کھانا پکاؤں گی''

''ارے اتنی خوشی کی خبر کے بعد اگر میری بیٹی کھانا بنائے گی تو مجھے کہیں ڈاکٹر کے پاس نہ جانا پڑ جائے''

''بابا!'' شہلا نے ناک پھلا کر مصنوعی غصے سے کہا جس پہ مولوی صاحب ہنس پڑے......

سارا دن شہلا کچن میں گھسی رہی ساتھ ساتھ زبیدہ بھی اس کے ساتھ لگی رہی۔

شام کے وقت جب مولوی صاحب آئے تو چائے کے بعد کھانے کی باری آئی اور شہلا کے بنائے پکوان سے حقیقی معنوں میں لطف اندوز ہوئے......

دن جیسے پر لگا کر اڑ رہے تھے...... شہلا کا داخلہ کالج میں ہو گیا تھا...... مولوی صاحب نے وین لگوا دی تھی کہ بیٹی کہاں بسوں میں دھکے کھائے گی...... وین گھر سے کالج اور کالج سے گھر لے آتی تھی......

پڑھائی میں تو وہ ویسے ہی ہوشیار تھی لیکن اُس کے پاس غیر نصابی سرگرمیوں سے جیتے شیلڈز، ٹرافیاں سرٹیفکیٹس بھی موجود تھے جس کی وجہ سے پرنسپل نے خاص شہلا کا نام ہر سلسلے میں لکھوایا ہوا تھا...... اب ایک طرف وہ پڑھائی میں بھی جتی ہوتی دوسری طرف کرکٹ اور دیگر سلسلوں میں بھی......

☆☆☆

کالج میں گرلز کرکٹ ٹیم تشکیل دی جا رہی تھی جو انڈر اٹھارہ کی ٹیم تھی لیکن ان کا مقابلہ سب سے پہلے لڑکوں کی ٹیم سے تھا...... یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ واقعی یہ ٹیم جو تشکیل دی گئی ہے وہ بہتر ہے یا مزید کوئی گنجائش ہوگی...... یہ شہلا کی دیرینہ خواہش تھی...... اسے ہر حال میں اِس میں شامل ہونا تھا لیکن اُس کے گھر تو جیسے طوفان آ چکا تھا......

''میں نے تمہیں اِس لیے پڑھنے کی اجازت نہیں دی تھی کہ اب تم یہ سب کرو؟ دماغ خراب کر دیتے ہیں یہ اسکول کالج والے۔ خبردار جو اِس چکر میں پڑیں''

''بابا...... اِس میں حرج ہی کیا ہے...... یہ میچ صرف یہ دیکھنے کے لیے ہے کہ ہماری ٹیم قابل ہے اسٹیٹ کے اندر کھیلنے کی یا نہیں بس'' شہلا نے جواب جیسے پہلے سے تیار کر رکھا تھا......

''جو بھی ہو میری طرف سے اجازت نہیں ہے تو نہیں ہے'' مولوی صاحب نے کرخت لہجے میں بولا

''مجھے سمجھ نہیں آتی صرف ایک میچ ہی تو ہے اِس میں حرج ہی کیا ہے؟'' شہلا جھنجلائی۔

''حرج؟ تم لڑکوں کے ساتھ کھیلو گی، یہ تمہیں برائی نہیں لگتی؟ اور اول تمہیں اسٹیٹ لیول پہ کھیلنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ جس مقصد کے لیے کالج جا رہی ہو وہی کرو، یعنی پڑھائی کسی اور خرافات میں پڑنے کی ضرورت نہیں''

''بابا آپ کبھی میرا شوق میرا رجحان نہیں سمجھیں گے'' شہلا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ تمہارا شوق آخر ہے کیا؟ پڑھنے کی آگے ضد تم نے کی، وہ بھی تمہارا شوق ہی تھا

اور اب یہ تمہارا شوق ہو گیا ہے؟ جب ماں باپ کسی کام سے روک رہے ہیں تو سمجھ جانا چاہیے کہ ضرور وہ ٹھیک ہیں اور اولاد کی بھلائی ہی چاہتے ہیں'' مولوی صاحب نے نرمی سے سمجھایا۔

''لیکن بابا آج کی نسل اور اولاد اپنی اچھائی بھلائی سے خوب واقف ہے انہیں پتا ہے کیا ٹھیک ہے کیا غلط''

شہلا نے بھی اُسی انداز میں جواب دیا۔

''اچھا.......... تم آج کی نسل کو خوب پتا ہے کیا صحیح ہے کیا غلط؟ اور ہم ماں باپ غلط ہیں؟

اپنے بچوں کی بھلائی کی بات کریں تو ہم غلط ہیں؟''

''اف بابا آپ سے بات کرنا وقت کا زیاں ہے''

شہلا یہ کہہ کر رکی نہیں اور اپنے کمرے میں چلی گئی......

''زبیدہ...... یہ ہماری بیٹی اب اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ باپ کو جواب دے رہی ہے؟ باپ کو سمجھا رہی ہے؟ ہم سے بات کرنا وقت کا زیاں لگ رہا؟''

''ایسا کیوں سوچ رہے ہیں؟ وہ ابھی چھوٹی ہے، ناسمجھ ہے جذباتی ہے، میں اُسے سمجھاؤں گی'' زبیدہ مولوی صاحب کو آب دیدہ دیکھ کر شرمندہ ہوئی......

☆☆☆

وہ دن آ ہی گیا تھا جس دن کے لیے وہ اپنے بابا سے بات نہیں کر رہی تھی لیکن پختہ ارادہ کر چکی تھی کہ کسی بھی حال میں یہ میچ کھیلنا ہے اور ثابت کر کے دکھانا ہے......

ناشتا کرنے کے بعد جب شہلا جانے لگی تو زبیدہ نے ہاتھ پکڑ کر روکا......

''میری مانو تو ایک بار پھر سے اپنے بابا سے پوچھ لو''

''نہیں اماں۔۔۔ میں حتمی فیصلہ کر چکی ہوں......

بابا سے بہت بار کہا لیکن وہ صرف اپنی سناتے ہیں کسی کی سنتے نہیں ہیں'' شہلا نے ناراضی سے کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے شہلا، بابا تمہارے لیے اچھا ہی تو......''

''اچھا؟'' شہلا نے زبیدہ کی بات کاٹی......

''میری یہ بات مان کیوں نہیں لیتے وہ آخر؟ خیر نہ مانیں میں بھی وہی کروں گی جو اب میرے جی میں آئے گا''

زبیدہ نے آوازیں دیں لیکن شہلا لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کالج کے لیے روانہ ہوگئی......

وین میں بھی وہ اداس بیٹھی رہی جب تک کالج نہیں آیا.......... جو بھی کوئی حال احوال لیتا آج کے میچ کی بابت بات کرتا بس مسکرا کر رہ جاتی......

کالج پہنچ کر بھی اُس کا دل اداس تھا...... بھاری قدموں سے وہ میٹنگ روم میں جانے لگی جہاں سب میچ کھیلنے والی طالبات کو اکٹھا ہونا تھا...... جب وہ وہاں پہنچی تو سب کو اچھے سے مسکراتے ہوئے خوش ہوتے ہوئے اُس کا بھی دل چاہ کہ کاش بابا بھی ایسے ہی ہنستے مسکراتے مجھے بھیجتے...... اُس کا دل کلس کے رہ گیا تھا لیکن صرف اپنی خواہش کی خاطر وہ یہ سب کرنے جارہی تھی خود پہ بھروسا تھا اِسی لیے سارے غم اور پریشانی کو بالائے طاق رکھ کے وہ بھی اُن سب کے ساتھ شامل ہوگئی۔

زبیدہ جاء نماز بچھا کر اپنی بیٹی کی کامیابی کی دعاؤں میں لگ گئی تو دوسری جانب مولوی صاحب پیچ وتاب کھا رہے تھے......

شہلا سمیت باقی ساری طالبات اور اساتذہ بس میں مقابلے میں جانے کے لیے بیٹھ گئے...... راستہ لمبا تھا سو گانے بجانے ایک دوسرے کو چھیڑنے میں ہی وقت گزارا گیا۔

گراؤنڈ میں پہنچ کر شہلا کا دل زور سے دھڑکنے لگا......

وہ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے ایک منزل دور تھی، اُسے ہر حال میں یہ میچ جیتنا تھا اپنی بہترین سے بہترین کارکردگی دکھانی تھی......

یہ میچ اُسے فائنل ٹیم میں پہنچا سکتی تھی۔ وہ ٹیم جو بنائی ہی خاص گئی تھی اب اِن کا مقابلہ لڑکوں سے کیونکر سیٹ ہوا اِس کی وجہ یہی تھی کہ جان سکیں کہ اگر کل کو واقعی کبھی لڑکوں کی ٹیم کے ساتھ میچ ہوا تو کیا یہ کالج کی لڑکیاں اتنا اچھا کھیل سکیں گی یا نہیں؟ اِسی لیے ایک

دوستانہ میچ رکھا گیا لیکن یہ میچ مشروط بھی تھا کہ جو لڑکی اچھے سے کھیلے گی اچھی کارکردگی دکھائے گی وہی فائنل ٹیم میں ہوگی۔

دونوں ٹیمز میدان میں اتر چکی تھیں۔ ایک دوسرے سے جان پہچان کروائی گئی، جس میں ایک واحد شہلا ہی تھی جو بہت گھبرا رہی تھی۔ ایک دوسرے کو نیک خواہشات کے ساتھ مسکرا کر وِش کیا اور ٹاس کروایا۔ ٹاس کے مطابق لڑکوں کی ٹیم جیتی تھی انہوں نے پہلے ہی باؤلنگ لے لی، اِس طرح اوپننگ لڑکیوں کی ٹیم سے سب سے پہلے شہلا اور ایک اور لڑکی کوثر نے کی تھی۔ پہلی گیند پہ کوثر ہی آئی جب گیند کو بلے سے گھمایا تو رنز بناتے ہوئے شہلا کی باری آگئی اور اِس طرح وہ اپنی بہتر سے بہترین کارکردگی دکھانے آگئی تھی۔ اب سامنے والے کی گیند ہوتی اور شہلا کا بلا۔ ہر گیند میں چوکا اور دو، ایک رنز ضرور ہوتے، تاہم شہلا اور کوثر کی ملی بھگت سے ۳۰ رنز بن چکے تھے۔ شہلا آؤٹ ہوگئی تھی اب سارا دارومدار اِس ٹیم کا باقی لڑکیوں پہ تھا جو کہ دیگرے اچھے اسکور کر کے آؤٹ ہوتی رہیں۔ لڑکیوں کی ٹیم نے 55 رنز بنالیے تھے اور بریک پہ چلے گئے۔ اب اگلی باری لڑکوں کی تھی اور لڑکیوں نے باؤلنگ کروانی تھی۔

چونکہ شہلا نے اوپننگ دی تھی اور بہت اچھی دی اِس لیے اُسے آخر میں رکھا تا کہ باقی لڑکیاں اپنا کھیل کر پھر شہلا اپنی کارکردگی دکھائے جس پہ کسی کو بھی اعتراض نہ ہوا، اب سب لڑکیوں نے ایک ایک کر کے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کیا لیکن لڑکوں کی ٹیم میں اچھے کھلاڑی موجود تھے اور اب تک بس تین آؤٹ ہوئے تھے جب کہ اسکور 45 تھا اور لڑکیوں کی ٹیم سے کوثر کی باری تھی لیکن اُس نے خاص یہ موقع شہلا کو دینا چاہا۔ کوچ نے اُس کی بات کی نفی کی لیکن کافی زور دینے پہ شہلا کو وہ موقع مل گیا اور اِس طرح شہلا اپنے پرجوش جذبے کے ساتھ اور مشکور ہوتی گیند کو سنبھالے ایک بار پھر میدان میں آئی۔

اُسے اپنے آپ کو منوانا تھا کہ اگر وہ بیٹنگ اچھی کر سکتی ہے تو باؤلنگ بھی اور اپنی ٹیم کو جتوا بھی سکتی ہے ساتھ میں خود کو بھی فائنل ٹیم میں لے جا سکتی ہے۔ سامنے والا بلے باز واقعی اچھا کھیل رہا تھا، شہلا نے پہلی گیند پھینکی جس پہ بلے باز نے چوکا لگا دیا، اب اسکور ۴۹ ہوگیا تھا، اب ان کو سات رنز درکار تھے جب کہ شہلا کا اوور ابھی شروع ہوا تھا۔ یعنی ۶ گیند باقی تھے اور ۷ رنز چاہیے تھے جیتنے کے لیے، سب کی امیدیں اب شہلا پہ تھیں۔ شہلا کو اپنا پورا فوکس اِسی بات پہ رکھنا تھا کہ ٹیم کو جیتانا ہے یعنی خود کو جتوانا ہے۔ بلے باز واقعی اچھا کھیل رہا تھا۔ شہلا نے اگلی گیند کی تیاری پکڑی اور وہ نو بال ہوگئی، جب تیسری گیند پھینکی وہ وکٹ پہ لگتے لگتے رہ گئی۔ اب بھی شہلا کے پاس چار باریاں تھیں جب کہ لڑکوں کی ٹیم کو اب بھی ۶ رنز درکار تھے، شہلا ایک جانب سکون دکھا رہی تھی لیکن اندر ہی اندر اُس کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا، وہ اپنی ہر ممکن کوشش میں تھی کہ کسی بھی طرح یہ جیت اپنے نام کرنی ہے، اپنے بابا کو دکھانا ہے کہ وہ بھی کچھ کر سکتی ہے بنا اُن کی اجازت کے بھی۔ اِس بار جو گیند پھینکی گئی شہلا کی جانب سے اُس نے اپنی پوری طاقت اور قوت لگادی، بلے باز نے اپنا بلا گھمایا اور گیند اچھال دی، گیند ہوا میں تھی اور جیسے ہی وہ نیچے گرنے لگی تھی کہ فیلڈنگ کرتے ہوئے لڑکیوں کی ٹیم سے انیسہ نام کی کھلاڑی نے وہ گیند پکڑ لی۔ میدان میں ایک دم خاموشی ہوگئی۔ کچھ ہی لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک دم ’’آؤٹ‘‘ ہونے کی صدا بلند ہوئی اور لڑکیوں کی ٹیم نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ایک دم تالیوں کی گونج تھی دوسری جانب شہلا جو ایک دم رونا شروع ہوگئی تھی تو تیسری جانب لڑکوں کی ٹیم تھی جو فقط کچھ رنز سے ہاری گئی تھی۔

اب سب ہر طرف ایک جگہ جمع ہوئے ایک دوسرے کو مبارکبادیں دینا شروع ہوئے، لڑکیوں کی ٹیم نے جس طرح کی کارکردگی دکھائی تھی سلیکٹرز کے ساتھ ساتھ لڑکوں کی ٹیم کے کھلاڑیوں نے بھی بڑھ چڑھ کر مبارک باد تھی۔ اب یہ دونوں ٹیمز

اطمینان سے کھاپی رہی تھیں ہنسی مذاق میں لگے ہوئی تھیں، شہلا بھی ان لڑکیوں کے ساتھ لڑکوں سے بھی باتیں کررہی تھی اور تبادلہ خیال کررہی تھی۔

ایک گھنٹے بعد نوٹس بورڈ میں اُن سب کا نام آگیا تھا جو فائنل ٹیم میں سلیکٹ ہوئے تھے۔ شہلا پُر امید تھی لیکن گھبراہٹ کے مارے ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

اپنا نام دیکھنے کے لیئے بے تاب ہورہی تھی لیکن اٹھنے کی ہمت بھی نہیں کر پارہی تھی۔ جیسے تیسے اٹھی اور نوٹس بورڈ کی جانب بڑھی لیکن ......لڑکیاں ایک۔ دوسرے کو دھکیلتی

اپنا اپنا نام دیکھتیں ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہی تھیں وہیں سدھ بدھ کھوئی شہلا کو اس بات کا ہوش نہیں تھا کون ٹکرا رہا ہے کیا ہورہا ہے اُس کی نظر بس اِس بات پہ ہی تھی کہ اُس کا نام فائنل ٹیم میں نہ تھا جب کہ اُس کی بہت اچھی کارکردگی تھی۔ وہ رونا چاہتی تھی، لیکن آنسو جیسے آنکھ کے اندر جامد تھے لیکن باہر نہیں آرہے تھے۔ وہ اپنے اساتذہ کے پاس گئی وہاں جاکر ساری صورت حال بتائی۔

سلیکٹرز کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اُن میں سے ایک نے صرف شہلا کو اندر بلوایا۔

''آؤ۔ بیٹھو اور بتاؤ کیا بات ہے؟'' سلیکٹر نے اوپر سے لے کر نیچے تک شہلا کو ابرو اچکائے دیکھا اور بیٹھنے کو کہا۔

''نہیں سر میں ٹھیک ہوں یہیں، بس مجھے وجہ جاننی ہے'' شہلا اب واقعی گھبرا رہی تھی۔

''ارے تو بیٹھ کر اطمینان سے بھی بات ہوسکتی ہے ناں۔ چلو آؤ بیٹھو'' سلیکٹر اٹھا اور شہلا کے پاس آیا اور ہاتھ پکڑ کر چیئر کی جانب لانے لگا۔

''سر میں نے کہا نا میں ٹھیک ہوں'' شہلا نے ناگواری سے اُسے دیکھا اور ہاتھ چھڑوایا۔

''اوہو کیا وجہ نہیں جاننی کہ کیوں تمہارا نام فائنل لسٹ میں نہیں آیا''، سلیکٹر لہراتے انداز میں بولا شہلا کو عجیب لگا۔

''جاننا چاہتی ہوں لیکن آپ اپنی سیٹ پہ جا کر بیٹھیں اور مجھے بس وجہ بتا دیں کہ جب اتنی اچھی اوپننگ کی اور آخر میں بھی باؤلنگ میرے ذمے تھی تو کیوں مجھے ٹیم میں شامل نہیں کیا''

شہلا نے کیپ پہنی ہوئی تھی جسے سلیکٹر نے اتارا۔

''وہ کیا ہے ناں مجھے تم اتنی اچھی لگ رہی تھیں کھیلتے ہوئے کہ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ تمہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دوں اور ابھی بھی دیکھو تمہارا نام نہیں آیا تو اپنے پاس اکیلے بلوالیا اور تم آ بھی گئیں'' ایک کمینگی سی ہنسی کے ساتھ سلیکٹر بولا۔

''یہ کس طرح کی باتیں کررہے ہیں آپ؟ ہوش میں تو ہیں؟ سلیکٹ نہ کرنے کی وجہ پوچھ رہی ہوں اور آپ ایسی بے تکی بات کیے جارہے ہیں''؟

''ارے وجہ بتا تو دی.. اب کیا میری جان لوگی؟ دل کررہا ہے کہ تمہیں واقعی دور نہ جانے دوں اپنے پاس....'' سلیکٹر جو ٹیبل سے پشت لگائے کھڑا ہوا تھا شہلا کے پاس آیا اور مزید قریب ہوکر بولا شہلا نے ایک دم اُسے دھکا دیا اور دور ہوئی۔

''ارے کہاں جارہی ہو؟ تمہیں فائنل ٹیم میں جانا ہے ناں تو پھر ایسے دور تو نہ جاؤ'' سلیکٹر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کمینگی سے کہا۔ شہلا نے یک دم اس پر تھوکا اور ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوایا۔

''جانتی ہو ناں میں سلیکٹر ہوں تمہارے خلاف کیا کیا کہہ سکتا ہوں تمہیں تو میں کالج سے بھی نکلوا سکتا ہوں سمجھ کیا رکھا ہے مجھے ہاں'' اب کے وہ خوں خوار لہجے میں بولا۔

''مجھے جانے دیں پلیز، میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ مجھے نہیں کھیلنا فائنل پلیز مجھے جانے دیں۔'' شہلا نے گڑگڑانا شروع کردیا۔

''تم جیسی لڑکیوں کو میں جانتا ہوں ارے جاؤ نکل جاؤ کمرے سے اب تم دیکھنا میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔''

سلیکٹر غصے سے بولا جس پہ شہلا نے رونا شروع کردیا۔

''میرے سامنے ڈرامے کرنے کی ضرورت

نہیں۔ چل نکل یہاں سے۔"
سلیکٹر نے اپنے آفس کا دروازہ کھولا اور اُسے دبوچتے ہوئے باہر لے آیا
"یہ دیکھو۔ یہ لڑکی، اِس کا نام کیا فائنل میں نہیں آیا چلی آئی میرے کمرے میں اور میرے ساتھ ... نجانے کیا کرنا چاہتی تھی کہ میں اِس کا نام فائنل کی لسٹ میں ڈال دوں۔"
شہلا روئے جارہی تھی اور سب وہاں جمع ہو گئے
"نہیں ۔ یہ ... یہ جھوٹ بول رہے ہیں ... میں نے ... کچھ نہیں کیا۔"
"اچھا کچھ نہیں کیا تو پھر اکیلے میرے کمرے میں کیوں آئیں؟ کیوں مجھے فورس کررہی تھیں کہ میں فائنل میں تمہارا نام دوں ہاں؟"
یہ ایسے کالج میں پڑھتی ہو؟ ارے تم جیسی تو اِس کالج میں ہونی ہی نہیں چاہئے" سلیکٹر نے بہت کچھ بولا وہاں کھڑی لڑکیاں بھی پہلے تو کچھ سمجھ نہ پائیں لیکن شہلا کا اکیلے آفس کے اندر جانا انہیں بھی برا ہی لگا جان کر۔
"جائیں آپ لوگ اب یہاں سے میچ ختم ہو گیا ناں نام بھی سب کو معلوم ہو گئے اب سب جائیں اور فائنل ٹیم میں جو جو ہے اب وہی تیاری کرے۔ نجانے کہاں سے ایسی لڑکیاں آجاتی ہیں" سلیکٹر نے ہنکارا بھرا اور وہاں سے چلا گیا۔ اب سب نے چہ مگوئیاں کرنا شروع کردیں۔ شہلا سب کی نظروں کے سامنے کھڑی تھی وہ سچی ہو کر بھی اپنی عزت بچا نہیں پائی۔ حالانکہ اُس سلیکٹر نے اُس کے ساتھ کیا کچھ نہیں تھا لیکن اگر وہ کر جاتا تو؟ بوجھل قدم اٹھائے وہ اپنے اساتذہ کے پاس گئی اور روتی رہی لیکن بند کمرے کے اندر کیا ہوا کیا نہیں وہ سوائے شہلا کے، سلیکٹر کے اور کوئی نہیں جانتا تھا اس لیے کوئی بھی سوال جواب نہیں کررہا تھا۔
بس میں جب سارے لوگ بیٹھ گئے جو جو فائنل میں پہنچ گئی تھیں وہ جیت کی خوشی منارہی تھیں جب کہ شہلا ایک جانب بیٹھی آنسو بہارہی تھی۔ وہ کس کس کو صفائی دیتی؟ کیا بتاتی؟ اساتذہ اُسے جانتے تھے اچھے سے لیکن یہاں بات وہی تھی کہ اگر وہ شہلا کا ساتھ دیتے تو کہیں کالج کو بدنامی نہ مل جائے، باقی لڑکیوں پہ نہ انگلی اٹھے۔
بس جب کالج پہنچی تو کوئی بھی شہلا سے بات کرنے کے لیے تیار نہ تھا ہر کوئی اپنے میں لگا ہوا تھا۔ کوثر شہلا کے پاس آئی۔
"کیا واقعی اندر کچھ نہیں ہوا تھا؟"
کھوجتی ہوئی نگاہ سے کوثر نے شہلا کو دیکھا تھا۔
"شہلا ہم دونوں اوپننگ میں تھے، تم نے مجھے اپنی باری دے دی باؤلنگ کی کیا میں تمہیں رسوا کرتی؟ میں نے اپنی سی ہر ممکن کوشش کی لیکن جب میرا نام نہیں آیا میں تو بس وجہ جاننے گئی تھی یہ نہیں پتا تھا وہ انسان اتنا گرا ہوا ہو سکتا ہے"
"کیا پتا تم اپنا نام نہ پا کر واقعی اُس کے پاس گئی ہو اور ...." کوثر نے اپنی بات ادھوری چھوڑی
"کیا تم بھی مجھے ایسا سمجھ رہی ہو؟" شہلا کو یقین نہیں آیا۔
"ہونہہ میں کیا کسی کو بھی یقین نہیں آنا"
کوثر یہ کہہ کر رکی نہیں اور چلی گئی۔
☆☆☆
ہزار سوچیں اِس وقت شہلا کے اردگرد منڈلا رہی تھیں۔ وہ جو باپ کی مرضی کے بغیر گئی، وہ اپنی ضد کے تحت گئی تھی، کالج سے لے کر گھر تک کا سفر بہت ہی کرب ناک گزر رہا تھا وہ اپنے گھر جا کر کہیں چھپ کر زاروقطار رونا چاہتی تھی۔
گھر پہنچ کر جب اندر قدم رکھا تو دیکھا مولوی صاحب غصے سے بیٹھے ہوئے تھے اور زبیدہ بھی سسکیاں لے رہی تھی۔
"اب کیوں آئی ہو گھر ہاں؟ جب بنا اجازت لیے گئی تھیں تب سوچا تھا باپ کے دل پہ کیا گزر رہی ہوگی؟"
شہلا چپ چاپ کھڑی اپنے بابا کی بات سننے لگی۔
"اپنی ضد پوری کرلی؟ مل گئی خوشی؟ یا اور شوق ہو رہا ہوگا جا کر لڑکوں کے ساتھ ملنے بیٹھنے کھیلنے کا ہے

ناں؟۔

"اسے کہہ دیں کہ مجھ سے اب بات نہ کرے، نافرمان کہیں کی"

"بابا مجھے معاف کر دیں۔ مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ آپ مجھے کیوں منع کرتے تھے، میں واقعی نادان تھی، ناسمجھ تھی، جو آپ کی بات میں چھپی مصلحت نہ جان سکی... میری یہ آخری غلطی سمجھ کر مجھے معاف کر دیں"

شہلا نے رونا شروع کر دیا تھا۔

"اب کیوں رو رہی ہو؟ باپ کا دل کہاں سمجھ پاؤ گی؟ ماں کا بھی نہیں سمجھ پاؤ گی ابھی تو... جاؤ معاف کیا جا کر آرام کرلو"

شہلا کو آسانی سے معاف کر دینے پہ اپنے بابا پہ ٹوٹ کے پیار آرہا تھا وہ بتانا چاہتی تھی کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا لیکن وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"زبیدہ جائیں شہلا کے پاس شاید اُسے آپ کی ضرورت ہے"

زبیدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ مولوی صاحب کا غصہ ایک جانب لیکن اگر واقعی جیت بیٹی کی ہوئی ہوتی تو وہ دوبدو جواب دیتی نہ کہ معافی مانگتی اِس لیے مزید کوئی بات کیے بغیر زبیدہ کو شہلا کے پاس جانے کا حکم دیا

وہ جیسے ہی کمرے میں گئی شہلا منہ تکیہ میں چھپائے روئے جا رہی تھی۔ زبیدہ نے پیٹھ پہ ہاتھ سہلایا تو وہ اُٹھی اور زبیدہ کے گلے لگ کر مزید رونا شروع ہوگئی

"کیا ہوا ہے شہلا؟ کیا بات ہے؟ رو کیوں رہی ہو؟"

شہلا مستقل روئے جا رہی تھی

"کیوں پریشان ہو اور مجھے بھی کر رہی ہو بتاؤ تو کیا ہوا ہے؟ کیا سلیکشن نہیں ہوئی؟"

"اماں... بابا صحیح کہتے تھے"

شہلا نے جو کہنا شروع کیا اپنے ساری روداد سنادی

"اماں اگر جو میرے ساتھ کچھ ہو جاتا تو؟"

"نہ میری جان ایسا نہ کہہ اللہ نے تجھے بچا لیا کافی ہے ناں"

زبیدہ ایک طرف شکر گزار تھی لیکن دوسری جانب بیٹی کو ہراساں کیا گیا یہ جان کر اندر ہی اندر رونا شروع ہوگئی۔

"اماں کالج والوں نے بھی میرا اعتبار نہیں کیا۔ میں اب کالج بھی نہیں جاؤں گی"

شہلا کو اپنی گود میں لٹا کر زبیدہ اُس کے سر پہ ہاتھ پھیر رہی تھی اور باتیں سن رہی تھی۔

"بس اللہ خود اِن سب کو دیکھے گا میری جان، بس شکر ادا کرو کہ تمہارے ساتھ کچھ نہیں ہوا باقی یہ پڑھائی یہ کالج آنی جانی چیز ہے اصل چیز تو عزت ہوتی ہے میری جان"

زبیدہ اب شہلا کو دلاسا دے رہی تھی۔

"اماں.. مجھے وہ والی لوری سناؤ ناں پھر سے"

زبیدہ اب شہلا کو لوری سنا رہی تھی اور شہلا آج ہوئے واقعہ کو بھولنا چاہ رہی تھی، اِسے سبق ملا تھا بہت بڑا جو اکثر لڑکیاں اپنے زعم میں ایسا قدم اٹھا لیتی ہیں جو بعد میں پچھتاتی ہیں لیکن شہلا نے قدم بھی اٹھایا اُسے بس سبق کی حد تک ہی سزا ملی اور بچ نکلی۔

"جب میری گڑیا کو بھوک لگے گی، چھوٹا چمچہ چھوٹی پیالی لے کر آؤں گی، اپنے ہاتھوں سے اُسے کھانا کھلاؤں گی......

جب میری گڑیا کو پیاس لگے گی، چھوٹا سا گلاس لاؤں گی، اپنے ہاتھوں سے اُسے پانی پلاؤں گی......

جب میری گڑیا کو نیند آئے گی، چھوٹا پلنگ چھوٹا تکیہ لے کر آؤں گی،

اپنے ہاتھوں سے اُسے لا الہ الا اللہ کراؤں گی......

زبیدہ تھپکی دیے جا رہی تھی اور لوری سنائے جا رہی تھی۔

☆☆

منشا محسن علی



ماۓ نی میں کنوں آکھاں' درد وچھوڑے دا حال نی
دھواں دھکھے میرے مرشد والا' جاں پھولاں تاں لال نی
سولاں مار دیوانی کیتی' برہوں پیا ساڈے خیال نی
دکھاں دی روٹی سولاں دا سالن' آہیں دا بالن بال نی
جنگلے بیلے پھرے ڈھونڈیندی اجے نہ پایو لال نی
کہے حسین فقیر نماناں' شوہ ملے تاں تھیواں نہال نی

منٹو ہال کی تین کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور نغمانہ کی خوب صورت آواز ساری یونی ورسٹی میں گونج رہی تھی۔ روشن خوشبوؤں والی شام تھی' یونی ورسٹی کے روڈز پر ریڈ کارپٹ بچھا تھا' جس کے دونوں اطراف میں ننھے ننھے مٹی کے دیے جل رہے تھے۔ بیلا بنت فاروق احمد ماضی کے گول چکر میں گھوم رہی تھی۔ تو وہ بھی وقت کے ہاتھوں' لوگوں کے ہاتھوں بچ نہ پائی تھی۔ وہ بھی "کٹھ پتلی" بن گئی تھی۔ اسے بے تحاشا رونا آرہا تھا اور وہ رو رہی تھی۔ اسے محبت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ سویٹ پی کی بیلوں پر بیٹھے جگنو مر رہے تھے۔ مٹی کے دیوں کی لو لرز رہی تھی۔ جانے ریہرسل روم میں وائلن کون بجا رہا تھا۔

"ہمدردی کو محبت نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ خسارے ہی تو ہاتھ آتے ہیں۔" بیلا نے روشنیوں کو مدھم پڑتا محسوس کیا تھا۔ دھند کے پار۔ جیسے ابا کھڑے تھے۔ وہ کیسے سر اٹھائے گی ان کے سامنے۔ کیسے؟

"بیلی۔۔۔ میرے اعتبار کا یہ صلہ دیا تم نے؟ میں نے تو تمہارے دوپٹے کے پلو کے ساتھ نسلوں کا اعتبار باندھا تھا۔" وہ زور' زور سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"جانے کیوں' کیسے یہ سب ہو گیا ابا۔ مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔" اور خبر ہوتی بھی کہاں ہے؟ نظر اٹھی تو جیسے اماں کو سامنے کھڑا پایا تھا۔ وہ پلکیں تک نہ جھپک سکی تھی۔

"کتنی بار کہا تھا بیلی۔۔۔ تو شہر گئی تو پہلے جیسی واپس نہیں آئے گی۔ کہاں ہے تیرا دل؟" بیلا کا ہاتھ دل پر پڑا تھا۔

"اماں۔۔۔ دل تو کھو گیا۔۔۔ یہیں تو تھا' جانے کہاں گم ہو گیا۔" وہ بے اختیاری میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ یونی ورسٹی کے کوریڈورز سے گزر رہی تھی۔ چہرے پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ قائد اعظم بلاک' جوہر بلاک' اقبال بلاک ہر جگہ دیکھ لیا۔ تھک ہار کر وہ سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی۔ "کہاں گیا میرا دل؟" وہ خود کلامی ہواؤں میں بکھر گئی تھی۔ بوگن ویلیا کے پھول سیڑھیوں پر بکھر گئے۔ شام تھی اور دل تھا کہ ملتا ہی نہ تھا۔ بیلا اذیت سے ہنسی تھی۔ "اماں پوچھیں گی تو کہہ دوں گی بھکر میں کہیں گم ہو گیا۔ سو بار ڈھونڈا' مگر ملا ہی نہیں۔"

سیڑھیوں کی گرل کے ساتھ۔ وہ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ "میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی منعم علی۔" بیلا کے لمبے بال شانوں پر ٹھہرے تھے۔ وہ اب کہیں جا کر حواسوں میں آرہی تھی۔ لمحہ۔۔۔ سیکنڈ۔۔۔ منٹ۔۔۔ وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ ہمت کرتے وہ اٹھی تھی۔ گرل پر جا گری۔ ماتھے سے لال لہو بہنے لگا تھا۔ وہ دوپٹے سے ماتھا صاف کر رہی تھی۔ لڑکھڑاتی ہوئی وہ جا رہی تھی۔ اس کا لمبا دوپٹا مٹی کے دیوں پر جا ٹھہرا تھا۔ کاٹن نے آگ پکڑلی تھی۔ وہ بے نیاز سی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ "کیا سب یہی سمجھتے ہیں کہ میں


ناولٹ
چھٹی اور آخری قسط

اب جینا چھوڑ دوں گی۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ میں محبتوں کا ماتم کیوں کروں؟" ہلکی ہوا سے آگ میں لپٹا دوپٹا اڑ رہا تھا۔ بیلا بنت فاروق روش پر چلتی جا رہی تھی۔ چلتی جا رہی تھی۔
منٹو ہال کی کھڑکیوں سے اب بھی آواز فضا میں تیر رہی تھی۔

رانجھا جوگی' میں جوگیانی کملی کر کر سڈیاں
ماس جھڑے پنجر ہوئیاں کڑکن لگیاں ہڈیاں

سجن بن راتاں ہوئیاں وڈیاں
نی سیو ۔۔ اسیں نیناں دے آکھے لگے

جنھاں پاک نگاہاں ہوئیاں کہیں نہ جاندے ٹھگے
کالے پٹ نہ چڑھے سفیدی کاگ نہ تھیندے بگے



خوشبوؤں کے شہر پیرس میں بھی شام اتری ہوئی تھی' گزشتہ روز ہونے والی بارش کی وجہ سے سڑکیں گیلی تھیں۔ فیریا اور جیکسن باف ٹیکسی میں سفر کر رہے تھے۔ دونوں کے درمیان خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ فیریا کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔
"ایک بات بتائیں گے؟" اس نے گردن موڑ کر پوچھا تھا۔ وہ محظوظ سا مسکرائے تھے۔
"تم سو باتیں بھی پوچھ سکتی ہو۔" وہ سرہلا گئی تھی۔
"یہ پیرس آج مجھے بدلا بدلا سا کیوں لگ رہا ہے؟"
وہ الجھن میں مبتلا نظر آ رہی تھی۔ جیکسن باف جیسے سوچ میں پڑ گئے تھے۔
"کیا تم میں ایک سچ سننے کا حوصلہ ہے؟" وہ گردن موڑ کر خفگی سے انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔
"میں سو سچ بھی سن سکتی ہوں۔" انہوں نے بغور اسے دیکھا تھا۔
"پیرس تو ویسے کا ویسا ہی ہے فیریا۔ بس تم بدل گئی ہو' تمہارا دل بدل گیا ہے۔ دیٹس اٹ۔" وہ خاموش ہو گئی تھی۔ جیکسن نے ٹیکسی ڈرائیور کو ڈانٹا تھا۔
"یہ ٹیکسی ہے یا گدھا گاڑی۔" وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر تیز دوڑانے لگا تھا۔ فیریا نے اب کے گردن موڑ کے انہیں نہیں دیکھا تھا۔
"کیا دل کے بدلنے سے سب بدل جاتا ہے؟" وہ سوال جیکسن کو بھید ابھرا لگا تھا۔
"ہاں سب بدل جاتا ہے۔ میں تقریباً "سو سے زائد ناکام محبتیں کر چکا ہوں۔" جانے وہ سچ تھا یا پھر۔۔۔
"واقعی؟" اسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔
"تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" وہ خفا ہوئے تھے۔
"نہیں۔۔۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیا کیسے ہو سکتا ہے؟"
"یہی کہ بار بار محبت کی جائے۔" وہ ہنسے تھے' ان کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔
"مائی ڈیر فیری۔۔۔ یہ جو دل ہوتا ہے نا اسے یوں سمجھو جیسے کرائے کا مکان ہے جہاں نئے نئے کرائے دار آتے رہتے ہیں۔ ہر نیا پرانے کی جگہ لے لیتا ہے۔ اسی طرح تو ہوتا ہے اور یوں ہی ہونا بھی چاہیے۔"
"کیوں ہونا چاہیے؟" وہ ارد گرد بھاگتے مناظر کو دیکھ رہے تھے۔
"انسان محبت میں مرنے سے بچ جاتا ہے۔" کتنی گہری بات تھی اور کتنی سادہ تھی۔ وہ دونوں اب خاموش ہو کر ارد گرد کے مناظر دیکھنے لگے تھے۔ ٹیکسی اب پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔
ادھر کیفے میں وہ دونوں ایپرن باندھے ڈش واشر کے پاس کھڑے تھے۔ ڈیرک کپ پکڑا رہا تھا اور ماریا نا دھو رہی تھی۔
"تم واقعی سیریس ہو؟" ڈیرک کو یقین نہیں آ رہا تھا۔
"ہاں تو۔۔۔" وہ بے نیازی کپ دھو کر اسٹینڈ میں رکھ رہی تھی۔

"میں اس سین کی ویڈیو بنانا پسند کروں گا۔" اس نے مطلع کیا تھا۔

"اور میں تمہارے بتیس کے بتیس دانت توڑنا پسند کروں گی۔" وہ ڈر کے پیچھے ہٹا تھا۔

"تم کتنی خوف ناک ہوتی جا رہی ہو ماری۔" ماریانا نے ہاتھ پونچھے تھے۔ ایپرن اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا اور موبائل لے کر بیٹھ گئی۔

"کیا کرنے لگی ہو؟" وہ متجسس سا اس کے پاس ہی چلا آیا تھا۔

"تم ذرا دیر کو چپ رہو گے کنڈیلے چوہے۔" ڈیرک صدماتی حالت میں بیٹھ گیا تھا۔

"ہیلو... جی آپ کتنی دیر میں پہنچیں گے؟" وہ دوسری طرف کا جواب سن رہی تھی۔

"جی... اوکے..." موبائل دور اچھال دیا تھا۔

"وہ آرہے ہیں۔" ماریانا نے اطلاع دی تھی۔ ڈیرک جیسے سکتے میں تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

"ماریانا..." وہ سرگوشی ماریانا نے بمشکل سنی تھی۔ نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"ہاں...؟"

"وہ بھی آرہا ہے کیا؟"

"نہیں... میں تمہیں سو بار بتا چکی ہوں۔" وہ ناراض ہوئی تھی۔

"تم فیریا کے سامنے میری گواہی دو گی نا کہ میں نے ان دونوں کو بددعائیں نہیں دیں۔" وہ نم سا مسکرائی تھی۔

"نہیں... میں بس خاموش رہوں گی۔" وہ بھناتا ہوا اٹھ کر کوکنگ رینج کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"تم بہت بری ہوتی جا رہی ہو۔" وہ کھڑکیوں کے پار اتری شام دیکھتی رہی تھی۔ روشنیاں گلاس ونڈو کے پار بکھری تھیں۔

"تم کیا کر رہے ہو اب؟"

"کافی بنانا چاہ رہا ہوں۔"

"تم اچھے کافی میکر نہیں ہو۔" ماریانا نے اسے آئینہ دکھا دیا تھا۔

"مگر آج اسے میری بنائی ہوئی کافی کی ہی ضرورت ہو گی۔" وہ کافی پھینٹ رہا تھا۔

"اور ایسا کیوں ہو گا؟" وہ جواب جاننے میں دلچسپی رکھتی تھی۔

"کیونکہ میں اس کافی میں اپنی محبت کی شیرینی گھولنے لگا ہوں۔" وہ سر ہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ٹیبل سیٹ کر رہی تھی۔ کوکنگ رینج کے پاس کھڑا وہ ماریانا کو دیکھے گیا تھا۔

"یہ ٹشو پیپرز کے تین ڈبے رکھنے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔" وہ اب کینڈل اسٹینڈ کی موم بتیاں ٹھیک کر رہی تھی۔

"جہاں محبت کے جنازے پڑھے جائیں، وہاں ٹشو پیپر لازمی ہیں۔" ماریانا نے پلٹ کر کہا تھا۔ وہ ایپرن کی ڈوری کھول رہا تھا۔

"میں تو لال گلاب ہی رکھوں گا۔" وہ ہولے ہولے چلتی گلاس ونڈو کے پاس جاکھڑی ہوئی تھی۔

"ہاں... تمہیں رکھنے چاہئیں۔" وہ دونوں اسٹیچو بنے ونڈو کے پار دیکھتے رہے۔ آنکھیں تھیں کہ تھکتی ہی نہ تھیں۔ انتظار تھا کہ مرتا ہی نہ تھا۔ کیفے میں ڈوریوں پر لٹکتے بلبوں کی ملگجی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

Let the world stop turning
Let the sun stop burning
Let them tell me love's not
worth going through
If it all falls apart
I will know deep in
my heart
only dream that mattered
The
had come true
In this Life i was
loved by you

وہ کیفے کا گلاس ڈور دھکیلتی اندر داخل ہوئی تھی۔ کیفے میں وائلن کی دھن بج رہی تھی۔ دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں جانب ڈیرک کھڑا تھا اور وہ دنیا کا سب سے خوب صورت شخص نظر آرہا تھا۔ خوب صورت شخص دنیا کی خوب صورت ہنسی ہنسا تھا۔

"ویلکم فیریا۔" اور فیریا تو ٹکٹکی باندھے ماریانا کو دیکھ رہی تھی جو سر جھکائیں تو امان پائیں کی تفسیر بنی کھڑی تھی۔ فیریا ہولے ہولے چلتی اس تک آئی تھی۔

"آئی ایم سوری ماری۔ کیا نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گی۔" ماریانا نے نظر نہیں اٹھائی تھی۔ اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور فیریا کے گال پر پڑا تھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو اپنے آپ کو' جب چاہو گی' جیسے چاہو گی منہ اٹھا کر چل دو گی۔ جہاں جواب کا پہلے سے علم ہو وہاں سوال نہیں دہراتے۔ تم نے یہی کیا اور اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ میں تمہیں خالی ہاتھ نہیں دیکھ سکوں گی۔ میں واقعی نہیں دیکھ سکتی فیریا۔ تم نے مجھ سے تو پوچھا ہوتا۔ تم اپنا آپ تو بکھر ہی چھوڑ آئی ہو گی۔ اب یہ فیریا مجھے نہیں چاہیے۔" ماریانا رو رہی تھی۔ جیکسن سامان اندر لا رہے تھے۔ ٹھٹک گئے۔ ڈیرک بھی ساکت کھڑا تھا۔ فیریا گالوں پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ ماریانا سسکیاں لے رہی تھی۔ "میں نے کتنا کہا تھا کہ مر جانا' مگر محبت نہ کرنا... مگر تم نے کرلی... کیوں فیریا؟" وہ اسے جھنجوڑ رہی تھی۔

"پتا نہیں ماریانا... کب کیسے ہو گئی۔ مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ اگر مجھے پتا ہوتا' اس کی ہیپی اینڈنگ نہیں ہو گی تو کبھی بھی نہ کرتی۔" وہ اذیت سے مسکرائی تھی۔ ماریانا نے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔ وہ دونوں رونے لگی تھیں۔

"وہ کیوں نہیں آیا؟" وہ سرگوشیاں بڑی دکھ بھری تھیں۔

"وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔"

"کس سے کرتا ہے؟" فیریا کے ذہن میں بیلا کی تصویر ابھری تھی۔

"ہے ایک لڑکی۔" "بہت خوب صورت ہے؟"

"پتا نہیں..." ماریانا نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

"خبردار اگر اب ایک بھی آنسو بہایا تو..." فیریا نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ ڈیرک نے جیکسن کو اشارہ کیا تھا۔

"اوہو سلی گرلز... کافی پیتے ہیں۔" وہ چاروں ٹیبل کے گرد بیٹھ گئے تھے۔ کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ فیریا نے کیفے میں نظر دوڑائی تھی۔

"تم نے وائٹ اور پنک پینٹ کروالیا؟" وہ چونکی تھی۔

"آہاں... تمہیں پسند تھا نا... تمہیں اچھا لگا؟" فیریا سفید اور گلابی دیواروں کو دیکھتی رہی تھی۔

"ہاں... اچھا ہے۔" وہ ٹیبل پر خالی کپ رکھتی

چونکی تھی۔
"یہ ریڈ روز کون لایا؟" وہ لال گلابوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور ڈیرک باف اسے دیکھ رہا تھا۔
"میں لایا تھا۔"
"مگر اب مجھے لال گلاب اچھے نہیں لگتے؟" ڈیرک کے دل میں کہیں اذیت سی اٹھی تھی۔
"کیوں..." مجھے لال گلابوں سے اب موت کی بساند آتی ہے۔" محبت موت ہو گئی اور پیرس اسٹریٹ پر پھرنے لگی۔
"تمہیں پتا ہے میری روسی بلی نے چار بچے دیے ہیں اور ان میں سے دو بچے میں تمہیں دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" وہ اشتیاق سے آگے جھکی تھی۔
"کیا وہ بھورے رنگ کے ہیں اور ان کی آنکھیں نیلی ہیں؟" وہ مشکوک سے ہوئے تھے۔
"تمہیں کیسے پتا؟" فیریا نے قہقہہ لگایا تھا۔
"بس مجھے پتا ہے۔" ماریانا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ فیریا ٹھٹکی تھی۔ "ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"
"جھوٹے قہقہے لگا کر یہ مت ثابت کرو کہ تم خوش ہو اور اس سب سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔" فیریا آنکھیں نہیں جھپک سکی تھی۔ ماریانا نے ڈیرک کو مخاطب کیا تھا۔
"مسٹر ڈیرک کیا تم میرے ساتھ کپ دھلوانا پسند کرو گے؟" وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"اوہ... یس..." وہ دونوں کپ دھو رہے تھے۔
"تم نے اسے ہرٹ کر دیا۔" ماریانا نے کپ کو پانی کی دھار تلے کیا تھا۔
"میں نہیں چاہتی کہ وہ آگے ساری زندگی ہرٹ ہوتی رہے۔ جو ہونا ہے ابھی ہو جائے۔"

☆ ☆ ☆

بیلا لائبریری میں بیٹھی ایک اسائنمنٹ پر کام کر رہی تھی، جبکہ وہ تینوں دو منٹ کا کہہ کر آدھے گھنٹے سے غائب تھیں۔ وہ ارد گرد سے بے نیاز اپنے کام میں مگن تھی۔ منعم کب وہاں آ کر بیٹھ گیا اسے خبر نہ ہوئی

تھی۔

"میری طرف نظر اٹھا کر دیکھ لو' اتنا برا بھی نہیں ہوں۔" وہ چونکی اور سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"میں ذرا بزی تھی' تم کب آئے؟" منعم نے سادگی میں گندھی اس لڑکی کو نظر بھر کے دیکھا تھا۔ کتنی خاص ہوگئی تھی وہ اس کے لیے۔

"تم نے دیکھا ہی نہیں۔" جانے شکوہ تھا یا کچھ اور۔۔۔

"کام سے فرصت ملے تو کہیں اور دیکھوں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دبا رہی تھی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو بیلا؟" وہ سر ہلاتے کہنے لگی تھی۔

"بس سر میں ذرا درد ہے۔" وہ اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آؤ کینٹین سے پیناڈول لے لینا۔" بیلا اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی' جو وہ تھامے ہوئے تھا۔ "آئی ایم سوری" وہ کھسیا گیا تھا۔ وہ ہاتھ چھڑاتی فائلز سمیٹتی آگے بڑھ گئی تھی۔ ہوا کے نرم جھونکے تھے۔ سفیدے کی مہک فضا میں تیر رہی تھی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ وہ قائداعظم بلاک کے سامنے سے گزر رہے تھے' جب اسد اچانک سامنے آیا تھا۔

"مس بیلا۔۔۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" منعم ٹھٹک گیا تھا۔ بیلا نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

"سوری۔۔۔ راستہ چھوڑیں۔" وہ اسد کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی تھی۔ سیڑھیوں کے پاس اب وہ دونوں کھڑے تھے۔

"اسد میں تمہیں وارن کر رہا ہوں کہ میرے معاملات میں مت آنا۔" اسد خبیث سی ہنسی ہنسا تھا۔

"اوہ ہو۔۔۔ میں ڈر گیا' تمہارے رعب میں آگیا ہوں۔" منعم کو تاؤ آیا تھا۔

"تم حد سے گزر رہے ہو۔" اسد سیڑھی پر بیٹھ گیا۔

"تم جو لو برڈ بنے گھومتے ہو اور ہم پر پابندیاں لگاتے ہو۔ تم مجھے حرا کے فوٹوز دے دو۔ بس پھر میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا۔" منعم مضبوط قدموں سے چلتا اس تک آیا تھا۔

"کسی بھول میں مت رہنا۔ تم کسی زمانے میں میرے دوست رہے ہو' مگر تم تو آستین کے سانپ نکلے۔ تمہاری دوستی پر مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔" منعم آگے بڑھ گیا تھا' جبکہ اسد دانت بھینچتا وہیں سیڑھیوں پر بیٹھا رہا تھا۔ ارد گرد سے اسٹوڈنٹس گزر رہے تھے۔ وہ کینٹین آیا تو بیلا کو تنے تنے چہرے کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔

"میں نے تمہیں کتنا کہا تھا کہ ایسے لوگ دوستی کے لائق نہیں ہوتے' مگر تم نے میری بات نہیں مانی۔ اگر تم نے مستقبل میں ان سے یارانے گانٹھنے ہیں تو اجازت ہے۔ پھر مجھ سے بات مت کرنا۔" وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔

"تم ایسا کیسے کہہ سکتی ہو بیلا۔"

"کیوں نہیں کہہ سکتی۔ آج ایک راستہ روکے کھڑا ہوا ہے' کل سو اور آجائیں گے۔ میں کس کس کو روکوں گی؟ تمہیں فرق نہیں پڑتا منعم' مگر مجھے فرق پڑتا ہے۔" بیلا کے لہجے نے منعم کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

"کیا واقعی مجھے فرق نہیں پڑتا؟" اسے دکھ ہوا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ تمہیں فرق پڑے گا۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بیگ کندھے پر لٹکایا اور فائلز ہاتھوں میں پکڑ لیں۔

"ایک نظر پیچھے ڈال لو۔ تمہارے دوست ادھر ہی متوجہ ہیں۔ قابل ذکر بات ان کے دیکھنے کا انداز ہے اور میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔" منعم کو اچانک غصہ آیا تھا اور اس نے بیلا کا ہاتھ پکڑا تھا۔

"تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو۔۔۔ صرف تمہارا کردار پاک شفاف ہے' باقی سب بدکردار ہیں۔" لمحوں کی بات تھی' ساعتوں کا کھیل تھا۔ غصے میں وہ آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا۔ وہ آنسو بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دو منعم۔۔۔ مجھے درد ہو رہا ہے۔" منعم نے ہولے سے ہاتھ چھوڑا تھا۔ "تم کہہ سکتے ہو۔۔۔ کیونکہ تم لڑکے ہو۔" وہ روتی ہوئی جا رہی تھی۔

پیچھے بھاگا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا۔

"بیلا... رکو۔" وہ نفی میں سر ہلاتی جا رہی تھی۔ "میری بات سنو۔" مگر وہ رکی نہیں تھی' آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ سر تھام کے رہ گیا تھا۔

"تم نے بیلا کو کیا کہا ہے؟" منعم نے سر اٹھا کر دیکھا تھا اس کے سامنے صدف کھڑی ہوئی تھی۔

"سوری... اٹس پرسنل۔" وہ چند ثانیے دیکھتی رہی تھی۔

"اٹس اوکے۔" وہ سارا دن بیلا نے خاموشی میں گزارا تھا اور ان سب کے سوالوں کا جواب بھی ہوں ہاں میں دیا تھا۔ صدف نے یہ سب نوٹ کیا تھا اور جو اس نے محسوس کیا تھا وہ اسے پریشان کرنے کو کافی تھا۔

"بیلا اور منعم... مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اسے چند روز قبل بیلا کے کہے گئے الفاظ یاد آئے تھے۔

"یہ جو ہم گاؤں کی لڑکیاں ہوتی ہیں نا جب شہر کی زمین پر قدم رکھتی ہیں تو اپنے باپ کی پگڑی سر پر رکھ کر آتی ہیں۔ ذرا سی لغزش' ذرا سی لڑکھڑاہٹ وہ عزت کی پگڑی گرا دیتی ہے۔" بیلا بھی تو گاؤں سے آئی تھی۔ اپنے سر پر بابل کی پگڑی تو وہ بھی رکھتی تھی۔ اسے لڑکھڑانا نہیں تھا۔ مگر "م" سے شروع ہوتا یہ لفظ ہر چیز سے منکر کر دیتا ہے اور اسی بات سے صدف رحیم خوف کھا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

لاتعداد دھکے کھانے کے بعد بھی جب بستی کھوکھر کے آثار نظر نہ آئے تو روشی کو تشویش سی ہوئی تھی۔

"بیلا تمہارا گھر کہیں کے ٹو پر تو نہیں؟" کٹی پھٹی سڑک پر تانگا ڈول رہا تھا۔ دھان کے کھیت دور' دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ بوڑھے کسان ٹولیوں کی صورت میں نظر آئے تھے۔ موسم خوش گوار تھا۔

"بس پہنچنے والے ہیں' ذرا صبر تو کرو تم' بستی کھوکھر بار ہی ہو' بانو بازار نہیں۔" تانگے کی پچھلی سیٹوں پر بیلا اور روشی بیٹھی تھیں' جبکہ صدف اور ریحانہ اگلی طرف بیٹھی تھیں۔

"واؤ... اتنے سارے گلاب... یہ کس کے کھیت ہیں؟" بیلا نے لال چادر بنے کھیت کو دیکھا تھا۔

"یہ گورچھا خاندان کے ہیں۔" کھیتوں میں کام کرتی عورتیں' انہیں اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔ پگڈنڈی پر اب تانگا دوڑ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فاروق احمد کے گھر کے دروازے پر تھیں۔ محلے کے بچے ان کے گرد جھرمٹ ہو گئے تھے۔ صدف نے دہائی دی تھی۔

"اتنا سفر کر کے اب تو جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔" ریحانہ اپلوں سے سجی دیواریں دیکھ رہی تھی۔

"ڈراموں میں ہی گاؤں کی زندگی کو دیکھا تھا' اب اصل میں تجربہ ہو رہا ہے' تو کتنا اچھا لگ رہا ہے۔" بیلا نے دروازے پر دستک دی تھی... ایک منٹ... دو... تین... پھر جیدی دروازے پر آیا تھا اور انہیں دیکھ کر چیختا چلاتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ گاؤں میں یوں ہی ہوتا ہے' مہمانوں کی آمد کا اعلان ایسے ہی تو کیا جاتا ہے۔

"اماں بیلی کی سہیلیاں آئی ہیں۔" بیلی نے ان تینوں کو مخاطب کیا تھا۔

"آؤ... آؤ... اندر آجاؤ۔" وہ جھجکتی ہوئی اندر آئی تھیں۔ سامنے سرخ اینٹوں سے بنا طویل صحن تھا۔ الگ حصے میں مویشی بندھے تھے۔ آم اور دھریک کے سایہ دار درخت تھے۔ جن سے انگور کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ پرندوں کا شور تھا۔ اماں بھاگی بھاگی آئیں۔

"بسم اللہ... جی آیاں نوں۔" وہ باری باری ان سے گلے ملنے لگی تھیں۔ ابا بھی وہیں چلے آئے تھے' ان کے سر پر ہاتھ رکھ کے دعائیں دی تھیں۔

"بیلا کو کہا بھی تھا کہ میں لینے آجاتا ہوں' مگر منع کر دیا کہ بس تانگا بھجوا دینا... خیر... سفر کیسا گزرا؟" وہ دھریک کی چھاؤں تلے بچھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ اماں لسی لے آئیں تو وہ مزے سے لسی پینے لگی تھیں۔ جیدی شرم سے دھریک کے تنے کے پیچھے چھپ رہا تھا' روشی نے کان سے پکڑ لیا تھا۔

"بڑے اچھے مہمان نواز ہو بھئی۔" وہ شرمندہ سا

پاس بیٹھ گیا تھا' سب ہنسنے لگے تھے۔ وہ وہیں چھاؤں تلے بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔
"آپ کا گاؤں بہت اچھا اور پر سکون ہے۔" اماں ہنسی تھیں۔
"ہاں بیٹا۔ شہر جیسی گہماگہمی نہیں ہے' سیدھے سادے لوگ ہیں۔" ریحانہ نے پھدکتی چڑیوں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
"جی آنٹی واقعی۔" اماں خفگی سے بولی تھیں۔
"اماں ہی کہو تم لوگ.... میرے لیے تم بیلی جیسی ہو۔" صحن میں اچانک بھونچال آگیا تھا' ابا اور جیدی دیسی مرغ پکڑنے میں لگے تھے۔ وہ دلچسپی سے یہ منظر دیکھتی رہیں۔ روشی کا خیال سب نے سنا۔
"ویڈیو نہ بنالوں؟" صدف نے تیکھے چتون سے دیکھا تھا۔
"تمہاری گردن نہ مروڑ دوں۔" صحن میں دھول اڑتی رہی۔ ابا نے ریتی سے چھری تیز کرکے مرغ حلال کیا تھا۔ کتنی سادگی تھی اور کتنا حسن تھا۔ بھوری مرغی اپنے چوزوں کی فوج کے ساتھ مٹرگشت کر رہی تھی۔ بیلا کی سہیلیاں ملنے آگئی تھیں اور سب ہی انہیں اپنے اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئی تھیں۔ ان کا خلوص اور محبت دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئی تھیں۔ سہ پہر نارنجی رنگ میں رنگ گئی تھی۔ وہ صبح سے بھوکی پیاسی تھیں تو اماں نے دیسی مرغ کے ساتھ چاول اور میٹھے میں کھیر بھی بنائی تھی۔ اتنی لذت اور ذائقہ انہوں نے کبھی نہیں چکھا تھا۔
"اماں آپ کے ہاتھ میں تو بہت لذت اور ذائقہ ہے' یہ کیسے آیا؟" یہ سوال روشی کا ہی تھا۔
"بس چھوٹی عمر سے ہی گھرداری سیکھ لی تھی تو میری اماں اور دادی نے مجھے طاق کر دیا۔" بیلا مسکرا رہی تھی۔ ریحانہ مزے لے لے کر کھیر نوش فرما رہی تھی۔
"واقعی میں نے آج تک ایسی مزے کی کھیر نہیں کھائی۔" ابا حقہ گڑگڑا رہے تھے۔
"ارے اتنا سر نہ چڑھاؤ۔" اماں نے طنزیہ نظروں سے ابا کو دیکھا تھا۔

"آپ تو چپ ہی رہیں' جلنے والی عادتیں کب چھوڑیں گے آپ۔" وہ ساری ہنس دی تھیں۔ کٹ کٹ کٹاک کی آواز سے گھر گونج رہا تھا۔ جیدی مرغیاں' چوزے پکڑ پکڑ کر ان کے ٹھکانے پر پہنچا رہا تھا۔ روشی نے دو چوزے پکڑے تو مرغی کی ناگواری کا سامنا کرنا پڑا۔ سارے آنگن میں چھڑکاؤ کیا گیا تھا اور اب مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔
"بیلا کتنی بڑے بڑے گھر ہیں یہاں کے۔" روشی نے طویل صحن کو دیکھا تھا۔
"ہاں یہاں گھر واقعی وسیع ہی ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ دل بھی.... سادہ لوگ ہیں' سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔" وہ شام کو اکٹھی بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔
"آب و ہوا کتنی خالص ہے یہاں کی۔"
"خیر.... کاش گاؤں میں سہولیات میسر ہوں تو زندگی آسان ہو سکتی ہے۔" پھر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ رات ہوئی' اندھیرا چھایا۔ آسمان پر چاند کی ٹکیہ سج گئی تھی۔ ابا کے گرد وہ بیٹھ گئی تھیں۔ ابا قصہ گو بن گئے۔ وہ مزے لے لے کر سنتی رہی تھیں۔ اماں نے سوکھا ساگ گلنے کے لیے تندور میں رکھا تھا' سوکھے ساگ کی خوشبو چاروں اطراف میں بکھر گئی تھی۔ ابا نے ہلکی چاند کی روشنی میں بیلا کو دیکھا تھا جو روشی کی سرگوشی پر مسکرا رہی تھی۔
"اسے بچپن سے ہی پڑھنے کا شوق تھا' جب لڑکیاں گڑیا گھر کھیلتی ہیں' تب بھی یہ تختی لکھتی تھی اور قاعدے پڑھتی تھی۔ پہاڑے تو اس نے چھوٹی سی عمر میں یاد کر لیے تھے۔ اے بی سی تو مجھے دن میں کوئی دس بار ضرور سناتی تھی۔ جتنا اس نے پڑھا ہے ہماری بستی کی کوئی لڑکی نہ پڑھ سکی۔ اعتبار کا زمانہ پہلے بھی نہ تھا' آج بھی نہیں ہے' جانے عورت کو اعتبار کیوں نہیں ملتا۔ وہ صدیوں اس کی ریاضت کرتی ہے۔ مگر میں نے اپنی بیٹی کو اعتبار دیا اور مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی کبھی بھی میرا اعتبار نہیں توڑے گی۔" وہ اندھیرے میں ساکت بیٹھی تھی۔ چاند بادلوں کی اوٹ سے نکلا تھا' صدف نے بغور اسے دیکھا تھا' نین کٹورے پانیوں

سے بھر گئے تھے۔ اماں نے تھال میں ٹھنڈے پانی میں آم رکھے تھے۔ وہ آم کھانے لگی تھیں۔

"تمہارے باغ میں ہیں آم کے بوٹے۔" جیدی کی روشی سے کچھ زیادہ ہی بن گئی تھی۔

"ارے واہ... تمہارے تو مزے ہوں گے پھر..." اماں ہنسی تھیں۔

"ارے بیٹی کیا بتاؤں' دن کے بارہ گھنٹے تو درختوں پر باندر کی طرح پھدکتا رہتا ہے۔" باندر مزے لے لے کر آم کھا رہا تھا' ذرا جو فرق پڑا ہو۔

"یہاں چاند کی کتنی روشنی ہے۔" ریحانہ دیواروں پر بکھرتی چاندنی دیکھ رہی تھی۔ بیلا اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"چلو باہر چلتے ہیں۔" وہ حیران ہوئی تھیں۔

"اس وقت؟"

"ہاں تو کیا ہوا؟" گلی میں واک کرتے ہیں' چاند کی روشنی تو ہے ہی۔ کچھ دیر بعد وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی طویل گلی میں ٹہل رہی تھیں۔ قریبی گیٹ پر انگوروں کی بیلیں تھیں' جن پر پکے ہوئے گچھے لٹک رہے تھے۔ بیلا اور صدف نے پہرا دیا تھا' جبکہ صدف باتیں بھی کرتی رہی تھی۔ روشی نے انگور توڑتے کہا تھا۔

"میں تو خود کو اس وقت کسی ہارر مووی کا کردار محسوس کر رہی ہوں۔"

"محسوس کرنے کی کیا بات ہے' وہ تو تم پہلے سے ہو۔"

"اللہ کے واسطے چپ ہو جاؤ' خود بھی مرو گی اور ہمیں بھی مرواؤ گی۔" خاموشی سے توڑے گئے انگور بے تحاشا شور کے ساتھ قہقہے لگاتے ہوئے کھائے گئے تھے۔

"کتنا اچھا لگ رہا ہے نا۔" روشی نے انگور اچھال کر منہ میں ڈالا تھا۔

"میں اور جیدی تو گرمیوں میں یوں ہی کرتے ہیں۔" بیلا نے انہیں مطلع کیا تھا۔

"انگور کون توڑتا ہے اور پہرا کون دیتا ہے؟"

"میں انگور توڑتی ہوں اور جیدی پہرا دیتا ہے۔" روشی گھر کے سامنے کھڑے پر بیٹھ گئی تھی۔

"میں تو تھک گئی ہوں۔" وہ تینوں ٹہلتی رہی تھیں۔ روشی اور جیدی باتوں میں مگن رہے تھے۔ اماں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تھا۔

"لڑکیو... آج رات تم نے سونا بھی ہے یا نہیں۔"

"آرہے ہیں اماں۔" کچھ دیر بعد وہ آکر سو گئی تھیں۔ چاند کی ٹکیہ اپنا سفر مکمل کر رہی تھی۔ ساگ کی مہک اب بھی پھیلی ہوئی تھی۔

صبح ہوئی تو نظر صحن میں بیٹھے بچوں کی فوج پر پڑی تھی۔

"یہ اتنے سارے بچے برتن لے کر کیوں آئے ہیں؟" وہ بالوں میں کیچر لگا رہی تھی۔

"لسی لینے آئے ہیں۔" اماں مدھانی سے مکھن نکال رہی تھیں' لسی لے کر وہ سارے بچے ایک ایک کر کے جانے لگے تھے۔ ناشتے کے بعد ابا انہیں کھیتوں کی طرف لے آئے تھے۔ بستی کھوکھر کے طویل میدان میں بچے کوکلا چھپاکی' پٹھو گرم' اور کنچے کھیل رہے تھے بلکہ کچھ پتنگیں بھی اڑا رہے تھے۔ رنگ برنگی پتنگوں سے آسمان سجا ہوا تھا۔ گلاب کے کھیتوں کو دیکھ کر وہ مسحور ہو گئیں' تاحد نظر جیسے سرخ چادر بچھی ہوئی تھی۔ ابا انہیں باغ لے آئے تھے۔ آم' جامن اور آڑو کے پیڑ تھے۔ ریحانہ تو گلہریوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ ابا نے جھولا ڈال دیا تو وہ جھولا جھولنے لگی تھیں۔

"ہائے دل چاہ رہا ہے یہیں رہ جاؤ۔" یہ اداس سا جملہ روشی کے منہ سے برآمد ہوا تھا۔ ریحانہ آم کے تنے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

"تو رہ جاؤ نا۔"

"کاش یہ ممکن ہوتا۔" ٹھنڈی سانس بھری گئی تھی۔ صدف لسوڑے کھا رہی تھی۔

"ایک طرح سے یہ ممکن ہو سکتا تھا۔" روشی نے لمبا جھونٹا لیا تھا۔

"مگر وہ کیسے؟" صدف شرارت سے ہنسی تھی۔

"جیدی اگر بڑا ہوتا تو بیلا تمہیں اس کے لیے مانگ لیتی۔" ابھی وہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ بیلا کی سہیلیاں چولہے 'کڑاہی' لے کر آگئی۔

"آج یہاں پنجیری بنائیں گے۔" باغ کے گرد دیواریں تھیں۔ ایک ہی آمدورفت کا دروازہ تھا۔ ریحانہ نے بیلا کو مخاطب کیا تھا۔

"تمہاری دوستیں بہت اچھی ہیں۔" اینٹوں سے چولہا بناتی کلثوم نے انہیں دیکھا تھا۔

"آپ لوگ بھی بہت اچھی اور پیاری ہیں۔"

"بہت شکریہ کلثوم۔" چٹائی بچھادی گئی تھی۔ تین چولہے قطاروں میں لگ گئے تھے۔ سوجی بھننے کی اشتہا انگیز خوشبو پھیل گئی تھی۔ کلثوم اور آمنہ پنجیری بنارہی تھیں۔ ریحانہ انہیں میوے کاٹ کردے رہی تھی۔ رضیہ اور سکینہ کڑھائی کررہی تھیں۔ روشی دنگ رہ گئی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ... اتنی خوب صورت۔" وہ شرما گئی تھیں۔ پرندے چونچ مار کے جامن گرا رہے تھے۔ جیدی آم کے پیڑ پر ٹنگا ہوا تھا اور وہیں سے آم توڑ کر روشی کی طرف پھینک رہا تھا۔ جو دوپٹا پھیلائے کھڑی تھی۔ انہوں نے ایسی بے فکری' آزاد اور سکون والی زندگی کبھی نہیں دیکھی تھی۔

بستی کھوکھر میں زندگی اپنے پورے حسن کے ساتھ نظر آتی تھی۔ اماں روٹیاں پکا کر وہیں لے آئی تھیں۔ سوکھے ساگ کے ساتھ اچار بھی تھا۔ باغ خوشبوؤں سے جیسے بھر گیا تھا۔ وہ ان کی زندگی کے سب سے خوب صورت دن تھے۔ وہ ایک ہفتہ رکی تھیں اور یہ وقت یادگار تھا۔ واپسی پر اماں نے انہیں کڑھائی کیے جوڑے اور ڈھیروں سوغاتیں دی تھیں۔ واپس انہیں ابا ہوسٹل چھوڑنے آئے تھے۔

چنبیلی فرش دھو رہی تھی۔ خوشی سے اچھلی "ہائے... تم آگئیں... سچی میرا تو دل بالکل نہیں لگ رہا تھا۔" وہ ان کے گلے مل رہی تھی۔

"ہم نے بھی تمہیں بہت مس کیا۔" وہ سامنے سے آتی کفی کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"تو تم لوگ آخر لوٹ آئیں۔ تم لوگوں کے بغیر ہوسٹل ویران ہوگیا تھا' کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ تم لے لو میری تو بھوک ہی مرگئی' ایک نوالہ بھی جو منہ میں ڈالا ہو تو..."

چنبیلی نے ہنستے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔ "کل فرینڈز سے پزا ڈیلیوری تو میرے لیے منگوائی تھی نا اور جو برسوں بریانی اڑائی تھی۔" بھانڈا چوراہے میں پھوٹا تھا مگر عفی کو مطلق پروانہ ہوئی تھی۔

"ارے تم لوگ اندر آؤ' بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" وہ اندر چلی گئیں تو چنبیلی گنگناتے ہوئے فرش دھونے لگی تھی۔

میرے دل کو جلانے والے
خدا کرے تیرا دل بھی ٹوٹ جائے

☆ ☆ ☆

"ایک بات پوچھوں بیلا؟" صدف نے پینٹنگ بنانا روک کر اسے مخاطب کیا تھا جو ہمیشہ کی طرح کھڑکی میں کھڑی تھی۔

"تمہیں آج کیسے اجازت کی ضرورت پڑگئی۔" بیلا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا جو برش رنگوں میں ڈبو رہی تھی۔

"جانے مجھے کیوں لگا کہ شاید تمہیں میری بات بری لگ جائے۔"

"تم ایسا کیا پوچھنا چاہ رہی ہو۔" اسے حیرت ہوئی تھی۔ شیٹ پیپر پر پیلا رنگ بکھرا تھا۔

"میں نے ایک بات فیل کی ہے۔" وہ اسپرٹ کی بوتل کا ڈھکن کھول رہی تھی۔

"کیا بات؟" اب وہ پوری کی پوری صدف کی طرف متوجہ تھی۔ پیپر پر نیلا رنگ بکھر گیا۔

"مجھے لگتا ہے منعم علی تمہارے لیے خاص فیلنگز رکھتا ہے۔" بیلا نے دل کو زور' زور سے دھڑکتے پایا تھا۔ دل سیٹی ہوگیا' بجنے لگا۔

"نہیں... نہیں... تمہیں غلط لگا۔" وہ برش کو سرخ رنگ میں ڈبو رہی تھی۔

"مجھے غلط نہیں لگا بیلا۔ آئی سوئیر۔۔۔ یہ سچ ہے' میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے محبت دیکھی ہے۔ پہلے مجھے لگا میں غلط ہوں' مگر پھر مجھے لگا میں غلط نہیں تھی' یہ سب سچ ہے۔" بیلا نے دل پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اس کا لہجہ کپکپا گیا تھا۔

"صدف یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے۔"

"تم حقیقت کیوں جھٹلا رہی ہو بیلا۔۔۔ اس چیز کو تم بھی سمجھ چکی ہو۔ مگر نظر انداز کر رہی ہو۔ میرے یا تمہارے لیے یہ بات اہم نہیں ہے' بلکہ ہمارے لیے تو یہ اہم ہے کہ کیا تم بھی۔۔۔؟" وہ ادھوری بات بیلا کو ساکت کر گئی تھی۔ اسے وہ روشن پیشانی' کھڑی ناک والا خوب صورت شخص یاد آیا تھا۔

"جو خوب صورت مسکراتے ہوں انہیں کم نہیں مسکرانا چاہیے۔"

"تم لڑتے ہوئے بھی اچھی لگتی ہو۔"

"تم نے کبھی اپنی آنکھیں غور سے دیکھی ہیں؟" وہ دونوں قائد اعظم بلاک کے کوریڈور میں سامنے کھڑے تھے۔

"تم میرا پیچھا کر رہے ہو؟"

"نہیں۔۔۔ تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔"

"مگر کیوں؟" وہ زچ ہوئی تھی۔

"مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"مگر مجھے نہیں لگتا۔"

"میں مجبور ہوں۔"

"میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔"

"کیا تم آج کل ہارر موویز دیکھ رہی ہو؟" وہ آگے بڑھ جاتی مگر وہ ساتھ چلتا رہتا۔

"نہیں آج کل تمہیں دیکھ رہی ہوں۔"

"میں اتنا خوف ناک تو نہیں ہوں۔" وہ خفا ہو جاتا ہے اور وہ بے پروا ہی رہتی۔

"ہونہہ۔۔۔ آئینہ نہیں دیکھتے۔"

"نہیں۔۔۔ بس تمہیں دیکھتا ہوں۔" وہ رکتی ہے' پلٹ کر دیکھتی ہے۔

"فلرٹ کر رہے ہو۔" اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو جاتا ہے اور وہ پلٹ جاتا ہے۔ وہ پشت دیکھتی رہی تھی۔

"جن کے دل میں چور ہو منعم علی۔۔۔ وہ یوں ہی پیٹھ موڑ کر چلتے ہیں۔ مگر تم مجھے فلرٹ نہیں لگتے۔" بیلا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ پیپر پر بکھرے رنگ تصویر میں ڈھل گئے تھے۔ ڈھیر سارے گلاب۔۔۔

"مجھ سے ہر بات کی توقع کر لینا صدف۔۔۔ مگر محبت کا نام میرے سامنے مت لینا۔" وہ باہر نکل گئی تھی۔ صدف دیکھتی رہ گئی تھی۔

"آنسو وہی چھپاتے ہیں جن کے دل میں چور ہوتا ہے بیلا۔ میں غلط نہیں تھی۔" تصویر میں سارے رنگ زندہ تھے' بس محبت کا رنگ مر گیا تھا۔



وہ دونوں سڑک پر یوں ٹہل رہے تھے جیسے صدیوں سے ان کا یہی معمول ہو اور اگر اس میں ذرا سا بھی فرق آیا تو ان کی زندگی درہم برہم ہو کر رہ جائے گی۔ ڈیرک نے پتھر کو ٹھوکر ماری تھی۔

"یوں لگ رہا ہے جیسے تمہارا تازہ تازہ بریک اپ ہوا ہو۔" وہ رکا تھا۔

"یہاں پیچ اپ تک نہیں ہوا تو بریک اپ کہاں سے ہو گیا۔" سرمئی سڑک چپ چاپ لیٹی تھی۔ "آپ نے دیکھا وہ اس کے لیے رو رہی تھی۔" ڈیرک کو جانے کیوں رہ رہ کر فیریا کی نم آنکھیں یاد آ رہی تھیں۔

"تو کیا اس کو نہیں رونا چاہیے تھا؟" جیکسن باف نے ہاتھ اپر کی جیب میں ڈالے تھے۔ وہ جوتے کی نوک سے زمین کریدتا کھڑا رہا تھا۔

"اس نے اسے ریجیکٹ کر دیا۔"

"ہر کسی کو محبت پر رونے کا حق ہوتا ہے' تمہیں فیریا کا بھی یہ حق تسلیم کرنا چاہیے۔" وہ آگے آگے چلنے لگا تھا۔ "تم نے پھر کیا سوچا ہے؟" وہ ٹھٹکا تھا۔

"کس بارے میں؟"

"یہی کہ کیا تم فیریا سے بات کرو گے یا نہیں۔" وہ سوال کتنا اہم تھا۔ وہ قریبی بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔

"وہ اسے جانے بھول پائے گی بھی یا نہیں۔" وہ دنیا سے ہارا ہوا نظر آتا تھا۔

"یہ تو تم پر منحصر ہے۔"

"مجھ پر۔۔۔؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"تمہاری محبت میں اتنی طاقت بھی نہیں ہے کیا کہ فیریا کو اس کی پہلی محبت بھول جائے۔" جیکسن باف کے لہجے میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ سا تھا۔ وہ خاموش سا بیٹھا رہا تھا۔ جیکسن نے اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ "میری طرف دیکھو ڈیرک۔۔۔ یہ جو محبت میں ٹوٹنے کے بعد کی حالت ہوتی ہے نا۔۔۔ بہت جان لیوا ہوتی ہے۔ انسان کو کھا جاتی ہے۔ فیریا خود کو بہت بہادر ظاہر کر رہی ہے' مگر وہ نہیں ہے' شاید کوئی بھی نہیں ہوتا۔ وہ نازک لڑکی تمہاری محبت سے جڑ جائے گی۔ تم اسے جوڑ سکتے ہو۔" وہ تسلی تھی' دلاسا یا کچھ اور۔۔۔؟

"پہلی محبت کبھی نہیں بھولتی۔" وہ سنہری لڑکا خدشوں میں گھرا تھا۔ وہ اسے دیکھتے رہے تھے۔

"تمہیں کس نے کہا ڈیرک؟" وہ پوچھ رہے تھے۔ وہ گہری سانس لے کر بولا تھا۔

"لوگ کہتے ہیں۔"

"غلط کہتے ہیں۔" سرمئی سڑک پر گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ دور' دور تک نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ روشنیاں جیسے اندھیرا تھیں۔ من جو اندھیرے کے اندر تھا۔ "دوسری محبت بھی نہیں بھولتی ڈیرک۔" وہ ٹھٹکا تھا۔ پھر انہیں جھنجوڑنے لگا تھا۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں نا۔"

"میں جھوٹا نہیں بولتا۔" وہ ہمیشہ کی طرح خفا ہو گئے تھے۔ وہ ان کی طرف جھکا' ان کے گالوں پر بوسہ دے کر بھاگ گیا۔ وہ چند ثانیے تو سمجھ ہی نہ سکے تھے۔ پھر چلائے تھے۔

"تم بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔" وہ دور تھا۔

"ریس لگائیں گے؟"

"نہیں۔۔۔" وہ ابھی بھی خفا سے تھے۔

"ہار سے ڈر لگتا ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"جیت سے خوف آتا ہے۔" وہ ہولے ہولے چلتا قریب آیا تھا۔

"آپ مجھے کب تک فیور دیتے رہیں گے؟" وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے رہے تھے۔

"مرتے دم تک۔" وہ جیسے ٹھہر گیا تھا اور یہ سرگوشی پیرس کی سڑکوں پر آوارہ گھومتی موت نے بھی سن لی تھی۔

"مرنے کی باتیں مت کیا کریں۔" وہ آنسو بنا کھڑا تھا۔ کھارا پانی تو وہ بھی ہوئے تھے۔

"کیوں" وہ قریب آن بیٹھا تھا۔

"موت آئی تو پہلے مجھے ہی آئے گی۔" وہ نفی میں سر ہلانے لگے تھے۔

"نہیں۔۔۔ میں اس بار بھی تمہیں ہرا دوں گا۔" وہ ہنسے تھے اور زندگی میں پہلی بار ڈیرک باف کو کسی مسکراہٹ سے خوف آیا تھا۔

"تم رو رہے ہو؟" وہ اس کی طرف جھکے تھے۔

"نہیں۔" وہ خود کو کمپوز کر چکا تھا۔ وہ اٹھے تھے تو وہ بھی ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں پھر سے ساتھ چلنے لگے تھے۔ خاموشی بھی ساتھ ساتھ ٹہلتی رہی تھی۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" زبردست انداز میں گھورا تھا۔

"آپ چیز برگر بہت اچھا بناتے ہیں۔" پندرہ منٹ بعد وہ دونوں کچن میں بیٹھے چیز برگر کھا رہے تھے۔

"میں واقعی اچھا برگر بناتا ہوں۔" وہ فریج سے کولڈ ڈرنک نکالنے لگا تھا۔

"بالکل۔۔۔ تب ہی تو میں آپ کی کوکنگ کا فین ہوں۔" وہ دونوں لاؤنج میں آ گئے تھے۔ مووی دیکھتے رہے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"میں سونا چاہتا ہوں' تھک چکا ہوں۔" سونے چلے گئے تو وہ صوفے سے ٹیک لگائے سوچتا رہا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم تم منعم کو بھول سکو گی یا نہیں۔ مگر تمہارے دل کے چار خانوں میں سے کوئی ایک تو مجھے مل ہی جائے گا۔ یہ کتنا دلچسپ لطیفہ ہے نا۔" وہ سوچتا رہا اور سوچ سوچ کے مسکراتا رہا۔ محبت یوں ہی تو

مسکرانا سکھاتی ہے۔ لب کے ساتھ آنکھ بھی کھل اٹھتی ہے۔ جاپانی وال کلاک گھنٹوں کا الارم بجاتا رہا اور وہ وہیں پہلو میں محبت رکھے سو گیا تھا۔
محبت بھی عجیب ہوتی ہے' انسان کو دنیا جہان سے بے پروا کر دیتی ہے۔



"میں نے اپنی زندگی کو بھی پریوں کی کہانی کی طرح سمجھا۔ انسانوں کی زندگیاں فیری ٹیلز نہیں ہوتیں۔ میری بھی نہیں تھی۔ میں نے سمجھا منعم سے میری محبت اس میجک اسٹک کی طرح ہے' جسے گھمانے سے سب بدل جاتا ہے' مگر میں غلط تھی۔ ہم سب محبت کے بارے اپنے اپنے تجربے اور مشاہدے رکھتے ہیں اور یہ کچھ اچھے بھی نہیں ہوتے۔ انسان کو محبت کرنے سے پہلے سو بار تو ضرور سوچنا چاہیے۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اسے کہوں گی کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور وہ "آئی لو یو ٹو" کہہ دے گا' مگر میں غلط تھی ماریانا..... میں غلط تھی۔" وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ وہ دونوں سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں۔ آئفل ٹاور کی سیڑھیوں پر جابجا لال گلاب بکھرے پڑے تھے۔ وہ دونوں آدھا گھنٹے پہلے ہی یہاں آئی تھیں۔ ماریانا نے ٹشو سامنے کیا تھا جو اس نے پکڑ لیا تھا۔

"تم نے اسے بتایا کہ تم اس سے محبت کرتی ہو؟" وہ انگارہ تھا' وہ جھلس ہی گئی تھی۔

"اس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے کچھ بتانا چاہتا ہے اور میں نے بھی یہی کہا۔ میں نے اسے پہلا موقع دیا اور اس نے کہہ دیا۔" اس کا گہرا جامنی اسکرٹ ہوا سے اڑتا جا رہا تھا۔

"کیا کہا؟" ماریانا جانے کیوں وہ دنیا کا مشکل ترین سوال کر گئی تھی۔

"اس نے کہا وہ بیلا سے محبت کرتا ہے۔" بیلا کا نام بازگشت ہو کر آئفل ٹاور میں گونجنے لگا تھا۔ وہ اب سسکیاں بھر رہی تھی۔

"بیلا.....؟" ماریانا نے سرگوشی کی تھی۔ فیریا نے ایک اور ٹشو پیپر لیا تھا۔

"ہاں اس کا نام بیلا تھا۔ تم نے چاند تو دیکھا ہے' وہ ویسی ہی تھی' اس نے میرے لیے دنیا کی سب سے اچھی کافی بنائی تھی۔ پھر کھڑکی میں کھڑے ہو کر میں نے اسے ایک کہانی سنائی تھی۔ میں کبھی نہیں بھولوں گی کہ وہ ایک اچھی سامع تھی۔ ان کے ہوسٹل کے کمرے میں کانچ ٹوٹا تھا' کوئی ٹکڑا مجھے بھی چبھ گیا تھا' میں نے اسے وہ نکالنے کو کہا' مگر وہ مسلسل انکار کرتی رہی' پھر اس نے وہ کانچ نکال لیا اور مجھے واقعی درد نہیں ہوا ماریانا... بالکل بھی نہیں۔"

"تم اتنی بہادر کیسے ہو گئیں؟"

"محبت سب کچھ بنا دیتی ہے۔"

"تمہیں ایک بار تو منعم کو بتانا چاہیے تھا فیریا۔"

"اگر میرے جیتنے کا ایک بھی چانس ہوتا تو یہ کر لیتی' مگر میں تو کھیلے بغیر ہی محبت کی بازی ہار گئی۔ یہ ٹوٹے دل جانے کیوں نہیں جڑتے۔"

"ہر ٹوٹی ہوئی چیز جڑ جاتی ہے فیریا۔ چاہے پھر وہ دل ہو یا کانچ۔" سیڑھیوں پر پڑے گلاب ہلکی ہوا سے اڑنے لگے تھے۔

"تمہارے جانے کے بعد پتا ہے کیا ہوا؟" ماریانا کی بات پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ "ڈیرک جو سمجھتا تھا اسے تم سے محبت ہے وہ غلط تھا۔ اسے تم سے محبت نہیں ہوئی' عشق ہو گیا۔ ایک بات یاد رکھنا فیریا یہ جو محبت ہوتی ہے نا یہ ہر کسی کو ہر کسی سے ہو جاتی ہے' مگر یہ جو عشق ہوتا ہے نا یہ کسی کسی کو کسی کسی سے ہوتا ہے۔ وہ ایک ہفتہ تمہاری محبت کو بددعائیں دیتا رہا' چرچ کی گھنٹیاں بجاتا' مگر آٹھویں دن وہ تمہاری محبت کو دعائیں دیتا رہا۔ اس نے پہلے دو درجن کرسٹل کپ توڑے' پھر خاموش ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ اسٹور جاتا رہا' جو تم کرتی تھیں وہ سارے کام وہ کرتا رہا۔ یہ دونوں باپ' بیٹا دلچسپ کردار ہیں۔ میں تمہیں صرف ایک بات کہوں گی۔" ماریانا نے بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ فیریا نے ہولے سے سر ہلایا تھا۔

"میں سن رہی ہوں۔"

”جو درد تم اٹھا چکی ہو وہ ڈیرک کو مت دینا۔“ وہ جیسے برف کا مجسمہ بن گئی تھی۔ وہ ترخ گئی تھی۔

”ماریانا میرے پاس دو دل نہیں ہیں‘ ایک ہی تھا جو میں گنوا چکی ہوں۔“

”ایک دل میں چار خانے ہوتے ہیں‘ تم اگر اسے ایک خانہ بھی دوگی ناتو وہ خوش ہو جائے گا۔“ فیریا اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی تھی۔

”تم کہتی ہو کہ ایک دل کے چار خانے ہوتے ہیں ماری۔ تو کیا منعم مجھے ایک خانہ بھی نہیں دے سکتا تھا؟“ اب ساکت ہونے کی باری ماریانا کی تھی۔ وہ ماریانا کو اتنی بے بس لگی تھی کہ ماریانا نے اپنی آنکھوں کو نم ہوتا محسوس کیا تھا۔

”تم جانتی ہو نا زندگی کی کتاب کے باب کھلتے رہتے ہیں‘ ایک باب کھلا‘ پھر بند۔ دوسرا باب کھلا پھر بند‘ یہی تو ہوتا ہے۔ اپنی محبت کو بھی ایسے سمجھ لو۔ یہ باب کلوز ہو چکا‘ اب نیا اوپن ہوگا اور کیا خبر تمہارے لیے اس نے نئے باب میں مسکراہٹیں‘ قہقہے اور شرارتیں ہوں۔“ وہ پہلی بار اپنی نم آنکھوں کے ساتھ مسکرائی تھی۔

”میں کوشش کروں گی۔“ وہ دونوں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ آئفل ٹاور کی سیڑھیوں پر لال گلاب اڑ رہے ہیں۔ آئفل ٹاور میں محبت سانس لیتی ہے۔ یہاں لوگ ٹوٹتے اور جڑتے رہتے ہیں۔

جاپانی لڑکا آنکھیں بند کیے مردہ محبت کی دھن بجا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے جا رہے تھے۔

If it all falls apart
I will know deep in
my heart



صدف کی باتوں کو وہ سوچتی رہی۔ ”جو جذبہ میں زمانے سے چھپا چھپا کر رکھتی رہی وہ ظاہر کیسے ہو گیا؟ ایسا کیونکر ہوا تھا۔“ ایک بات تو طے تھی کہ وہ اس خاموش محبت کو تو خاموشی سے چھوڑ سکتی تھی‘ مگر ابا کی عزت نیلام نہیں کر سکتی تھی‘ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہمدردی سے شروع ہونے والی بات محبت پر ختم ہوگی۔

وہ یاد کرنے لگی تھی کہ اسے منعم علی سے محبت کب ہوئی تھی۔ تب شاید جب وہ ڈبیٹ کمپیٹیشن میں روسٹرم پر کھڑا بول رہا تھا اور وہ سن رہی تھی۔ یا پھر تب جب وہ ہر بار اسے کوریڈور میں آن ٹکراتا تھا۔

”سنو تمہاری آنکھوں کا کاجل پھیل رہا ہے۔“ وہ ہولے سے آنکھیں پونچھ لیتی تھی۔ ”تم آج کی مونا لیزا ہو۔ تمہیں مسکرانا چاہیے۔“ اور پھر وہ قہقہے لگانے لگی تھی۔ صدف کو پہلی بار اس کے قہقہوں سے خوف آیا تھا۔

”بیلا..... تمہارا دل مردہ ہو جائے گا۔“ تب دل مردہ نہ ہوا تھا‘ مگر اب ہو گیا تھا۔ اسے بند کتابوں میں لال گلاب ملنے لگے تھے۔ وہ گلاب اٹھا لیتی تھی۔ مگر کتابوں میں خوشبوئیں تو ہمیشہ قید رہتی ہیں نا۔ یونی ورسٹی کے اسٹور میں بلی نے بچے دیے تو وہ اسے دکھانے آیا تھا‘ تب بس وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔

”مجھے شیکسپیئر متاثر نہیں کرتا تھا‘ شاید میں کافی بدذوق تھا‘ مگر اب شیکسپیئر مجھے اچھا لگتا ہے‘ تم نے مجھے باذوق بنا دیا ہے‘ تھینک یو فار دس فیور۔“ وہ سحر تھا تو وہ مسحور ہو رہی تھی‘ نہ چاہتے ہوئے بھی۔

رزلٹ والے دن وہ مسکراتا ہوا اس کے پاس آیا تھا۔ ”مجھے تم سے ہارنا اچھا لگنے لگا ہے۔“ اور وہ سوچ رہی تھی۔ ”اور مجھے تم سے جیتنا برا لگ رہا ہے۔“ ابھی کل تک تو وہ صرف دوست تھے‘ پھر کیسے‘ کیونکر ”محبت“ درمیان میں آگئی تھی اور جب اسے ادراک ہوا تو وہ لرز کر رہ گئی تھی۔

اسے فاروق احمد یاد آئے تھے۔ ”سب کو لگتا ہے بیٹیاں مر جاتی ہیں‘ مگر میں جانتا ہوں‘ میری بیلا ایسی نہیں ہے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی۔

”ابا..... بیٹیاں ٹوٹ بھی تو جاتی ہیں۔“

وہ کانچ ہو گئی اور پھر ایسی ٹوٹی کہ بس..... اس نے محبت چھوڑ دی۔ وہ راستوں میں آنے لگا تھا اور وہ

راستے بدلنے لگی تھی۔ وہ سامنے کھڑا ہو کر جرح کرنے لگا تھا۔

"میں جانتا ہوں، تم کس چیز سے اور کیوں بھاگ رہی ہو۔"

"میرے راستوں میں نہ آیا کرو۔" وہ اذیت سے مسکرایا تھا۔

"جان لے لو میری۔۔۔ نظر انداز کیوں کرتی ہو۔" وہ تھمی تھی، پلٹ کر نہ دیکھ سکی تھی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ ٹھٹکا تھا۔

"جھوٹ تو میں بھی نہیں کہہ رہا بیلا۔" جانتی تو وہ بھی تھی کہ وہ سچ تھا اور وہ کیسا سچ تھا آہ۔

میری آنکھوں کو سوجھتا ہی نہیں
یا مقدر میں راستہ ہی نہیں
وہ شہر میں کسی سے بھی
میرے بارے میں پوچھتا ہی نہیں
پھر وہی شام ہے، وہی ہم ہیں
ہاں مگر دل میں حوصلہ ہی نہیں
ہم چلے اس کی بزم سے اٹھ کر
اور وہ ہے کہ روکتا ہی نہیں
دل جو اک دوست تھا، مگر وہ بھی
چپ کا پتھر ہے، بولتا ہی نہیں
میں تو اس کی تلاش میں گم ہوں
وہ کبھی مجھ کو ڈھونڈتا ہی نہیں

بیلا پھر بند دروازہ ہو گئی اور وہ دستک دیتا رہا۔ بار بار دیتا رہا۔ دروازہ کھلا ہی نہیں اور پھر اس نے سنا تھا۔

"منعم علی کا پتا چلا تمہیں؟" بیلا کے قدموں تلے سے زمین کھسکنے لگی تھی۔

"کیا۔۔۔ کیا ہوا؟ حادثہ ہوا اور وہ الہادی میں ایڈمٹ ہے۔" اس دن اسے یونی ورسٹی کے کوریڈور میں دیوانہ وار بھاگتے سب نے دیکھا تھا۔ بند دروازے دھڑا دھڑا کھلے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ہاسپٹل کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھی تھی۔

"جب بھی بیلے کی کلیاں دیکھتا ہوں، مجھے بیلا یاد آتی ہے۔"

"تمہیں لگتا ہے مجھے نظر انداز کرنے سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ تڑپ تڑپ کر روتی رہی تھی۔ وہ کمرے میں آئی تھی، وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا، وہ دیکھتی رہی، ٹکٹکی باندھے۔ اٹھی نظر پھر جھک نہ سکی تھی۔ پاؤں پاؤں چلتی اس تک آئی تھی۔ پیشانی پر ہاتھ دھیرے سے رکھ دیا۔

"مجھے پتا ہے تمہیں مجھ سے بہت گلے شکوے ہیں، مگر تم نہیں جانتے، کاش جان سکتے۔ ہم لڑکیوں کے پیروں میں عزت کی زنجیر بندھی ہوتی ہے، جو محبت ہونے لگے تو ہلا دیتی ہے۔" وہ واپس پلٹنے لگی تھی، گلاس ڈور پر ہاتھ تھا جب پیچھے سے آواز آئی تھی۔

"تمہاری آنکھوں کا کاجل اسپریڈ ہو (پھیل) رہا ہے۔" وہ ساکت رہ گئی، پیچھے مڑ کر دیکھ ہی نہ سکی۔ دوپٹے سے آنسو پونچھتی وہ باہر بھاگی تھی۔ وہ دونوں پھر مل گئے تھے۔ شاید سارے معاملات وقت پر چھوڑ دیے تھے۔ اب وہ ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔

"محبت" کو پرے رکھ کر دیکھا جائے تو وہ دوست بھی تو تھے۔ یہ جذبہ ان کی محبت کا مکھوٹا تھا جو وہ دونوں چڑھائے گھومتے تھے۔ وہ دونوں فن کار ہو گئے تھے۔



یونی ورسٹی کا آخری سال بھی ختم ہوا تھا۔ آج آخری دن تھا۔ الوداعی پارٹی دی جا رہی تھی۔ بارش ٹوٹ کے برسی تھی، ساری فضا خنک سی ہو گئی تھی۔ یونی ورسٹی کی سفید دیوار پر وہ جملہ جگمگا رہا تھا۔ "ون ڈے یو ول مس می" وہ کچھ بھی تو نہیں بھول سکتے تھے۔ کچھ بھی نہیں۔ یہاں ان کے قہقہے، مسکراہٹیں، شرارتیں اور آنسو بکھرے تھے۔ شاید زندگی میں وہ سب کبھی آئیں تو۔۔۔ ہاں۔۔۔ شاید صدف نے رنگوں، تتلیوں سے سجی ایک پینٹنگ یونی ورسٹی کے لیے بنائی تھی اور اس کا کیپشن "یادیں" رکھا تھا۔ روشی اور ریحانہ نے سفیدے کے تنوں پر اپنے نام کھدوائے تھے۔ کیا خبر وہ پھر کبھی آئیں تو سفیدے نئی چھال اوڑھے کھڑے ہوں۔ قائداعظم بلاک کی دیواروں کا

لمس محسوس کیا گیا تھا۔ کینٹین کے ٹریک پر پھسکڑا مار کر وہ بیتے دنوں کی یادیں یاد کر کر کے روتی رہی تھیں۔
"زندگی کے یہ لمحے ہم کبھی نہیں بھولیں گے۔"
"ہم وقت سے کہہ دیں گے' ہماری یادوں کو کبھی دھندلا نہ کرے۔"
"کیا وقت ہماری بات مان لے گا۔" روشی کو خوف آیا تھا۔
"ہم نے وقت کو مسکراہٹوں' قہقہوں کی بازگشت دی ہے' وہ ہماری بات مان لے گا۔"
وہ ڈائریاں تھامے ہر ایک پروفیسر کے پاس گئیں۔ آٹو گراف لیے گئے۔
کورے کاغذ سنہری باتوں سے سج گئے۔ "زندگی کا ہر لمحہ آخری سمجھ کر گزاریں۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ کو کبھی جدا نہ ہونے دیں۔ وقت کو آواز دیں' آپ کو جواب ملے گا۔"
ایکو روم میں وہ ایک ساتھ روتی ہنستی چلائی تھیں۔
"وی ول مس یو" بازگشت پلٹ پلٹ کر واپس آتی رہی تھی۔ سموسے' چپس لے کر وہ ٹوٹے پیپل کے تنے پر آکر بیٹھ گئی تھیں۔
"روشی مستقبل میں تم خاصی موٹی ہو چکی ہوگی اور اپنے شوہر کے ساتھ مل کر بیوٹی پارلر چلا رہی ہوگی۔"
وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی تھی۔ لان سے جہاں پھول توڑنا منع ہے کا بورڈ لگا تھا' وہاں سے پھول توڑ کر بالوں میں اڑس دیے گئے۔
"کہیں فائن نہ لگ جائے؟" ریحانہ کو خدشہ لاحق ہوا تھا۔
"مرو نہیں۔۔۔ دو پل کے مہمانوں کو یونی ورسٹی اتنی فیور تو دے ہی سکتی ہے۔" اور پھر فیور مل ہی گئی۔ چاروں لائبریری میں گھس گئیں خاموشی کو ناراض کر کے قہقہے لگاتی رہیں۔ پھر آخری دن گزار کر واپس ہوسٹل آگئیں آخری بار پلٹ کر یونی ورسٹی کو دیکھا تھا' ہر آنکھ میں آنسو تھے۔ مگر افسوس کسی کے پاس بھی ٹشو پیپر نہیں تھے۔ وقت پاس کھڑا دیکھتا رہا تھا۔ ٹکٹکی باندھے۔۔۔ دم سادھے۔۔۔ عفت نے انہیں دلکشا باغ' گرین ٹاؤن اور جناح پارک کی سیر کے ساتھ ساتھ گرینڈ ہوٹل سے کھانا بھی کھلایا تھا۔
چنبیلی ان کے گلے لگی دھاڑیں مار مار کر روتی رہی تھی۔ "باجی۔۔۔ جی تسی نہ جاؤ۔" وہ اس کے آنسو پونچھ رہی تھیں۔
"زندگی یہی تو ہوتی ہے' آنے والوں کو جانا ہی پڑتا ہے۔" عفت بھی سسکیاں بھرتی پلٹ گئی تھیں۔ انہوں نے چنبیلی کو سوٹ اور کاسمیٹکس کی چیزیں لے کر دی تھیں اور عفت کو بشریٰ رحمٰن' رضیہ بٹ کے رومانی ناول لے کر دیے تھے۔ سنہری سہ پہر رنگوں بھری شام میں ڈھلی تھی اور چھاجوں چھاج برستی بارش میں بجلیاں کڑکی تھیں۔ بیلا بنت فاروق احمد محمد علی جوہر بلاک کی طرف ریحانہ کو ڈھونڈنے آئی تھی۔ اندھیرا ایسا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اسد اور منعم علی کوریڈور کے سرے پر کھڑے تھے' وہ دونوں کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ اسد کسی بات پر اصرار کر رہا تھا۔
"مجھے حرا کے فوٹوز دے دو' ورنہ میں بیلا کو سب بتا دوں گا۔"
"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" منعم غرایا تھا۔ اسد نے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔
"تو پھر سودا کر لو۔"
"تم اتنے چیپ اور گھٹیا ہو گے۔" اسد طنز سے مسکرایا تھا۔
"تم کون سا دودھ کے دھلے ہو۔ تم نے خود ہم سے بیلا کو پٹانے کی شرط لگائی تھی' کیا بھول گئے؟" اور بیلا بنت فاروق احمد نے خود کو اندھیرے میں کھڑا پایا تھا۔ وہ ساکت کھڑی تھی۔
"شرط کیسی شرط؟" اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ وہ کانپنے لگی تھی۔
"خاموش رہو۔" منعم دھاڑا تھا۔ مگر اسد خاموش نہیں رہا تھا۔
"کیوں تم نے شرط نہیں لگائی تھی؟ تم اسے توڑنا چاہتے تھے' نیچا دکھانے چلے تھے' کیونکہ وہ تمہاری

پوزیشن چھین رہی تھی۔ پھر تم نے فلرٹ کیا۔" منعم علی طیش میں آپے سے باہر ہو گیا تھا۔

"ہاں میں نے اسے نیچا دکھانا چاہا۔ میں نے محبت کا پھانسا دیا۔ فلرٹ کیا' مگر مجھے کیا پتا تھا کہ...." آدھی بات بادلوں کی گڑگڑاہٹ میں گم ہوئی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے بے تحاشا رو رہی تھی۔ اس کا دل جیسے غم سے پھٹ رہا تھا۔ وہ روتی ہوئی وہاں سے بھاگی تھی اور ادھر منعم اپنی بات پوری کر رہا تھا۔ "ہاں میں نے فلرٹ کیا' مگر مجھے کیا پتا تھا کہ مجھے اس سے اصل میں محبت ہو جائے گی۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے' تم یہ سب بتاؤ گے تو وہ تمہارا نہیں میرا یقین کرے گی۔"

ادھوری بات کی پوری اذیت لے کر وہ سیڑھیوں پر بیٹھی سسک رہی تھی۔ بارش تھمی تھی' چاند ابھر آیا تھا۔

"ابا آپ کی بیلا برباد ہو گئی.... کاش.... ایسا نہ ہوتا۔" وہ گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ لمبے بال بکھرے ہوئے تھے اور دوپٹا ہوا سے اڑ رہا تھا۔

"بیلا...." وہ سامنے کھڑا تھا۔ وہ سناٹے میں آگئی تھی۔ نفرت سے اسے دیکھتی وہ اس تک آئی تھی۔ بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"تم ایسا کیسے کر سکتے ہو میرے ساتھ؟" وہ چونکا تھا' حیران ہوا۔

"کیسا....؟" وہ جیسے وہیں کھڑے کھڑے مردہ ہوئی تھی۔

"ہم تو واقعی موم سے بنی ہوتی ہیں' جیسے مرد موڑتے ہیں' مڑ جاتی ہیں۔ تم نے اپنی پوزیشن کے لیے' مجھے نشانہ بنایا۔ تم نے تو مجھے کٹھ پتلی سمجھ کر ساری ڈوریاں ہلا دیں اور پھر کٹھ پتلی ہی توڑ ڈالی۔ جب کٹھ پتلی مرتی ہے ٹوٹتی ہے تو پھر تماشا کون کرتا ہے؟ تماشا کون بنتا ہے۔" وہ پہلا تھپڑ لگا تھا منعم کو "تم نے میرے کردار کو محفلوں میں اچھالا.... کتنے چھوٹے نکلے تم۔" اس نے دوسرا تھپڑ مارا تھا۔ سویٹ پی کے پھول مرجھانے لگے تھے۔ خوشبوئیں مرنے لگیں' کیونکہ محبت بھی تو مردہ ہوئی تھی۔ زندہ تو وہ بھی نہیں رہی تھی۔ وہ جو "کٹھ پتلی" تھی۔ "مجھے گھن آتی ہے تم سے.... دفع ہو جاؤ۔" وہ رو رہی تھی۔ اور وہ بے قرار ہوا تھا۔

"بیلا میری بات سنو۔" وہ اس کے پیچھے بھاگا تھا۔

"آئی ہیٹ یو۔" وہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

"آئی لو یو بیلا۔" وہ ٹھہر گئی۔ اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور منعم کے گال پر پڑا تھا۔

"اس جھوٹ کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔" وہ لڑکھڑا کر وہاں سے بھاگی تھی۔ دوبار گری تھی۔ پیشانی سے لہو ٹپکنے لگا تھا۔ وہ اسٹیچو بنا وہیں کا وہیں کھڑا رہا تھا۔ وہ اسے روتے کرلاتے' سسکیاں بھر کر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ اس نے محسوس کیا وہ رو رہا ہے۔ اس کے آنسو گالوں پر پھیلنے لگے ہیں۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا ہے۔

"مجھے معاف کر دو بیلا۔ صرف ایک بار۔" اس کی آواز باز گزشت ہو گئی ہے۔

"میں کٹھ پتلی نہیں تھی' منعم میں ایک لڑکی تھی۔" وہ سر اٹھا کر آسمان کو دیکھتا ہے۔ تو یہ طے ہے کہ سب ختم ہو گیا؟ کچھ نہیں بچا؟ شاید تماشا ختم ہوا' راکھ باقی ہے۔

وہ بینچ پر بیٹھی بار بار نفی میں سر ہلا رہی ہے۔ "اے شہر بھکر' میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تم نے مجھے خساروں کے سوا کچھ نہیں دیا۔" وہ اس رنگوں بھری شام میں اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھے جا رہی ہے۔

میں نے شام ہاری ہے
ہم نے تو اداسی میں
زندگی گزاری ہے
فاصلوں سے جوئے میں
میں نے شام ہاری ہے
آنسوؤں کا آنکھوں سے
سلسلہ تو جاری ہے
آسروں کا کیا ہو گا؟

سائبان بھاری ہے
اس نے آسمانوں سے
آگ بھی اتاری ہے
موت بھی ضروری ہے
زندگی بھی پیاری ہے
میں نے شام ہاری ہے

ایک بات تو ثابت ہوئی تھی' بیلا نے سچ کہا تھا کہ وہ اس سے "محبت" نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ وہ تو "عشق" کرتا تھا۔ ہاسٹل کے اس کمرے میں پھر اندھیرا تھا۔ موم بتی جل رہی تھی۔ شیشے کا گلاس الٹا رکھا تھا۔ دیواروں پر سائے لرز رہے تھے۔ روشی ایک بار پھر جن بلا رہی تھی۔ کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ روشی نے بیلا کو متوجہ کیا تھا۔

"مانگو کیا مانگتی ہو؟" وہ خالی نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔ پھر گلاس اٹھا کر جلتی ہوئی موم پر رکھ دیا۔

"مجھے میرا ماضی واپس لادو۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ وہ اس کے گرد جھرمٹ ہوگئیں۔

"کیا ہوا بیلا؟" روشی اس کے آنسو پونچھ رہی تھی۔

"یہ تمہاری پیشانی پر چوٹ کیسے لگی؟" ریحانہ قریب آئی تھی۔ وہ انہیں دیکھ رہی تھی' پھر ہولے سے سرگوشی میں بولی تھی۔

"میں گر گئی تھی' پھر اٹھ ہی نہ سکی۔" جانے کب موم کے اوپر رکھا کانچ پگھلا تھا۔ تڑاخ کی آواز کے ساتھ کانچ کے ٹکڑے بکھر گئے تھے۔ وہ ان کا آخری دن تھا۔ ان کے راستے بھی مختلف تھے اور منزلیں بھی... کیا خبر زندگی میں کبھی وہ ایک ہی راستے پر آن کھڑی ہوں... ہاں... کیا خبر؟

تم نے شام ہاری ہے
میں نے ذات ہاری ہے



تین سال بعد

گریٹ لینڈ کے قبرستان میں برستی بارش میں وہ چھتری تھامے کھڑا تھا۔ گہرے جامنی رنگ کے جنگلی پھولوں پر بارش کی پھوار پڑ رہی تھی۔

"آپ کو کیا لگا تھا کہ ڈیرک آپ سے ملنے نہیں آئے گا اب' آپ کو میرے بارے میں مثبت انداز میں سوچنا ہوگا۔ آپ کو ہمیشہ سے مجھ سے شکایتیں رہی ہیں یا شاید پھر یوں کہنا ٹھیک ہوگا کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے شکایتیں رہی ہیں' اب ایک ہاتھ سے کہاں تالی بجتی ہے۔ آپ سن رہے ہیں؟" وہ سوال کررہا تھا۔ کاسنی پھول اڑنے لگے جو قبر پر پڑے تھے۔

"تین سالوں سے سوال کررہا ہوں' جواب کیوں نہیں دیتے؟ آپ اچھا نہیں کرتے' آپ کو کیا لگتا ہے کہ ڈیرک آپ سے محبت نہیں کرتا؟ اگر ایسا ہوتا تو برستی بارش میں یہاں نہ کھڑا ہوتا۔ کافی بنانا سیکھ گیا ہوں' مگر کتنے دکھ کی بات ہے کہ بنانا بھی خود ہوں اور خود کو ہی پینی پڑتی ہے۔ میں آپ کو بار بار کہہ رہا ہوں' آپ کو مجھے نہیں چھوڑ کر جانا چاہیے تھا۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلا اور تنہا گھومتا پھرتا ہوں۔ ساری کھڑکیاں کھولے رکھتا ہوں کہ شاید آپ مجھے آواز دیں گے' مگر ایسا کبھی بھی تو نہیں ہوا۔ ساری روشنیاں جلائے رکھتا ہوں کہ کہیں سے آپ آئیں تو آگے آپ کو اندھیرا نہ ملے۔ میں آج تک نہیں بھولا کہ آپ کو اندھیروں سے خوف آتا تھا۔"

ڈیرک کی چھتری تیز ہوا سے اڑ کر دور جا پڑی تھی۔ اب وہ روتا ہوا بارش کی پھوار میں بھیگ رہا تھا۔ اس کا وجود لرز رہا تھا۔ وہ چھتری تھامے قبرستان کے احاطے میں قدم رکھ رہی تھی۔ وہ ہولے ہولے چلتی بارش میں بھیگتے ڈیرک تک آئی تھی۔

"تم روکران کی روح کو اذیت میں مبتلا کررہے ہو۔" وہ اس کے قریب دوزانو ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

"اور وہ جو مجھے ساری زندگی کے لیے اذیت میں مبتلا کرگئے۔" وہ قبر کے کتبے کو دیکھ رہی تھی۔

"کچھ چیزیں ہم انسانوں کے اختیار میں نہیں ہوتیں ڈیرک۔" وہ اسے سمجھا رہی تھی۔ وہ قبر پر سر رکھے بیٹھا تھا۔

"ماریانا... کوئی اتنا اچانک چپ چاپ کیسے چھوڑ کر جاسکتا ہے۔ ہارٹ فیل ہوا اور مجھے روتا بلکتا چھوڑ کر چل دیے۔ انہوں نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" وہ اب رو رہا تھا۔ ماریانا اس کی چھتری اٹھا کر اس تک لائی تھی جو اس نے پکڑلی تھی۔

"یہی زندگی ہے اور یہی ہونا ہوتا ہے۔ خیر... میں ذرا کام سے جارہی ہوں' پلیز تم فیریا کے پاس چلے جاؤ' وہ اکیلی ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ کیفے میں ٹاول سے خود کو پونچھ رہا تھا' جبکہ وہ اوون میں کچھ گرم کررہی تھی۔

"تمہارے لیے کافی بناؤں؟" اس نے ٹاول کو کھونٹی پر لٹکادیا تھا۔

"نہیں۔" وہ بھی اوکے کہہ کر اوون کی طرف دوبارہ متوجہ ہوگئی تھی۔ وہ وہیں بیٹھا کھڑکیوں کے پار دیکھتا رہا تھا۔ سڑک پر جیسے رنگ برنگی چھتریوں کی بہار آگئی تھی۔ جوان' بچے' بوڑھے سب برستی بارش میں اپنی اپنی چھتریاں سر پر تانے واک کررہے تھے۔

"تمہیں بارش کیسی لگتی ہے؟" وہ اس کی طرف پلٹی تھی۔

"اچھی لگتی ہے' مگر بچپن میں زیادہ اچھی لگتی تھی' کاغذ کی کشتیاں تیرانے کا اپنا ہی لطف ہوتا تھا۔" وہ مسکرایا تھا۔

"تمہیں اپنا بچپن یاد ہے' ابھی تک امیزنگ... مجھے تو صرف اتنا یاد ہے جب میں نے اپنے آپ کو کچرے کے ڈھیر پر پایا تھا اور تب بھی بارش ہورہی تھی۔" اک پل کے لیے جیسے فیریا سن ہوگئی تھی۔

"تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو ڈرک... سب بھول جاؤ۔" وہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"تم بھول گئیں فیریا... نہیں نا... پھر مجھے بھی ایسا مشورہ مت دو۔" وہ اک پل میں کٹھور ہوا تھا۔

"یہ دو الگ باتیں ہیں جو الگ الگ پوائنٹ آف ویو سے دیکھی جانی چاہئیں۔ تمہیں اپنا پوائنٹ آف ویو بدلنا ہوگا۔"

"تو اس کا مطلب ساری تبدیلیاں صرف میرے لیے ہیں فیریا؟ تمہارے لیے کچھ نہیں؟" وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا اور وہ چاہ کر بھی نظر نہیں چرا سکی تھی۔

"میں کیا بدلوں ڈرک... مجھے کیا بدلنے کی ضرورت ہے۔" وہ تلخ ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا' پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تمہیں اپنا دل' ذہن سب بدلنے کی ضرورت ہے فیری۔ تین سال کم عرصہ نہیں ہوتا کسی کو بھلانے کے لیے اور کسی دوسرے کو اپنانے کے لیے۔ تم مینٹلی سک ہوتی جارہی ہو۔ جو دکھ تم کو منعم نے دیا وہی دکھ تم مجھے دے رہی۔ کتنا غلط کررہی ہو تم یہ سب کرکے۔ تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا اور اپنے ساتھ بھی ظلم کیا۔" یہ کہتا ہوا وہ زور سے دروازہ بند کرکے باہر نکل گیا تھا۔ وہ متوحش سی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ وہ کیسے سب بھول جاتی؟ یہ کم از کم اس کے اپنے بس میں نہیں تھا اور شاید کسی کے بھی بس میں نہیں ہوتا۔ وہ گہری سانس لے کر اٹھی تو نظر ٹیبل پر پڑی چھتری پر جم گئی۔ وہ غصے میں وہیں چھوڑ گیا تھا۔ وہ چھتری اٹھاتی دروازہ دھکیلتی اسے چھتری دینے اس کے پیچھے بھاگی تھی جو دنیا بھر سے خفا شخص بارش میں بھیگتا سڑک پر چلتا ہوا جارہا تھا۔

"ڈرک رکو... پلیز..." وہ رکا تھا اور پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی گلابی گڑیا سی لڑکی اسی کی طرف آرہی تھی۔ وہ اس سے نظریں نہیں ہٹا سکا تھا۔



وہ ننھے تلے قدم اٹھاتی پگڈنڈی پر چلتی جارہی تھی۔ وہ سر جھکائے ہوئے تھی۔ بچوں کی فوج اس کے پیچھے تھی جو کپڑے کے بستے' دوات کی ڈبیاں اور تختیاں سینے سے لگائے قطار میں اس کے پیچھے چل رہے تھے' مجال ہے جو کبھی وہ قطار ٹوٹی ہو یا توڑی گئی ہو۔ وہ اپنی استانی کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے' جگنو کو اس کے قریب رہنے کا شرف حاصل تھا۔

"آج آپ کے لیے زردہ لاؤں گا۔" وہ سامنے دیکھتی چل رہی تھی۔

"نہیں جگنو۔" اس نے انکار کردیا تھا۔
"آپ ہر بار انکار کیوں کردیتی ہیں؟" وہ جیسے خفا ہوا تھا۔ بیلا پہلی بار مسکرائی تھی۔
"جب میں اور کسی کو بھی تو اقرار نہیں کرتی۔"
تین سال میں وہ اتنا بدلی تھی کہ قہقہے لگانا بھول گئی تھی۔ وہ اتنی سنجیدہ اور بردبار سی ہوگئی تھی کہ اماں اور ابا حیران ہوجاتے تھے۔ اسے وہیں گورنمنٹ اسکول میں جاب مل گئی تھی اور وہ وہیں پڑھاتی تھی۔ اس نے چہرے پر ایسا نقاب چڑھالیا تھا جو آج تک کسی کو نظر نہیں آیا تھا۔ تعلیم اتنا سنجیدہ نہیں کرتی۔ تین سال پہلے وہ بھکر سے بستی کھوکھر تک روتی ہی آئی تھی۔
"بیلا... کیوں روتی ہے بیٹا؟" ابا پوچھ پوچھ تھک گئے اور وہ رو' رو کر نڈھال ہوئی تھی۔
نقصان اتنا بڑا تھا کہ وہ صدیاں رو سکتی تھی۔ خود ہی روتے دھوتے وہ اپنے آنسو پونچھنا سیکھ گئی تھی۔ اب بھی آدھی آدھی راتوں کو وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھتی تھی۔ خوف سے چاروں طرف دیکھتی تھی۔ سنہری آنکھیں' ستواں ناک' کشادہ پیشانی تو کیا وہ اس شخص کو ساری زندگی نہیں بھول پائے گی؟ تین سالوں نے اسے اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ پھر وہ بھی جواب کی تمنا چھوڑ گئی۔
"تم غصے میں بھی اتنی ہی پیاری لگتی ہو۔ تم دوسری لڑکیوں کی طرح لیپا پوتی نہیں کرتیں اور پھر بھی خوب صورت لگتی ہو۔" چائے چھلک گئی۔ انگلیاں جل گئیں۔ اماں نے برنال لگائی۔
"بیلا... کیا ہوگیا ہے تجھے بیٹھے بیٹھے' کہاں کھو جاتی ہے' یوں لگتا ہے پیچھے کچھ چھوڑ آئی ہے۔"
"نہیں اماں... میں تو سب کچھ ہی پیچھے چھوڑ چکی ہوں۔" وہ کہہ نہ سکی تھی' بس سوچ کر رہ گئی تھی۔ حقہ تازہ کرکے وہ ابا کے سامنے رکھتی۔
"تو ہنسنا بھول گئی ہے بیلی۔ کوئی بات ہے' پریشانی ہے تو بتا۔ ہم باپ بیٹی سے پہلے اچھے دوست ہیں۔" وہ انہیں خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔
"منعم علی... میں تمہیں کون کون سا نقصان معاف کروں گی؟ تم نے تو میری ہنسی بھی میری نہیں رہنے دی۔"
گول کنویں پر وہ ساری بیٹھ کر سیپ کاڑھتی' ہنسی ٹھٹھول کرتی تھیں اور چپ بیٹھی انہیں دیکھے جاتی تھی۔ "بیلا... تم پہلے تو ایسی نہیں تھیں۔" وہ سر اٹھا کر دیکھنے لگی تھی۔
"کیسی' آمنہ؟" آمنہ نے کپڑے سے سوئی کھینچی تھی۔
"اتنی چپ چاپ' بے نیاز' تو بدل گئی ہے بیلا۔" وہ خالی نظریں ان پر جمائے انہیں دیکھے گئی تھی۔
"ہاں اب تو مجھے بھی لگتا ہے بدل گئی ہوں۔" وہ سب سے بات چھپا گئی تھی' مگر کلثوم وہ بھید پا گئی تھی۔
"جو میں سمجھ رہی ہوں وہی بات ہے نا بیلی؟" وہ بیلوں کی گھنٹیاں سننے میں مگن تھی۔
"تم کیا سمجھ رہی ہو؟"
"تمہارا دل بدلا ہے۔ یقیناً" بغاوت کرگیا ہوگا۔ بتاؤ تو کون ہے وہ؟" وہ ساکت رہ گئی تھی تو کیا دل کی بغاوت چہرے دکھا دیتے ہیں؟
"کون ہے وہ؟" زیر لب بڑبڑاتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دوپٹا ڈھلک گیا تھا۔ "پتا ہے کلثوم... مجھے تو تین سال پہلے ہی علم ہوا کہ لوگ دو' دو چہرے رکھتے ہیں۔ وہ بھی دو چہرے رکھتا تھا۔ پہلے دوست تھا' پھر جانے کب کیسے محبت ہوگئی۔ یہ جو ہم عام سی لڑکیاں ہوتی ہیں نا' بہت جلد غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ میں بھی مبتلا ہوگئی۔ وہ تو دھوکا دے رہا تھا' فریب دے رہا تھا اور میں سمجھ ہی نہ سکی۔ وہ تو مجھ پر شرط باندھ رہا تھا۔ میں تو ٹارگٹ تھی۔ کتنا آسان تھا یہ کسی کو محبت کے نام پر بے وقوف بنانا۔ کتنا آسان تھا یہ کلثوم۔"
کلثوم کی پور میں سوئی گھسی سی تھی' خون دھار کی صورت نکلا تھا۔ "ایسے کیسے ہوگیا بیلا؟"
"پتا نہیں کلثوم کیسے ہوگیا۔" وہ فریم پرے رکھ کے اس کے قریب ہوئی تھی۔
"کب تک اس کی وجہ سے خود کو سزا دیتی رہوگی' خود کو اذیت دوگی۔ اپنی زندگی پڑی ہے تمہارے

سامنے۔ ماضی میں جینے والے کبھی بھی حال کی خوشی محسوس نہیں کرپاتے۔" وہ گہری سانس لے رہی تھی۔
"میں پوری کوشش کروں گی کلثوم۔" وہ گھر آگئی تھی۔ کیا کہتی کوششیں تو وہ ہزار کرچکی تھی اور ہر کوشش میں ناکام ہوئی تھی۔
دل تو چاہ رہا تھا کہ چلا چلا کر کہہ دے۔ "منعم علی تم تو میری نفرت کے بھی لائق نہیں ہو۔" اور اس نے اس سے محبت کرلی تھی۔ اسے صدف یاد آئی تھی۔
"بیلا... جن کے پیروں میں محبت پڑ جائے وہ کبھی سر نہیں اٹھا سکتے۔" سر تو وہ بھی نہیں اٹھا رہی تھی۔ جیدی شرارتیں کرتا تھا تو وہ خاموشی سے دیکھے جاتی تھی۔
"اماں... بیلی پر جن تو نہیں آگیا۔"
"دفع ہو مردود... تعلیم جب شعور دیتی ہے تو بندہ سنجیدہ ہو ہی جاتا ہے۔" ماں کو کیا خبر تھی جن تو آگیا تھا... محبت کا۔



ہوسٹل کی دیواروں پر گہری اداسی کا راج تھا۔ عفت اب بھی کاؤنٹر پر بیٹھی ناول پڑھنے میں غرق نظر آتی تھیں۔ مگر اب تو زندگی سے کچھ مسنگ لگتا تھا۔ وہ کبھی بھی ان چاروں کو بھلا نہیں سکی تھیں۔ چنبیلی کی شرارتیں، قہقہے کہیں گم ہونے لگے تھے۔ اردو والیاں تو انہیں کوئی روگ ہی لگا گئی تھیں۔
عفت چنبیلی سے کہتی تھیں۔ اب تو رومانوی ناول پڑھنے کا لطف ہی نہیں آتا۔" چنبیلی جھاڑو پرے کو سیڑھیوں پر بیٹھ جاتی تھی۔
"کیوں میم؟" وہ جانے کیوں آنکھ کے بھیگے کونے صاف کرتی تھیں۔
"اب مجھ پر آنکھ رکھنے والیاں جو نہیں ہیں۔" وہ گھنٹوں ان کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ وہ ہی تصور تھیں ناقابل فراموش ہستیاں تھیں۔ صدف ہوسٹل کی دیواروں کو اپنی بنائی گئی تھی پینٹنگز سے سجا کر گئی تھی۔ بیلا نے عفت کو الماری بنوا کر دی تھی۔ روشی نے پردے لگوائے تھے۔ اور ریحانہ نے باغبانی میں جوہر دکھائے تھے۔ وہ وہاں سے چلی گئی تھیں، مگر اپنی یادیں، باتیں یہیں چھوڑ گئی تھیں۔ عفی میم کو ان کی آوازوں کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ اور وہ اپنی آنکھوں کو نم ہوتا محسوس کرتی تھیں۔
"عفی میم... اگر اگلی بار باسی بریانی کھلائی تو دھرنا ہوگا۔"
"ایک ہفتے سے سبزی کھا رہے ہیں۔"
"سویٹ ڈش میں کسٹرڈ کب کھانے کو ملے گا؟"
آوازیں قطار ہو جاتی تھیں۔
باؤل میں سونف ویسی کی ویسی پڑی رہتی تھی، کوئی اٹھانے والا ہی نہیں تھا۔ اب کہیں سے بھی چوری چوری دیسی گھی کے لڈو کھائے جانے کی خوشبو نہیں آتی تھی۔ باقی جیسے کچھ رہا ہی نہیں تھا اور چنبیلی بیلا کو فون کرتی تھی۔ دونوں کا آپس میں رابطہ تھا۔
"کیسی ہو چنبیلی؟" چنبیلی نیم تلے رکھے بینچ پر بیٹھی بات کررہی ہوتی تھی۔
"میں ٹھیک ہوں، آپ کو بہت یاد کرتی ہوں۔"
ادھر بیلا سیڑھیوں پر بیٹھی ہوتی تھی۔
"میں بھی تمہیں نہیں بھول سکتی چنبیلی... کبھی نہیں۔" آسمان پر بدلیاں ٹہلتی ہوئی نظر آتی تھیں۔
"عفت میم کیسی ہیں؟ تم سے جھگڑا تو نہیں کرتیں؟" وہ ہنس کر پوچھ رہی تھی۔
"وہ ٹھیک ہیں۔ اب جھگڑا نہیں کرتیں۔"
"کیوں؟"
"کیونکہ اب میں بھی تو نہیں لڑتی۔"
"اب بھی ناول پڑھتی ہیں کیا؟"
"ہاں... پڑھتی ہیں، مگر فرق صرف اتنا آیا ہے کہ اب ایک ناول کو ایک ہی بار پڑھتی ہیں۔" فرق تو پڑا تھا چاہے معمولی سا ہی سہی۔
"آج بھی ہوسٹل تمہاری سریلی آواز سے گونجتا ہوگا۔" چنبیلی پہلی بار مسکرائی تھی۔
"اب ایسا نہیں ہوتا۔ جو نئی لڑکیاں آئی ہیں انہیں آپ کی چنبیلی کی آواز نہیں بھاتی۔" وہ دونوں خاموشی

سے اب آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔

"وہ پھر آیا تھا بیلا۔" چنبیلی کی سرگوشی نے بیلا کی آدھی جان نکال لی تھی۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" چنبیلی نے فرسٹ ایر والیوں کو ہیٹ سر پر پہنتے دیکھا تھا۔

"عفت میم سے آپ کا پوچھنے آیا تھا۔ موبائل نمبر بھی مانگ رہا تھا۔ مگر عفت میم نے آپ کی ہدایت کے مطابق انکار کر دیا تھا۔" بیلا کی آنکھیں بہنے لگی تھیں۔

"وہ کیسا تھا چنبیلی؟ مجھے فریب دے کر بہت خوش ہوا پھرتا ہوگا۔" چنبیلی زیر لب بڑبڑائی تھی۔

"خوش... نہیں... بیلا۔" وہ آنسو پوچھ رہی تھی۔

"عجیب سی اداسی تھی اس کے چہرے پر... آنکھوں میں کرب اور چہرے پر اداسی نظر آتی تھی۔ وہ جانے کیوں اداس تھا۔" ادھر وہ بیلا کی پوری جان نکال گئی تھی۔ بیلا کا لہجہ کپکپا رہا تھا۔

"سارے قصور تو اس کے تھے، چنبیلی پھر یہ اداسی کیوں اور ناخوشی؟"

"میں زیادہ نہیں جانتی بیلا، مگر اتنا کہوں گی کہ تین سال میں وہ ہر روز آ رہا ہے۔ تمہیں اس کی بات سننی چاہیے۔" وہ چپ سی بیٹھی رہی تھی۔

"ہر برستی بارش میں، میں یہ سوچتی ہوں کہ آج وہ نہیں آئے گا، مگر وہ آجاتا ہے۔" وہ سیڑھیوں پر سن سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ وہ گھٹنوں کے گرد ہاتھ رکھے بیٹھی رہ گئی تھی۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہے؟" اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ اماں فکرمند سی سامنے کھڑی تھیں۔

"تم رو رہی ہو؟" وہ تڑپ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔ "جھلی... کیوں رو رہی ہے؟" وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی تھی، بس آنسو بہاتی رہی تھی۔

"کچھ نہیں اماں... کچھ نہیں۔" وہ غائب دماغی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دوپٹا سیڑھیوں پر گر پڑا تھا۔ اماں ہکا بکا بیٹھی تھیں۔ وہ جھکی اور دوپٹا اٹھا کر سر پر جما لیا تھا۔ نظر اماں کے چہرے پر پڑی تھی۔ وہ جیسے زبردستی مسکرائی تھی۔ "فکر مت کریں۔ میں ٹھیک ہوں۔" وہ چلتے چلتے لڑکھڑائی تھی اور منہ کے بل گری تھی۔ وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ہو چکی تھی۔

اماں خوف سے چلائی تھیں۔

"فاروق احمد چھیتی آ۔" ابا اور جیدی بھاگ کر اس کی طرف آئے تھے۔ ابا نے اسے بازوؤں میں اٹھا لیا تھا۔ وہ بے ہوش سی ان کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ وہ آنکھیں بند ہونے سے پہلے خود کو اندھیرے کوریڈور میں کھڑا دیکھ رہی تھی۔ فاروق احمد اسے تھامے پگڈنڈی پر ننگے پاؤں دوڑ رہے تھے۔ دھول اڑ رہی تھی۔

"میں محبتوں کا ماتم کرنے، سوگ منانے والوں میں سے نہیں ہوں منعم علی۔" مگر وہ تھی۔



وہ دونوں لان میں رکھی پلاسٹک چیئرز پر بیٹھے تھے۔ ہلکی ہلکی سی ہوا چل رہی تھی۔ "ڈاکٹر واسطی کی کال آئی تھی، آپ کا پوچھ رہے تھے۔" منعم نے ڈیڈ کو مطلع کیا تھا۔

"اوہ... اچھا... کیا کہہ رہے تھے؟" وہ پوچھنے لگے تھے۔

"آپ کے چیک اپ کا پوچھ رہے تھے، تو میں نے انہیں کہا کہ ہم کل آئیں گے۔"

"ہاں... ٹھیک کہا، پھر کل چلیں گے ان کے پاس۔" وہ سر تھامے بیٹھا تھا۔ ڈیڈ نے بغور اسے دیکھا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو نا؟" وہ چونکا تھا۔

"جی ہاں، میں ٹھیک ہوں۔"

"سر میں درد تو نہیں؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"نہیں بس ذرا سی تھکن ہے، آرام کرنا چاہتا ہوں۔" وہ اندر کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے، تین سالوں سے وہ کسی گلٹ میں تھا، جو کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

اسے وہ دھوپ میں پھیلی چھاؤں سی لڑکی نہیں

بھول رہی تھی اور وہ اسے بھول بھی تو نہیں سکتا تھا۔ بیلا فاروق اس کی رگ رگ میں بس چکی تھی۔ وہ حد سے زیادہ پشیمان تھا۔ اسے وہ گھنی پلکوں والی بھیگی آنکھیں یاد آرہی تھیں۔

"تم نے مجھ کٹھ پتلی سمجھا..... میرا مان، یقین، بھروسا سب مٹی میں مل گیا۔ تم نے اک پل کو تو سوچا ہوتا۔ میری جگہ خود کو رکھا ہوتا۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود میں خود میں اتنا ظرف نہیں پاتی کہ تمہیں معاف کرسکوں۔"

وہ تو اس ٹوٹی ہاری عام سی لڑکی کو دیکھتا رہا تھا جو جانے کب اور کیسے اس کے لیے خاص ہوگئی تھی۔ وہ اس کے ذہن پر جیسے نقش ہوچکی تھی۔ وہ کب سے اسے کھوج رہا تھا، مگر وہ تو جیسے کوئی سراب ہوچکی تھی، کیسے اس کے ہاتھ آتی۔ وہ کتنی اچھی دوست تھی اور اس نے تو دوستی کا بھی لحاظ نہیں رکھا تھا۔

"تمہیں میری باتیں بری لگتی ہیں تو لگتی رہیں، مگر میں دوستی کے ناطے تمہیں سمجھانا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ زندگی سے تمہارے شکوے بے بنیاد اور تمہارے خود کے پیدا کردہ ہیں۔ یہ ہم انسانوں کی عادت ہوتی ہے کہ اپنے اردگرد شکوے، شکایتوں کے انبار لگالیتے ہیں اور پھر روتے بلکتے بھی رہتے ہیں، بے وقوف ہوتے ہیں جو ایسا کرتے ہیں۔"

وہ ایسے ہی تو اس سے اختلاف نہیں کرتی تھی، وہ دلائل اپنے پاس رکھتی تھی، جنہیں وہ رد نہیں کرپاتا تھا۔ وہ کوریڈور میں چلتے ہوئے بھی بحث کرتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ اپنی بات پر زور دے رہا ہوتا تھا اور وہ اپنے پرس کو کھنگال رہی ہوتی تھی۔

"سر اٹھا کر اوپر بھی دیکھ لیا کرو، کسی سے ٹکرا جاؤ گی۔" وہ خفا سی سر اٹھاتی تھی۔

"منعم تو پھر تم میرے ساتھ کس لیے چل رہے ہو۔"

"میں تمہارا باڈی گارڈ نہیں ہوں۔"

"جانتی ہوں۔" وہ چڑ کر جواب دیتی تھی۔

"اچھا تم بار بار چھوٹی چھوٹی باتوں پر یوں ناراض مت ہوجایا کرو۔" وہ مسکراتا۔

"اور تم میرے سامنے کمینی ہنسی مت ہنسا کرو۔" ساون آیا تو بادل گڑگڑاتے رہے تھے، وہ دونوں کیفے میں بیٹھے چائے پیتے رہے تھے۔ وہ پنسل کان کے پیچھے اڑس کر بیٹھی ہوتی تھی۔

"بندے کو بارش میں کھل کر رولینا چاہیے۔" وہ ہمیشہ یہی مشورہ دیتی تھی۔

"وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" وہ طنز کرتا تھا۔ بیلا مزے سے چائے کے سپ لے رہی ہوتی تھی۔

"ارے بھئی، برستی بارش میں آنسو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔"

اور بارش تو تین سال پہلے ہوئی تھی اور وہ رو بھی رہی تھی، وہ اسے کہنا چاہتا تھا۔ "بیلا..... ہر بار ایسا نہیں ہوتا۔ مجھے تمہارے آنسو نظر آرہے ہیں۔" وہ شام ان کی زندگی کی ساری خوشیاں نگل گئی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح اسے ڈھونڈتا کھوجتا رہا تھا، مگر پھر "وہ" کہیں نہ ملی تھی۔

تین سال سے وہ ہوسٹل جارہا تھا، گھونسلا بالوں والی وارڈن ہمیشہ نفی میں سرہلاتی تھی۔ "آئی ڈونٹ نو" وہ ہارے ہوئے مسافر کا سا نظر آتا تھا۔

گیٹ کے پاس چنبیلی کے پھولوں کے پاس چنبیلی کھڑی ہوتی تھی۔ "وہ ہوسٹل کی زندہ دل لڑکی تھی۔ اس کے قہقہوں کی گواہ یہ دیواریں ہیں، پھر آخری شام جانے اس نمانی کو کون سا روگ کھا گیا۔" وہ ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔ تو جو اسے لگا تھا کیا وہ روگ تھا؟ تو جو منعم کو لگا تھا وہ؟ وہ خود کو مصروف رکھنے لگا تھا اور ڈیڈ کا آفس جوائن کرلیا۔ زندگی مصروف تو ہوگئی تھی، مگر وہ اسے نہیں بھولی تھی۔ وہ ریوالنگ چیئر پر جھولتا اسے یاد کرتا تھا۔ وہ جو اپسرا نہیں تھی، مگر اپسراؤں سے کم بھی نہیں تھی۔ وہ جو مسکین کی ایلس تھی۔ اس کی کہی ایک ایک بات منعم کی یادداشت میں محفوظ تھی۔

"کاش..... میرے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہوتی تو میں سب کی پریشانیاں، تکلیفیں ختم کردیتی۔" کبھی کبھی لگتا تھا کہ وہ اپنے لیے نہیں، بلکہ دوسروں کے لیے

جیتی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر بتاتی تھی۔ "تمہیں کیا میں اکیلی نظر آتی ہوں۔ یہ غلط ہے منعم..... میں جانے کتنی آنکھوں کے خواب لیے گھومتی ہوں۔" باقی سب کے خواب تعبیر پا گئے تھے۔ مگر اس کا اپنا خواب مر گیا تھا شاید۔ وہ کھڑکی میں کھڑا خود سے بات کرتا تھا۔

"زندگی میں کبھی تو اک پل کے لیے ٹکرا جاؤ۔ مجھے ایک وضاحت کرنی ہے..... کبھی تو..... صرف ایک بار....."



پھپھی سکینہ اس کی عیادت کو آئی تھیں، تو بار بار صدقے واری ہوتی رہیں، وہ چپ چاپ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔

"آئے ہائے، بچی کتنی کمزور ہو گئی ہے وجود پر کوئی ماس بوٹی ہی نہیں۔ پڑھائی کر کے بچی ختم ہی ہو گئی ہے۔" اماں یخنی بنا رہی تھیں۔

"ہاں باجی..... کچھ کھاتی پیتی بھی تو نہیں ہے یہ۔"

"ارے کچھ کھایا پیا کر، تب ہی تو صحت بنے گی۔"

ابا آئے تو پھل ساتھ لائے۔ اس کا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں کر رہا تھا، مگر ان کا دل رکھنے کو وہ کھا لیتی تھی۔ پھپھی جاتے جاتے ابا کے کان میں بات ڈال گئی تھیں۔

"کہے دیتی ہوں فاروق بیلا تو میرے فاروق کی ہی دلہن بنے گی۔" ابا بس خاموش ہی رہے تھے۔ بیلا نے بھی سوچ لیا تھا کہ اگر ابا نے اس کی رضامندی چاہی تو وہ خاموشی سے سر جھکا دے گی۔ مگر اس سے پہلے "وہ" آگیا تھا۔ بالوں میں تیل، آنکھوں میں سرمہ، پیشانی پر بکھرے بال، وہ جھجکتا ہوا پاس پیڑھی پر بیٹھ گیا تھا۔

"جی اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

"بہتر ہے..... آپ سنائیں۔" وہ ماتھے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"جی اللہ کا کرم ہے۔" بیلا کو وہ بہت سادہ اور معصوم لگا تھا۔

"آپ کا کام کیسا چل رہا ہے؟" بیلا نے اس سے سوال کیا تھا۔ وہ سر اٹھا کر دیکھنے لگا تھا۔

"جی اوپر والے کا کرم ہے۔ روز کے پندرہ سوٹ سی لیتا ہوں۔" وہ حیران رہ گئی تھی۔

"اکیلے سیتے ہیں؟"

"نہیں جی..... شاگرد ہوتے ہیں ساتھ۔" وہ جھجکتا ہوا دروازے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"وہ مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔" بیلا نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"جی فرمائیں۔"

"مجھے لگتا ہے آپ ہی ہیں جو میری بات کو سمجھیں گی۔"

"جی..... ضرور..... آپ بات کریں۔" وہ جھکے سر کے ساتھ بول رہا تھا۔

"وہ جی میں آپ سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھ میں اور آپ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک وجہ ہے۔" وہ سناٹے میں آگئی تھی، وہ اس سب کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"اور کیا وجہ ہے؟" وہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔

"وہ جی میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا اور وہ پیچھے بس سوچتی ہی رہ گئی تھی۔

"محبت؟ کتنا مانوس تھا یہ لفظ..... اور اب جیسے ناشناسا۔"

ابا نے شاکر سے رشتے کی بات کی تو وہ سر جھکا کر بس اتنا ہی بولی تھی۔ "ابا..... جہاں دونوں فریقین کی مرضی شامل نہ ہو تو وہاں ایسے تعلق نہیں جوڑے جاتے۔ ساری عمر کی بات ہوتی ہے۔" سکینہ پھپھی نے خوب واویلا مچایا گیا۔ آخر روتے ہوئے چلی گئیں۔ ابا کو افسوس تو ہوا، مگر وہ کسی کی بھی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بیلا کی طبیعت بہتر ہوئی تو اسکول دوبارہ سے شروع ہو گیا تھا۔ اسکول کے بڑے سے صحن میں وہ کرسی پر بیٹھی ہوتی تھی اور شاگرد سامنے ٹاٹ پر بیٹھے ہوتے تھے۔ ان کی باتوں میں مگن کبھی کبھار وہ سب

بھول جاتی تھی۔
"استانی جی اس نے ک سے قینچی لکھا ہے۔" اور ھ سے حلوہ لکھ دیا ہے۔" وہ زیر لب مسکراتی رہتی تھی۔ سیاہ سکے سے تختیوں پر وہ انہیں ہاشیے لگا دیتی تھی اور وہ دوات میں قلم ڈبو ڈبو کر لکھتے تھے۔ کبھی کبھی وہ خیالوں میں کھو سی جاتی تھی۔

کہا اس نے
مجھے تب واقعی تم سے محبت تھی
کہا میں نے مجھے تو آج بھی تم سے محبت ہے
وہ تب کی بات کرتی ہے
میں اب کی بات کرتا ہوں
مگر جو فاصلہ اب اور تب کے درمیان حائل ہے
وہ ہم سے تو مل کر بھی سمیٹا جا نہیں سکتا
وہ اب تک آ نہیں سکتی
میں تب تک جا نہیں سکتا

اس شام دیئے کی لو سے بھڑکتی آگ کو صدف نے آکر بجھایا تھا اور اسے جھنجوڑا تھا۔ "کیا ہوا ہے تمہیں؟"
وہ اسے دیکھتی رہی، پھر سرگوشی میں بولی تھی۔
"محبت ہو گئی تھی صدف.... تم نے سچ کہا تھا۔" جانے وہ کیسا سچ تھا۔



"میں پیرس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔" ڈیرک نے جس سنجیدگی سے بات شروع کی تھی اس نے فیریا کو چونکا کے رکھ دیا تھا۔ شام سے ذرا پہلے کا وقت تھا۔ پیرس کی سڑکوں پر لوگ چل پھر رہے تھے۔ زندگی رواں دواں تھی۔ مگر گولڈن کیفے میں یوں لگتا تھا زندگی رکی رکی سی تھی۔ وہ کھڑکیوں کے شیشے بھیگے ٹشوؤں سے صاف کر رہی تھی۔ ماریانا ان دونوں سے مکمل بے نیاز نظر آتی تھی اور کالی جلد والی ڈائری پر جھکی ہوئی تھی۔ ڈیرک کی بات پر اس نے بھی سر اٹھایا تھا۔
"جیکسن باف کو چھوڑ کر جا رہے ہو؟" وہ اداس سا ہنسا تھا۔

"وہ مجھے اب نہیں روکیں گے۔" ماریانا اٹھ کر اس کی طرف چلی آئی تھی۔ وہ جانے کیوں اس کو ٹوٹا ہوا سا لگا تھا۔ "میرے لیے پیرس کو چھوڑنا آسان نہیں تھا ماریانا، مگر یہ فیصلہ میں نے کافی دقتوں کے ساتھ کیا ہے۔ پیرس نے مجھے بہت کچھ دیا ہے اور میں اس کا شکریہ تک ادا نہیں کر سکتا۔ جیکسن باف تو میرے جینے کی وجہ تھے اور جب وجہ ہی نہ رہے تو پھر باقی پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟"
اسے جیکسن یاد آ رہے تھے۔ کافی کی دھند میں گم ہوتا ماضی اب ابھر کر سامنے آ رہا تھا۔ وہ رات کو دیر تک لان میں لگے لیمپ کی روشنی میں ہارر ناول پڑھتا رہتا تھا اور وہ چڑتے تھے۔
"تمہیں ہارر موویز میں ایکٹنگ کے جوہر دکھانے چاہئیں۔" وہ کھل اٹھتا تھا۔
"وہ ریئلی؟" یقین نہ آتا تھا، وہ طیش میں آجاتے تھے۔
"شیور۔" وہ سوچ میں پڑ جاتا تھا۔
"لیکن میں ایک اور بات سوچ رہا ہوں۔" سنجیدگی کی انتہا تھی۔
"وہ کیا؟" وہ گاؤن کی ڈوریاں کستے متجسس ہوئے تھے۔ اس نے کتاب بند کر دی تھی۔
"یہی کہ میں ناول لکھنا شروع کر دوں؟" مشورہ طلب نظریں جیکسن باف پر جم گئی تھیں۔
"ناول.... اور تم۔" وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔
"آپ جیلس ہو رہے ہیں۔" وہ طیش سے بھناتا ہوا ٹیبل کو ٹھوکر مارتا اندر بڑھ گیا تھا۔ صبح پودوں کی کٹنگ وہ دونوں مل کر کرتے تھے اور گھمسان کا رن پڑتا تھا۔
"جب تمہیں کٹنگ کی الف ب کا علم نہیں تو کیوں کٹر لے کر آجاتے ہو۔" وہ بے نیاز سا کٹ کٹ کر رہا ہوتا۔ ذرا بھی پروا نہیں ہوتی اسے۔ "تمہیں پودے بددعا دے رہے ہوں گے۔"
"وہ کیوں؟"

"تم ان پر ظلم کرتے ہو۔"

"لیکن میں تو ڈسپلن کو فالو کرتا ہوں۔" اس نے ان کے اعتراض پر اپنا دفاع کیا تھا۔

"یہ ڈسپلن ہرگز نہیں ہے۔" پیرس کی سڑکوں پر پتھر اڑانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ جو وہ دونوں شوق سے سرانجام دیتے تھے۔

"آپ کو نہیں لگتا تھا کہ ہماری زندگی بہت بورنگ ہے؟" وہ چلتے چلتے رک کے تھے۔

"نہیں... ہم بالکل بھی بورنگ لائف نہیں گزار رہے۔" انہوں نے ڈیرک کی بات سے انکار کیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے ہمارے گھر کو کسی تیسرے وجود کی ضرورت ہے۔" سنجیدگی کمال کی تھی۔ جیکسن نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔

"تو یوں صاف صاف کہو نا کہ تم شادی کرنا چاہتے ہو۔" ڈیرک کا منہ کھل گیا تھا۔

"بالکل بھی یہ بات نہیں۔ میں تو آپ کی شادی کروانے کا سوچ رہا تھا۔" وہ بدکے تھے۔

"بالکل نہیں... میری پرسکون زندگی سے کیوں سکون ختم کرنے پر تلے ہو۔" وہ قہقہہ لگاتا آگے بڑھ گیا تھا اور وہ اسے پیچھے گھورتے رہ گئے تھے۔ واقعی ان کا رشتہ خالص تھا۔ بغیر غرض اور مقصد کے... کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ دھواں بیٹھ گیا تھا' وہ ماضی سے حال میں پلٹا تھا۔ اس نے ٹشو پیپر سے اپنی نم آنکھیں صاف کی تھیں۔

وہ ماریانا سے مخاطب ہوا تھا۔ "دو گھنٹے بعد میری فلائٹ ہے۔ مجھے پیکنگ بھی کرنا ہوگی۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ خوب صورت شخص کی آنکھوں میں عجیب سا حزن و ملال تھا۔ ماریانا اداس سی بیٹھی اسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ ہولے ہولے چلتا اس تک آیا تھا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

فیریا ساکت کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں بولی تھی۔ دل کی دھڑکنوں کا شور تھا اور وہ کچھ بھی نہیں سن پا رہی تھی۔ وہ چند ثانیے کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا کہ شاید وہ کچھ کہے۔ مگر وہ خاموش کھڑی رہی تھی۔ وہ کیفے کا دروازہ کھولتا باہر نکل گیا تھا۔ ماریانا تڑپ کر اٹھی تھی اور فیریا کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی جو گلاس ڈور سے باہر جاتے ڈیرک کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" وہ جیسے تڑاخ سے ٹوٹی تھی۔

"میں نے؟" وہ جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔ ماریانا کو شدید غصہ آ رہا تھا۔

"دیکھو اسے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے جنگ ہار کر جا رہا ہے۔ فیریا نے شیشوں کے پار دیکھا تھا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔"

"تم نے ساری زندگی غلط فیصلے کیے ہیں فیریا۔ تم تو ایسی کبھی بھی نہیں تھیں' پھر آج ایسا کیوں کر رہی ہو۔ تمہارے لیے سارے دروازے بند تھے اور یہ تمہاری قسمت تھی' اب یہی بات ڈیرک کی قسمت بننے جا رہی ہے۔ تمہیں تو یہ سوچ کر خوشی سے مر جانا چاہیے کہ کوئی تم سے اتنی محبت کرتا ہے۔ تمہاری پروا کرتا ہے۔ آج کل ایسا کوئی کسی کے لیے نہیں کرتا۔ محبت ہر دل پر دستک نہیں دیتی۔ کب تک منعم کا سوگ مناتی رہو گی؟ آخر کب تک؟ تم تو اسے یاد بھی نہیں ہو گی۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں ڈیرک کو جانے سے روک لو۔" ماریانا واقعی ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ فیریا کے وجود میں حرکت ہوئی تھی۔

"میرے کہنے پر وہ رک جائے گا کیا؟" وہ سوال بازگشت ہو گیا تھا۔ ماریانا نے اس کے ہاتھ تھامے تھے۔

"ہاں فیریا... واقعی وہ رک جائے گا۔ جب کوئی اس آس پر کہیں جا رہا ہو کہ اسے روک لیا جائے گا تو اس کی آس کو موت نہیں دینی چاہیے۔" فیریا نے وال کلاک کی طرف نظر دوڑائی تھی۔ اس کی فلائٹ میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ وہ دونوں کیفے بند کرتی ٹیکسی میں سوار ہو کر ایئرپورٹ کی طرف بھاگی تھیں۔ فیریا پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ پھر "وہ" اسے ویٹنگ روم میں بیٹھا نظر آ ہی گیا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی اس تک پہنچی

تھی۔
"ایسے کیسے تم نے کہہ دیا کہ پیرس میں رہنے کی وجہ تمہارے لیے ختم ہو گئی ہے۔" وہ حیرت سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اب ٹکٹکی باندھے اس گلابی لڑکی کا غصے سے سرخ چہرہ دیکھ رہا تھا۔ "تم سوچ بھی کیسے سکتے ہو کہ تم چلے جاؤ گے اور میں تمہیں نہیں روک سکوں گی۔"
وہ حیرت سے بت بنا کھڑا تھا۔ "مجھے لگا تھا میں اپنے دل کے چاروں خانے بکھر چھوڑ آئی ہوں' مگر میں غلط تھی ڈیرک۔ آج مجھے لگا میرے دل کا آدھا حصہ تو تمہارے پاس رہ گیا ہے۔ اور تم میرا دل لے کر بھاگے جا رہے تھے۔" وہ اس کے غصے سے سہم گیا تھا۔
"نہیں... نہیں تو۔" وہ اس کے بالکل سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔
"پتا ہے' تب ہم اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرتے ہیں جب ایک راستہ رکھتے ہیں۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا اور خود کو کسی بند گلی میں پایا۔ پھر تم مجھے دوسرا راستہ لگے۔ میں مانتی ہوں کہ دیر ہو گئی' مگر پھر بھی اتنی دیر بھی نہیں ہوئی۔" آتے جاتے لوگ ان دونوں کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ماریانا دور کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ "تمہیں پرپوز کرنا آتا ہے؟" وہ حواس باختہ ہوا' پھر گردن جھکالی تھی۔
"سوری... مجھے نہیں آتا۔" وہ اسے اب غور سے دیکھ رہی تھی۔ سنہری آنکھیں' بھورے بال' روشن پیشانی وہ اسے دنیا کا خوب صورت ترین شخص لگا تھا۔
"میں سیکھ لوں گا۔" وہ واقعی اس کی خاطر سیکھ لے گا۔
"میری آنکھوں میں اس وقت تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟"
"میں اپنا آپ دیکھ رہا ہوں۔"
تم میرے ماضی پر تو کبھی سوال نہیں اٹھاؤ گے نا؟"
ڈیرک اس کے چہرے پر عجیب سا خوف دیکھ رہا تھا۔
"میں حال میں جینے کو ترجیح دیتا ہوں۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ روشنیاں ان کے ہم قدم تھیں۔
"پرپوز کرنے کے لیے آئفل ٹاور کیسا رہے گا؟"
وہ سوچ میں پڑ گئی ہے۔
"مجھے سوچنے کے لیے وقت دو۔"
"کیا تم اب بھی کافی کے ڈبے مقابل کو دے مارتی ہو؟" تو کیا وہ خوف زدہ تھا؟
"تم بے فکر رہو۔ ڈیرک باف۔" وہ گڑبڑایا تھا۔
"نہیں تو... میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔" وہ رک کر اسے دیکھ رہا تھا۔
"کیا تم میرے لیے مسکرا سکتی ہو؟" ادھر سوال ہوا اور ادھر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔ وہ دیکھتا رہ گیا تھا۔
"تمہارے گالوں میں تو اب بھی ڈمپل پڑتے ہیں۔" وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ وہ ٹھٹک کر گھورنے لگی تھی۔
"مطلب کیا ہے اس بات کا؟" وہ ہکلایا تھا۔
"وہ... مجھے اچھے لگتے ہیں۔" وہ سر جھٹک کر مسکرائی تھی۔ وہ اس کی طرف جھکا تھا۔ "تھینکس فیریا۔"
"تھینکس فار واٹ؟"
"مجھے روکنے کے لیے میری زندگی میں آنے کے لیے۔" وہ دونوں گول چرچ کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے ہیں' جہاں ٹیولپ کے گلابی پھول بکھرے پڑے ہیں۔ وہ ایک ایک کر کے اس کے بالوں میں وہ پھول لگاتا ہے۔
"تم دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو۔" وہ اسے دیکھ رہی ہے۔
"اور تم پورے پیرس کے پرکشش مرد ہو۔"
"مذاق کر رہی ہو؟"
"نہیں سچ ہے۔"
"چلو یقین کر لیا۔" وہ دونوں سڑک پر پیدل چلتے کیفے کی طرف جا رہے تھے جہاں ماریانا ان کی منتظر تھی۔ چاکلیٹ کافی کے کپوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ وہ اسے بتانے لگا تھا کہ اسے اس سے کیسے پہلی نظر میں محبت ہوئی تھی۔ موم بتی کی روشنی میں وہ ڈیرک باف کی باتیں سنتی اپنا ماضی بھول گئی تھی۔ وہاں صرف وہ بیٹھی تھی اور ڈیرک باف تھا۔

"تم پر پہلی نظر پڑتے ہی میرا دل میرے ساتھ ہاتھ کر گیا اور واردات ہو گئی۔ مجھے ہمیشہ ان لوگوں پر غصہ آتا تھا جنہیں پہلی نظر کی محبت ہوئی۔ مگر اب مجھے اپنے آپ پر غصہ نہیں آتا۔" وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ زندگی اگر "اتفاق" کا دوسرا نام ہے تو یہ اتفاق پیرس میں وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ اور یہی اتفاق "کہیں" اور بھی جنم لینے کو تھا۔

✡ ✡ ✡

یہ کوئی اتفاق تھا یا معجزہ؟ وہ دونوں اس بات کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ بیلا نے اپنے دل میں مرگھٹ سی خاموشی کو سانس لیتے پایا تھا۔ وہ تین سال بعد اس کے سامنے اسی کے گاؤں میں کھڑا تھا۔ وہ سیلاب زدگان کی فہرست بنا رہی تھی۔ دریا کا بند ٹوٹا تھا اور پانی موت ہو گیا، چنگھاڑتا ہوا گھروں، چھتوں، فصلوں پر سے گزر گیا تھا۔ مویشی تک زیر آب آ گئے تھے۔ روتے، کرلاتے لوگ افراتفری میں بھاگتے پھر رہے تھے۔ امدادی ٹیمیں تاحال نہیں پہنچی تھیں۔ منعم علی بھی وہاں ایک این جی او کے توسط سے آیا تھا۔ عورتیں سینہ کوبی کر رہی تھیں۔

"اللہ رحم کر۔ سب کچھ تباہ ہو گیا۔" واقعی ایسا ہی تھا پانی کی زیادتی یونہی تباہی مچاتی ہے..... اور پھر انسان کی بے بسی انتہا کو پہنچ جاتی ہے..... درخت جڑوں سمیت اکھڑ گئے تھے..... ابا سب کے ساتھ مل کر سامان نکلوا رہے تھے..... یہ بستی کھوکھر کے ساتھ والی بستی تھی جہاں سیلاب آیا تھا.....

بیلا بھی وہاں ابا کے ساتھ آئی تھی اور استانی ہونے کی وجہ سے اسے ریکارڈ بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی..... آرمی پہنچ گئی تھی اور احسن طریقے سے اپنا کام سرانجام دے رہی تھی..... وہ کیمپ سے فہرست تھامے باہر نکلی تھی اور ساکت رہ گئی تھی..... اور زمین میں کیل تو وہ شخص بھی ہو گیا تھا..... تین سال بعد وہ اسے دیکھ رہا تھا اور دیوانہ وار دیکھ رہا تھا..... جانے وہ اسے پہلے جیسی کیوں نہیں لگی تھی۔ چہرے پر عجیب

سا حزن و ملال تھا اور آنکھوں میں اداسی تھی۔۔۔ وہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے پاس سے گزری تھی۔

"بیلا" اس پکار میں تین سالوں کی نہیں جیسے صدیوں کی تھکن تھی۔۔۔ اس کا دل پانی ہونے کو تھا مگر وہ رکی نہیں تھی وہ پیچھے کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔۔۔!!!

فاروق احمد اس لڑکے کو دیکھ رہے تھے جو بڑھ چڑھ کر لوگوں کی امداد کر رہا تھا۔۔۔ پانی کے ریلوں میں سے ٹرنک، مویشی نکالنا بہت مشکل تھا۔۔۔ درختوں کی ٹہنیوں پر مردہ سانپ لٹکے ہوئے تھے۔۔۔ وبا پھوٹنے کے ڈر سے میڈیکل کی ٹیمیں ویکسین لگانے آن پہنچی تھیں۔۔۔ وہ میٹرس پر تھک کر آن بیٹھا تھا۔

"کیا نام ہے جوان تمہارا؟" وہ فاروق احمد کے سوال پر ان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔۔۔

"جی منعم علی" وہ ہولے سے مسکرایا تھا "جی۔۔۔ شہر سے آیا ہوں" وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

"اچھا کیا جو چلے آئے ہو۔۔۔ انسانوں میں آج کل انسان کہاں ملتے ہیں؟۔۔۔ انسانیت کا مذہب تو جیسے دنیا سے ہی رخصت ہوتا نظر آرہا ہے۔۔۔" وہ بھی ان سے باتیں کرنے لگا تھا۔

"جی انکل۔۔۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔" وہ ابھی باتیں کر رہے تھے کہ وہ ان کی طرف آئی تھی۔

"ابا۔۔۔ وہ میں۔۔۔" اسے دیکھا تو نفرت سے نظر پھیرلی تھی۔۔۔

فاروق احمد نے اسے متوجہ کیا تھا۔ "یہ بیٹی ہے میری۔۔۔ شہر سے پڑھ کر آئی ہے سولہ جماعتیں پاس ہے۔" بیٹی نے دوبارہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔۔۔

"میں اماں کے ساتھ گھر جا رہی ہوں ابا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا جاؤ۔۔۔ میں نہیں آسکوں گا ادھر میری ضرورت رہے گی۔" وہ سر ہلاتی پلٹ گئی تھی۔

وہ باہر آیا تو اسے برس کھنگالتے دیکھا تھا۔ "بیلا۔ میری بات تو سنو" نظر اٹھی تھی اور ایسی نفرت کہ بس۔

"مر گئی بیلا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی تھی۔۔۔ سارا ضبط تو رات کے اندھیرے میں ٹوٹا تھا۔۔۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی۔

"تین سال میں، میں نے بڑے حوصلوں سے تمہیں بھلایا ہے اور آج تین سالوں بعد تم میرے حوصلوں کو مسمار کرنے آن پہنچے ہو۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے۔" مگر وہ کہیں بھی نہیں گیا تھا ادھر سے ادھر بھاگتا دوڑتا پھر رہا تھا۔۔۔ اسی بھاگم دوڑی میں جانے کب کیسے اسے چوٹ لگی تھی۔۔۔ وہ ماتھے پر پٹی باندھے پھر رہا تھا۔ کیمپ کی درز سے وہ دیکھتی رہی تھی۔۔۔ آنکھوں کو اس نے دریا ہوتا پایا تھا۔

جیدی سر پر کھڑا تھا۔ "کیا ہوا بیلی؟" اس نے غائب دماغی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"کچھ نہیں جیدی۔۔۔ کچھ نہیں۔" آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تھے۔۔۔ ہوائیں خنک سی تھیں۔۔۔ وہ کسی درخت کے ٹوٹے ہوئے تنے پر بیٹھا دور خلاؤں میں گھور رہا تھا۔۔۔ جانے کیوں بیلا کو وہ اس دنیا کا نہیں لگا تھا۔۔۔!!!

وہ ہولے سے چلتی اس تک آئی تھی۔ "تم چلے جاؤ یہاں سے۔ وہ چونک کر اس کی طرف مڑا تھا۔

"کوئی صفائی کوئی وضاحت نہیں مانگو گی؟" وہ رخ موڑ گئی تھی۔۔۔ منعم نے دیکھا وہ لرز رہی تھی۔

"جب سب کچھ سامنے ہو تو کسی صفائی کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔"

"آنکھوں دیکھی بھی تو جھوٹ ہو سکتی ہے ناں؟" وہ سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔۔۔ جینز پہ بلیک شرٹ پہنے، پیشانی پر گرے بال، پرفیوم کی خوشبو ہالہ بن گئی تھی۔

"ہر بار جھوٹ نہیں ہو سکتی۔"

"تمہیں مجھے ایک موقع دینا ہو گا بیلا۔" وہ پلٹی تھی۔ گالوں پر آنسو پھسل رہے تھے۔

"میں نے تم پر اعتبار کیا اور غلط کیا۔" وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

"کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں بیلا؟"

اور بیلا تو سن ہو گئی تھی۔۔۔ "محبت۔۔۔؟" وہ لفظ اسے خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔۔۔ وہ الٹے پاؤں واپس پلٹ گئی تھی۔۔۔ تو کیا وہ اب بھی؟ ایسا کیسے اور کیونکر

ہو سکتا تھا؟... تین سال بعد محبت دوبارہ زندہ ہو رہی تھی... وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی... اور سر پکڑ کر بیٹھ جانے سے کہاں محبت کا مسئلہ حل ہوتا ہے؟



"میں تمہیں یہ نہیں کہوں گا کہ میری کوئی غلطی، کوئی قصور نہیں... میں یہی کہوں گا بیلا کہ سب غلطیاں، سارے قصور میرے ہیں... جن کی پرورش زمانہ کرتا ہے پھر وہ یوں ہی ادھر ادھر لڑھکتے پھرتے ہیں... میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مام ڈیڈ اپنے اپنے جھمیلوں میں ہی مگن رہے... انہیں کبھی یاد نہیں آیا کہ ان کا کوئی بیٹا بھی تھا... ڈیڈ سے مام نے ڈائیورس لے لی اور پیرس چلی گئیں اور مجھے روتا بلکتا ہوا یہیں ڈیڈ کے پاس چھوڑ گئیں... اور ڈیڈ کو کبھی میری پروا نہیں رہی تھی ان کے نزدیک ان کا اسٹیٹس، مارکیٹ ویلیو، ہی اہم رہی تھی... میں ایک نظر اور پیار کی تھپکی تک کو ترستا ہی رہ گیا... میں تعلیم میں تو اچھا تھا ہی مگر مجھے کبھی اچھے دوست میسر نہیں آئے... میں بھی بروں کی صحبت میں برا بنتا گیا... یونیورسٹی میں تمہاری آمد اور تمہارے ارادوں نے مجھے خوف زدہ کر دیا... میں ایک سیڑھی پر تھا جہاں تم مجھے دھکا دینے آن پہنچی تھیں... مجھے تم سے بہت خوف محسوس ہوا تھا...

گاؤں کی ایک عام سی دبو سی لڑکی کی باتیں اوروں کے لیے چاہے نظرانداز کرنے کے قابل ہوں مگر میرے لیے ہرگز نہیں تھیں... پھر اسد وغیرہ کے کہنے پر میں نے تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا اور مجھے اس بار منہ کی کھانا پڑی... تمہارے کردار کی مضبوطی نے مجھے بہت متاثر کیا جس کا اعتراف میں آج تک نہیں کر پایا... پھر تم نے میری پوزیشن چھین کر مجھے یہ باور کرا دیا کہ ذہانت سانجھ کی کھیتی ہوتی ہے... میرا غرور چکنا چور ہو گیا تھا... تم نے میری انا کو روند ڈالا تھا... اور میرے لیے یقیناً" یہ چھوٹی بات ہرگز بھی نہیں تھی... پھر چند دنوں بعد میں نے تمہیں اپنی طرف متوجہ ہوتا محسوس کیا تھا اور وہ میری کوششوں کا نتیجہ ہرگز بھی نہیں تھا بیلا... وہ تو صرف وہ ہمدردی تھی جو تمہارے دل میں میرے لیے اس وقت پیدا ہوئی جب تمہیں میرے بارے میں علم ہوا۔

اسٹیچو ایکٹ پلے میں ہمارا آمنا سامنا اتنا خوش گوار نہیں تھا... مگر اس کے بعد ہماری شمولیت کے راستے یکساں ہو گئے اور پھر میں بیلا فاروق سے آشنا ہوا تھا اور مجھے شدید حیرت سے دوچار ہونا پڑا... تم عام ہرگز بھی نہیں تھیں مجھے تم میں عجیب سا وقار، تمکنت اور شاہانہ پن محسوس ہوا۔ جو آج تک مجھے کسی بھی لڑکی میں محسوس نہیں ہوا تھا۔ پھر ہم آہستہ آہستہ قریب ہوتے گئے اور دوست بن گئے۔ اور میں اس بات کو عار محسوس نہیں کرتا کہ اعتراف کروں کہ میرے اور ڈیڈ کے درمیان آدھے مسائل تم نے حل کروا دیے... تم ایک اچھی دوست تھیں بیلا... اور اسی دوستی کو میں نے اپنے لیے محبت ہوتا پایا... میں ماضی کب کا بھول چکا تھا مگر پھر ماضی ہمارے درمیان آ گیا... ماضی کے ڈسے کا علاج آج تک ایجاد نہیں ہوا... تم کب اور کیسے میرے لیے اہم ہو گئیں مجھے خبر ہی نہ ہو سکی تھی۔

میں نے سوچا الوداعی پارٹی کی اس شام تمہیں سب

کچھ سچ بتادوں گا مگر اس سے پہلے ہی یہ سب اس طرح سے سامنے آیا کہ ہمارے درمیان دیوار کی طرح حائل ہوگیا۔۔۔ آئی ایم سوری بیلا۔۔۔ رئیلی سوری۔"

وہ ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا اور وہ جیسے نمک کا مجسمہ ہوگئی تھی۔۔۔ رجسٹر پر کھلی نب والا پین گرا تھا۔۔۔ نیلی روشنائی پھیل گئی تھی۔

"کیا تم مجھے معاف کرسکو گی؟" وہ سوال صرف بیلا نے نہیں سنا تھا وہ سوال فاروق احمد نے بھی سنا تھا اور لرز گئے تھے۔

"آپ کی عزت پر کبھی آنچ نہیں آنے دوں گی ابا۔۔۔ اگر زندگی میں کبھی زیادہ مجبور ہو بھی گئی تو تب بھی آپ کا سر جھکنے نہیں دوں گی۔" کیمپ کے بانس پر ہاتھ رکھے وہ پتھر ہوگئے تھے۔۔۔ ادھر بیلا منعم سے مخاطب تھی۔

"میں تھک گئی ہوں زندگی سے لوگوں سے' جذبوں سے۔۔۔ تم نے تو مجھے کٹھ پتلی سمجھا تھا پھر تمہیں مجھ سے محبت کیسے ہوگئی۔۔۔ خیر۔۔۔ محبت کی بات اب نہیں کروں گی۔۔۔ ہم ماضی میں اچھے دوست رہے ہیں۔۔۔ میں کسی کو معاف کرنے والی کون ہوتی ہوں۔" وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ "میں نہیں جانتی کہ مجھے تم سے محبت تھی یا نہیں۔۔۔ میرے حالات مجھے اس جذبے کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے۔۔۔ مگر کچھ چیزیں بے اختیاری میں سرزد ہوجاتی ہیں اور پھر بعد میں ندامت کا باعث بنتی ہیں۔۔۔ میں اپنے ابا کو نادم نہیں دیکھ سکتی۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ میرے ابا نے زندگی میں دو چیزوں سے بہت محبت کی ہے اپنی اولاد سے اور اپنی فصل سے۔۔۔ فصل کا دکھ برداشت کرچکے ہیں مگر اولاد کے دیے گئے دکھ پر مرجائیں گے۔۔۔ اسی لیے میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں چلے جاؤ یہاں سے۔۔۔ چلے جاؤ منعم۔۔۔"

وہ ہاتھ جوڑے بیٹھی تھی۔۔۔ اور وہ اس لڑکی کو کبھی بھی ایسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔۔۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں تو سمجھا تھا جان مانگ لوگی اور کہو گی جاؤ معاف کیا مگر تم نے تو جدائی مانگ لی بیلا۔" وہ خوب صورت شخص بھیگے لہجے میں بولتا ہوا اس کی طرف جھکا تھا!

"تمہاری عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں میرے لیے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔" وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔۔۔ وہ جانے لگا تھا۔۔۔ پلٹا اور مسکرا کر پوچھنے لگا تھا۔ "ہم دوست تو رہیں گے ناں۔۔۔؟" اس نے سر اٹھایا تھا مسکرانے کی کوشش کی مگر ناکام ہوگئی تھی۔

"ہاں۔۔۔ ہم دوست تو رہیں گے۔" ہواؤں میں جانے کہاں سے نمی آگئی تھی۔۔۔ خیموں کے پردے پھڑپھڑا رہے تھے۔ ادھر وہ باہر نکلا تھا ادھر فاروق احمد اندر آئے تھے۔۔۔ وہ میز پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی رجسٹر پر پھیلی نیلی روشنائی اس کے بالوں میں جذب ہو رہی تھی۔

"تم رو رہی ہو۔۔۔؟" آنسوؤں سے بھیگا چہرہ سامنے تھا۔ "ابا آپ؟" فاروق احمد نے بغور اسے دیکھا تھا۔

"محبت کرلی اور بتایا تک نہیں میں تو سینہ چوڑا کیے پھرتا تھا کہ میری بیلی میری اچھی دوست بھی ہے مگر میں غلط تھا تم نے مجھے ہمیشہ ایک باپ کی طرح ہی سمجھا۔۔۔ تم نے غلط کیا۔۔۔ مجھے ایک بار تو کہا ہوتا۔"

"ابا میں آپ کو شرمندہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔"

"کاہے کی شرمندگی؟"

"میں آپ کی عزت کی۔۔۔" بات ادھوری رہ گئی تھی۔۔۔ وہ پین کی نب پر کیپ لگا رہے تھے۔

"عزت یہ نہیں ہوتی بلکہ وہ ہوتی ہے جس کا تم دم بھرتی ہو۔ روایات' اخلاقیات اور اقدار۔۔۔ اور یہ جو بندے کا دل ہوتا ہے ناں یہ عزت کے مقابل نہیں آتا۔۔۔ یہ تو شہنشاہ ہوتا ہے اپنی مرضی کرتا ہے۔۔۔ تمہارے دل نے بھی یہ کرلیا تو کیا غلط کیا؟" وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔۔۔ "تمہارا باپ بھی دل کی مرضی پر چلا تھا۔۔۔ محبت زندگی کی آکسیجن ہوتی ہے یہ نہ ہو تو زندگی ہی ختم ہوجاتی ہے۔۔۔ اور تمہارا باپ اتنا ظالم نہیں کہ تمہاری زندگی کو موت دے دے۔" وہ اٹھی اور ان کے گلے آن لگی تھی۔

"مجھے معاف کردیں ابا۔" وہ اسے تھپک رہے تھے۔

"بیٹیاں معافی مانگتے اچھی نہیں لگتیں۔" وہ اس کے سامنے کھڑے اس کے آنسو پونچھ رہے تھے۔ "وہ اچھا لڑکا ہے بیلا... بالکل تمہارے جیسا۔"

اور ان کی بیلا جیسا وہ شخص کاندھے پر بیگ رکھے پگڈنڈی پر چلتا ہوا جارہا تھا۔ وہ اس تک پہنچے تھے۔

"سنو... منعم علی" وہ وہیں زنجیر ہوگیا تھا۔

"جی..." چہرے پر صدیوں کی تھکن تھی۔

"پھر کب آؤ گے؟" وہ دور قطاروں میں لگے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔

"اب کبھی نہیں آؤں گا۔" وہ اس کے سامنے کھڑے ہوگئے تھے۔

"بیٹیاں' باپ کا مان ہوتی ہیں۔ عزتوں کی وارث ہوتی ہیں اور اچھے باپ' بیٹیوں کے دلوں کے وارث ہوتے ہیں۔" وہ ہنسے تھے' آنکھیں چھلک گئیں' وہ دم بخود سا انہیں دیکھ رہا تھا۔ "بیٹی اگر تعلیم کا حق رکھتی ہے تو اپنی پسند کا بھی حق رکھتی ہے۔ میری بیٹی کو لگا اس کا باپ اسے تعلیم کا حق تو دے سکتا ہے مگر اپنی پسند کا حق نہیں دے سکتا۔ مگر وہ غلط تھی۔ فاروق احمد ایک اچھا باپ ہے۔ جلدی اپنے ابا کو لے کر واپس آنا۔ میں انتظار کروں گا۔"

منعم علی کے ہاتھوں سے بیگ چھوٹ گیا تھا۔ وہ ان کے گلے لگا تھا۔ "تھینک یو انکل فار دس فیور۔" وہ ہنس دیے تھے۔

"اوئے پتر... تیرے سوہرے (سسر) کو انگریزی نہیں آتی۔" وہ جھینپ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ پلکوں پہ رم جھم ستاروں کا میلا سا ہے
یہ جو آنکھوں میں دکھ سکھ کے ساون کا ریلا سا ہے
یہ جو تیرے بنا کوئی اکیلا سا ہے
زندگی تیری یادوں سے مہکا ہوا شہر ہے
سب محبت کا اک پہر ہے
زندگی' دھوپ چھاؤں کا اک کھیل ہے... بھیڑ چھٹتی نہیں
اور اسی کھیل میں دن گزرتا نہیں... رات کٹتی نہیں
پیار کرتے ہوئے آدمی کی عمر... کبھی گھٹتی نہیں
دل کی دہلیز پر عکس روشن تیرے نام سے
رت جگے آئینوں میں کھلے ہیں کہیں شام سے
ایک دریا چاروں طرف درمیاں لہر ہے
سب محبت کا اک پہر ہے

وہ ان کی زندگی کا سب سے حسین ترین دن ہے۔ وہ سر جھکائے گھونگھٹ اوڑھے بیٹھی ہے۔ وہ اس کے قریب بیٹھا سرگوشیوں میں مصروف ہے۔

"تم نے زمین پر پریاں اترتی دیکھی ہیں؟"

"نہیں تو۔" بیلا نے واقعی نہیں دیکھی تھیں۔

"میں نے دیکھی ہیں۔"

"سفید جھوٹ۔"

"ارے تمہارا مجازی خدا جھوٹ نہیں بولتا۔" یقین دلایا گیا تھا۔

چنبیلی ہیل پہنے گرتی پڑتی ان تک آئی تھی۔ "تم دونوں کی محبت کے لیے میری دعائیں قبول ہوئیں۔"

عفت اسے دھکیلتی بیلا تک پہنچی تھیں۔ "میں سوچ رہی ہوں تم دونوں کی محبت کہانی لکھوں۔"

منعم ہنسا تھا۔ "سوری میم... وہ تو منشا محسن علی نے لکھ لی ہے۔" صدف' روشی اور ریحانہ اسٹیج پر نیگ لینے پہنچی ہوئی تھیں۔

ابا اور اماں دور کھڑے بیلا کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ "زندگی کی خوشیوں پر ہر بیٹی کا حق ہوتا ہے اور اس حق کو ہر ماں' باپ کو کھلے دل سے تسلیم کرلینا چاہیے۔" وہ دوبارہ بیلا کی طرف جھکا تھا۔

"کیا میں یہ یقین رکھوں کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟"

"سوچ کر بتاؤں گی۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ بیلے کی کلیوں سی بیلا کی آگے زندگی قہقہوں' شرارتوں اور مسکراہٹوں کے رنگوں سے سجنے والی تھی۔ اور اسے ہی تو زندگی کہتے ہیں۔

☆ ☆

حیا بخاری

ملال چاہیے نہیں

مارچ کے اوائل کے دن تھے۔ مگر گرمی کافی شدت اختیار کرچکی تھی۔ حبس اور گھٹن تو فضا میں مفقود تھے پھر بھی عجیب سی سستی چڑھی رہتی تھی وجود پہ۔ آج صبح سے گھر گھر کے آنے والے بادلوں نے موسم کو کافی اچھا کردیا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں دل اداس ہورہا تھا وہ چائے بناکر ٹیرس پہ آگئی۔ اماں ابا کا یہ گھر آبادی سے کافی دور خاصی اونچائی پہ تھا۔ تب ہی یہاں سے اردگرد پھیلا سبزہ' پکی صاف لمبی سڑکیں اور رات کو جلتی بجھتی شہر اسلام آباد کی روشنیاں صاف نظر آتی تھیں ... یہ اس کی سب سے پسندیدہ جگہ تھی۔ جسے چھوڑنے کا وہ تصور بھی نہ کرسکتی تھی۔ لیکن ہر بیٹی کی طرح اسے بھی یہ گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ جب وہ دلہن بنی اشعر کی ہمراہی میں ایبٹ آباد رخصت ہوکے گئی تھی۔

ایک دم سے ہی بارش شروع ہوئی تھی۔ تیز بوچھاڑ نے اسے بھگودیا تھا۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔ بارش میں بھیگتی' بارش کے پانی کے ساتھ گرم سیال مادہ اس کے گال جلائے جارہا تھا۔

اشعر نے اسے اپنے ایک کزن کی شادی میں دیکھا تھا۔ وہ دلہن کی سہیلی تھی۔ اور تب ہی ہر رسم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی۔ اشعر کی نگاہیں مسلسل اس کا طواف کرتی رہتیں۔ وہ اشعر کی نگاہوں میں اپنا عکس صاف دیکھ سکتی۔ تب ہی رخصتی کے فوراً" بعد واپس گھر لوٹ آئی تھی۔ اور صرف تیسرے دن ہی اشعر اپنی امی کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گیا تھا۔ ابو کئی سال پہلے ایک حادثے میں وفات پاچکے تھے۔ سو صرف امی ہی تھیں اشعر کی۔ زیادہ لمبی چوڑی فیملی نہیں تھی تب ہی امی ابو نے بخوشی اس رشتے کو قبول کرلیا تھا۔ اور وہ خواب سجائے اشعر کے گھر اتری تھی بالکل پریوں کی طرح۔



اشعر اور اماں دونوں ہی اس کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ وہ خود بھی بہت کیئرنگ تھی۔ لیکن اشعر اور اماں اس پہ زیادہ کام کا بوجھ نہیں ڈالتے تھے۔

شادی کا دوسرا مہینہ تھا جب اماں کو فالج کا اٹیک ہوا۔ وہ بالکل بستر پہ ڈھے گئیں۔ یہ صورت حال اشعر سے زیادہ ہانیہ کے لیے پریشان کن تھی۔ وہ ایک ساتھ دو بھاری ذمہ داریوں میں گھر گئی۔ اشعر کام کے سلسلے میں شام تک باہر ہی ہوتے۔ ہانیہ گھر کو بھی دیکھتی اور اماں کو۔ اماں بالکل چپ ہوگئی تھیں۔ بس بستر پہ لیٹی یا چھت کو گھورتی رہتیں یا پھر ہانیہ ان کو دیکھنے ان کے کمرے کا چکر لگاتی تو اسے دیکھتیں۔ ان کی آنکھوں کی بے بسی اس کا دل کاٹ دیتی۔ ہنس مکھ' چست سی اچانک ہی دوسروں کے رحم و کرم پہ آگئی تھیں۔ ہانیہ کو ان کی حالت نے توڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ سارا دن ان کے کاموں میں لگی رہتی۔ ان کے بستر سے لگی باتیں کرتی رہتی۔ ان سے اپنا حال شیئر کرتی۔ مختلف کتابیں سناتی۔ اور کبھی ٹی وی لگا کر ان کے پسندیدہ پروگرام دکھایا کرتی۔ ان کے لیے تلاوت کرنا بھی اس نے اپنا معمول بنالیا تھا۔

ان ہی دنوں اللہ تعالیٰ نے اسے ایک بہت بڑی خوش خبری بخشی تھی۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ اس دن وہ بہت خوش تھی۔ اس نے اماں سے بہت سی باتیں شیئر کی تھیں۔ اپنے پلان اپنے جذبات سب اماں سے

ڈسکس کیے تھے۔ اماں اب مسکرانے لگی تھیں۔
لیکن ان ہی دنوں اس کے مسائل بھی بڑھ گئے تھے۔ اماں کی بیماری کی وجہ سے گھر دواخانہ بنا ہوا تھا۔ پہلے تو کام کرتے ہوئے اسے کوئی دقت نہ ہوتی تھی



لیکن اب دواؤں کی بو سے اسے عجیب سا محسوس ہونے لگا تھا۔ دل متلانے لگتا۔ اور شدید متلی ہونے لگتی۔ اماں کی دواؤں کو دیکھتے ہی وہ کھایا پیا الٹ دیتی۔ اشعر پریشان ہو جاتا۔

"تم اب آرام کیا کرو۔ میں کسی نرس کا بندوبست کر دیتا ہوں۔" اشعر اس کے خیال سے کہتا۔ مگر وہ انکار کر دیتی۔

"نہیں نہیں اشعر۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ امی کہتی ہیں شروع کے دنوں میں ایسا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اسے تسلی دیتی۔ "پھر آپ جانتے ہیں۔ اماں کسی اور کو اپنے قریب کہاں برداشت کر پائیں گی۔ خواہ مخواہ شرمندگی محسوس کریں گی۔ مجھ سے ویسے بھی ان کی یہ حالت برداشت نہیں ہوتی۔ نرس کی وجہ سے وہ اور زیادہ محرومی کا شکار ہو جائیں گی۔" اس کی بات میں وزن تھا۔ تب ہی اشعر نے اصرار نہیں کیا تھا۔ اور وہ اپنی نازک حالت بھلائے اماں کی خدمت میں لگی رہی تھی۔



وقت پر لگا کر گزرا تھا۔ وہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ زندگی کٹھن سہی لیکن بے حد خوب صورت تھی۔ اماں بے شک چپ تھیں لیکن ہانیہ جانتی تھی ان کے دل سے ہر وقت ان سب کے لیے دعائیں جاری رہتی تھیں۔

ہانیہ نے اماں کی شدید بیماری کے باوجود ان کو کبھی حقیر نہ سمجھا تھا۔ نہ ہی بچوں کو ان کے قریب جانے سے کبھی روکا۔ وہ دل سے نہ صرف ان کی خدمت کرتی بلکہ خود بچوں کو لے کر ان کے پاس جا بیٹھتی۔ اماں بس ان کو دیکھ دیکھ کے مسکرائے جاتیں۔

"نہ جانے تم میری یا اماں کی کون سی نیکی کا ثمر ہو۔" اشعر بے اختیار ہوتے اس کی پیشانی چوم لیتا۔ وہ نظریں جھکا جاتی۔

"خوش قسمت تو میں ہوں اشعر۔ کہ آپ جیسا پیار کرنے والا ساتھی اور اماں ملیں۔ آپ دونوں کا ساتھ نہ ہو تو زندگی میں ایک قدم بھی دو بھر ہو جائے۔"

"کاش میں کبھی تمہارے احسانات کا بدلہ چکا سکوں۔" وہ دعا کرتا۔

"اشعر۔ شرمندہ نہ کریں۔" وہ سچ میں شرمندہ ہو جاتی۔ اور پھر اس کا امتحان ختم ہوا تھا۔ اماں چپ چاپ ہی دنیا سے منہ موڑ کر چلی گئی تھیں۔ اور ہانیہ کو لگا اماں پہلی بار ہی چپ ہوئی تھیں یا کم از کم اس کی زندگی بالکل ویران کر گئی تھیں۔



امی کی طبیعت خراب تھی۔ وہ پہلی گاڑی سے ایبٹ آباد پہنچی تھی۔ اشعر کو کام تھا۔ سو وہ اس کے ساتھ نہ آسکا تھا۔ وہ بچوں کو لے کر اکیلی وہاں پہنچی تھی۔ بابا دروازے پہ ہی اس کے منتظر تھے۔

"بابا۔" وہ فوراً ان سے لپٹ گئی۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر گئے۔ "امی کہاں ہیں؟"

"آؤ۔ اندر اپنے کمرے میں ہی ہیں۔" ہانیہ کو ساتھ لیے وہ اپنے کمرے میں آگئے۔ اماں بے سدھ سی بیڈ پر پڑی تھیں۔

"امی!" ہانیہ نے قریب جا کر ماں کو پکارا تو آنکھیں بے خود بخود بھیگنے لگے۔ امی نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ "امی" وہ رو دی۔

"ہانیہ۔" انہوں نے بولنے کی کوشش کی۔ مگر نہ بول سکیں۔

"ہانیہ۔" بابا نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پکارا۔ "یوں تو تم اپنی ماں کو اور پریشان کرو گی۔" ان کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے وہ خاموش ہو گئی تھی۔

بعد میں بابا نے اسے بتایا تھا۔ کہ اس کی ماں کو برین ٹیومر ہے اور ڈاکٹرز کے مطابق وہ صرف چند دن کی مہمان ہیں۔ وہ کتنی ہی دیر روتی رہی۔ بابا بس چپ چاپ اس کا سر سہلاتے رہے۔

☆ ☆ ☆

وہ امی کے کپڑے دھو رہی تھی۔ جب چار سالہ شانی دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"امی۔ میں نانو کے ساتھ جا کر سو جاؤں۔" وہ اس کی طرف مڑی۔

"نیند آرہی ہے۔" شانی اثبات میں سر ہلا گیا۔ وہ دادو کے ساتھ سونے کا عادی تھا۔ یہاں آکر اکثر امی کے ساتھ ہی سونے کی ضد کرتا۔ امی بھی اسے پاس دیکھ کر خوشی سے نہال ہو جاتی تھیں۔

"ہاں۔ جاؤ سو جاؤ۔ میں بس کپڑے پھیلا لوں تو آتی ہوں۔" اس نے شانی کے گال تھپتھپائے اور پھر سے کام میں جت گئی۔

"مجھے کم از کم تم سے یہ امید نہیں تھی ہانیہ۔" اشعر کی آواز سے اس کے انگ انگ میں اس قدر خوشی پھوٹی تھی کہ نہ اس کے لہجے پہ وہ غور کر پائی تھی نہ اس کے الفاظ پہ۔

"اشعر آپ۔!" وہ خوشی سے تقریباً" چلا اٹھی۔

"مجھے لگا تھا تم بچوں کا خیال رکھو گی۔ تب ہی میں نے ان کو تمہارے ساتھ بھیجا تھا۔ لیکن اب..." اس کے بدلے لہجے پہ وہ ایک دم ماند پڑی تھی۔

"کیا مطلب؟ کیا ہوا بچوں کو۔" وہ پریشان سی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ کہ اشعر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔ لیکن جس طرح کی لاپروائی تم کر رہی ہو۔ تو ایک دن وہ بھی تمہاری ماں کی طرح بستر پر پڑے نظر آئیں گے۔"

"اللہ نہ کرے اشعر۔" اشعر کے سخت تلخ لہجے نے اس کا دل کاٹ کے رکھ دیا۔

"نیچے اماں کے کمرے میں دواؤں کی اسمیل سونگھی ہے تم نے۔ اور تمہیں پتا ہے کہ تمہاری ماں کو برین ٹیومر ہے۔ اگر ان کی وجہ سے میرے بچے بھی اس بیماری کا شکار ہو گئے تو... ذمہ دار کون ہوگا ہانیہ۔" وہ بولے گیا۔ اور ہانیہ کا ذہن بس ایک لفظ میں اٹک کے رہ گیا۔ "تمہاری ماں۔"

"میں سوچ کے آیا تھا کہ تمہارے ساتھ ایک ہفتہ یہیں رہوں گا۔ لیکن مجھے لگتا ہے، بچوں کو لے کر آج ہی نکل جانا چاہیے۔ میں اپنے بچوں کو تمہاری لاپروائی کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا۔ سوری۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا نیچے چلا گیا تھا۔ ہانیہ اس کے لفظوں کی بازگشت سنتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"ہانیہ۔ چپ کر جاؤ بچے۔" بابا نے اپنی نم آنکھیں رگڑتے ہوئے اس سے بھی کہا۔ مگر وہ سسکیوں میں روتی رہی۔

"کیوں بابا... مرد ایک ہی جست میں میری تمہاری پہ کیوں آجاتا ہے۔ میں نے آپ کو چھوڑا' آپ کے ساتھ اپنا گھر چھوڑا۔ اس گھر کو اپنا مانا' اماں کو اپنی ماں سمجھا' ان کی بے لوث خدمت کی' کبھی خود ان سے گھن کھائی نہ بچوں کو ان سے الگ کیا تو آج امی کے لیے ان کو 'تمہاری' کا لفظ کیوں یاد آیا بابا۔ کیوں؟" وہ روتی رہی۔ لیکن بابا کے پاس اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"بابا۔ مما کب آئیں گی؟" بچوں کی وجہ سے وہ آفس بھی صحیح نہ سنبھال پا رہا تھا۔ اور گھر آتے ہی بچوں کے سوالات۔ اس کا دماغ پھٹنے لگتا۔

"آجائیں گی۔" وہ رف سا جواب دیتا۔

"بابا۔ دادو کے کمرے کا سامان کہاں گیا؟" شانی کے سوال پہ وہ چونکا۔

"کون سا سامان۔" وہ حیران ہوا کیونکہ سارا سامان ڈبے میں پڑا تھا۔

"ان کی دوائیں' ان کی باتھ روم چیئر اور ان کے کپڑے۔"

"کمرے میں نہیں ہیں کیا؟" وہ الجھا۔ شانی نے نفی میں سر ہلایا۔

"صابرہ۔ صابرہ۔" وہ چلایا۔ نوکرانی بھاگ کے آئی تھی۔

"جی صاحب۔"

"میں نے منع کیا تھا ناں کہ اماں کے کمرے کی ہر چیز وہیں موجود ہونی چاہیے۔ پھر ہانیہ نے جرات بھی کیسے کی سامان ہٹانے کی۔ اور تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔"

"وہ صاحب جی۔" وہ گھبراہٹ سے انگلیاں موڑنے لگی۔

"بیگم صاحبہ نے نہیں جی میں نے سامان اٹھا کر اسٹور روم میں رکھوا دیا ہے جی۔"

"کیوں۔" وہ چلایا۔

"صاحب جی ان معصوموں کی وجہ سے۔ اماں کے سخت عادی تھے یہ۔ تو بار بار ان کے کمرے میں گھس جاتے تھے۔ میں نے سوچا خدا نا خواستہ کہیں یہ بھی...." اور وہ بت کی طرح جم سا گیا تھا۔ برف کی سرد لہر اس کے جسم کا احاطہ کرنے لگی۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ پھر بھی اسے عزیز تھی۔ اور ہانیہ کی ماں۔

ہانیہ نے کبھی اس کی ماں سے گھن نہ کھائی تھی۔ نہ ہی ان کی بیماری سے، بلکہ بچوں کو بھی ان کا اتنا عادی بنا دیا تھا کہ اب بھی وہ بار بار اس کمرے میں چلے جاتے تھے۔ ہانیہ بھی ہر وقت ان سے اماں کی باتیں کرتی تھی۔

"بار بار بچوں کو اماں کی باتیں کیوں سناتی ہو۔" ایک مرتبہ اس نے یوں کہا تھا۔

"کیونکہ میں چاہتی ہوں انہیں اماں کبھی نہ بھولیں۔" وہ مسکرائی تھی۔ اشعر کے دل میں درد سا ہونے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"نانا.... نانو۔" وہ جو آنکھیں بند کیے روئے جا رہی تھی۔ بارش کے شور میں مانوس سا شور اس کو اپنا وہم ہی لگا۔ آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ بارش پھر برسنے لگی تھی۔

"میرے بنا یہ بارش کیونکر انجوائے کر سکتی ہو تم۔" کوئی اس کے بے حد قریب بولا۔ وہم در وہم.... اس نے اور زور سے آنکھیں میچ لیں۔

"ساری زندگی تمہیں اپنا بنا کے رکھنے، تمہیں دل سے بھی قریب رکھنے کا وعدہ کر کے نہ جانے میں تیری میری کی گردان میں کیسے جا پھنسا۔" کسی نے دھیرے سے اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کیے تھے۔ اس نے لب دانتوں کے نیچے دبا لیے تھے۔ وہ بکھر رہی تھی۔

"تب ہی آج معافی مانگنے آیا ہوں۔ میرا یقین کر لو ہانیہ۔" کسی نے اسے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ اور چنبیلی کی مسحور کن خوشبو محسوس کرتے ہی اس کے چوڑے سینے پہ سر رکھے وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔

"آخری دفعہ معاف کر دو ہانیہ۔ خدا گواہ ہے مجھے کبھی بھی ملال کی چاہ نہیں رہی۔ میں نے تو تمہارے اور اپنے لیے ہمیشہ آسودگی مانگی ہے۔ اور اس کے لیے مجھے جتنا بھی جھکنا پڑے گا۔ میں جھکوں گا۔"

اس کے لہجے میں شرمندگی تھی، ملال تھا، محبت بھی تھی اور مان بھی۔ ہانیہ نے خود ہی تو محبت اور مان کے پودے سینچے تھے۔ وہ ان کو شرمندہ کیونکر کر سکتی تھی۔

"میں آپ سے خفا ہو ہی نہیں سکتی اشعر۔"

"تھینک یو ہانیہ۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ ملال کی چاہ نہ تھی، تب ہی تو وہ فوراً "ملال کی راہ سے واپس پلٹ آیا تھا۔

☆ ☆

تنزیلہ ریاض

راپنزل

مہر کو کہانیاں سننے کا بے حد شوق ہے اسکول کے فینسی ڈریس شو میں وہ شہزادی راپنزل کا کردار ادا کر رہی ہے' اس لیے اس نے اپنے پاپا سے خاص طور پر شہزادی راپنزل کی کہانی سنانے کی فرمائش کی۔ کہانی سناتے ہوئے اسے کوئی یاد آجاتا ہے' جسے وہ راپنزل کہا کرتا تھا۔

نینا اپنے باپ سے ناراضی کی وجہ سے اپنے خرچ مختلف ٹیوشن پڑھا کر پورے کرتی ہے۔ اس کی بہن زری ٹیلی فون پر کسی لڑکے سے باتیں کرتی ہے۔ نینا کی سلیم سے بہت دوستی ہے۔ سلیم کی محلے میں چھوٹی سی دکان تھی۔ ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے وہ ایک ٹانگ سے معذور ہو جاتا ہے۔ سلیم نے پرائیویٹ انٹر کیا ہے اور اس کی غزل احمد علی کے نام سے ایک ادبی جریدے میں شائع ہوتی ہے۔

سمیع اور شہرین نے ضد کر کے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جا کر شادی کی ہے' لیکن شہرین اپنے والدین کی ناراضی کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ سمیع اور شہرین دونوں اپنی بیٹی ایمن کی طرف سے بہت لاپروا ہیں اور انہوں نے گھر کی دیکھ بھال کے لیے دور کی رشتہ دار اماں رضیہ کو بلا لیا ہے۔

صوفیہ کا تعلق ایک متوسط گھر سے تھا' صوفیہ کی شادی کاشف نثار سے ہوتی ہے' جو وجاہت کا اعلا شاہکار بھی تھا۔ شادی کے بعد صوفیہ کو کاشف کا غیر عورتوں سے بے تکلفی سے ملنا پسند نہیں آتا اور وہ شک کا اظہار کرتی ہے' لیکن کاشف کاروبار کا تقاضا ہے کہہ کر اس کو مطمئن کر دیتا ہے۔ صوفیہ کو کاشف کے دوست مجید کی بیوی حبیبہ بہت بری لگتی ہے کیونکہ





وہ کاشف سے بہت بے تکلف ہے۔ صوفیہ کی ایک بیٹی پیدا ہوتی ہے۔ زرمین۔
حبیبہ کے شوہر مجید کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوجاتا ہے وہ اپنا سارا پیسا کاشف کے کاروبار میں انویسٹ کردیتی ہے۔ حبیبہ کاشف پر شادی کے لیے دباؤ ڈالتی ہے' کاشف کے انکار پر ان کا جھگڑا ہوجاتا ہے اور وہ دبئی چلی جاتی ہے۔
کاشف کے تعلقات ایک ناکام اداکارہ رخشی سے بڑھنے لگتے ہیں اور وہ کاشف کو فلم بنانے کے لیے آمادہ کرلیتی ہے اور اس چکر میں کاشف اپنا سارا پیسا لٹا دیتا ہے۔ صوفیہ ایک مردہ بچے کو جنم دیتی ہے۔ کاشف کی ماں بی بی جان کا انتقال ہوجاتا ہے۔
سلیم کی بہن رخشی کا انتقال ہوجاتا ہے اور نینا اس کی بیٹی مہر کے لیے پریشان ہوتی ہے۔ نینا کی اسٹوڈنٹ رانیہ' اسے بتاتی ہے کہ ایک لڑکا اسے فیس بک اور واٹس اپ پر تنگ کررہا ہے۔ "آئی لو یو رابینزل" لکھ کر۔
شہرین کو برین ٹیومر ہوجاتا ہے اور سمیع اس کا آپریشن کرواتا ہے اور اس کی ماں کو منا کر اسپتال لے آتا ہے۔
زری بعض لڑکے سے بات کرتی تھی وہ شادی کے لیے کہتا ہے' زری نینا سے ذکر کرتی ہے۔ نینا اس کی تصویر دیکھ کر چونک جاتی ہے' بعد میں اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ ہی لڑکا ہے جو رانیہ کو میسج کرتا تھا وہ زری کو منع کرتی ہے اور سلیم کے کہنے پر زری کو سمجھانے کے لیے رات کو سلیم کو گھر بلاتی ہے۔ زری اس پر سلیم سے محبت کرنے کا الزام لگاتی ہے۔ شور ہونے پر ابا جاگ جاتے ہیں اور سلیم کو تھپڑ مارتے ہیں۔ سلیم صدمے اور شرمندگی کی وجہ سے خودکشی کرلیتا ہے۔

تیئسویں قسط

"سب ٹھیک ہے نا۔۔؟ آپ کی بہن کی طبیعت کیسی ہے اب" وہ ویٹنگ روم میں چیئر پر بیٹھی ہی تھی جب سمیع نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ نینا نے اس کے سوال پر اپنی خوش گوار حیرت کو بمشکل چھپایا۔ وہ تو اپنی حیرت کو تب بھی نہیں چھپا پائی تھی جب سمیع نے اسے ہاسپٹل خود ڈراپ کرنے کی آفر کی تھی اور پھر اسے گیٹ پر چھوڑ کر چلے جانے کے بجائے وہ اس کے ساتھ اندر آگیا تھا اور اب نا صرف وہ ہاسپٹل ہی میں موجود تھا بلکہ اس کی بہن کے متعلق پوچھ بھی رہا تھا جبکہ وہ لیبر وارڈ سے یہ سوچتی ہوئی آئی تھی کہ وہ اب تک چلا گیا ہوگا۔ نینا نے ہاسپٹل پہنچتے ہی اسے کہہ دیا تھا کہ وہ چاہے تو واپس چلا جائے لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ کچھ دیر بعد چلا جائے گا۔۔ کیا پتا کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے جو فی الوقت ہاسپٹل میں موجود نا ہو۔۔۔
"میں یہیں آپ کے ساتھ ہوں نینا۔۔" سمیع نے ویٹنگ روم میں بیٹھتے ہوئے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا۔ نینا جانتی تھی کہ اس کے اس طرح سے کہنے کے کوئی دو مطالب نہیں ہیں۔ وہ عام سے انداز میں اسے حوصلہ دینے کی کوشش کررہا تھا لیکن پھر بھی اسے بے حد اچھا لگا اور اب جب وہ زری کے متعلق پوچھ رہا تھا تو اسے مزید اچھا لگا۔
"جی ٹھیک ہے۔۔۔ اس کی ڈاکٹر کو کال کردی ہے۔۔ سرجری کریں گے شاید" نینا نے نہایت ہی مناسب الفاظ میں اسے وہ سب بتانے کی کوشش کی جو لیبر روم میں ہیڈ نرس نے اسے بہت تفصیل سے بتایا تھا۔ ان کے درمیان ایک جھجک کا رشتہ تھا۔ ایک دو منٹ یونہی خاموشی میں گزر گئے پھر نینا نے ہی یہ خاموشی توڑی تھی۔
"آپ واپس چلے جائیں۔۔۔ میں تو اب یہاں رکوں گی۔۔۔ صبح ہوجائے گی" اسے امید تھی کہ وہ ابھی بھی وہی جملہ دہرائے گا جو اس نے پہلے کہا تھا لیکن سمیع نے مثبت انداز میں سر ہلاتے ہوئے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔
"ہمم۔۔۔" اس نے ہنکارا بھرا تھا پھر ذرا سا رخ اس کی جانب موڑ کر بولا "شہرین اکیلی ہوگی۔۔۔ میں اب چلتا ہوں۔۔۔ آپ کو جب بھی واپس آنا ہو۔۔۔ آپ کال کردینا۔۔۔ میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا"۔

ابھی بہتر۔۔" نینا نے اپنے تاثرات کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلایا تھا۔وہ چاہتی تھی کہ وہ اس کے پاس ہی بیٹھا رہتا یا کم سے کم ایک بار ضرور وہی جملہ دہراتا۔
"میں یہیں آپ کے ساتھ ہوں کونین۔۔"اس نے تصور ہی تصور میں اس کا یہ جملہ اب تک کئی بار دہرایا تھا۔کتنا اچھا لگتا ہے جب ایک من چاہا شخص ایسے کہتا ہے۔۔۔نینا کو بھی اچھا لگتا تھا لیکن سمیع کو شاید احساس ہی نہیں تھا۔وہ اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔نینا کو بھی اٹھنا پڑا۔
"اماں رضیہ سے کہیے گا کہ ایمن کو اپنے ہاتھوں سے ناشتا کروا کر اسکول بھیجیں۔۔وہ خود نہیں کھائے گی۔۔۔اسے زبردستی کھلانا پڑتا ہے۔"اس نے تاکید کی تھی۔
"آپ اس کی فکر مت کریں۔۔میں دیکھ لوں گا۔۔فی الوقت آپ اپنی بہن پر فوکس کریں۔۔آپ کی انرجی کی زیادہ ضرورت ہے یہاں" سمیع نے کہا تھا۔نینا بلاوجہ ہی مسکرادی۔حالت تو پریشان کن تھے لیکن پھر بھی اسے مزا آیا تھا۔۔عام حالات میں تو سمیع کبھی اس سے ایسے بات نا کرتا تھا جیسے اس وقت کر رہا تھا۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔۔۔ایک جھینپی ہوئی مگر اطمینان بخش مسکراہٹ۔۔
"گھر پہنچ کر مجھے واٹس ایپ کردیجیے گا ورنہ میرا دل پریشان رہے گا۔"اس نے سمیع کی پشت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔سمیع آگے بڑھ چکا تھا۔اس کی بات سن کر وہ پلٹا پھر اس نے سر ہلایا اور پھر جانے کیا سوچ کر اس کی جانب مڑا۔
"آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا"اس نے کہا تھا اور اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔وہ جانے سے پہلے اس سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا۔ایسا بھی اس نے پہلے کبھی نا کیا تھا۔نینا کے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہوئی۔اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا تھا،سمیع نے اس کا ہاتھ تھاما اور اگلے ہی لمحہ چھوڑ دیا تھا۔
"کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کال کر لیجیے گا کونین" وہ کہہ رہا تھا،نینا کو لگا وہ گر پڑے گی۔وہ آگے بڑھ گیا تھا جبکہ نینا اپنی دھڑکن کو قابو کرتی وہیں بیٹھ گئی۔
اتنی اپنائیت،اتنی محبت۔۔۔پہلے کب اتنی توجہ دی تھی اِس شخص نے اُسے۔
"زری۔۔تیری اور تیرے ہونے والے بچے کی خیر ہو۔۔۔"اس نے دل ہی دل میں زری اور اس کے ہونے والے بچے کے لیے ڈھیروں دعائیں کرڈالیں کہ جن کی بدولت اسے یہ دن دیکھنے کو ملا تھا۔اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ میں دبا لیا تھا۔اس نے ایک ہی لمحے کے لیے تو چھوا تھا یہ ہاتھ۔۔۔نینا کو اپنا ہی ہاتھ پہلی بار بے حد قیمتی لگا۔۔۔زندگی میں پہلی بار کوئی اچھا لگنے لگا تھا اسے۔۔۔پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کوئی ایسے اہم ہوا تھا اس کے لیے۔۔۔اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کو سہلایا تھا۔ایک بار نہیں کئی بار۔۔۔پہلی بار اسے اپنی لاپروائی پر غصہ آیا تھا
"کبھی ہاتھوں پر کوئی موئسچرائزر ہی لگا لیا کرو اللہ کی بندی۔۔۔کیا سوچتا ہوگا وہ۔۔۔کتنے خشک سے بے رونق ہاتھ ہیں کونین کے۔۔۔"وہ ویٹنگ روم کی ٹھنڈی سی کرسی پر بیٹھی بلاوجہ ہی مسکرادی تھی۔۔۔ایسی طمانیت بھری ہنسی بہت دن کے بعد نصیب ہوئی تھی اسے۔
یہ ہوتی ہے محبت۔۔کسی کی ادا۔۔کسی کی زندگی ہوتی ہے۔۔۔کسی کو پروا بھی نہیں ہوتی۔۔اور کوئی جان نچھاور کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔۔۔کوئی فقط ایک نظر دیکھتا ہے۔۔اور کسی دوسرے کے لیے وہ نظر نور کا ہالہ بن جاتی ہے۔۔کوئی کہہ کر بھول جاتا ہے۔۔اور کوئی اسی بھولی ہوئی بات کو تعویذ بنا کر گردن میں سجا لیتا ہے۔۔۔۔

محبت کو خواہ مخواہ بدنام نہیں کیا شاعروں نے۔۔۔" کمینے" کی ادائیں ہی قاتلانہ ہیں" نینا سوچتے ہوئے خود ہی ہنس دی تھی۔

☆☆☆

ایمن کی بے بی سسٹر کے طور پر اس کی جاب کا چوتھا یا پانچواں دن تھا۔ ایمن کی دادو فیصل آباد سے شہرین کی بیماری کا سن کر رہنے کے لیے آ گئی تھیں۔ نینا نہیں جانتی تھی کہ انہیں اس کے متعلق کیا بتایا گیا ہے لیکن وہ ان کی کریدتی آنکھوں اور پر تجسس طبیعت کو اپنے وجود کے ارد گرد طواف کرتا محسوس کر رہی تھی۔ وہ زیادہ تر ایمن کے کمرے میں ہی وقت گزارتی تھی لیکن پھر بھی بچی کی ضروریات کے سو مسئلے مسائل تھے وہ سارا وقت کمرے میں ہی بیٹھی نہیں رہتی تھی۔ اسے کچن میں بھی جانا پڑتا تھا۔ اماں رضیہ کو اکیلا کام کرتا دیکھ کر وہ ان کی مدد بھی کر دیتی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ سمیع کی والدہ اس سے کچھ پوچھنا کہنا چاہتی ہیں لیکن چپ رہتی ہیں شاید سمیع نے انہیں کچھ پوچھنے سے منع کر دیا تھا۔

گھر میں صرف اماں رضیہ واقف تھیں کہ سمیع اور نینا نے یہ فیصلہ ایمن کی بھلائی کے لیے کیا ہے۔ وہ اس فیصلے سے کافی مطمئن بھی نظر آتی تھیں۔ وہ اکیلے اب اتنی ساری ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل نا رہی تھیں۔ اس لیے بھی انہیں نینا کی موجودگی اچھی لگ رہی تھی حالانکہ اسے زیادہ کام نہیں آتے تھے نا ہی وہ گھر کی ملازمہ تھی لیکن اس نے ایمن کی مکمل ذمہ داری ان پانچ دنوں میں سنبھال لی تھی۔ شہرین کی سرجری ہوئی تھی اور وہ کوما میں چلی گئی تھی۔ اس کی حالت زیادہ تسلی بخش نا تھی۔ سمیع سارا وقت ہاسپٹل میں ہی ہوتا تھا۔ گھر میں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی کچھ بڑھ گیا تھا۔ اماں رضیہ بھی کافی سست سی رہنے لگی تھیں۔ انہوں نے سمیع سے درخواست کی تھی کہ ملازمین کی تنخواہیں اور خرچے کے پیسے وغیرہ نینا کو دے دیے جائیں تاکہ گروسری اور دوسرے کاموں میں وہ ان کی معاونت کر سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ حساب کتاب دیکھیں یا مہمان سنبھالیں جو شہرین کی بیماری کا سن کر بڑی تعداد میں آنے لگے تھے۔ سمیع کے درخواست کرنے پر نینا نے یہ ذمہ داری بھی قبول کر لی تھی۔ وہ سب اس پر بھروسا کرنے لگے تھے اگرچہ یہ سب کچھ مستقل بنیادوں پر نہیں ہو رہا تھا لیکن پھر بھی فقط چند ہی دنوں میں نینا اس گھر کی "ضرورت" بن گئی تھی۔

شہرین کے اس طرح کوما میں چلے جانے سے جو صورت حال یکدم بگڑ گئی تھی وہ سب مل کر اس کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس روز بھی وہ دوپہر کے وقت ایمن کو کھانا کھلانے اس کے کمرے سے باہر لائی تو سمیع اپنی امی کو ہاسپٹل سے گھر ڈراپ کرنے آیا تھا۔ نینا نے اسے سلام کیا، شہرین کی طبیعت پوچھی اور ساتھ ہی اس سے دوپہر کے کھانے کے متعلق بھی استفسار کر لیا کہ آیا اس نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ سمیع کی امی بغور اسے دیکھ رہی ہیں۔ ایمن کو کھانا کھلا کر وہ اسے تھوڑی دیر سلانے کی نیت سے واپس کمرے میں چلی گئی تھی پھر جب وہ خود کھانا کھانے واپس آئی تو اسے اندازہ ناتھا کہ لاؤنج میں کوئی مہمان بھی موجود ہے۔ اماں رضیہ ہر روز اس کے کھانے کے لیے بہت اہتمام سے ٹرے تیار کرتی تھیں اور وہ لاؤنج کے سامنے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھا لیتی تھی۔

اس روز بھی وہ اپنی ٹرے لے کر جب میز پر آ بیٹھی تو اسے احساس ہوا کہ کوئی اور بھی ہے جو لاؤنج میں سمیع کی والدہ کے پاس بیٹھا ہے۔ اس نے چونک کر اس جانب دیکھا تھا جہاں سے "مہمان" کی آواز آئی تھی۔ وہ "مہمان" بھی اس کی جانب دیکھنے بلکہ اسے گھورنے میں مگن تھیں۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر انہوں نے عجیب

ذو معنی انداز میں مسکرا کر اسے مخاطب کیا تھا۔
"کیسی ہو نینا۔۔۔ یونیورسٹی ختم ہوگئی تمہاری؟ جاب کی خاطر بڑی دور نکل آئیں بھئی۔۔۔" وہ پوچھ رہی تھیں۔انہیں شاید سمیع کی والدہ نے اس کی اس گھر میں موجودگی کی وجہ سے آگاہ کیا تھا۔ نینا نے روٹی لینے کے لیے ہاتھ بڑھا رکھا تھا۔اسے ان کی موجودگی سے جھٹکا تو لگا تھا لیکن اس نے بہت آرام سے اس جھٹکے کو برداشت کرلیا تھا لیکن اس طنزیہ انداز پر اس کا دماغ ضرور آؤٹ ہوا تھا۔ انہیں کس نے یہ حق دیا تھا کہ وہ کونین کاشف نثار سے اس انداز میں سوال کرتیں۔
"جی درزن آنٹی۔۔۔ میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔۔۔ آپ سنائیں کیسی ہیں۔۔۔ آپ کے نقش، قدم پر چل رہی ہوں۔۔۔ بڑی دور دور تک آپ کی سلائی کڑھائی کے بھی تو چرچے ہیں۔۔۔ یہاں تک آپہنچی ہے آپ کی شہرت بھی۔۔۔ بس سے آتی جاتی ہیں اتنی دور یا کوئی ڈرائیور لگوایا ہوا ہے" اس نے اطمینان سے روٹی نکالی پھر مسکرا کر جواب دیا تھا۔ یہ بات صرف وہ جانتی تھی یا اس کے سامنے بیٹھی خاتون کو اس نے کیا طعنہ دیا ہے۔اماں رضیہ ان کے لیے چائے لے کر آرہی تھیں، اس بات پر اس کی جانب دیکھ کر بولیں۔
"ارے بیٹا ہاتھ تو واقعی بہت صاف ہے ان کا۔۔۔ بہت اچھی سلائی کرتی ہیں۔۔۔" اماں رضیہ سراہ رہی تھیں۔
"مجھ سے بہتر کون جانتا ہوگا۔۔؟" نینا کو ذرا سا بھی فرق نا پڑا۔اس نے جل کر سوچا تھا۔اس کا مقصد درزن آنٹی کو"کچھ" جتانا تھا جو وہ بہت اچھی طرح سے جتا چکی تھی۔ وہ دوبارہ کچھ نا بولی تھیں لیکن سمیع کی والدہ سے وہ کافی دیر باتیں کرتی رہی تھیں۔ان کی واپسی کے وقت بھی نینا جان بوجھ کر وہیں میز پر بیٹھی چائے پی رہی تھی جب اماں رضیہ نے اسے مخاطب کیا تھا۔
"کونین بیٹی۔۔۔ ان کو پانچ ہزار روپے دے دیں۔۔۔ ان کا حساب نکلتا ہے کچھ پرانا۔۔۔ شہرین ٹھیک ہوتی تو اپنے ہاتھ سے دیتی۔۔۔ مگر اب۔۔۔" وہ کہتی کہتی چپ سی ہوگئی تھیں۔اس گھر میں صورتحال آج کل اتنی غیر یقینی تھی کہ زیادہ تر باتیں نامکمل ہی ہورہی تھیں۔ نینا نے سر ہلایا تھا پھر وہ روپے نکال کر لے آئی تھی۔
"یہ لیجیے۔۔۔ پانچ ہزار۔۔۔ بس اتنی سی کمائی ہے آپ کی۔۔۔" اس نے روپے دیتے ہوئے بھی طنز کیا تھا۔ درزن آنٹی نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا تھا۔ وہ دونوں گیٹ کے قریب آگئی تھیں۔ نینا نے دیکھا تھا کہ گیٹ کے باہر کوئی گاڑی نہیں کھڑی تھی۔ وہ شاید آج بس سے آئی تھیں۔
"تمہیں بہت باتیں کرنے آگئی ہیں۔۔۔ اور کیوں نا آئیں گی بھئی۔۔۔ تم نے سولہ جماعتیں جو پڑھ لی ہیں۔۔۔ بہت پڑھی لکھی ہوگئی ہو تم تو۔۔۔ اچھا چلو تم بتا دو تمہاری کتنی کمائی ہے۔۔۔ یہ جو آیا گیری کررہی ہو تم۔۔۔ کیا مل رہا ہے تمہیں اس کا۔۔۔ رشتہ دار ہیں یہ لوگ تمہارے۔۔۔ کیا لگتی ہو سمیع رندھاوا کی تم۔۔۔؟" وہ سوال نہیں کررہی تھیں، اسے اس طعنے کا جواب دے رہی تھیں جو چند لمحے پہلے نینا نے انہیں دیا تھا۔ نینا کو امید نہیں تھی کہ وہ بھی اسے اسی کے انداز میں طعنے دینے لگیں گی۔۔۔ اس نے بلاوجہ آنکھیں مٹکائیں۔
"وہی جو آپ لگتی ہیں میرے باپ کی۔۔۔ افیئر چل رہا ہے میرا سمیع رندھاوا کے ساتھ۔۔۔ اب پیار محبت کے معاملات میں پیسوں کے متعلق کون سوچتا ہے بھلا۔۔۔ آئی سمجھ۔۔۔؟" اس نے جیسے بہت مزا لیتے ہوئے بات مکمل کی تھی اور ساتھ ہی انہیں آنکھ بھی ماردی تھی۔ آنٹی درزن کو امید نہیں تھی کہ وہ ایسا جواب دے گی۔ وہ ناک چڑھا کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھی تھیں۔ نینا بھی اندر کی طرف آگئی اور تب ہی نینا کو احساس ہوا تھا کہ جیسے وہاں کوئی اور بھی تھا جس نے ان کی باتیں سنی ہیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ

سر جھٹک کر واپس اندر چل دی تھی۔

☆☆☆

صوفیہ کو وہ رات کبھی نا بھولی تھی۔

"رات کے دس بج رہے ہیں۔۔۔اور تمہاری صاحبزادی اس وقت تشریف لا رہی ہیں۔۔۔کہاں سے آ رہی ہیں یہ بھی نہیں پتا ہوگا تمہیں۔۔۔اس سے پوچھو تو سہی کہاں جاتی ہے۔۔کہاں سے آتی ہے اس وقت۔۔کہاں ہوتا ہے تمہارا دھیان صوفیہ۔کوئی خیر خبر رکھا کرو اس کی۔۔۔یہ جوان بچیوں کے گھر آنے کا وقت ہے"۔

کاشف نے نہایت خفگی بھرے انداز میں ان سے کہا تھا۔وہ خود دس منٹ پہلے ہی گھر میں داخل ہوئے تھے اور کافی ناراض نظر آتے تھے۔صوفیہ تو پہلے ہی بے زار بیٹھی دعا کر رہی تھیں کہ نینا ان سے پہلے آجائے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔وہ کئی دن سے صبح کی گئی رات گئے گھر پلٹتی تھی۔چہرے کے تاثرات ہمیشہ ایسے ہوتے کہ صوفیہ اس سے کچھ پوچھتے ہوئے بھی چڑتی تھیں اور ایک دوبار استفسار پر بھی اس نے کچھ نا بتایا تھا کہ وہ کدھر جاتی ہے، کیا کرتی ہے۔صوفیہ خود جھنجلائی ہوئی بیٹھی تھیں۔زری کی شادی کے بعد سے گھر کے حالات مزید ابتر ہو چلے تھے۔کاشف اور نینا کے درمیان کشیدگی بہت زیادہ بڑھ چکی تھی۔ان دونوں کا آمنا سامنا ہی نا ہوتا تھا کیونکہ وہ دونوں ہی آج کل گھر سے صبح نکلتے تھے اور رات کو واپس آتے تھے۔صوفیہ کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ شوہر سے شکوہ کریں یا بیٹی سے۔۔۔

کاشف کی ہر بری بھلی کو وہ سہتی آئی تھیں۔ان کی مشکوک حرکتیں صوفیہ سے مخفی نا تھیں۔اپنی دور زن کزن پر ان کی مہربانیاں بھی ان کے علم میں تھیں لیکن وہ چپ رہنے پر مجبور تھیں۔اس عمر میں شوہر کے ساتھ جھگڑتیں تو جوان بچیوں پر کیا اثر پڑتا اسی لیے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی نینا کے الزامات کو پوری شد و مد سے جھٹلاتی تھیں لیکن حالات سے وہ خود بھی کافی ناخوش تھیں۔نینا بھی اپنے بیان سے ہٹنے کو تیار نا تھی۔اس کا بس چلتا تو وہ باپ کی شکل بھی نا دیکھتی جبکہ کاشف بھی اپنی روش بدلنے کو تیار نہیں تھے۔۔عجیب سے دن رات تھے۔

زری بھی شادی کے ابتدائی دنوں والی مصروفیات میں گم تھی۔اسے بھی بخوبی اندازہ تھا کہ اس کے میکے میں حالات کچھ سازگار نہیں ہیں سو وہ بھی احتراز برتتے ہوئے زیادہ فون نا کرتی تھی لیکن کبھی اس کا فون آجاتا تو اسے گھنٹا گھنٹا باتوں میں لگائے رکھتی تھیں حالانکہ وہ کوئی بہت باتونی خاتون تو نا تھیں لیکن تنہائی، فراغت اور گھر کے حالات انہیں لاچار کرنے لگے تھے۔ان کا زیادہ دل گھبراتا تو چادر اوڑھ کر آپا کی طرف آجاتیں۔آپا کی طرف بھی سناٹے بولتے تھے، جس کے لیے بھی انہیں اپنا آپ ہی قصوروار نظر آتا تھا۔وہاں بھی ان کا دل نا لگتا تھا۔ایسی صورتحال میں کاشف کا دیا گیا طعنہ انہیں بہت چبھا تھا۔

" آپ بھی تو اسی وقت تشریف لائے ہیں۔۔اور آپ خود کیوں نہیں پوچھتے اس سے۔۔آپ کی بھی تو اولاد ہے "انہوں نے اکتا کر کہا تھا۔ان کا مقصد شوہر کو طعنہ دینا نہیں تھا۔وہ بس اکیلے پن سے بے زار بیٹھی تھیں لیکن کاشف کو سخت برا لگا۔

"جوان بیٹیوں سے باپ ایسی باتیں پوچھتے اچھے نہیں لگتے لیکن جب بیٹیاں اتنی نافرمان ہوجائیں تو یہ کڑوا گھونٹ بھی پینا پڑتا ہے۔۔۔اور تم بھی یہی چاہتی ہو تو میں ہی پوچھ لیتا ہوں۔۔بلاؤ اس مہارانی کو ذرا۔۔" کاشف نے بھی سرد مہر لہجے میں کہا تھا۔صوفیہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔نینا اور کاشف کا جب بھی ایسے آمنا سامنا ہوا تھا، اس کا نتیجہ صوفیہ کے ہائی بلڈ پریشر کی صورت میں ہی نکلا تھا اور اب بھی یہی ہونے والا

تھا۔وہ رات کو اس وقت گھر میں کوئی شور ہنگامہ نہیں چاہتی تھیں۔
"اب تو سو بھی گئی ہوگی۔۔آتے ہی گر جاتی ہے بستر پر۔۔کل بات کیجیے گا اس سے" صوفیہ نے اب کی بار لہجے کو نرم رکھتے ہوئے کہا تھا لیکن کاشف کو یہ بات پسند نا آئی۔انہیں ایک اور طعنہ دینے کا موقع مل گیا تھا۔
"اس کے باوجود تم نے زحمت نہیں کی کہ اس سے پوچھ ہی لو کہ محترمہ ایسے کون سے پتھر توڑتی رہتی ہو سارا دن کہ تھک کر گھر واپس آتی ہو۔۔یہ طور طریقے ہوتے ہیں شریف لڑکیوں کے۔۔۔" وہ ان پر چڑھ دوڑے تھے۔۔ان کی آنکھوں سے جیسے انگارے برس رہے تھے۔
"۔۔پچھتاؤ گی تم ایک دن۔۔یاد رکھنا صوفیہ۔۔تمہاری اسی نرمی نے اسے اتنا خودسر بنا دیا ہے اور مجھے تو بات ہی نہیں کرنے دیتی تم اپنی شہزادی سے۔۔۔میں تو بس جیسے اس کے لیے پیسے کمانے کی مشین ہوں۔۔۔" کاشف ایک ایک لمحے کا توقف کر کے چبا چبا کر بول رہے تھے۔وہ بھی کافی اکتائے ہوئے نظر آتے تھے اور ان کا غصہ ٹھنڈا ہونے والا نہیں لگ رہا تھا۔اس سے پہلے کہ صوفیہ کوئی جواب دیتیں۔باورچی خانے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔نینا یقیناً اپنے لیے کچھ لینے آئی تھی۔
"نہیں سوئی ہے وہ۔۔۔بلاؤ اسے یہاں۔۔۔مجھے پوچھنے تو دو کہ کہاں سے آرہی ہے اس وقت۔۔۔تم نہیں پوری کر سکتیں ذمہ داریاں تو مجھے تو کرنے دو۔۔۔پوچھنے تو دو اس سے کہ کیا اسے ہی صرف انکوائری کا حق ہے۔۔۔یا ہمیں بھی کوئی حق ہے تمہاری اولاد پر۔۔۔ابھی بلاؤ اسے۔۔۔مجھے بھی پتا چلے کہ کہاں سے آرہی ہے اس وقت مہارانی صاحبہ۔۔" کاشف نے طنزیہ انداز میں ان سے کہا تھا۔وہ خود بیٹی کو مخاطب تک نا کر سکتے تھے۔صوفیہ نے ان کی جانب دیکھا۔وہ کتنا خائف رہتی تھیں اس شخص کے غصے سے لیکن آخر میں پھر بھی ان کے حصے میں یہی خفگی بھرے طعنے ہی آجاتے تھے۔انہیں برا لگا۔
"اور اگر اس نے پوچھ لیا کہ آپ کہاں سے آرہے ہیں اس وقت۔۔۔تو آپ کیا جواب دیں گے" صوفیہ طعنہ نہیں دینا چاہتی تھی،وہ لڑنے جھگڑنے کی روش کب کی ترک کر چکی تھیں لیکن جانے کیسے ان کے منہ سے پھسلا تھا۔ایک عرصہ ہوا وہ شوہر کی تابعداری میں اپنا آپ بھی بھول گئی تھیں۔بالخصوص جب ان کے والدین کا انتقال ہوا تو اس دن کے بعد سے انہوں نے کاشف سے بحث کرنا چھوڑ دیا تھا مگر اب جیسے وہ تھک چکی تھیں۔۔حبیبہ۔۔رخشی۔۔۔مس نوشابہ۔۔۔تابندہ۔۔۔نیلوفر۔۔۔ستارہ۔۔۔کتنے ہی نام تھے جو انہیں ازبر تھے۔۔عورتیں ان کے شوہر کی زندگی میں آتی نہیں تھیں،بلکہ لاٹری کی طرح نکلتی تھیں اور جیسے لاٹری کی رقم اللوں تللوں میں خرچ کر کے ختم کر دی جاتی ہے۔۔ایسے ہی ان کے شوہر کے تعلقات بھی ختم ہو جاتے تھے لیکن اس شخص کی حرص ختم ہی نا ہوتی تھی۔۔۔جبکہ وہ برداشت کر کر کے ادھ موئی ہو چکی تھیں۔
ایک عیاش مرد کے ساتھ زندگی گزارنا کتنا مشکل رہا تھا ان کے لیے۔۔۔کتنے سمجھوتے کیے تھے انہوں نے۔ان کی زندگی میں یہ اذیت کیا کبھی ختم نہیں ہو سکتی تھی۔
رات کو بلاوجہ سیل فون پر آنے والی مسڈ کالز،سارا سارا دن کاشف کا اپنے گھر اور دکان سے دور رہنا،استفسار پر من گھڑت قصے،بہانے اور جھوٹی تاویلیں کاشف اپنی لن ترانیوں سے باز کیوں نہیں آجاتے تھے۔۔۔۔۔وہ کوئی چھوٹی بچی تو نا تھیں۔شوہر کے بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ ان سے چھپے ہوئے تو نہیں تھے اور بیٹی کو تو ڈانٹ کر چپ کروا چکی تھیں لیکن اپنے دل کو کیسے مطمئن کرتیں۔گھٹ گھٹ کر وہ نڈھال ہو چکی تھیں یہی وجہ تھی کہ انہوں نے شوہر کو طعنہ دیا نہیں تھا،طعنہ خود بخود ان کے منہ سے پھسلا تھا۔کاشف نے انہیں مڑ کر دیکھا۔وہ کھسیانے سے

نظر آتے تھے اور کھمبا نوچنے کے سوا ان کے پاس کوئی اور حربہ نا بچا تھا سو انہوں نے پہلے گھور کر ان کی جانب دیکھا پھر غرائے تھے۔

"بلاؤ اسے۔۔اور کہو کہ پوچھے مجھ سے یہ سوال۔تمہاری شہہ پر ہی تو اتنا اکڑتی ہے وہ۔۔۔پوچھ لو یہ سوال بھی۔۔۔۔تم لوگوں کو پھر بھی احساس نا ہوگا کہ تم لوگوں کے عیش و آرام کے لیے سارا دن مرتا کھپتا ہوں۔۔۔دکان سے آرہا ہوں اور روز دکان سے ہی آتا ہوں۔۔۔لیکن تم کیوں کرو گی مجھ پر یقین۔۔۔تمہیں مجھ سے زیادہ اپنی چہیتی کی باتوں پر یقین ہے نا۔۔۔تم لوگ زہر دے دو مجھے، میں مر گیا تو ہی سکون ملے گا تم لوگوں کو لیکن۔۔تمہیں۔۔۔میں مر بھی گیا نا صوفیہ تو تمہاری یہ شک کی بیماری دور نا ہوگی۔۔۔تمہیں احساس ہی نہیں کہ تم لوگوں کی خاطر اس عمر میں بھی دھکے کھا رہا ہوں۔۔ہڈیاں گھسا رہا ہوں اپنی۔۔اور تم اور تمہاری بیٹی سمجھتی ہو کہ میں ——— گلچھرے اڑاتا پھرتا ہوں۔۔۔" وہ اتنی زور سے چلا کر بولے تھے کہ صوفیہ دم بخود رہ گئیں۔وہ اب اس انداز میں بات نہیں کرتے تھے ان سے۔۔صوفیہ کو افسوس ہوا۔انہیں شکوہ نہیں کرنا چاہیئے تھا شوہر سے۔۔۔چپ رہ کر وقت گزر تو رہا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتیں یا شوہر کو راضی کرنے کے لیے اپنے الفاظ واپس لیتیں۔نینا کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی تھی۔اس کی آنکھوں میں تجسس تھا۔اسی اثناء میں کاشف نے اسے دروازے میں ایستادہ دیکھا تھا۔

"تم کیوں وہاں کھڑی ہو۔۔اندر آجاؤ۔۔اور وہاں سامنے بیٹھ کر اس تماشے کا مزا لو۔۔۔کیونکہ یہ آگ تمہاری ہی لگائی ہوئی ہے۔۔۔تم ہی بھرتی رہتی ہو اپنی ماں کے کان۔۔۔ایسی بدبخت اولاد تو کسی کی بھی نا ہوگی جیسی میری ہے" کاشف پہلے سے بھی زیادہ سخت انداز میں بولے تھے۔نینا کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر طنز چمکا تھا۔

"میں کیوں لگاؤں گی آگ۔۔۔یہ الزام ہے می لارڈ۔۔۔سیانے کہتے ہیں انسان وہی کاٹتا ہے۔۔۔جو اس نے بویا ہوتا ہے۔۔" نینا ایسی صورتحال میں ہمیشہ ہی انتہائی گستاخ ہو جایا کرتی تھی۔صوفیہ نے آگے بڑھ کر اسے چپ کروانا چاہا تھا لیکن کاشف اس کی جانب مڑے تھے۔

"تم تو دفع ہی ہو جاؤ یہاں سے۔۔شکل نہیں دیکھنا چاہتا میں تمہاری۔تم میری اولاد نہیں ہو۔۔۔سانپ ہو سانپ۔۔۔۔میرے کسی بہت بڑے گناہ کی سزا ہو۔۔۔" وہ غرائے تھے۔

"یہ بات۔۔" اسے جیسے بہت مزا آیا تھا۔اس نے انہیں مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے سراہا تھا پھر ذرا سا کمرے میں داخل ہو کر بولی۔

"مجھے تو یہ بات پہلے سے ہی پتا ہے کہ میں کسی " گناہ " کی سزا ہوں۔۔۔آپ ہی نے پہلی بار اعتراف کیا ہے۔۔۔اور ایک اعتراف مجھے بھی کر لینے دیں کہ بھئی بڑے ہی تیز سگنل ہیں آپ کی طرف۔۔۔ساری رپورٹس وقت پر پہنچ جاتی ہیں آپ کے پاس" وہ پہلے ہی کافی غصے میں تھے۔نینا کی بات نے جیسے ان کی دم پر پاؤں رکھ دیا تھا۔وہ نینا کی جانب بڑھے تھے۔

"بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری۔۔۔ہر وقت بک بک۔۔۔بک بک۔۔۔اپنی اوقات میں رہا کرو۔۔بیٹی ہو۔بیٹی بن کر رہو۔۔۔ورنہ گھر سے نکالنے میں ایک لمحہ نہیں لگاؤں گا" وہ اس کے عین سامنے کھڑے ہو کر بولے تھے۔نینا ذرا سا خائف ہوئی تھی پھر ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔صوفیہ کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔صورتحال ان کے اختیار سے باہر ہو گئی تھی۔

"جی۔۔۔بہت بہتر۔۔۔شکر تو اس بات کا ادا کرنا چاہیے کہ آپ کو یاد ہے کہ میں بیٹی ہوں آپ کی۔۔۔مجھے بتانا

نہیں پڑا۔ اور دوسرا نکال دیں گھر سے۔۔ کوئی حسرت نا رہے آپ کے دل میں۔۔ "اپنی عادت کے مطابق اس نے طنزیہ انداز میں جواب دیا تھا۔ کاشف لمحہ بھر کے لیے کچھ بول ہی نا پائے پھر انہوں نے صوفیہ کی جانب دیکھا تھا۔

"یہ دیکھو۔۔۔ یہ ہے تمہاری تربیت۔۔۔ پال پوس کر بڑا کرنے کا یہ صلہ دے رہی ہے یہ کمبخت۔۔۔ "انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ نینا نے ان کی بات کاٹ دی۔

"پالنے والی تو بس اللہ کی ذات ہوتی ہے اب انسان تو صرف وسیلہ بنتے ہیں۔۔ جیسے آپ اپنی کزن کا وسیلہ بنے پھرتے ہیں۔۔ ایسے ہی مجھے بھی کوئی وسیلہ مل ہی جائے گا۔۔۔ "کاشف کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ایک زوردار طمانچہ اس کے چہرے پر رسید کیا تھا۔

"زبان کو لگام دو۔۔۔ ورنہ کاٹ کے رکھ دوں گا۔۔۔ ایک منٹ میں ساری اکڑ نکال دوں گا۔۔ پھر پتا چلے گا کہ کس کی ذات ہوتی ہے پالنے والی۔۔ شرم نہیں آتی باپ سے اس انداز میں بات کرتے ہوئے۔۔۔ اس لیے پڑھایا لکھایا تھا تمہیں میں نے۔۔۔۔ بس اب پھوٹی کوڑی نہیں خرچ کروں گا تم پر۔۔۔ پھر ڈھونڈتی رہنا وسیلے حرام خور۔۔ پھر اسی کے گھر جا کر رات بھی رہ لینا جس کے گھر سارا دن گزارتی ہو۔۔ حرام خور نا ہو تو۔۔۔ دو دن ہوئے نہیں پیسے کماتے ہوئے اور باپ پر رعب ڈالتی ہے۔۔ خبردار جو اب گھر سے قدم نکالا تو"۔۔۔

اس سے پہلے کہ صوفیہ ان دونوں کے درمیان میں آ کر صورتحال کو کنٹرول کر سکتیں۔ کاشف نے نینا کے منہ پر دوسرا زوردار طمانچہ رسید کیا تھا اور پھر وہ رُکے نہیں تھے۔ ایک کے بعد ایک کئی طمانچے انہوں نے اس کے گالوں پر رسید کیے تھے۔

"اولاد ہے۔ اولاد بن کر رہ۔۔ میری ماں بننے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں نے پوچھا کبھی کچھ۔۔ کوئی سوال نہیں کیا۔۔ سارا دن آوارہ گردیاں کرتی پھرتی ہے۔۔ دیکھتا ہوں مگر چپ رہتا ہوں۔۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اندھا ہوں۔۔ کس کے بھروسے پر چلتی ہے اتنی زبان۔۔ چار جماعتیں کیا پڑھ لیں۔۔۔۔ بس اب ہمیں ہی بھگو بھگو کر مارے گی۔۔۔ مجھے نکالنے آتے ہیں سارے کس بل۔۔۔ سیدھا کر دوں گا ایک ہی دن میں۔۔ خبردار اب گھر سے ایک بھی قدم باہر نکالا تو۔۔۔ جان سے مار دوں گا"۔

وہ صرف ہاتھ ہی نہیں چلا رہے تھے۔ ان کی زبان بھی مسلسل آگ اُگل رہی تھی۔ صوفیہ انہیں روکتے روکتے نڈھال ہو گئی تھیں لیکن وہ تب ہی رُکے تھے جب ان کی توانائی کم پڑنے لگی تھی۔ نینا زمین پر گر گئی تھی۔ صوفیہ نے دیکھا وہ رو رہی تھی لیکن اس نے باپ سے التجا نہیں کی تھی کہ وہ اسے مت مارے۔ وہ بس رو رہی تھی۔ صوفیہ کے لیے یہ منظر نیا نہیں تھا۔ یہ تو اس کے بچپن سے ہو رہا تھا۔ صوفیہ کا دل چاہا اس کے قریب جائیں اور اسے اپنی گود میں لے لیں۔ اس کے گال جو باپ کے لمس سے احساسِ تفاخر سے چمکنے چاہیے تھے، اب دہک رہے تھے۔ ان کا دل چاہا وہ اس کے دہکتے گالوں کو چوم کر اسے اپنے ہونے کا احساس دلائیں لیکن وہ وہیں کھڑی رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھتیں تو شوہر کو کون سنبھالتا۔۔۔ وہ وہیں کھڑی رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلے دن کی صبح بے حد تاریک تھی۔۔۔ سورج نکلا تھا مگر ان کے آنگن میں جیسے روشنی ہی نا ہوئی تھی۔ وہ نماز کے بعد کتنی ہی دیر جائے نماز پر بیٹھ کر رو رو کر اپنے اور اپنے خاندان کے دلی سکون کی دعائیں مانگتی رہیں۔ سلیم کے انتقال کے بعد نینا کا یہ باپ سے براہِ راست ہونے والا تیسرا یا چوتھا جھگڑا تھا لیکن اس کی شدت ان پہلے تمام

جھگڑوں سے زیادہ تھی۔ رات ہونے والے جھگڑے کی آوازیں محلے کے دوسرے گھروں تک بھی گئی ہوں گ
۔ یہ سوچ سوچ کر وہ مزید دکھی ہوتی رہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے شوہر کا ناشتا بھی بنایا تھا، ان کے کپڑے
بھی استری کیے اور جوتے پالش کر کے بھی رکھے۔ وہ اپنے وقت پر اٹھے اور بنا ان سے کوئی بات کیے تیار ہو کر کا
پر چلے گئے۔

وہ ناشتے کی ٹرے جو صوفیہ نے تیار کر کے رکھی تھی ویسی ہی تپائی پر پڑی رہی۔ صوفیہ رات بھر بھی روتی رہی تھیں
لیکن شوہر کے رویے نے انہیں مزید رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ دوسری طرف نینا بھی کمرے سے نہیں نکلی تھی۔ زری
موجود ہوتی تو وہ اسے نینا کو منانے کے لیے کہہ دیتیں لیکن اب تو وہی دونوں نفوس تھے گھر میں اور انہیں کبھی نا کبھی
تو اپنی اس بیٹی سے بھی اپنے تعلقات بحال کرنے ہی تھے سو وہ خود ہی ہمت کر کے اٹھی تھیں اور اس کے کمرے
میں آگئی تھیں تاکہ محبت سے اس سے سمجھا سکیں۔ وہ ابھی تک اپنے لحاف میں ہی گھسی ہوئی تھی۔

"نینا۔۔۔ جاگ رہی ہو" انہوں نے بہت ہمت مجتمع کر کے اسے مخاطب کیا تھا۔

"جی امی۔۔ جاگ گئی ہوں۔۔۔ اب ہی تو جاگی ہوں" وہ بے حد نرم لہجے میں بولی تھی جس کی انہیں بالکل توقع
تھی۔ وہ تو یہ سوچ کر اس کے کمرے میں آئی تھیں کہ وہ ان سے سخت ناراض ہوگی۔ انہوں نے یہ بھی سوچا تھا
کہ وہ اس کی ساری جلی کٹی تحمل سے سن لیں گی، اس سے ناراض ہوئے بنا اسے محبت سے سمجھانے کی کوشش کریں
گی کہ رات جو کچھ بھی ہوا، اچھا نہیں ہوا۔ انہوں نے تہیہ کیا تھا کہ وہ اسے احساس دلائیں گی رات والے واقعے
میں بے شک اس کے باپ کی ہی غلطی تھی، وہی قصوروار تھے لیکن وہ اس کے باپ ہیں اور باپ سے اس اندا
میں بات کرنا غلط ہے اور یہ بھی کہ دوبارہ ایسی صورتحال سے بچنے کے لیے اسے اپنے رویے میں کچھ تبدیلی لا
ہوگی۔

وہ اسے یہ سب سمجھانا چاہتی تھیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں۔ نینا نے لحاف چہرے سے ہٹایا تھا۔ صوفیہ
دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے چہرے اور گردن پر رات والی مار کے اثرات اس قدر نمایاں تھے کہ اُن سے اس
کے چہرے کی جانب چند سیکنڈز سے زیادہ دیکھا ہی نا گیا۔

"ہاہ۔۔!!!!" انہوں نے سسک کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔ نینا نے قہقہہ لگایا۔

"کیا ہوا امی۔۔۔ آپ میرے چہرے کی جانب کیوں نہیں دیکھ رہیں۔۔۔ دیکھیں نا۔۔" وہ عجیب سے اندا
میں ہنستے ہوئے ان سے اسی نرم متحمل سے انداز میں بولی جس انداز میں وہ ان سے پہلے مخاطب ہوئی تھی۔

"نینا۔۔ میری بچی۔۔۔" وہ اسے گلے لگانا چاہتی تھیں۔ اس کے چہرے کو چومنا چاہتی تھیں کہ وہ پھر اسی اندا
میں ایک بار پھر ہنسی جیسے پہلے ہنسی تھی۔

"آپ تو ایسے ری ایکٹ کر رہی ہیں۔۔۔ جیسے یہ کوئی پہلی بار ہوا ہے۔۔۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ آپ نے
یہ منظر پہلی بار دیکھا ہے کیا؟" اس نے عام سے انداز میں سوال کیا تھا۔ صوفیہ سے اگلا جملہ بولا ہی نا گیا تھا۔ اس
کے چہرے پر نیل، اس کی آنکھوں میں کرب اور اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ تھی۔ صوفیہ تو بس منہ پر ہاتھ
رکھے اس کی جانب دیکھ رہی تھیں جبکہ وہ عجیب سے انداز میں ان کی جانب دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

"یہ کچھ بھی نہیں ہے امی۔۔۔۔۔ ذرا سے نیل ہیں، گھاؤ اور خراشیں۔۔۔ فکر نا کریں۔۔۔ بھر جائیں
گے۔۔۔ فکر تو ان کی کرنی چاہیے جو زخم بھرتے نا ہوں۔۔۔ وہ میرے دل پر لگے ہیں اور اس چہرے سے
کہیں زیادہ ہیں۔۔۔"

اس نے اپنے سینے پر بائیں جانب انگلی رکھی تھی۔ وہ عجیب سے انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے حواس میں نا ہو۔
"یہ جو اس دل پر لگے ہیں نا امی۔۔۔ وہ زخم نہیں بھریں گے۔۔۔ اور جو زخم بھرتے نہیں ہیں نا ان کی جواب طلبی ہوگی۔۔۔ ضرور ہوگی جج صاحب۔۔۔ ضرور ہوگی۔۔۔ پلیٹ فارم کوئی بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ یہاں نا سہی۔۔۔ وہاں سہی۔۔۔ اُوپر۔۔۔ کبھی تو اللہ کے ساتھ تعلقات بحال ہوں گے نا میرے بھی۔۔۔ پھر مزا آئے گا امی۔۔۔ آپ دیکھے گا تو سہی۔ پھر مزا آئے گا"۔
"نینا۔۔۔ مت بول ایسے۔۔۔ بیٹی۔۔۔ میرے دل میں ہول اُٹھتے ہیں۔۔۔ مت بول ایسے" وہ رو ہی پڑی تھیں۔ اس نے پھر مصنوعی سا قہقہہ لگایا۔
"آپ کیوں ملکہ جذبات بن رہی ہیں۔۔۔ آپ سے تھوڑی ہوں گے حساب کتاب۔۔۔ یہ میرا، ابا اور اللہ کا ذاتی معاملہ ہے۔۔۔ آپ اس معاملے سے دور ہی رہیں۔۔۔ آپ کو تو یہ بھی نہیں پتا کہ دراصل آپ کے مجازی خدا نے جو تھرلر فلم ریات چلائی ہے اس کا اصل محرک کیا تھا۔۔۔" وہ چھلانگ لگا کر بستر سے اتری تھی اور باتھ روم کی جانب چل دی تھی۔
"یا خدا! کیا یہ پاگل ہو گئی ہے۔۔" صوفیہ ہک دک اس کا رویہ ملاحظہ کر رہی تھیں۔ پہلے وہ اس کی وجہ سے پریشان تھیں لیکن اب تو جیسے انہیں ڈر لگنے لگا تھا جبکہ وہ نصف گھنٹے بعد باتھ روم سے نکلی تھی اور پھر بنا کچھ کھائے پیئے گنگناتے ہوئے گھر کی سیڑھیاں اُتر گئی تھی۔ صوفیہ اپنا دل پکڑ کر وہیں بیٹھی رہ گئی تھیں۔ ان میں تو اتنی ہمت بھی نا تھی کہ اسے روک سکتیں۔

☆☆☆

"بیٹی ہوئی ہے جی۔۔" نرس نے آکر انہیں ان کے خیالوں سے باہر کھینچ نکالا تھا۔ انہوں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ ان کے گال آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی تھی۔ فجر کی اذان کی آوازیں آرہی تھیں۔
"فکر کی بات نہیں ہے۔۔ زچہ بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔۔۔ بچی ستوانسی ہے۔۔ انکیوبیٹر میں رکھیں گے کچھ دن۔۔۔ پر ٹھیک ٹھاک ہے۔۔" نرس نے انہیں روتا دیکھ کر تسلی دی تھی۔
"میری بیٹی کیسی ہے۔۔ وہ ٹھیک تو ہے۔۔؟" صوفیہ نے پوچھا تھا۔
"ہاں جی۔۔ ابھی وارڈ میں شفٹ نہیں کیا۔۔ ٹانکے لگا دیے ہیں۔۔ بے ہوش ہے ابھی۔۔ مگر ٹھیک ہے۔۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے" اس نے کہنے کے ساتھ صوفیہ کا رویا رویا چہرہ بغور دیکھا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ صوفیہ کو اس لمحے کس احساس نے رونے پر مجبور کیا تھا لیکن وہ اطلاع دے کے مایوس ہو کر آگے بڑھ گئی تھی کہ شاید "بیٹی" کی خبر نے بڑی اماں کو زیادہ خوش نا کیا تھا۔ اسے یہاں سے "کچھ" ملنے کی امید نا تھی۔
"الحمدللہ۔۔" انہوں نے گال خشک کرتے ہوئے گہری سانس بھر کر کہا تھا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کوئی اپنا نہیں نظر نا آیا تھا۔ وہ چند قدم چل کر آپریشن تھیٹر تک گئی تھیں مگر وہ ابھی اندر سے مقفل تھا۔ اندر جانے کی اجازت نا تھی۔ وہ مڑ کر کوریڈور سے نکلی تھیں۔ باہر ویٹنگ روم میں انہیں نینا تنہا بیٹھی نظر آئی۔ وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مروڑتی ہوئی بالکل گم بیٹھی تھی۔ صوفیہ نے پہلے کبھی اسے ایسے بیٹھے نا دیکھا تھا۔ وہ لاتعلق۔۔ بے زار تو نظر آیا کرتی تھی لیکن ایسی شکست خوردگی اس کے وجود پر صوفیہ نے پہلے کبھی طاری نا دیکھی

تھی۔ وہ بہت تھکے تھکے قدموں سے اس کی جانب بڑھی تھیں۔
"بیٹی ہوئی ہے۔۔" انہوں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ وہ جیسے چونکی پھر اس نے سر ہلایا تھا جیسے ان کی بات چند لمحوں کے توقف سے اسے سمجھ میں آئی ہو۔
"الحمدللہ۔۔ بہت خوشی کی بات ہے۔۔۔ میری خواہش تھی کہ زری کے یہاں پہلی اولاد بیٹی ہو" وہ خوش ہو کر بولی۔ صوفیہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔
"" کیوں۔۔" وہ پوچھے بنا رہ نا سکی تھیں۔
"بس۔۔ یونہی۔۔۔ سُنا ہے پہلی بیٹی خوش قسمت ہوتی ہے۔۔۔ بیٹیاں قسمت والی ہی ہونی چاہئیں ورنہ بہت رونا پڑتا ہے انہیں۔" اس کا لہجہ سادہ تھا لیکن صوفیہ جیسے اندر تک ہل گئیں۔۔۔ وہ کیا جتانا چاہتی تھی۔ چند لمحے ان سے کچھ بولا نا گیا۔۔
"آپ گھر چلی جائیں۔۔۔ میں یہاں ہوں نا۔۔ آپ گھر جا کر ریسٹ کریں۔۔ دو تین گھنٹے بعد آجایئے گا۔۔۔ تب تک زری کو بھی ہوش آجائے گا" وہ بولی تھی۔
"تم رہ لوگی یہاں۔۔ میرا مطلب تمہارے پیچھے بچی کو اسکول کا مسئلہ تو نہیں ہوگا۔۔؟" وہ واقعی گھر جانا چاہتی تھیں، کئی گھنٹوں سے ایک ہی پوزیشن میں کرسی پر بیٹھے رہنے کے باعث ان کے گھٹنے میں تکلیف شروع ہوگئی تھی لیکن یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ نینا کسی مشکل میں گرفتار ہو اسی لیے اس سے پوچھ رہی تھیں۔
"نہیں۔۔ سمیع چلے گئے ہیں واپس۔۔۔ اور پھر اماں رضیہ ہیں نا۔۔ وہ اسے اسکول بھیج دیں گی۔۔۔ اور پھر آپ آئیں گی تو میں چلی جاؤں گی۔۔ تب تک ایمن اسکول سے واپس آجائے گی۔۔۔ پھر شام کو اسے اپنے ساتھ ہی لے آؤں گی۔" اس نے پورا پلان بتایا تھا۔ سمیع کا ذکر کرتے ہوئے اس کا چہرہ کیسا روشن سا لگنے لگتا تھا۔
صوفیہ نے بغور دیکھا پھر سر ہلایا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کاشف بھی نظر نا آتے تھے اور اظفر کی بھی خیر خبر نا تھی۔ فجر کا وقت تھا۔ ہاسپٹل میں چہل پہل بڑھنے لگی تھی۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھی تھیں۔ نینا بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"اظفر نہیں آیا کیا۔۔ اسے آنا چاہیے تھا" نینا نے بس اتنا ہی کہا تھا۔ صوفیہ نے فوراً اس کی صفائی پیش کی تھی۔
"یہیں کہیں ہوگا۔۔۔ ہمارے ساتھ ہی تھا۔۔ وہی تو لایا ہے زری کو۔۔ ساس نندیں تو ہیں نہیں گھر میں۔۔ وہی سنبھال رہا تھا زری کو ہاسپٹل لانے سے پہلے۔۔۔ شاید باہر چائے وغیرہ پینے گیا ہو"۔
"میں جب سے آئی ہوں۔۔ مجھے تو نظر آیا نہیں۔۔۔ میڈیسن بھی ابا ہی لا کر دیتے رہے ہیں۔۔۔ اسے یہاں آپریشن تھیٹر کے باہر موجود ہونا چاہیے تھا۔۔ کسی بھی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے" اس نے جتا کر کہا تھا۔ اس کا لہجہ تلخ نہیں تھا لیکن وہ بات تو سچ ہی کہہ رہی تھی۔ اظفر ان کو دیکھتے ہی جیسے ہر چیز سے لاتعلق ہو گیا تھا۔
وہ دونوں چلتی ہوئی مردانہ ویٹنگ روم کی طرف آئی تھیں اور صوفیہ کی توقع کے برعکس اظفر وہاں بھی نظر نا آیا تھا کاشف کو دیکھ کر انہیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ویٹنگ روم کے سامنے والے حصے میں نماز پڑھنے کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی۔ کاشف وہیں جائے نماز پر بیٹھے دعا مانگ رہے تھے۔ صوفیہ نے اپنی اب تک کی ازدواجی زندگی میں کبھی کاشف کو نماز پڑھتے نا دیکھا تھا۔ بی بی جان کی زندگی میں بھی وہ اپنی ماں کو راضی کرنے کے لیے کہتے ضرور تھے کہ وہ نماز پڑھنے جا رہے ہیں لیکن وہ کبھی جاتے نا تھے۔ یہاں تک کہ کام سے واپسی پر بھی وہ یہی کہتے تھے کہ وہ عشا کے بعد واپس آئیں گے یا عصر کے وقت مجھے گھر سے نکلنا ہے۔ اسی لیے انہیں اس طرح حالتِ دعا میں

دیکھ کر انہیں حیرت کا خوش گوار سا جھٹکا لگا تھا۔
"صوفیہ میں نانا بن گیا۔زری کے یہاں بیٹی ہوئی ہے" دعا مانگ کر جب ان کی نگاہ ان دونوں پر پڑی تو وہ بے پناہ خوش ہو کر بولے تھے۔ان کی آواز اور لہجہ دونوں نم سے لگتے تھے۔یہ زری سے ان کی بے پناہ محبت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔
"آپ کو پتا چل گیا۔۔۔" صوفیہ ان کی خوشی دیکھ کر مزید خوش ہو گئی تھیں اگرچہ ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی کے یہاں پہلی اولاد بیٹا ہوتا لیکن کاشف کا گلِ گلنار چہرہ دیکھ کر انہیں بہت اچھا لگا۔
"ہاں ابھی نرس نے آکر بتایا۔۔میں نے فوراً نوافل ادا کی ہیں۔۔ اللہ نے بڑا کرم کیا۔۔ہم نانا نانی بن گئے صوفیہ۔۔میرے تو پاؤں ہی نہیں ٹک رہے زمین پر صوفیہ۔۔" وہ واقعی بے پناہ خوش لگ رہے تھے۔اپنی عادت کے مطابق وہ نینا کو بالکل نظر انداز کیے وہ اپنی خوشی کا والہانہ اظہار کر رہے تھے۔۔فی الوقت صوفیہ کو ان کا یہ انداز بہت اچھا لگ رہا تھا۔اتنا تو وہ زری کی پیدائش پر بھی خوش نا ہوئے تھے۔
"اظفر نظر نہیں آرہا۔۔۔؟" صوفیہ نے پوچھا تھا۔
"وہ اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔۔ کہہ رہا تھا مجھے دوائیوں کی مہک سے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔۔۔ٹھہرو میں اس کو کال کرتا ہوں۔"انہوں نے جیب سے فون نکالنا چاہا تھا۔اسی اثنا میں انہیں اظفر اپنی ہی سمت آتا نظر آیا۔
"مبارک ہو بیٹا۔۔۔بیٹی آئی ہے" صوفیہ نے اسے دیکھتے ہوئے پر جوش لہجے میں کہا تھا۔کاشف کے بھرپور رویے نے انہیں بھی چارج کر دیا تھا۔اظفر نے ان کی سمت دیکھا پھر وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔
"جی۔۔نرس نے بتایا مجھے۔۔۔۔میں امی کو کال کر کے آتا ہوں۔"وہ سادہ سے لہجے میں بولا تھا جیسے اس کے نہیں کسی دوسرے کے بچے کے متعلق اطلاع دی گئی ہو۔وہ اپنا سیل فون لے کر آگے بڑھ گیا تو صوفیہ نے کاشف کا چہرہ دیکھا تھا۔
"اظفر خوش کیوں نہیں لگ رہا تھا؟" وہ ان سے کہنا چاہتی تھیں لیکن نینا کی موجودگی کی وجہ سے چُپ رہی تھیں۔

☆☆☆

"آپ گھر پہنچ گئے ہیں؟" وہ ہاسپٹل سے واپس آکر شہرین کے پہلو میں لیٹا ہی تھا جب موبائل کی بیپ بجی۔اس نے دیکھا۔کونین کا میسج تھا۔وہ اس کے لیے پریشان تھی۔سمیع نے گہری سانس بھری۔یہ لڑکی اس کی زندگی کو آسان بنانے کے لیے آئی تھی لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی زندگی کو مزید مشکل بنا رہی تھی۔
"گھر پہنچ کر واٹس ایپ کر دیجیے گا۔۔ورنہ میرا دل پریشان رہے گا۔" وہ جب واپس آرہا تھا تو اس نے کہا تھا۔اس کے الفاظ ہی نہیں اس کی آنکھوں سے چھلکتی اپنائیت بھی اسے صاف محسوس ہوتی تھی۔اسے اِس "اپنائیت" سے ڈر لگتا تھا۔
وہ چند لمحے موبائل کی اسکرین کی جانب دیکھتا رہا۔وہ تذبذب میں گھرا تھا کہ اسے کچھ جواب دینا چاہیے یا نہیں پھر اس نے فون دوبارہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔وہ کونین کو میسج کرنا چاہتا تھا لیکن جانے کیا چیز تھی جس نے اسے روک دیا تھا۔۔۔اس نے کروٹ بدل لی تھی۔
اسے اب کوئی اچھی بات بھی اچھی نا لگتی تھی۔اس کے لیے لفظ "خوشی" اپنے معنی و مطلب کھو چکی تھی۔جب شہرین اس کے ساتھ نہیں تھی تو وہ کس کے لیے خوش ہوتا۔۔۔کیوں ہوتا۔۔۔اس نے شہرین کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔وہ نرم ملائم بال جو شہرین کی شخصیت کا چارم کئی گُنا بڑھا دیا کرتے تھے،اب بے رونق سی جھاڑ جھنکاڑ کی طرح

اکلوتا ہی اس کے سر پر موجود تھے مگر پھر بھی اس کے لیے قیمتی تھے۔اس نے بہت نرمی سے اس کے سر کو چوما تھا
"زندگی کسی کے لیے نہیں رکتی شہرین۔۔۔وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔۔۔لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں۔۔۔کسی کو پروا نہیں ہوتی۔۔۔لیکن میری زندگی جمود کا شکار ہے شہرین۔۔۔۔۔۔میں وہیں کسی لمحے میں قید ہوں جہاں تم میرے ساتھ تھیں۔۔۔تم ابھی موجود ہو لیکن میں تو وہیں مر گیا تھا جب تم نے مجھے پہچاننا چھوڑ دیا تھا۔۔۔اور لوگ سمجھتے ہیں میں زندہ ہوں۔۔۔وہ ایک مردہ انسان سے توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کی خوشیوں میں شریک ہو۔۔۔ان کی محبت کا جواب محبت سے دے۔۔۔کیسے بھلا۔۔۔یہ ممکن ہی کب ہے۔۔۔شہرین میرے لیے دعا کردو کہ میں بھی ختم ہو جاؤں۔۔۔فنا ہو جاؤں۔۔۔مجھے مکمل موت عطا ہو جائے تو میرا بھلا ہو جائے۔۔۔"
وہ شہرین کے پہلو میں لیٹ کر ایسی ہی باتیں کرتا رہتا تھا۔جس روز کونین موجود ہوتی تھی۔اس روز وہ بہت ہی دھیمی آواز میں شہرین سے باتیں کرتا رہتا تھا لیکن آج چونکہ وہ موجود نہیں تھی تو اس کی آواز ذرا بلند ہو گئی تھی۔
شہرین نے بچوں کی طرح کسمسا کر اس کے ہاتھ کو اپنے سر سے ہٹا دیا تھا۔اسے محسوس ہوا جیسے شہرین اس کی باتیں نا صرف سن رہی تھی بلکہ سمجھ بھی رہی تھی۔وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔اس نے شہرین کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔وہ گہری نیند میں تھی۔سمیع چند لمحے چھت کو گھورتا رہا تھا۔اس دوران اس کے سیل واٹس ایپ کی بیپ دوبارہ بجی تھی۔اس نے فون ہاتھ میں پکڑا تھا۔

"میں خالہ بن گئی ہوں" کونین نے اسے میسج کیا تھا۔سمیع پھر تذبذب میں گھر گیا تھا۔
"تم کیوں نہیں سمجھ جاتیں کہ سوکھے کنویں کسی کی پیاس نہیں بجھایا کرتے۔۔۔بنجر زمینیں کسی کو پھل نہیں دیا کرتیں۔۔۔۔کیوں پتھر سے سر پھوڑتی رہتی ہو اپنا"۔
اس نے چڑ کر سوچا تھا۔
اس کے اور کونین کے درمیان تعلقات کی نوعیت ایسی ہی تھی۔وہ ابھی تک اس شادی کی مستقل حیثیت کا تعین کر ہی نہیں پایا تھا حالانکہ وہ کوئی چھوٹا بچہ نا تھا۔کونین کی آنکھوں سے چھلکتی محبت اسے محسوس ہوتی تھی۔اس کے بدلتے رویے اسے نظر آ رہے تھے۔کونین کے ساتھ شادی کے بعد اس کے میکے میں ہونے والی یہ پہلی خوشی کی خبر تھی جسے وہ اس سے شیئر کر رہی تھی اگرچہ وہ بہت زیادہ باتونی تھی،اسے خاموش رہنے سے چڑ ہوتی تھی لیکن وہ اپنے بارے میں یا اپنے گھر والوں کے بارے میں کبھی بھی زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔اپنے والدین کے بارے میں بھی اس نے بس ایک ہی بار کھل کر بات کی تھی۔اس کی ایک ہی بہن تھی جس کے متعلق اس نے سمیع کو تب بتایا تھا جب اس نے ایمن کو بھی اپنے ساتھ اپنی امی کے گھر لے جانا شروع کیا تھا۔اس کے علاوہ ایک بچی مہر تھی جس کے متعلق کونین نے اسے تب بتایا تھا جب ایمن نے اس کا ذکر کرنا شروع کیا تھا چونکہ ایمن کی اور اس بچی کی کافی دوستی ہو گئی تھی۔
وہ اکثر اس کے متعلق باتیں کرتی رہتی تھی اس لیے کونین نے سمیع کو اس سے غائبانہ متعارف کروا دیا تھا کہ وہ اس کی کسی کزن کی بیٹی ہے اور وہ اکثر اسے اور ایمن کو پارک میں رائیڈز وغیرہ کے لیے ساتھ لے جاتی ہے۔اس کے علاوہ وہ کسی کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔
کونین کبھی اپنے متعلق زیادہ تفصیل سے بات کرتی نہیں تھی اور سمیع کو بھی اس کی باتیں سننے میں کوئی دلچسپی بھی نا تھی۔یہ حقیقت تھی کہ اسے ابھی بھی کونین کے وجود میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ خود کو اس کے احسانات تلے دبا ہوا محسوس کرتا تھا بالخصوص شہرین کی گرتی ہوئی صحت اور اس کی دگرگوں دماغی

حالت کے ساتھ وہ بہت اچھی طرح ڈیل کر رہی تھی۔ شہرین کو نہلانا دھلانا، اس کے کھانے پینے یا میڈیسن وغیرہ کا دھیان تو وہ رکھتی ہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ شہرین کو ہینڈل کرنا بخوبی جانتی تھی۔ شہرین اس سے بہت مانوس تھی۔ وہ جانتا تھا شہرین کبھی کبھی بالکل چھوٹے بچوں کی طرح ضد کرنے لگتی تھی، وہ ایسی چیزیں کرنے کے متعلق اصرار کرتی تھی جو یا تو نامناسب تھیں یا پھر نقصان دہ لیکن کونین محبت سے اسے سمجھا لیتی تھی جبکہ سمیع اور اماں رضیہ کو شہرین کو انکار کرنا سب سے زیادہ مشکل لگتا تھا اور نا ہی وہ ان کی بات سنتی تھی۔ اسی لیے سمیع منہ سے اعتراف نا بھی کرتا لیکن دل ہی دل میں وہ اس شادی کے فیصلے پر مطمئن تھا۔

یہ فیصلہ اس نے کب اور کیسے کیا تھا، اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔

☆☆☆

"یہ لڑکی تجھے بیچ کھائے گی۔۔۔" وہ صبح ہی صبح ناشتے کے بعد امی کو لے کر ہاسپٹل جا رہا تھا جب انہوں نے تیکھے سے انداز میں کہا تھا۔ اس نے ان کی جانب ناراضی سے دیکھا۔ اسے ان کی بات بُری لگی تھی۔ اسے لگا وہ شہرین کی بات کر رہی ہیں۔

"امی۔۔۔ وہ نہیں رہی اب۔۔۔ ختم ہو چکی ہے۔۔۔ لیکن آپ کے دل میں موجود نفرت ختم نہیں ہوئی" وہ سخت ناراض لہجے میں بولا تھا۔ امی نے اس کے غصیلے انداز کو دیکھا پھر نرمی سے بولیں۔

"میں بہو کی بات نہیں کر رہی۔۔۔ شہرین کے لیے لفظ "بہو" پہلی بار سنا تھا سمیع نے ان کے منہ سے جبکہ وہ ناک چڑھا کر کہہ رہی تھیں۔

"میں تو اس کی بات کر رہی ہوں جو مہارانی بنی اِدھر اُدھر پھرتی رہتی ہے تیرے گھر میں۔۔۔" امی کا بات کرنے کا اپنا ہی انداز تھا۔ سمیع اندازہ نا لگا سکا کہ وہ کس کی بات کر رہی ہیں۔

۔وہ بہت پریشان کن دن تھے۔ دونوں اطراف کے خاندان والوں کو بھی شہرین کی سیریس حالت کی اطلاع مل چکی تھی۔ سب لوگ ہی اس بات کے لیے ذہنی طور پر تیار نا تھے کیونکہ شہرین کی حالت تو کافی بہتر تھی۔ وہ ٹھیک نظر آتی تھی اسی لیے جب انہیں دوبارہ سے ٹیومر ہو جانے کا پتا چلا تو وہ سب ہی بے حد پریشان ہو گئے تھے۔ سمیع کی امی اس کے گھر رہنے کے لیے آ گئی تھیں تاکہ بیٹے کو جذباتی سہارا مل سکے۔ وہ خود بھی بیمار رہنے لگی تھیں۔ چند مہینے پہلے ہی ان کے گردے ڈائلائسز ہونے شروع ہوئے تھے۔ وہ خود بیمار ہوئی تھیں تو شہرین کو بُرا بھلا کہنا بھی چھوڑ دیا تھا۔۔

سمیع کو اس بار تسلی دلاسا دینے والوں کی کمی نا تھی لیکن ڈاکٹرز نے شہرین کی حالت کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ بے حد خطرناک تھا اور پھر جب اس کی سرجری ہوئی تھی تو وہ کوما میں چلی گئی تھی۔ صورتحال تو پہلے بھی تسلی بخش نا تھی لیکن شہرین کے کوما میں چلے جانے سے مایوسی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ان دنوں پریشانی کا یہ عالم تھا کہ کوئی کسی کو مخاطب بھی نا کرتا تھا۔ گھر میں رشتہ دار عیادت کے لیے آنے جانے لگے تھے۔ اس کی امی بھی گھر میں موجود تھیں لیکن اس صورتحال میں اماں رضیہ اور کونین ہی تھیں جو اس کا گھر اور گھریلو معاملات کے ساتھ ساتھ اس کی اولاد کی دیکھ ریکھ بھی کر رہی تھیں۔ بالخصوص ایمن مکمل طور پر اس کی ذمہ داری تھی۔

اُس دن کے بعد سے کونین سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو بار کھانے کی میز پر آمنا سامنا ہی ہوا تھا۔ شہرین کی حالت کی وجہ سے سمیع کے ہوش وحواس تو خود جیسے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ ہر روز صبح کو آفس جاتا تھا پھر وہاں سے ہاسپٹل چلا جاتا تھا اور پھر وہیں رہتا تھا۔ گھر میں کیا ہو رہا تھا، کیا نہیں ہو رہا تھا، اس کی اسے کوئی پرواہ ہی

نا رہی تھی۔اسی لیے جب اس کی امی نے کسی "تیسرے فرد" کا تذکرہ کیا تو اسے ذرا دلچسپی محسوس نا ہوئی۔
"کس کی بات کر رہی ہیں۔۔؟" اس نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا تھا۔
"سمیع۔۔تو مجھے ہمیشہ غیر سمجھتا ہے۔۔۔کبھی اپنے دل کی بات مجھے نہیں بتاتا۔۔۔اسی کی بات کر رہی ہوں۔۔جس سے چکر چل رہا ہے تیرا۔۔" وہ برا مان کر بولی تھیں۔اس نے حیران ہو کر مڑ کر ان کی جانب دیکھا ،وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔سمیع گاڑی میں نا بیٹھا ہوتا تو شاید ان کی بات پر اچھل ہی پڑتا۔
"کیسی باتیں کر رہی ہیں امی۔۔۔مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا" وہ واقعی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔
"دیکھ سمیع۔۔۔میں اس جوان لڑکی کی بات کر رہی ہوں جو سارا دن تیرے گھر میں رہتی ہے۔۔۔" وہ وضاحت کرنا چاہ رہی تھیں لیکن سمیع نے ان کی بات کاٹ دی۔اسے سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ "کس" کے متعلق بات کر رہی ہیں۔
"وہ ایمن کی بے بی سٹر ہے امی۔۔۔ایمن کی دیکھ بھال کے لیے آتی ہے۔۔۔" وہ پہلے سے زیادہ جھنجلا کر بولا تھا۔اسے کونین پر بھی غصہ آیا۔اسے پتا تھا یہ باتیں ہوں گی،کونین کے متعلق اس سے سوال کیے جائیں گے اور اسی لیے وہ اس لڑکی کو گھر میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ان کے خاندان میں ایسی باتیں قابلِ اعتراض ٹھہرتی تھیں۔
"آئے ہائے۔۔تجھے کوئی اچھی بے بی سسٹر نا ملی تھی۔۔۔یہ تو خود ابھی چھیل چھبیلی سی ہے۔۔یہ کہاں سنبھال سکتی ہے ایمن کو۔۔۔" وہ ناک چڑھا کر بولیں۔سمیع نے بیک ویو مرر سے ان کی جانب دیکھا۔
"امی!وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔۔۔سمجھ دار ہے۔۔۔اور ایمن بھی بہت مانوس ہے اس کے ساتھ۔۔۔اسی لیے میں نے اور شہرین نے رکھا تھا اسے۔۔۔۔۔شہرین تو اب بے ہوش پڑی ہے۔۔اب ہمیں کب اندازہ تھا کہ قسمت یہ کھیل کھیلے گی ہمارے ساتھ۔۔۔۔یہ بہت عرصے سے ایمن کو پڑھانے آرہی تھی۔۔شہرین بہت تعریف کرتی تھی اس کی ،اعتماد کرتی تھی اس پر ایمن کے معاملے میں۔۔جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہی ہے۔۔۔اب آنا فانا کہاں سے بھروسے والے لوگ ڈھونڈ کر لاؤں۔۔۔اسی لیے اس کو میں نے ہی درخواست کی تھی۔۔۔آپ سمجھ رہی ہیں نا۔۔۔" اپنے حساب سے تو اس نے امی کو ہر بات کی وضاحت کردی تھی۔انہیں مطمئن ہو جانا چاہیے تھا لیکن وہ سر ہلاتے ہوئے بولیں۔
"سمیع۔۔میں تجھے کچھ نہیں کہہ رہی۔۔۔تیرا تو مجھے پتا ہے۔۔اس شہرین نے ہی تیری مت ایسی مار کر رکھی ہے کہ تجھے کہاں نظر آتا ہے کوئی۔۔۔لیکن اس لڑکی کے ارادے نیک نہیں۔۔۔تجھ پر نظر ہے اس کی۔۔" وہ اسی بے دھڑک انداز میں بولیں جو ان کا خاصہ تھا۔
"لاحول ولا۔۔" سمیع کو سخت برا لگا۔
"کیسی فضول باتیں کرتی ہیں امی آپ بھی۔۔۔۔ بیس،اکیس سال کی بچی ہے وہ۔۔۔دس پندرہ سال چھوٹی ہو گی مجھ سے۔۔۔کیوں کسی کی بیٹی پر الٹے سیدھے الزام لگاتی ہیں" وہ نہایت سخت لہجے میں بولا تھا۔اس کا انداز ایسا تھا کہ اس کی امی ایک لمحے کو خائف ہو کر چپ ہوئیں پھر سر جھٹک کر با آوازِ بلند بڑبڑائی تھیں۔
"بچی۔۔۔؟" پھر اپنے لہجے میں زور دیتے ہوئے مزید کہنے لگیں۔
"مجھ سے تو ہمیشہ تیرا پردہ ہی رہے گا پتر۔۔تجھ سے بہتر تو وہ بیس اکیس سال کی "بچی" ہے جس نے اطمینان سے سب کو بتا دیا ہے کہ میرا افیئر چل رہا ہے سمیع رندھاوا کے ساتھ۔۔۔" سمیع کو بڑے زور کا جھٹکا لگا۔اس نے بمشکل اسٹیرنگ تھاما تھا ورنہ گاڑی ضرور ہی کہیں لگ جاتی اس سے۔۔

"کیا۔۔۔؟" وہ بھڑک کر بولا تھا۔
"اس نے کہا ہے یہ سب آپ سے۔۔" اسے یقین نہیں آیا تھا۔
"ظاہر ہے اسی نے کہا ہوگا۔۔ مجھے کون سے سچے خواب آتے ہیں یا میرے کون سے موکل بکھرے ہیں اِدھراُدھر جو تیری راز کی باتیں بھی مجھے بتا جاتے ہیں۔" وہ جل کر بولیں۔
"آپ سچ کہہ رہی ہیں۔۔۔؟" وہ بے یقین لہجے میں بپھر کر پوچھ رہا تھا۔اس کی امی کو جھوٹ بولنے کی عادت تو تھی۔
"چل۔۔۔اب اس بات سے صاف ہی مُکر جاماں کے سامنے۔۔اوہ پُتر۔۔ماں ہوں تیری۔۔دشمن نہیں ہوں۔۔۔میں نے تو اِس پٹھانی کو بھی سر آنکھوں پر بٹھایا ہوا تھا۔۔یہ تو پھر اپنی برادری کی لگتی ہے۔۔۔ہے نا۔۔ویسے ذات کی کون ہے یہ۔۔۔؟" وہ اپنا موقف بیان کر کے جیسے پرسکون ہوگئی تھیں اور اگلی انکوائری شروع کردی تھی۔ سمیع نے بیک ویو مرر سے ان کو تیکھے چتونوں سے گھورا پھر غرا کر بولا۔
"اب آپ نے ایسی کوئی بات کی نا امی تو میں نے یہ گاڑی اس سامنے والے ٹرک کو مار دینی ہے۔۔۔۔ایک منٹ میں قصہ ختم ہوجائے گا" ۔امی نے ذرا جھک کر سامنے دیکھا۔وہاں سڑک پر ان سے آگے واقعی ایک بڑا سا ٹرک گزر رہا تھا۔وہ ڈرسی گئیں۔سمیع نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔اسے پسینہ آنے لگا۔اس نے اے سی چلاتے ہوئے شرٹ کا اوپر والا بٹن کھولا تھا۔
"۔یہ لڑکی کیا کھیل رہی تھی میرے ساتھ۔۔۔۔" اس نے جل کر سوچا تھا۔اسے بے حد غصہ آنے لگا تھا۔پہلے ہی اتنے مسائل تھے زندگی میں اور یہ محترمہ جانے کہاں سے ان میں اضافہ کرنے آ گئی تھیں۔
"میں ایک بات ضرور کہوں گی سمیع۔۔۔اب چاہے تجھے بُرا لگے۔۔۔۔لیکن اگر ایک لڑکی اپنے منہ سے یہ بات کہہ رہی ہے تو دال میں ضرور ہی کچھ کالا پیلا ہوسکتا ہے۔۔۔ہاں ٹھیک ہے۔۔۔بے شک لڑکی منہ متھے لگنے والی تو نہیں ہے۔۔۔عام سی شکل۔۔عام سا رنگ روپ۔۔۔قد بھی نِکا سا ہے۔۔۔پر تیری بچی سے بڑی محبت کرتی ہے۔۔یہ جانچ لیا ہے میں نے۔۔۔جان چھڑکتی ہے اُس پر۔۔اگر تیرا کوئی سلسلہ چل رہا ہے اس کے ساتھ۔۔تو میں اس بار تیرے حق میں ہوں۔۔۔یہ زندگی سنوار دے گی تیری بِن ماں کی بچی کی"۔
اس کی امی زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکتی تھیں۔انہوں نے اطمینان سے مشورہ دیا تھا۔سمیع نے اب کی بار انہیں گھورا نہیں تھا۔گاڑی کی رفتار پہلے ہی اتنی تیز تھی۔اس نے اتنی زور سے بریک لگائے کہ گاڑی جھٹکے سے رُکی تھی لیکن اس نے ساتھ ہی پھر گاڑی چلا دی تھی۔امی کی پیشانی سیٹ کی پُشت سے ٹکرائی تھی۔پیچھے والی گاڑی ان کی گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی اور اردگرد سے ہارن بجنے لگے تھے۔
"حسب اللہ حسب اللہ۔۔۔حسب اللہ حسب اللہ" امی ڈر کر باآوازِ بلند ذکر کرنے لگیں۔

☆☆☆

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

غزالہ جلیل راؤ



"یا خدایا..... اس ساری وسیع و عریض کائنات میں تم کو کہاں ڈھونڈوں گی؟ کہاں ڈھونڈوں گی؟....."

اس کے اندر بارش ہو رہی تھی۔ لیکن پت جھڑ کا موسم شروع ہو گیا تھا... بے شمار آوارہ پتے اڑتے پھر رہے تھے۔ بے سہارا، معصوم، بے گھر، درختوں کے نیچے، تنوں کے قریب بھورے، مٹیالے اور زرد پتے و پتیوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔

کالی طویل اداس رات نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ نیم کی تمام ننگی ٹہنیاں اس کی روح میں سما گئی تھیں اور اسے کند چھری کی طرح کاٹ رہی تھیں۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ درختوں کی شاخوں پر رات تھکے ہارے پرندوں کی طرح اونگھ رہی تھی..... اس کے دل میں جذبوں نے انگڑائی لی اور اداسی میں تبدیل ہو گئے۔ وہ اس گھر کو دیکھتی تو دل میں عجیب سی اداسی اتر جاتی۔

اتنے برس بیت جانے کے بعد بھی وہ چاچی مہراں کا ستا ہوا زرد چہرہ اور محبت کی آنکھوں میں اتری دھند آج تک نہیں بھول پائی تھی۔ اتنے برس تک وہ زندگی کی پگڈنڈی پر ان کا ہاتھ تھام کر چلتی رہی تھی۔

اس کے دل میں اس کی محبت کی پیاس انگڑائیاں لینے لگتیں! اس کے دل میں چاہت کی صحرا کی ریت ادھر سے ادھر اڑنے لگتی۔ کبھی یہ ریت ٹیلوں کی صورت اختیار کر لیتی اور کبھی یہ ٹیلے مٹتے دکھائی دیتے اور کبھی ہوا چلتی اور ریت پر لہریں بناتی ہوئی کچھ الفاظ کے نشان چھوڑ جاتی۔ عذرا کو یوں محسوس ہوتا ان لہروں نے "م..... ح..... ب..... ت" لکھا ہو چاندنی جب نیم کے پتوں سے چھن چھن کر آتی..... اور عذرا کے دل کو پیار کرنے لگتی۔ محبت بھرا لمس اسے بوسے دیتا تو اس کے اردگرد روشنی کا ایک ہالہ سا بن جاتا۔ اس کے من میں خود بخود ہی نرم نرم احساس پھوٹتے..... تب وہ سوچنے لگتی۔ کیا "محبت" کبھی اس کے بارے میں سوچتا ہو گا۔

اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اور وہ چہرے کو بازوؤں میں لے کر آنسو بہانے لگتی۔ خاموش لبوں سے آہیں نکلنے لگتیں۔

"تم کہاں کھو گئے محبت..... پلٹ کر میری خبر بھی نہ لی۔" وہ دل میں اس سے باتیں کرنے لگتی۔ وہ سوچتی کاش کوئی وقت کا پہیہ الٹا چلا دے اس کے بچپن کے وہ دن جو محبت کے ساتھ گزرے تھے وہ لوٹ کے آ جائیں، ایسا کچھ ہو جائے جو لمحوں میں سب کچھ بدل کر رکھ دے۔ محبت آ جائے۔

محبت وقت کی دھند میں کھو گیا تھا مگر اس کا چہرہ نہ دھندلا سکا تھا..... عجو کی سوچوں میں محبت کا وہ ہی چہرہ ابھرتا جو بچپن میں اس سے جدا ہوا تھا۔ ایک وہ ہی تو اس کا ساتھی اس کا ہمدرد تھا۔

اس نے سب سے پہلے..... محبت کا نام لکھنا سیکھا تھا۔

بچپن کی یادوں میں جو خوشبو سب سے زیادہ اسے مخمور کر دینے والی تھی وہ دیسی گھی سے بنے تازہ

مکمل ناول



پراٹھوں اور چولہے میں جلتی لکڑیوں کے کوئلوں پر سینکی ہوئی روٹیوں کی۔ جلتے دہکتے کوئلوں سے مختلف رنگ جھلکتے تھے۔ سرخ، کاسنی، عنابی رنگوں کی چنگاریاں پھوٹتیں۔

اور ایک بڑی دل فریب، دل موہ لینے والی محبت کی "محبت" کی خوشبو جو سب سے انوکھی تھی... یہ ساری خوشبوئیں آج تک اس کے ساتھ چل رہی تھیں۔ وہ شام کو لیٹ کر اسے یاد کرتی اور چاند میں اس کا عکس دیکھتی۔ اس کی یادیں رات کے اس ٹکڑے کو اتنا حسین بنا دیتیں کہ وہ اپنے سب دکھ بھول جاتی وہ اس کے متعلق سوچتی تو اس کا دل بے چین ہو جاتا۔ تب اس کا دل شدت سے خواہش کرتا کہ کاش محبت کہیں سے آجائے۔

محبت کی یادوں کو اس نے ردی کاغذ کی طرح پھینکا نہیں تھا بلکہ دل کے طاق میں سینت سینت کر رکھی تھیں... وہ اپنی یادوں کے ساتھ اس کی کائنات میں موجود تھا۔

عرصے سے محبت کے ساتھ اس کا خاموش رشتہ چلتا آرہا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔ جب ماں اس کے پاس آکر بولیں۔

"عذرا تم اپنے اقبال ماموں کے گھر لاہور چلی جاؤ۔ میں تمہیں خط دوں گی وہ ان کو دے دینا وہ کہیں نہ کہیں تمہاری نوکری کا بندوبست کر دیں گے۔ تمہارے ابا کا علاج تب ہی ہو گا جب پیسے ہوں گے! ان کے بیٹوں نے تو پلٹ کر خبر نہ لی۔ اب تم ہی ان کا بیٹا ہو۔ شہر میں تو کہیں نوکری مل ہی جائے گی۔ میں بھاگ بھری کو تمہارے ساتھ بھیجوں گی وہ لاہور آتی جاتی رہتی ہے۔"

آسیہ تو کہہ کر چلی گئیں لیکن اس پر سوچوں کے در وا کر گئیں... اس کی آنکھوں میں کئی منظر ابھر کر معدوم ہو رہے تھے۔ ایک زمانہ بیت گیا۔ ایک عرصہ گزر گیا۔ وقت کے پلو سے ایک ایک گرہ کھلنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

عذرا ڈیڑھ سال کی تھی جب آسیہ پیشانی پر طلاق کا داغ سجائے ایک بار پھر سے بھائی کی دہلیز پہ آ گئی۔

آسیہ اور اکرم میں بے پناہ محبت تھی... مگر اکرم میں ایک خامی تھی وہ کچے کانوں کا مالک تھا اور جو سب سے پہلے اس کے کانوں میں پھونک مار دیتا وہ اس کی بات پر اعتبار کرتا... آسیہ کی ساس ذرا تیکھے اور تلخ مزاج کی مالک تھیں... بات بات پر روک ٹوک نکتہ چینی... بولنا شروع ہوتیں تو رکنے کا نام ہی نہ لیتیں۔ سارا دن ساس نندوں اور دیوروں کے آگے آگے... کسی کام میں کوتاہی نہ کرتی۔ مگر پھر بھی ساس کی پیشانی کے بلوں میں کمی نہ آتی... لیکن آسیہ حرف شکایت زبان پر نہ لاتی۔ خاموشی سے معمول کے کاموں میں لگی رہتی۔ پھر بھی ساس کے عتاب کا نشانہ بنتی۔ جب عذرا پیدا ہوئی تو دس دن بعد چھلے ہی میں آسیہ کو کام پر لگا دیا۔ آسیہ نے تب بھی زبان نہ کھولی۔ اکرم سب کچھ دیکھتا مگر ماں بہنوں کے سامنے آسیہ کے حق میں بولنے کی ہمت نہ تھی۔ آسیہ کی ساس کو خدا واسطے کا بیر ہو گیا تھا اس سے... شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی عذرا کے بعد وہ آسیہ کے اور بھی قریب ہو گیا تھا۔

حالات آہستہ آہستہ تبدیل ہونے لگے... اب گھر میں شور ہنگامہ رہنے لگا... مگر یہ سب اکرم کی ماں بہنوں کا ہوتا... لیکن بدنام وہ ہی کی جاتی...

اکرم نے کبھی بیوی سے یہ نہ پوچھا کیا ماں جو کہتی ہے وہ جھوٹ ہے یا سچ اور نہ ہی کبھی آسیہ نے شوہر سے ساس نندوں کے بارے میں کچھ کہا۔

اکرم ہر وقت کی چخ چخ سے تنگ آنے لگا تھا... ایک دن اس نے ہمت کر کے ماں کو سمجھانا چاہا... وہ اس پہ پھٹ پڑیں۔ اور ماں نے اتنا شور و غل کیا کہ وہ چیخ پڑا... اور اس قصے کو ہی ختم کر دیا! اور آسیہ کے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ تھما دیا۔

جب اس کا غصہ کم ہوا تو اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا... پچھتاوے

سے کیا ملتا.... لیکن اس نے خود کو آسیہ کا مجرم سمجھا اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے گھر ہی چھوڑ گیا۔

آسیہ گھر کیا آئی خالدہ کے ہاتھ پھر سے مفت کی نوکرانی ہاتھ آگئی۔ لیکن اس کے باوجود خالدہ کو ان کا بوجھ محسوس ہوتا۔ وہ جلد از جلد ان کے عذاب سے جان چھڑانا چاہتی تھیں کہ کل کو ان کے لیے دونوں مصیبت بن جائیں۔ وہ اپنے ملنے جلنے اور رشتہ کرانے والی خالہ سے بھی آسیہ کے رشتے کا کہہ چکی تھیں۔ حالانکہ آسیہ کی عدت بھی پوری نہ ہوئی تھی۔ اقبال نے ایک دو بار بیوی کو سمجھایا کہ آسیہ پر اتنے ظلم نہ توڑے مگر خالدہ الٹا شوہر پر ہی برس پڑیں اور بے بھاؤ کی سنائیں۔ جس کے جواب میں اقبال نے خاموشی میں ہی اپنی عافیت جانی۔

آخر خالدہ کی کوشش رنگ لے ہی آئی۔ عذرا تین سال کی ہوگئی تھی جب احمد یار کا رشتہ آسیہ کے لیے آیا۔

خالدہ احمد یار کا رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھیں کیونکہ بہت دیر کے بعد کوئی گھر تک پہنچا تھا۔ جانچ پڑتال کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سو آسیہ ایک بار پھر بھائی کی دہلیز سے رخصت ہو کر احمد یار کے گھر آگئی۔ زندگی کے اس سفر پر بھی کڑی آزمائشیں اس کی منتظر تھیں۔

☆ ☆ ☆

احمد یار کے گھر میں بہت سارے افراد تھے اور افراد کا بے پناہ شور تھا۔ گھر کے افراد جتنی دیر جاگتے رہتے .... ایک ہنگامہ برپا رہتا۔ جیسے بہت ساری بطخیں ایک ساتھ قیں قیں کر رہی ہوں۔ گھر میں اتنے افراد کے ہوتے ہوئے بھی عذرا کا ٹھکانا' نہ تھا۔ اور یہاں آکر عذرا کی ماں بھی اپنی نہ رہی تھی۔

نیم کے پیڑ کے نیچے پڑی کھرے موٹے بان کی ڈھیلی ادوائین والی جھلنگا چارپائی اس کا ٹھکانہ بن گئی۔ اور پھر گرمی کے دن رات اور سردی کے دن اس نیم کے پیڑ کے نیچے ہی گزرتے تھے اس کے۔

بہت یاد کرنے پر بھی اسے یاد نہ آیا وہ اس گھر میں آکر کبھی ماں کی آغوش میں سکون سے سوئی ہو۔ اسے اچھی طرح یاد ہے اس کا ٹھکانا کاٹ کباڑ سے بھرا ایک کچا کوٹھا تھا اور اس میں ایک ٹوٹی پھوٹی سی چارپائی پڑی تھی جو نیم کے پیڑ کے نیچے پڑی چارپائی سے ملتی جلتی تھی۔ عذرا کو اس کمرے میں پھینک دیا گیا۔ اس کے کمرے کا دروازہ ساتھ والے کمرے میں کھلتا تھا جس میں گھر کے باقی افراد سوتے تھے۔

وہ آج تک بھول نہ پائی تھی پہلی رات کو اسے بہت ڈر لگا تھا اور اندھیرے میں مختلف شکلیں نظر آتی تھیں۔ وہ ڈر کے مارے دبک گئی اور اگلی صبح اس نے ماں کو یہ بتانا چاہا لیکن ماں کے پاس اس کے لیے وقت ہی نہیں تھا جو سنتی.... وہ ماں کا ہاتھ تھامے منمنا رہی تھی کہ اسی وقت ابا دھاڑے۔

"اس کے چاؤ چونچلے اٹھانے کے علاوہ کوئی کام نہیں تمہیں.... ؟ اگر اتنا ہی خیال تھا اس کا تو دوسری شادی نہ کی ہوتی.... ادھر آکر دیکھو منا رو رہا ہے.... ان کے لیے ہی بیاہ کر لایا ہوں تمہیں.... اگر ان کو سنبھالنے کا وقت نہیں ہے تمہیں تو پھر اس گھر میں رکھنے کا فائدہ.... تمہاری وجہ سے اس منحوس کو بھی بھگت رہا ہوں۔ دوبارہ میرے بچوں کو نظر انداز کیا تو وہ

دن اس گھر میں آخری ہوگا تمہارا..." وہ ان کا غصہ دیکھ کر اندر تک سے کانپ گئی اور منمنانے لگی۔

"نہیں' نہیں ایسی کوئی بات نہیں... وہ تو عذرا رات کو ڈر گئی تھی بتا رہی تھی۔ رات میں اکیلے سونے کی عادت نہیں اسے۔"

"اکیلے سونے کی عادت نہیں تو نہ کی ہوتی تم نے دوسری شادی۔ سینے سے لگا کے بیٹھی رہتی لاڈلی کو۔"

"آج معاف کردیں' آئندہ کوئی شکایت نہیں ہوگی..." وہ لاچار سے لہجے میں گویا ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں تارے سے چمکنے لگے تھے۔

"آج آخری بار کہہ رہا ہوں۔ پہلی اور آخری بار... پھر کبھی یہ غلطی دہرائی نا تو اس گھر سے باہر ہوگی تم..." انہوں نے آسیہ کو وارننگ دیتے ہوئے ناشتے کا حکم دیا۔

وہ جلدی سے چولہے کی طرف بھاگی۔ آگ تو چولہے میں پہلے سے ہی جل رہی تھی کچھ اور لکڑیاں ڈالیں اور توا رکھ دیا۔

"بچوں نے اچھی طرح ناشتا کرلیا تھا یا اس منحوس کے لاڈ چاؤ میں بھوکے ہی چلے گئے اسکول...؟"

"جی ناشتا کر کے گئے ہیں۔" آسیہ نے دھیرے سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جلدی سے ناشتا لے آؤ۔ دیر ہو رہی ہے مجھے۔" آسیہ نے جلدی جلدی ناشتا بنایا اور ان کے سامنے لا کر رکھ دیا اور پھر وہ ناشتے کے بعد گھر سے کام کے لیے چلے گئے۔

اور پھر اللہ یار کو اس معصوم پر ترس آیا تھا۔ اگلی رات اس کی چارپائی گھر والوں کے ساتھ کمرے میں ڈال دی تھی۔ ڈر تو سوتے ہوئے بھی لگا تھا مگر گزری رات سے بہتر تھی سب کے ساتھ تھی... تنہائی کا خوف نہیں تھا۔



گھر کے افراد چولہے کے گرد بیٹھے اونچا اونچا بول رہے ہوتے جیسے پلیٹ فارم پر جمع لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہوں۔ کسی کو روٹی چاہیے ہوتی' کسی کو پراٹھا اور کوئی چائے کے ساتھ رس کھانے کی خواہش رکھتا۔ سب کے ناشتے سے فارغ ہونے تک وہ بھوک سے بلبلا اٹھتی۔

اس گھر میں آنے کے دوسرے یا تیسرے دن کی بات ہے۔ سب اسی طرح چولہے کو گھیرے بیٹھے تھے... اور وہ ان سب کے پیچھے سب سے آخر میں بیٹھی تھی۔ جب دادی' دادا اور بچے چائے میں رس ڈبو ڈبو کر کھا رہے تھے۔ اور ماں گرم گرم پراٹھے اتار رہی تھی باقی ان سے لطف اندوز ہو رہے تھے... وہ بھی تو چھوٹی سی بچی تھی۔ بھوک سے نڈھال ہوگئی... اس نے ماں سے کہا۔

"ماں بھوک لگی ہے..."

اس کا اتنا کہنا تھا کہ ابا چیخے۔

"بیٹھ جا چپ کر کے۔ جب سب کھالیں گے تو مل جائے گی تجھے بھی..." اس کے ساتھ ہی اس کے لبوں پر قفل پڑ گیا۔ ماں نے اس کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں اسے پیغام دیا۔

"صبر کرو میری بچی... تھوڑا سا انتظار اور کرلو۔ دیتی ہوں۔" اس نے ناسمجھی سے ماں کو دیکھا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔

جو ناشتا کرتا جاتا وہ اٹھتا جا رہا تھا... جب کافی دیر گزر گئی تو ماں نے ترس بھری نظروں سے اسے دیکھا... اور ایک پیالی میں چائے ڈالی اور اس کے قریب رکھنے ہی لگی تھی کہ اسلم فوراً" بولا۔

"یہ چائے مجھے دے... مجھے اور چائے چاہیے..."

آسیہ نے خاموشی سے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھادی... دیگچی میں اور چائے نہیں تھی اور عذرا کے لیے اور چائے بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ آسیہ نے ایک بار پھر بیٹی کو دیکھا اور دوسری نگاہ قریب رکھی پیالیوں کی طرف آسیہ نے سب کی بچی ہوئی چائے دیگچی میں ڈالی گرم کی اور پیالی بھر کر سامنے رکھ دی... وہ آدھی پیالی چائے تھی۔

"آسیہ جلدی جلدی احمد یار اور اللہ یار کی روٹی پکا کر باندھ دے۔ یہ کام پر جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔" ساس نے حکم دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا اماں۔۔۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

اور شاپر میں پڑا رس کا چورا اکٹھا کر کے اس کی پیالی میں ڈال دیا اور ایک چمچ بھی اسے تھما دی۔۔۔ نجانے ایک مکھی گھومتی ہوئی کہاں سے آئی اور اس کی چائے میں گر گئی۔

"ماں مکھی گر گئی۔۔۔؟" عذرا نے ماں کی توجہ اس طرف دلائی۔

"نکال کر پھینک دو اسے اور جلدی سے کھا لو۔۔۔ ورنہ یہ بھی نہیں ملے گی۔" ماں نے سرگوشی کے انداز میں اسے کہا۔

وہ بے بسی سے ماں کو دیکھنے لگی۔۔۔ اس سے یہ چائے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ آسیہ نے چائے سے مکھی نکال کر پھینک دی اور چمچ بھر کر اس کے منہ میں۔۔۔ اور پھر عذرا چائے میں بھیگے رسوں کا چورا کھانے لگی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ اکثر ہی ایسا ہوتا تھا۔۔۔

جب اس کی روٹی کی باری آتی تو۔۔۔ تھال میں آٹا ختم ہو چکا ہوتا۔۔۔ یا ساس آسیہ کو کسی کام سے اٹھا دیتی ۔۔۔ کہ منا رو رہا ہے۔ جس کا مطلب ہوتا اب ناشتے کا وقت ختم۔۔۔ آسیہ منے کو گود میں لے کر پھر سے چولہے پر آکر چیزیں سمیٹنے لگتی۔

آسیہ اکثر اس کو رات کی بچی ہوئی روٹی گرم کر کے دیتی اور وہ چائے میں ڈبو کر ٹکڑا ٹکڑا کھانے لگتی۔

✡ ✡ ✡

وہ گھر میں بولائی بولائی پھرتی اور پھر دہلیز کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر آنے جانے والوں کو دیکھتی رہتی۔ محبت کپڑے کا تھیلا گلے میں ڈالے ایک ہاتھ میں تختی پکڑے سیاہ وردی میں ملبوس اسکول جا رہا ہوتا۔ وہ اس کو حسرت بھری نگاہوں سے اسکول جاتا دیکھتی۔ محبت اسے آتے جاتے دیکھ کر مسکراتا۔۔۔ ایک دن دو دن اور

تین دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا... چوتھے دن وہ اس کو دیکھ کر مسکراتا ہوا اس کے پاس آکھڑا ہوا...

"اسکول جاؤ گی تم؟" پہلے تو وہ حیران نظروں سے اسے دیکھتی رہی اور پھر نفی میں سر ہلانے لگی۔

"پڑھو گی نہیں؟" محبت نے دوسرا سوال کیا۔

ایک بار پھر اس نے زور زور سے سر نفی میں ہلایا۔

"کیوں...؟"

"ابا مارے گا..." اس نے کہہ تو دیا اور پھر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"تمہیں ابا سے ڈر لگتا ہے...؟"

"ہاں... ابا غصہ کرتا ہے..." مگر اس کی آواز حلق میں دب کر رہ گئی کیونکہ ہونٹوں پر اس کا ہاتھ رکھا تھا۔

"ابھی اسکول سے دیر ہو رہی ہے مجھے... آکر بات کروں گا۔" اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا اور پھر اسکول کی طرف چلا گیا۔

وہ کتنی دیر تک وہیں بیٹھی رہی... اس کا ننھا سا ذہن الجھ سا گیا۔ وہ پڑھنا چاہتی تھی... اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی اسکول جائے مگر ابا... اور گھر والے جو دو وقت کی روٹی کے لیے روتے تھے تو اسکول کیسے بھیج دیتے۔

وہ اٹھ کر اندر آگئی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"کر آئی گلیوں کی سیر مہارانی...؟" دادی کی آواز پر چونک کر اس نے دیکھا۔

ماں جو نلکا چلا چلا کر برتن دھو رہی تھی۔ ایک دم ساس کی طرف اور پھر عجو کو دیکھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے ہی وہ دہلیز کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتی تھی وہ بھی ان کو کھٹک رہا تھا... آسیہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی... بہت مجبور تھی۔ کچھ نہیں کر سکتی تھی اس کے لیے...

کچھ دیر بعد وہ اٹھی پھوپھی کے بچے مٹی سے کھیل رہے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ کھیلنے لگی اور مٹی کے گھروندے بنانے لگی۔

"یہ کیا بنا رہی ہو تم...؟"

شازی نے اس سے پوچھا۔ جو اس سے ایک سال بڑی تھی۔

"گھر..."

"گھر کس کا گھر...؟"

"میرا گھر..." عجو نے بڑی بڑی آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔

"تیرا گھر... تو گھر بنائے گی۔" آٹھ سالہ اسلم یہ کہہ کر ہنسا اور ایک ٹھوکر اس کے بنائے گھروندے پر ماری۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے بنایا ٹیڑھا میڑھا گھر مٹی بن گیا۔

یہ اس کا سب سے بڑا سوتیلا بھائی تھا۔

ماں کے کلیجے پر چوٹ لگی... قسمت نے آسیہ کو کہاں لا کھڑا کیا تھا۔ نہ شوہر طلاق دیتا نہ وہ دوسرے شوہر کا منہ دیکھتی نہ ہی اسے اور بیٹی کو ایسی باتیں سننے کو ملتیں۔ اسلم تو ان کو اول روز سے پسند نہیں کرتا تھا... ماں بیٹی کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتا اور بدتمیزی کرتا تھا۔ عذرا پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی... اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھیں۔ وہ ایک دم سسکی...

"ماں... ماں۔" وہ ماں کی طرف لپکی۔

"اسلم بیٹا یوں نہ کرو... بہن ہے تمہاری۔" آسیہ نے آگے بڑھ کر اسلم کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"یہ میری بہن نہیں ہے۔ میری بہن تو شازی ہے شازی... یہ میرے پاس کھڑی ہے اور نازیہ ہے جو پھوپھی کے پاس سو رہی ہے..."

"آسیہ تو کیا اس کو سینے سے لگائے کھڑی ہے۔ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں... چل ادھر آ... جمال رو رہا ہے... اس کو دودھ کی بوتل دے... اس کو بھی دیکھ لیا کر..." ساس نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا... اور جب پوتے نے دادی کو ایک کی دو لگا کر بتایا تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو گئیں۔

"تیری یہ مجال تو میرے پوتے کے سامنے زبان چلائے۔ یاد رکھ تو آئی ان کی وجہ سے ہے اس گھر میں... اور ان ہی کی وجہ سے گھر میں ہے ورنہ کبھی کا چلتا کرتے۔ ایسی بدزبان عورت کو کون گھر رکھتا ہے۔

آنے دے احمد یار کو.... بیوی کا غلام بن گیا.... بیوی کی اہمیت پیر کی جوتی سے زیادہ نہیں...."

انہوں نے آسیہ کی کمر دو ہتڑوں سے لال کر دی۔

عذرا روتی ہوئی باہر کی طرف بھاگی اور گھر کے باہر چبوترے پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے.... اتنے میں سامنے سے محبت آتا دکھائی دیا۔ وہ اپنے گھر جانے کے بجائے اس کے پاس آکھڑا ہوا۔

"کیا ہوا' رو کیوں رہی ہو؟" وہ کچھ نہ بولی خاموش نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا بتاؤ گی نہیں...."

"اسلم بھائی نے مجھے مارا اور ماں کو دادی نے...." اس نے ہچکی لیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیوں مارا....؟"

"اس نے میرا مٹی کا گھر توڑ دیا۔"

"اچھا...." محبت نے بہت پیار اور معصومیت سے کہا۔

"چلو آؤ میرے ساتھ...." وہ اس کی انگلی پکڑے اسے اپنے گھر لے گیا۔

اتنے میں وہ گھر میں داخل ہو گیا۔ چاچی مہراں نے اس کو محبت کے ساتھ دیکھا تو ایک دم خوش ہو گئیں۔

"اماں عذرا.... باہر بیٹھی رو رہی تھی میں اس کو اپنے ساتھ لے آیا...."

"اچھا کیا تم نے...." انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"نہ روؤ میری بچی۔ تم اتنی پیاری ہو مگر مقدر خراب تھے جو احمد یار کے گھر آگئی ہو۔ یہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔ پورے کا پورا گھرانہ جاہلوں اور بدتمیزوں کا ہے.... تم کچھ نہ کہا کرو ان کو.... برے کے منہ لگو تو دوسرا بھی برا ہو جاتا ہے.... اسلم تو ہے ہی چور اچکا...."

عذرا کی سمجھ میں کچھ آیا اور کچھ نہیں.... لیکن اتنا ضرور ہوا اسے لگا وہ ماں کی گود میں آگئی ہو.... اس کے تڑپتے دل کو ایک دم سکون آگیا.... لیکن ماں کی طرف سے بے چینی تھی ابھی بھی.... چاچی مہراں نے اس سے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے ساری بات بتادی....

"آج تو خیر نہیں آسیہ کی.... ایک دوبار ملی ہوں اچھی عادت کی ہے مگر نصیب کس نے دیکھا ہے۔"

انہوں نے محبت سے بات کرتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری اور پھر محبت کے لیے تازہ روٹی ڈالی اور ساتھ میں اسے بھی دی اور اپنے ہاتھ سے کھلانے لگیں۔ عذرا کا دل ایک بار پھر سے بھر آیا تھا۔

جب وہ شام کو گھر آئی تو اس نے ماں کو بتایا وہ چاچی مہراں کے گھر تھی اور وہیں روٹی کھائی۔ اور یہ بتایا اب وہ چاچی مہراں کے گھر جایا کرے گی۔ اور محبت کے ساتھ کھیلا کرے گی۔ اس نے ایک سانس میں ماں کو سب بتا دیا مبادا کوئی آنہ جائے۔

آسیہ کے اندر ڈھیروں سکون اتر آیا۔ اور وہ نیم کے پیڑ کے نیچے اپنی مخصوص جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔



وہ محبت کے ساتھ کھیلنے لگی۔

یہ ہی وہ مرحلہ تھا جب ان کے درمیان فاصلے مٹنے لگے۔ یہ ہی وہ مقام تھا جب وہ محبت کے بہت قریب آ گئی۔ وہ سارا سارا دن محبت کے ساتھ کھیلتی اور پڑھتی رہتی۔ اور جیسے جیسے ابا کے آنے کا وقت ہوتا تو اس کی ننھی جان ڈر اور خوف سے کانپنے لگتی۔ ایک دہشت سی اسے گھیر لیتی۔

شام کے وقت اس کی واحد جگہ نیم کے پیڑ کے نیچے پڑی بان کی کھری جھلنگا چارپائی ہوتی جس پر لیٹ کر وہ سورج کو غروب ہوتے دیکھتی.... پرندوں کی ڈاروں کو گھر جاتے دیکھتی تھی اور اس وقت اسے یہ محسوس ہوتا جیسے اسے بھی کسی گھر کی تلاش ہو.... اسے بھی کہیں جانا ہو.... کاش اس کے پر ہوتے تو وہ بھی پرواز کر جاتی مگر کہاں....؟ اس کا دل چلاتا "میرا گھر کہاں ہے؟"

یہ سوال اکثر اس کے دل میں چبھتا رہتا۔ اس کے

دل میں ایک عرصے سے جو ایک کسک ایک خلش تھی۔ ایک احساس ایک جذبہ ایک بے نام سی آرزو جس کو وہ بتانہ پاتی سمجھ ہی نہ پاتی۔ گھر اپنا گھر۔۔۔ کیا اس کا یہ خواب پورا ہوگا۔

اس کا ننھا سا ذہن یہ بات تو نہیں سمجھ پایا تھا لیکن یہ بات پنجے گاڑھ کر اس کے اندر پیوست ہوگئی تھی۔

وہ زبان سے تو کچھ نہ کہتی۔۔۔ لیکن اس کی سوچیں نومولود بچے کی طرح بہت معصوم سی کلکاریاں ہوتیں۔ جو ماں کی سماعتوں میں کبھی نہ پڑیں۔ کبھی وہ غور سے ماں کا چہرہ دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں 'ڈر' خوف اور بے گانہ پن نظر آتا۔ اس پل اسے اپنی ماں اجنبی لگنے لگتی اور تب اسے کوئی اپنا نظر آتا تو مہراں چاچی اور محبت۔

محبت اپنا کپڑے کا تھیلا اٹھائے اور ہاتھ میں تختی پکڑے صحن میں ایک طرف بنے مٹی کے کچے چبوترے پر بوری بچھا کر آلتی پالتی مار کر بیٹھتا تو وہ بھی چپ چاپ جا کر اس کے پاس بیٹھ جاتی اور خاموشی سے اسے پڑھتا لکھتا دیکھتی اور ساتھ ہی وہ لفظ دہراتی جو وہ پڑھتا۔

وہ محبت کو دوات میں قلم ڈبو کر تختی لکھتے ہوئے دیکھتی۔ وہ لکھتا اور ساتھ ساتھ بولتا جاتا۔ وہ ان لفظوں کو پہچاننے لگی تھی۔

وہ محبت کو لکھتے دیکھ کر تھوڑا بہت لکھنا سیکھ گئی تھی۔ لیکن عذرا وہ نہیں لکھتی تھی جو محبت لکھتا وہ بار بار ایک ہی لفظ لکھتی تھی۔ "م۔۔۔ ح۔۔۔ ب۔۔۔ ت"

اس نے سب سے پہلے جو لفظ لکھنا سیکھا وہ محبت کا نام تھا۔

وہ اس کے ساتھ یوں ہی کھیلتے کھیلتے کبھی کھیتوں اور باغ کی سیر کو نکل جاتی۔ پگڈنڈی پر چلتے چلتے جب کوئی چھوٹا سا موڑ آجاتا تو وہ سوتی جاگتی گڑیا کی طرح پلکیں جھپکا کر اسے دیکھتی۔ تو وہ اسے پریشان دیکھ کر بے حد نرم لہجے میں کہتا۔

"گھبراؤ نہیں۔۔۔ میرا ہاتھ تھامے رہو۔۔۔ میرے ساتھ قدم اٹھاؤ اور چھلانگ لگاؤ۔" وہ محبت کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتی اور یوں ہی اس کا ہاتھ تھامے وہ موڑ پھلانگ جاتا۔

تب عذرا کو ایک دم اس کے ساتھ سے تحفظ کا احساس ہوتا۔ وہ سرسوں کے کھلے ہوئے زرد پھولوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی۔ اور محبت اس کی خوشی دیکھ کر نہال ہو جاتا۔ جب وہ باغ میں جاتے دونوں بیٹھ کر امرود کھاتے۔ کبھی درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں سے لپٹ کر جھولتے۔

سڑک کے دائیں طرف مرزوں کا ٹیوب ویل تھا۔ بہتے پانی کا شور' سفید شفاف پانی وہ آکر منہ ہاتھ دھوتے اور ٹھنڈا پانی پیتے۔

پانی میں دیر تک ہاتھ ڈالنے سے ہاتھوں کی ہتھیلیاں گلابی ہو جاتیں اور انگلیوں کے پوروں پر لکیریں پڑنے لگتیں۔ عجیب کھیل تھا یہ بھی دونوں ہاتھوں میں پانی بھرتے اور ایک دوسرے پر اچھالتے۔ دونوں کھیلتے اور خوش ہوتے اور اس وقت کی دنیا اسے پریوں کی کہانیوں جیسی لگتی۔۔۔ خوشگوار پرسکون زندگی تمام دنیا اور اس کی ساری رفتار اور اس کے سارے رنگ اسے محبت کے چہرے میں ہی نظر آتے۔



ایک بار ایسا ہوا کہ اس کے بال روکھے پھیکے ہو رہے تھے۔ ماں کو ذرا فرصت ملی تو اس کو لے کر بیٹھ گئی۔

"عجو ادھر آؤ۔۔۔ تمہارے سر میں تیل لگاؤں۔"

اس نے اسے پکڑ کر سامنے بٹھا لیا اور اس کے سر میں تیل ڈال کر مالش کرنے لگی۔۔۔ بال بھی تو اس کی عمر سے زیادہ لمبے اور گھنے تھے۔

"بی بی تیل مفت کا نہیں ہے جو پانی کی طرح سر میں بہایا جا رہا ہے۔۔۔ رہ کیا گیا ہے بوتل میں۔۔۔"

دادی نے تیل کی شیشی اٹھاتے ہوئے غصے سے کہا۔

آسیہ نے بے بس نگاہوں سے ان کو دیکھا اور خاموشی سے ایک گہرا سانس کھینچا۔

کوئی چیز بھی تو نہیں تھی عذرا کے لیے اس گھر میں .... کھانے کو بھی بچا کھچا ملتا اور کسی چیز کو ہاتھ لگا لیتی تو ہاتھ سے جھپٹ لی جاتی۔ دکھ ہی دکھ دل بھر آیا اس کا .... مگر مجبور اتنی تھی کسی کو ایک لفظ بھی نہ کہہ سکتی تھی۔

"اس کے باپ کی کمائی نہیں جو دونوں ہاتھوں سے اڑائی جائے۔ بڑی جان جوکھوں سے کمایا جاتا ہے.... بڑی محنت مشقت کا پیسہ ہے جو دوسروں کی اولاد پر لٹانے کے لیے نہیں۔ اس مردود کو چھوڑو اور میرے سر میں مالش کرو۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔" وہ عجو کے ہاتھ سے پرے دھکیلتے ہوئے بولیں۔

"لگاتی ہوں اماں بس تھوڑی سے دیر۔ کنگھی کر کے چوٹی باندھ دوں عذرا کی۔"

"تم نے سنا نہیں کیا کہہ رہی ہوں میں۔ آگے سے زبان چلا رہی ہو۔ چل پرے ہٹ نامراد۔" انہوں نے اسے ایک دو ہتڑ جڑا۔

اسے لگا اس کے ننھے وجود پر جیسے کسی نے گرم تھالی لگا دی ہو۔ وہ خاموشی سے ایک سائیڈ پر ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں دھند اتر آئی۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں کی دہلیز بھیگ رہی تھی۔ وہ کتنی دیر تک تو بال کر پر بکھرائے بیٹھی رہی اور پھر آنسو پیتی ہوئی چاچی مہراں کی طرف آ گئی۔ چاچی نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

"کیا ہوا عجو بٹی.... یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

چاچی مہراں کو دیکھتے ہی وہ رو پڑی اور روتے ہوئے ساری بات بتا دی۔ انہوں نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور سینے سے لگا کر اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"نہ رو میری بچی.... میں بناتی ہوں تیرے بال اور چوٹی باندھتی ہوں۔"

انہوں نے اسے چپ کراتے ہوئے کہا اور اس کا دھیان بٹانے کو کہانی سنانے لگیں۔

اور اس کے بالوں میں کنگھی کر کے چوٹیا باندھ دی۔ اور پھر اس کے بعد جب تک وہ گاؤں میں رہیں۔ اس کے سر میں تیل لگانا اور چوٹی بنانا ان کے ذمہ داری بن گئی تھی۔



محبت اور اس کا گھر آمنے سامنے تھا۔ گھر کے سامنے مٹی کے تھڑے بنے ہوئے تھے.... سو اپنے گھر سے نکلو اور چبوترے پر چلتے چلتے محبت کا گھر آ جاتا تھا۔

محبت کے گھر میں ایک چاچی مہراں اور ایک محبت۔ محبت کے ابا جب وہ دو سال کا تھا جب خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ چاچی مہراں کی دو ایکڑ زمین تھی جس سے گزر بسر ہو رہی تھی۔

چاچی مہراں محبت کو دیسی گھی کے پراٹھے بنا کر دیتیں اور اس کی خوراک کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اس لیے وہ صحت مند اور اپنی عمر سے بڑا نظر آتا تھا اور دوپہر کو وہ چاچی مہراں کے گھر ہی محبت کے ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ اور اس وقت کا کھانا ہی وہ پیٹ بھر کر کھاتی تھی۔ اپنے گھر میں تو سب کا بچا کھچا ہی ملتا تھا اور پراٹھوں کی تو صرف خوشبو ہی سونگھتی تھی۔

وہ اس کھلی فضا میں خود کو آزاد محسوس کرتی۔ جدھر جی چاہتا بیٹھ جاتی' جو جی چاہتا کرتی۔ ادھر سے ادھر اٹھلائی اٹھلائی پھرتی۔ کچے آنگن کا یہ گھر اسے شروع سے ہی بہت اچھا لگتا تھا۔ پھر جانے کیسے۔ کب اسے اس گھر سے اس آنگن سے لگاؤ پیدا ہونے لگا۔ ان دونوں کے دلوں میں محبت پروان چڑھتی رہی۔ اس گھر میں محبت کی محبت نے اس کے دل میں نومولود بچے کی طرح جنم لیا.... اس گھر کے مکینوں کی طرح' اس گھر کے در و دیوار بھی اس کے عادی تھے۔ عجو نے اس گھر میں بے پناہ چاہت اور خوشی دیکھی تھی۔ جب وہ محبت کے ساتھ ہوتی تو وہ لمحے اس کی "محبت" کا تاج محل ثابت ہوتے۔

"م.... ح.... ب.... ت" وہ اپنا لکھا ہوا سبق یاد کرتے ہوئے سو جاتی اور جب رات میں اس کی آنکھ کھل جاتی تو وہ انگلی سے ننھی ہتھیلی پر اپنا سبق لکھنے لگتی۔

"م۔۔۔ح۔۔۔ب۔۔۔ت"

سوچیں جو موسموں کی طرح بدلتی رہتی ہیں۔۔۔ لیکن اس کی سوچوں کا رخ بہتے پانی کی طرح ایک ہی سمت میں محبت کی طرف چلتا رہتا۔



چاچی مہراں بیمار رہنے لگی تھیں۔ نجانے کیا تکلیف تھی دن بدن کمزور ہوتی جارہی تھیں۔ ان کا بخار ٹوٹ رہا تھا نہ ہی کسی دوائی سے آرام آرہا تھا۔ وہ ان کو کھانستے دیکھتی تو پریشان ہو جاتی۔ اور اپنے چھوٹے سے ذہن کے مطابق ان کی تیمارداری کرتی۔

"چاچی آپ رو رہی ہیں۔۔۔؟" کھانسی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تو وہ یہ ہی سمجھتی کہ وہ رو رہی ہیں۔

"نہیں بیٹا۔۔۔ کھانسی کی وجہ سے۔۔۔" وہ کھانستے کھانستے کہتیں۔

"چاچی آپ لیٹ جائیں۔۔۔ میں دباتی ہوں کھانسی رک جائے گی۔۔۔" وہ ان کا سینہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ہلکا ہلکا دباتی اور مالش کرنے لگتی۔۔۔ تو ان کے ہونٹوں پر ہنسی آجاتی اور وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتیں۔ محبت بھی ان کی وجہ سے پریشان رہنے لگا تھا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کیا جائے اور جب ان کے منہ سے خون آیا تو محبت کے ساتھ وہ بھی رو دی تھی اور محبت کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرا رہے تھے! تب گاؤں والوں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ لاہور جا کر اپنا علاج کروائیں۔ انہوں نے محبت سے خط لکھوایا اور وہاں کو پوسٹ کردیا۔ خط کے کچھ دن بعد محبت کی نانی چلی آئیں اور انہوں نے چاچی مہراں کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ کیونکہ وہ سوکھ کر لکڑی بن گئی تھیں اور یہاں رہ کر ان کا علاج ممکن نہیں تھا۔ عجو نے سنا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایک وہ ہی گھر تو اس کا تھا۔ وہ دونوں ہی تو اس کے ہمدرد تھے۔

اس کا' چاچی مہراں اور محبت کا ساتھ چار سال تک رہا۔ مگر یہ چار سال چار صدیوں پر محیط تھے۔ ان بیتوں چار سالوں میں ان کے ساتھ سے اس نے زندگی کے ہر لمحے سے خوشیاں کشید کی تھیں۔ اس گھر میں اس کو مکمل تحفظ تھا۔ چاچی نے اسے سینے سے لگا کر سمجھایا تھا اور خوب پیار کیا تھا۔۔۔ وہ چاچی مہراں کو دیکھتی' کبھی محبت کو اور کبھی گھر کو۔۔۔ اس کی آنکھوں میں دھند اتر رہی تھی جسے وہ بار بار ہاتھ کی پشت سے صاف کرتی۔ مگر یہ سیلاب تھمنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ اس کا دل کٹا جا رہا تھا۔ اس کا دوست اس کا ساتھی محبت اسے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ جب وہ اس گاؤں میں آئی تھی تو تین سال کی تھی اور محبت سات سال کا اور چار سال ان کا ساتھ رہا تھا۔ اب وہ سات سال کی ہوگئی تھی اور محبت گیارہ سال کا۔

چاچی مہراں کو پھیپھڑوں کی بیماری ہوگئی تھی اور اب خون تھوکنے لگی تھیں۔

"چاچی آپ کب واپس آئیں گی۔۔۔؟" اس نے روتے ہوئے ان سے پوچھا۔

بہت جلدی پتر۔۔۔" محبت کی نانی نے اسے جواب دیا تھا۔

"میں آپ کے لیے دعا کروں گی چاچی اللہ تعالیٰ جلدی سے آپ کو ٹھیک کردیں گے۔"

"ہاں بیٹا تم ضرور دعا کیا کرنا۔۔۔ میں ٹھیک ہوجاؤں گی ان شاء اللہ اور جلدی ہی اپنی بیٹی کے پاس آؤں گی۔"

انہوں نے اس کے چہرے پر آئے بالوں کو کانوں کے پیچھے کرتے ہوئے پیار سے کہا وہ لوگ جانے کو تیار کھڑے تھے۔ وہ خاموشی سے محبت کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔۔۔ اب وہ دونوں خاموش تھے۔ عذرا کی آنکھیں بھیگی جارہی تھیں۔۔۔ وہ اپنی سبز آنکھیں جھپکا جھپکا کر آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں ناکام رہی۔ اس کی چھوٹی مگر تیکھی ناک انگارے کی طرح دہک رہی تھی۔ اور اس کی ناک پر ٹھہرا آنسو کا قطرہ موتی کی طرح چمک رہا تھا۔

"عجو کبھی رونا نہیں۔ ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے۔ میں کبھی تمہیں بھولوں گا نہیں۔" اس نے عجو

کی آنکھ سے آنسو کے قطرے انگلیوں کے پوروں میں جذب کرلیے۔۔۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"ہم جارہے ہیں تم بھی اپنے گھر جاؤ اور کبھی گھر سے اکیلے نہیں نکلنا اور کسی کے ساتھ کہیں نہیں جانا ..." وہ اس کا ہاتھ تھامے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے چل رہی تھی۔ اس پل وہ دہکتے ہوئے کوئلوں پر چل رہی تھی۔ اس کے دل سے فریاد نکل رہی تھی۔

"کاش یہ گھڑی ٹل جائے' کاش محبت کا فیصلہ بدل جائے۔۔۔ وہ اسے چھوڑ کر کبھی کہیں نہ جائے۔۔۔"

"محبت چھپتی چھپتی پیر چک دیر ہوندی پیی اے۔" نانی نے اسے ڈھیلے قدم اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

عذرا کا دل اندر سے کانپ اٹھا۔ اس نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔۔۔ وہ یوں ہی اس کا ہاتھ تھامے گھر سے نکل آیا اور چاچی مہراں ان کے پیچھے۔ اس کی نانی نے دروازے کو تالا لگایا اور وہ تینوں موڑ پر کھڑے تانگے میں بیٹھ گئے۔

جدائی کا لمحہ اس پل ان کے بیچ آکھڑا ہوا تھا۔

عذرا کو لگا یہ شام محبت کے ساتھ اس کی آخری شام تھی۔ آخری ملاقات تھی اور وقت اس کے ہاتھ سے ہوا کی طرح نکل گیا تھا۔

"میں اکیلی کیسے رہوں گی تمہارے بغیر محبت۔۔۔؟" اس کی آنکھوں میں سیلاب اتر آیا۔ واپس آکر وہ نیم کے پیڑ کے نیچے چارپائی پر لیٹ گئی۔ وہ بے انتہا خاموش تھی۔ بس سانسوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

اس گھر میں سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ زندگی کی ساری گردش تھم گئی تھی۔ اور عجو کی زندگی ٹھہرے ہوئے پانی کی سی ہو گئی تھی۔



اگلی صبح وہ اٹھی اور چپ چاپ چارپائی پر پیر لٹکا کر بیٹھی رہی۔ اسے ناشتے کی جلدی تھی نہ کہیں جانے کی۔ وہ بولائی بولائی سی صحن میں پھرتی رہی۔ اس کے اندر عجیب سی تھکاوٹ اتر آئی تھی۔ وہ مرے مرے قدموں سے دروازے سے باہر نکل آئی۔۔۔ تو ایک دم کانوں میں محبت کی آواز گونجی۔

"گھر سے کبھی اکیلی کہیں نہ جانا عجو۔" اس کی آنکھ سے اوس قطرہ قطرہ ٹپک رہی تھی۔ ٹپ۔۔۔ ٹپ۔۔۔ ٹپ۔ وہ نڈھال سی دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھ گئی۔ سامنے دیکھا تو دروازے پر بڑا سا تالا پڑا دیکھ کر دل ایک بار پھر اداسی کا شکار ہو گیا تب اسے محسوس ہوا زندگی تو اس دروازے کے پار ہی تھی۔

کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں کہ آپ کا ہر رشتہ ان کے ساتھ ہی جڑا ہوتا ہے اور اتنی شدت سے یاد آتے ہیں کہ لگتا ہے ان دونوں انسانوں کے علاوہ کوئی ان کا اپنا نہیں۔ کئی دن تک تو اسے یہ ہی لگتا رہا وہ واپس آجائے گا اور آکر کہے گا۔

"عجو تم اداس تھی نا میں واپس آگیا ہوں۔ میرا دل بھی نہیں لگا وہاں۔" یہ اس کا وہم تھا۔ اسے نہ آنا تھا اور نہ ہی وہ آیا۔

محبت کے جانے کے بعد اس کی زندگی پھر سے تنہائیوں کے سپرد ہو گئی تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق چلتا رہا۔ بس اک کمی تھی تو چاچی مہراں اور محبت کی۔ اسے محبت کی کڑکانے والی قلم اور اس سے چھڑکی جانے والی سیاہی کی بوندیں یاد آتیں جن سے وہ اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر "م" لکھا کرتی تھی۔

اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ عجو بے حد تھکاوٹ اور بوریت محسوس کرتی۔ شاید اس کو محبت کہتے ہیں۔ لیکن اس کا کچا اور ننھا ذہن اس کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتا تھا۔ وہ راستہ بھولے ہوئے مسافر کی طرح کچے آنگن میں بولائی بولائی پھرتی رہتی۔ پھر جیسے کوئلوں پر چلتی ہوئی چارپائی پر آکر لیٹ جاتی۔

تب دادی ماں کو آواز دے کر کہتیں۔

"آسیہ محبت کے جانے سے تیری بٹی کے سیر سپاٹے ختم ہو گئے ہیں۔۔۔ پہلے سارا دن مٹرگشت کرتی پھرتی تھی اور اب مہارانی اس تاج محل میں آرام کرتی ہے۔۔۔ اسے گھر کے کام کاج سکھاؤ ورنہ تیری طرح

نکمی ہی رہے گی۔۔۔ تیرے اس نکمے پن نے ہی تجھے دوسرے شوہر کا منہ دکھایا ہے! عقل کے ناخن لے اسے یہ دن نہ دیکھنے پڑیں۔ تجھے برا لگ رہا ہو گا لیکن تیرے بھلے کو کہتی ہوں۔ تو ماں ہے تکلیف تجھے ہی ہو گی۔۔۔ مگر کیا ساری زندگی تو دکھ ہی دیکھتی رہے گی۔۔۔؟"

آسیہ کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ آنکھوں میں پتھریلی ریت بھر گئی۔ اس کے کپکپاتے لبوں سے نکلا۔

"اللہ نہ کرے اماں۔ میری بچی کو گرم ہوا بھی چھوئے۔ ابھی بہت چھوٹی سی ہے سیکھ لے گی! عمر پڑی ہے۔ اس بے چاری نے کون سا سکھ دیکھا ہے جو یہ کھیل کود کے دن بھی کام کاج میں گزار دے۔ یہ ہی دن تو بے فکری کے ہوتے ہیں۔" وہ سوچتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔۔۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ منہ ہاتھ دھونے کے خیال سے آگے بڑھیں۔ مگر اس سے پہلے ہی دادی پھر سے بولیں۔

"اس کو چھوڑ یہ منہ ہاتھ دھو لے گی چائے بنا۔۔۔ تیرے ابا نے دوائی کھانی ہے۔۔۔ اس کے ہانڈی روٹی کی تیاری کر احمد یار اور اللہ یار آتے ہی ہوں گے۔ اور بچوں کو صاف ستھرا کر دے۔ مرد صبح کا نکلا شام کو گھر آتا ہے اور جب بچے صاف نہ ہوں تو آتے اس کا مزاج بگڑ جاتا ہے۔ اور نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔ تجھ سے بہتر کون جانتا ہے اس بات کو۔۔۔ دو شوہروں کے منہ دیکھ چکی ہے۔" ساس کی بات آسیہ کے دل پر لگی۔۔۔ وہ لبوں کو بھینچتی ہوئی عذرا کا ہاتھ چھوڑ کر اسے منہ ہاتھ دھونے کی ہدایت کرتے ہوئے چولہے کی طرف آ گئی۔



وہ چپ چاپ خاموش گھر کے دروازے کی سیڑھی پر بیٹھ بند دروازے پر تالا لگا دیکھتی تو سوچتی "یہ دروازہ کبھی کھلے گا؟ محبت کبھی واپس لوٹ کر آئے گا؟"

آج بھی وہ اسے یاد کرتی تو وہ اسے وہیں نظر آتا مٹی کچے چبوترے پر بوری بچھائے آلتی پالتی مار کر بیٹھا دوات میں قلم ڈبو ڈبو کر تختی لکھتا ہوا۔ اس گھر کے اندر تو اس کی کل کائنات تھی۔ ہر انسان اپنی ذات میں انجمن ہوتا ہے۔ اسی طرح عذرا کی بھی ایک الگ کائنات تھی۔ مکمل اور ثابت۔۔۔ اور اس کائنات کے دو ہی کردار تھے۔ "محبت اور عذرا۔"

مگر اس کے جانے کے بعد۔۔۔ اب بھی وہ اپنی یادوں کے ساتھ اس کائنات میں موجود تھا۔ اس کے اندر برف گرتی رہتی' دھیرے دھیرے یہ برف چٹان بن گئی!

محبت کے ساتھ جو چند برس اس نے گزارے اصل میں وہ ہی اس کی زندگی تھے۔ اگر وہ شمار کرنے بیٹھ جاتی تو ساری زندگی گزر جاتی۔

وقت کے ساتھ ساتھ بھرے پورے کنبے کے افراد کم ہونے لگے۔ پہلے دادا خالق حقیقی سے جا ملے۔ دادی ان کی جدائی برداشت نہ کرپائیں ان کے چھ ماہ بعد وہ بھی چل بسیں۔ چاچا الگ گھر میں شفٹ ہو گئے۔ دونوں پھپھیاں جو سسرال میں کم اور میکے میں زیادہ دھرنا مارے بیٹھی رہتی تھیں اپنے گھروں کو روانہ ہو گئیں۔

اس کے تینوں سوتیلے بھائی اسکول سے بھاگے تو ابا نے ان کو ورکشاپ میں ڈال دیا۔۔۔ لیکن وہاں بھی چوری سے باز نہ آئے تو مالک نے انہیں نکال دیا۔۔۔ وہ محنت مزدوری کے بجائے چوری چکاری پر دھیان دیتے۔

وہ تینوں مختلف سمتوں میں سفر کرنے لگے۔ گھر کو تو بھول ہی گئے تھے۔ کبھی کبھار چکر لگا لیتے تو باپ سے الجھ پڑتے۔۔۔ زمانے کا کون سا عیب تھا جو ان میں نہیں تھا۔ ابا ان کا دکھ سینے سے لگائے بیمار رہنے لگے۔۔۔ اور ماں میں بھی وہ پہلا سا دم خم نہ رہا تھا۔ گھٹنوں اور جوڑوں کا دردان کو لے کر بیٹھ گیا۔۔۔ اور وہ بہن بھائی جو اس گھر میں بھائی کی کمائی پر عیش کرتے تھے۔ اب بھائی سے نظریں چرانے لگے۔ کہیں ان کی مدد نہ کرنی پڑ جائے یا وہ کچھ رقم ادھار نہ مانگ لیں۔ کیونکہ ان کے حالات کچھ خراب رہنے لگے تھے۔ اس کی وجہ برابر کام پر نہ جانا تھا۔

گھر کی ساری ذمے داری عذرا کے کاندھوں پر آ پڑی تھی۔ سارا وقت کام کاج میں لگی رہتی۔

فرصت کے لمحوں میں نیم کے پیڑ کے نیچے چارپائی پر لیٹ کر محبت کو یاد کیا کرتی۔

تبدیلی بہت آہستہ آہستہ آئی تھی۔ غیر محسوس طور پر آئی تھی ایسی کہ وہ خود بھی پوری طرح اسے سمجھ نہ پائی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ وقت گزر جاتا ہے وقت کا کرشمہ یہ ہی ہے کہ گزر جاتا ہے۔

نیم کی ٹھنڈی چھاؤں اور سرد ہوا میں بیٹھ کر وہ محبت کو یاد آتی اور نیلے آسمان پر نظریں جما کر اسے سوچا کرتی۔

اس نے ان یادوں کو ایک بار پھر سے پلو میں باندھ کر مضبوط گرہ لگالی تھی۔ ایک ایسی گرہ جو کبھی نہ کھل سکے۔



آسیہ آلو کاٹ رہی تھیں کہ احمد یار کی بات پر چھری آلو نہیں انگلی کاٹ گئی۔ مگر وہ اس تکلیف سے بے خبر احمد یار کا چہرہ تکے جا رہی تھی... کیا خوب تیر چلایا تھا ان کے دل پر۔ جو شخص ان کی بیٹی کا وجود گھر میں برداشت نہ کرتا ہو وہ ہی اسے اپنے گھر میں مستقل رکھنے کی بات کرے۔ یہ ناممکن بات تھی۔

مگر اس سب کے پیچھے ان کی غرض چھپی تھی... اپنے چور بیٹے کے لیے انہیں عذرا کا ساتھ چاہیے تھا... اس لیے کہ وہ ان کے احسانوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی... ان کی بات سے اختلاف نہیں کر سکتی تھی... اور ماں کی طرح گونگی بہری بن کر زندگی گزار دیتی۔

مگر آسیہ کے لیے یہ بات قابل قبول نہیں تھی کہ اس کی بیٹی عذرا کسی چور' بدکردار شخص سے بیاہی جائے... اور ساری زندگی حالات کی چکی میں پستے ہوئے گزار دے جیسا کہ اس گھر میں آنے کے بعد اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اچھا کھانے کو ملا تھا اور نہ ہی کبھی اچھا پہنے کو۔

"میں چاہتا ہوں عذرا بیٹی کا بیاہ اسلم سے ہو جائے۔" آسیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کو دیکھتی رہ گئی۔ آج ان کی زبان پر بیٹی کا لفظ آگیا تھا۔

"اسلم کے لیے..." آسیہ کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"ہاں..." انہوں نے پرسوچ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"عذرا بہت صبر والی بیٹی ہے۔ وہ ہی اسلم کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہے۔" اپنی غرض کے لیے... آج وہ بیٹی ہو گئی تھی جبکہ انہیں ہمیشہ اس کا وجود کھٹکتا تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے..." اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ خون صرف انگلی سے ہی نہیں ان کے دل سے بھی رس رہا تھا۔

"کیوں' کیوں ممکن نہیں ہے...؟ عذرا اور اسلم کا کون سا خون کا رشتہ ہے۔ وہ تمہارے پہلے شوہر کی بیٹی ہے۔ نکاح جائز ہے دونوں کا۔"

وہ خاموشی سے ان کا منہ دیکھ رہی تھی... کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں اس کے پاس۔

"ویسے تو مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ عذرا کو بیٹی کی طرح پالا ہے میں نے۔ میں اس کا سرپرست ہوں۔ جہاں چاہے شادی کرنے کا حق رکھتا ہوں۔"

"سرپرست..." آسیہ نے سرگوشی کی۔ ساری زندگی وہ ان کی بچی کچھی کھاتی رہی ہے اب یہ احسان کر دیا بیٹوں کی طرح پالا ہے... جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے۔" پھر وہ بولی۔

"میں اس کی ماں ہوں... عذرا میری بیٹی ہے۔ میں اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق بھی رکھتی ہوں اور اختیار بھی ہے مجھے..."

"یہ بھول رہی ہو تم وہ سترہ سال سے میرا کھا رہی ہے... اپنے گھر کی چھت دی ہوئی ہے... اور اب مستقل ٹھکانا بنانا چاہتا ہوں اس کا۔ کل کو کسی اور کے گھر جائے گی کون جانے کیسا رکھے۔ یہاں کم از کم یہ ڈر تو نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر ماں بیٹی ایک ساتھ ایک گھر میں رہو گی۔ بیٹی کو دور بھیجنے کا دکھ نہیں ہو گا۔ ابھی اسلم کبھی کبھار آتا ہے شادی کے بعد اس گھر سے جائے گا بھی نہیں۔"

"اسلم کا کردار ٹھیک نہیں ہے... میری بیٹی نے

ساری زندگی کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ اب پھر اسے دکھوں کی بھٹی میں جھونک دوں۔ زندگی پر' زندگی کی خوشیوں پر اس کا بھی حق ہے۔" آسیہ نے دوٹوک الفاظ میں جواب دے دیا۔

"تو تمہاری طرف سے انکار ہے...."

"ظاہر ہے...." ساری زندگی وہ اپنے اور بیٹی کے حق کے لیے خاموش رہی تھی کبھی کسی زیادتی پر کچھ نہ بولی... مگر اس کی زندگی کے اتنے اہم فیصلے پر وہ خاموش نہیں رہ سکتی تھی... خاموشی کا مطلب تھا... عذرا کو جلتے تندور میں پھینکنا

"تم اپنی اوقات بھول رہی ہو.... وہ وقت بھول گئی جو بھائیوں پر دو وقت کی روٹی بھاری ہو گئی تھی.... کہ میرے سر پر بہن' بھانجی کی بلا ڈال دی۔ یہ میں ہی تھا جس نے اس وقت میں ماں' بیٹی کو سہارا دیا تھا.... احسان فراموش بھول رہی ہو وہ وقت...."

آسیہ کی آنکھوں میں گہری پرچھائیاں اتر آئیں... اور لبوں کو بھینچ کر رہ گئی۔

"اگر میرے بیٹے کا ساتھ منظور نہیں تو.... تمہارا کوئی جواز نہیں بنتا اس گھر میں رہنے کا۔ ایک بار پھر پیشانی پر طلاق کا داغ سجا کر اس گھر سے نکلو گی۔ اس عمر میں یہ طوق گلے میں ڈال کر نکلو گی تو لوگ وجہ پوچھیں گے۔"

وہ ان کے منہ سے "طلاق" کا لفظ سن کر سناٹے میں رہ گئی... احمد یار سے ویسے تو کسی بھی بات کی توقع کی جا سکتی تھی... لیکن اس کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں.... کہ وہ اس بندھن کو توڑ بھی سکتا ہے۔

سچ کہتے ہیں مرد کا کوئی اعتبار نہیں۔ زندگی کے کسی بھی حصے میں عورت کو آزادی کا پروانہ تھمانے میں دیر نہیں کرتا۔ اپنے اس حق کا استعمال کسی بھی وقت کر سکتا ہے۔ وہ فراخ دل نہیں تھے کہ انکار برداشت کر سکتے... سو انہوں نے آخری حربہ استعمال کیا تھا۔

"اگر تمہیں اس گھر سے نکلنے کا ڈر ہو تو.... سوچ سمجھ لو۔ کل تک کا وقت ہے.... اگر راضی نہیں ہو گی تو یہ اچھی طرح سن لو۔ اس گھر میں تم دونوں کا ٹھکانا نہیں ہے۔" اور یہیں آ کر آسیہ نے بے بسی محسوس کر رہی تھیں۔ مگر عذرا کو دیکھا تو دل کٹ کر رہ گیا.... وہ ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں لیکن حالات ان کے بس سے باہر ہو گئے تھے۔ لیکن انہوں نے ہار تسلیم نہیں کی تھی۔

"ماں.... ہاں کر دیں آپ...." اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں.... اور آنکھوں میں محبت کا عکس دھندلا گیا تھا۔

"نہیں.... ایسا نہیں ہو گا...." وہ اسے حوصلہ دینے لگی... بلکہ اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔

"تو اس عمر میں کہاں جائیں گی....؟"

"پتا نہیں...." اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اس ٹھکانے کو نہ کھوئیں۔ جب اتنی زندگی گزر گئی ہے تو اور بھی گزر جائے گی.... اگر میری وجہ سے آپ کا گھر بسا رہے تو ایک نہیں ایسی سو زندگیاں آپ پر قربان۔"

"عجو میری بیٹی.... نہیں۔" اس نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور رو پڑی۔ وہ شدت سے دعا مانگنے لگی.... کوئی ایسا راستہ نکل آئے.... کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے.... گھر میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ جیسے کسی طوفان کے آنے سے پہلے گہری خاموشی ہوتی ہے احمد یار کل تک خاموشی سے آسیہ کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں امید تھی کہ آسیہ اسلم کے حق میں فیصلہ کرے گی۔

عجو کو شدت سے محبت یاد آیا... کاش وہ کہیں سے آ جائے اسے اس دوزخ سے نکال لے جائے....

اس کی دنیا میں بچپن سے لے کر اب تک دکھ ہی دکھ تھے۔ ایک بار پھر اسے دکھوں کے حوالے سونپا جا رہا تھا۔ اماں کے سکون' ان کے گھر کی خاطر یہ سب بھی ٹھیک تھا.... وہ اپنی زندگی کے' اپنے گھر کے سارے دکھ سہہ لے گی۔ کاش اماں سکون سے فیصلہ کر کے مطمئن ہو جائیں۔ وہ ماں کی پریشانی ختم کرنا چاہتی تھی۔ ایک بار پھر سے نئے امتحان میں نہیں ڈال سکتی

تھی ان کو۔



رات سوچوں میں گزر گئی۔ اگلی صبح ان کے لیے قیامت کی گھڑی تھی.... فیصلے کا دن اسلم کے حق میں یا ان کے خلاف۔

جیسے جیسے دن ڈھلتا جارہا تھا آسیہ کی روح فنا ہو رہی تھی۔ انہیں احمد یار سے رحم کی توقع نہیں تھی۔ اوپر والے کو ہی ان پر رحم آگیا تھا۔

شام ہو گئی ابا گھر نہیں آئے۔ جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا ان کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ کام سے واپس آرہے تھے کہ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔

وہ بری طرح زخمی ہو گئے۔ لوگوں نے انہیں ہسپتال پہنچادیا۔

اور ان ہی میں سے ایک آدمی اطلاع دے گیا۔

آسیہ کے لیے تو ایک نئی پریشانی تھی۔ وہ ایک بار اجڑنے کا دکھ جھیل چکی تھی.... وہ یہ بھول گئی تھی کہ ساری پریشانی اسی شخص کی بخشی ہوئی تھی.... آنچل پھیلا کر ان کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

اس کا دل شاخ پر تنہا پتے کی طرح کانپتا تھا.... وہ چپ چاپ ماں کو دیکھنے لگی۔ جو اب ہسپتال جانے کے لیے کھڑی تھی۔ وہ پریشان تھی اسے اکیلا کس کے پاس چھوڑ کر جائے۔

آسیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بھاگ بھری کے گھر لے گئی۔

"بھاگ بھری عذرا کے ابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے.... میں ہسپتال جارہی ہوں۔ میں جب تک واپس نہیں آجاتی عذرا تمہارے پاس رہے گی۔ گھر پر اکیلے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تم جانتی ہو.... بچے کس کردار کے ہیں۔"

"ہاں ہاں اچھی طرح جانتی ہوں.... تم بے فکر ہو کر جاؤ.... عذرا میری بیٹی ہے میں اس کا خیال رکھوں گی.... اللہ تمہارے سہاگ کی حفاظت کرے۔ احمد یار جیسا بھی ہو ہے تمہارے سر کی چھت ہے اسی کے دم سے اس گھر میں ہو۔"

آسیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ چادر کے پلو سے پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس نے خاموش نگاہوں سے بھاگ بھری کو دیکھا۔ وہ یہ ہی سمجھی وہ ابا کے لیے پریشان ہے۔ اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔

"تم پریشان نہ ہو.... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جلد تمہارے ابا صحت یاب ہو کر گھر آجائیں گے۔" وہ بس خاموشی سے اس کی سنتی رہی بولی کچھ نہیں۔ سب لوگ جانتے تھے۔ احمد یار اور اس کے گھر والوں کا سلوک اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ سب لوگوں کو اس پر ترس تو بہت آتا تھا مگر اس کے لیے کر کچھ نہیں سکتے تھے۔

ماں اس روز ہسپتال میں ہی رہی تھی۔ اللہ یار کو بھائی کے ایکسیڈنٹ کا پتا چل گیا تھا مگر اس کا جا کر حال تک نہ پوچھا۔ اگلی صبح ماں ہسپتال سے آگئی۔ بھاگ بھری کے گھر والا احمد یار کے پاس چلا گیا اور پھر جتنے دن ابا ہسپتال میں رہے وہ ہی ان کے پاس رہا اور دیکھ بھال کی۔ ماں تو دن میں ایک چکر لگالیا کرتی تھی۔ لیکن ابا کے تینوں بیٹوں میں سے کسی ایک کو بھی ان کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی۔ ایک ہفتہ ہاسپٹل میں رہنے کے بعد ابا گھر آگئے۔ ان کی ٹانگوں میں شدید چوٹیں آئی تھیں جس کے باعث وہ فی الحال چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے.... اور یہ ہی وجہ ان کے غصے کا گراف ہائی کر جاتی۔ ان کے مستقل گھر میں رہنے سے عذرا کے لیے زندگی اور بھی عذاب ہو گئی تھی۔ وہ بات بات پر غصہ کرتے اور اسے گالیاں دیتے.... اس کے باوجود وہ ماں کے ساتھ ان کی خدمت میں لگی رہتی۔

ابا کے گھر بیٹھنے کی وجہ سے گھر میں تنگدستی کا دور شروع ہو گیا.... آسیہ نے کپڑے سلائی کرنے کا سوچا.... اور ساتھ میں عذرا کو بھی لگالیا.... لیکن کپڑوں کی سلائی سے بھلا ابا کی بیماری اور گھر کا خرچا کہاں پورا ہوتا تھا۔

کوئی ایک ماہ کے بعد جمال نے گھر کا چکر لگایا تو اسے باپ کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا پتا چلا....

"ایسی اولاد ہوتی ہے جسے باپ کے جینے مرنے سے کوئی غرض نہیں۔ تم لوگوں کو پالنے کے لیے میں نے دن رات ایک کردیے تھے اور تم تینوں خبر تک نہیں لیتے۔" ابا کو سانس چڑھ گیا تو الفاظ بھی زبان پر ہی دم توڑ گئے۔

"تو ابا کیا ہوا... سب ہی ماں پیو اپنی اولاد کو پالنے کے لیے دن رات ایک کرتے ہیں... تونے کون سا انوکھا کام کیا ہے جو احسان جتا رہا ہے ہم پر..." جمال نے انتہائی لوفرانہ انداز میں باپ کو جواب دیا۔

"صحیح کہہ رہا ہے تو... خود غرض اولاد سے یہ امید کی جاسکتی ہے... تمہارے جیسی اولاد کے لیے ہی لوگ دعا کرتے ہیں۔ کاش پیدا ہوتے ہی مرجاتی۔" ابا نے تلخ اور نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں تو ماردیتا تو... کس نے روکا تھا۔ زہر دے دیتا، یا کسی نہر میں پھینک دیتا یا پھر گلا دبا دیتا۔ کم از کم یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا تجھے... ہم تو اپنا کماتے ہیں اپنا کھاتے ہیں۔ بڑی عیش کی زندگی ہے۔ کلادم کوئی غم نہ فکر۔" جمال مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا مسکرا کر بولا۔

"دفع ہوجا میرے گھر، میری نظروں کے سامنے سے..." ابا نے چیخ کر کہا۔

"چلا جاؤں گا ابا... کچھ دیر بیٹھنے تو دے..." اس نے ابا کی چیخ و پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے تو یوں ہی اس کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ آخر وہ غیر کی اولاد ہی تیرے کام آئی ہے... تجھے ہر وقت اس کا وجود کھٹکتا تھا۔ دو روٹی بھاری لگتی تھی۔ کتنا برا بھلا بولتا تھا تو اس کو... گالیاں دیتا تھا... اور ہمیشہ بچا کھچا ہی کھانے کو دیا... پر دیکھ وہ ہی تیرے کام آرہی ہے... کیسے کپڑے سلائی کررہی ہے۔ اس سے جو پیسے آتے ہوں گے وہ تیری ہی دوائی پر خرچ ہوتے ہوں گے۔" اس نے عذرا کو سامنے کپڑے سلائی کرتے ہوئے دیکھ کر کہا اور ساتھ ہی ساتھ ابا کو ان کا ماضی یاد دلادیا کہ وہ کس طرح اس کے ساتھ ظلم کرتا تھا۔

"ہاں تو کوئی احسان نہیں کررہی مجھ پر... سترہ سال تک میں نے بھی کھلایا ہے اسے۔ اپنے گھر کی چھت اور تحفظ دیا ہے... یہ احسان کیا کم ہیں میرے... تجھے اس کا خیال آگیا میرا نہیں..." ابا ایک بار پھر دھاڑے...

"ابا تو کچھ بھی کہہ بات سچی ہے اور میں کہے بغیر نہیں رہوں گا... تونے ناانصافی کی حد کردی تھی اس کے ساتھ... لیکن اچھے خون کی یہ ہی نشانی ہوتی ہے... جو تیرے لیے محنت کررہی ہے ورنہ تو اس کی ذمے داری نہیں... اسی لیے کہتے ہیں نا بڑھاپے میں بیٹی ہی ماں پیو دے کام آتی ہے... چل تو شانت رہ۔ اپنی اولاد نہ سہی غیر کی اولاد تو تیرے کام آرہی ہے۔"

وہ پیلے پیلے دانت نکالتے ہوئے ایک بار پھر باپ پر چوٹ کرگیا۔

"تو میرے گھر سے نکل جا جمال... نہیں تو میں کوئی شے اٹھا کر تیرے سر میں ماردوں گا..." انہوں نے کسی چیز کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ مگر کوئی مطلوبہ چیز نظر نہ آئی...

"اب یہ غصہ چھوڑ دے ابا... اب تو معذور ہوگیا ہے۔ بغیر سہارے تو اپنی جوتی نہیں اٹھا سکتا... چلا ہے مجھے مارنے... اور فکر نہ کر چلا جاؤں گا چند گھڑیوں کے لیے آیا ہوں۔ چائے کے دو گھونٹ پی لینے دے چلا جاؤں گا پھر..." اس کے ساتھ ہی اس نے ماں کو آواز لگائی۔

"ماں ایک پیالی چائے تو پلادے... تو تو سوتیلی تھی ہی اب تو ابا بھی سوتیلا ہوگیا ہے۔" اس نے ہنس کر چارپائی پر ہاتھ مارا۔

"ایسے حرام خوروں کے لیے کوئی چاہ شاہ نہیں ہے میرے گھر میں... تو بس میرے گھر سے نکل جا..." ابا نے بے بسی سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"لے ابا تو خوش ہوجا چلا جاتا ہوں میں... یہ دیکھ تجھے پیسے دے کر جاتا پر جب تیرے گھر میں گرم پانی کی ایک پیالی نہیں ہے میرے لیے تو میں کیوں اپنی محنت کی کمائی تجھ پر لٹاؤں... جانے سے پہلے پھر کہوں گا عذرا کو برا بھلا کہنا چھوڑ دے اب یہ ہی تیرے کام آئے

گی۔"

"تو دفع ہو جا میرے گھر سے نامراد۔" ابا چیخے۔

"اور ہاں تیری ملاقات اسلم اور کمال سے ہو تو ان کو بول دینا ادھر کا رخ نہ کریں۔ مر گیا میں تم تینوں کے لیے۔ مٹی ڈال دیں جیتے جی مجھ پر۔" یہ کہہ کر احمد یار نے رخ موڑ لیا۔ کہنے کو ابا نے کچھ بھی کہہ دیا مگر تھے تو ان کا خون ان کی اولاد۔ آسیہ نے ایک نظر شوہر کے چہرے کو دیکھا۔ جہاں بے بسی ہی بے بسی تھی۔ جوان بیٹوں کا دکھ۔ جوان کا سہارا تھے مگر انہیں بے سہارا کر گئے تھے یہ دکھ دیمک کی طرح انہیں اندر سے چاٹ رہا تھا۔ یہ سچ ہے اولاد کا دکھ ماں باپ کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اس نے کھڑے ہو کر ابا کی بات سنی اور پھر تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔



ابا پہلے سے بھی زیادہ اس کے خلاف ہو گئے تھے کہتے تھے اس کی بد دعا لگی ہے کہ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ پہلے بھی ابا کی آنکھوں میں کنکر کی طرح چبھتی تھی اور اب بھی۔ وہ سات سال کی عمر میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ بھائیوں کے کام کرنے لگی تھی۔ وہ دیکھ بھی رہے ہوتے وہ کام میں الجھی رہتی ہے پھر بھی انہیں یہ ہی لگتا وہ مفت کی روٹی توڑتی ہے! بدلے میں اس کے ڈھیروں کام نظر نہیں آتے تھے! اور اب بھی وہ گھر کے کام کاج کے علاوہ سارا دن کپڑے سلائی کرتی تھی۔ تب ان کی دوائی کے پیسے جمع ہوتے تھے۔ اور ماں کے کپڑوں کی سلائی سے گھر کا خرچا چلتا لیکن اب بھی ابا کو اس کا وجود کھٹکتا تھا بلکہ اور زیادہ کھٹکنے لگا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا ذمہ دار اسے ٹھہراتے اور برملا کہتے تھے۔

"تیری بد دعا نے مجھے محتاج کر دیا کہ بغیر سہارے کے اٹھ سکتا ہوں نہ بیٹھ سکتا ہوں۔ کون سے ظلم کے پہاڑ توڑے تھے تجھ پر۔ کون سی ناانصافی کی تھی تیرے ساتھ۔ تیرا مستقبل ہی تو محفوظ کرنا چاہا تھا۔ اسلم کے ساتھ بیاہ کر گھر میں پڑی رہے گی اور ہو سکتا تھا وہ بھی راہ راست پر آ جاتا۔ کسی دوسرے کا اعتبار تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کون کیسا سلوک کرے تیرے ساتھ اور تجھے دینے کے لیے جہیز بھی چاہیے تھا۔ اسلم سے شادی کی صورت میں کچھ بھی نہ دینا پڑتا۔ مگر تو نے میری نیکی کو بد دعا میں بدل دیا۔ اب دعا کر میرے لیے کہ میں صحت یاب ہو کر پھر سے چلنے پھرنے لگوں۔ یہ بے سہاروں کی زندگی مجھ سے نہیں گزاری جا سکتی۔"

عذرا نے ابا کی بات پر مشین سے سر اٹھا کر ان کو دیکھا تھا کہا کچھ نہیں۔ وہ ہمیشہ ان کے سامنے گونگی بہری ہو جاتی تھی۔ اب بھی ٹکر ٹکر ان کی صورت دیکھ رہی تھی۔ تب اس نے دل میں سوچا۔

"ابا میں نے کوئی بد دعا نہیں کی تیرے لیے۔ میرے رب کو مجھ پر رحم آ گیا تھا۔ اور جب اس کے بندوں کے ظلم حد سے بڑھنے لگیں۔ ان کی رسی دراز ہونے لگے تو وہ رسی کھینچ لیتا ہے۔ شکر کر اس نے تمہیں توبہ کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ معافی مانگ لو اس سے۔ اور اس بیٹے کے لیے مجھے آگ میں دھکیل رہے تھے جس نے پلٹ کر خبر نہ لی۔"

اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھیں۔ اس نے سر جھکا لیا۔ اور مشین چلانے لگی۔

"سلائی پوری ہو گئی ہو تو۔ یہ کپڑے دے کر پیسے لے آ۔ میرے لیے سگریٹ اور پان بھی۔ باقی پیسے لا کر مجھے دے۔"

اس نے خاموشی سے ابا کی بات سنی اور سر اثبات میں ہلا دیا۔

آج تک ابا نے اس کے ہاتھ پر پھوٹی کوڑی نہ دھری تھی اور اب کتنے استحقاق سے اس سے پیسوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد ہی کپڑوں کی سلائی آ گئی۔ اور اس نے خاموشی سے وہ سارے پیسے ان کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔



لاہور پہنچتے پہنچتے ان کو دوپہر ہو گئی۔ جب وہ بھاگ

بھری کے ساتھ ماموں کے گھر پہنچی تو دوپہر کا کھانا لگایا جا رہا تھا۔

مامی اپنے سامنے دو انجان خواتین کو دیکھ کر حیران ہوئیں تو بھاگ بھری نے ان کی حیرانی بھانپتے ہوئے بتایا۔

"یہ آسیہ کی بیٹی عذرا ہے۔۔۔ آسیہ نے اسے یہاں بھیجا ہے۔۔۔ میں اسے یہاں چھوڑنے آئی ہوں۔"

"آسیہ۔۔۔" خالدہ مامی نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں آسیہ۔۔۔ تمہاری نند۔۔۔" بھاگ بھری نے پھر سے کہا۔

"آسیہ نے کہا تھا کہ عذرا کو اس کے ماموں اقبال کے گھر چھوڑ آؤ۔ میں اسے یہاں چھوڑنے کے لیے لے کر آئی ہوں۔۔۔" خالدہ مامی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کو دیکھ رہی تھیں۔ تب عذرا نے ماں کا لکھا ہوا خط مامی کی طرف بڑھا دیا۔ جو ماں نے اقبال ماموں کے لیے دیا تھا تاکہ ان کی الجھن دور ہو جائے۔

"یہ اقبال ماموں کے لیے دیا تھا ماں نے۔۔۔ لیکن آپ پڑھ لیں۔" اس نے مامی کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔۔۔ وہ واضح طور پر مامی کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں دیکھ چکی تھی۔

"اوہ اچھا۔۔۔" مامی نے سرد سے لہجے میں کہا اور اس کاغذ کے ٹکڑے کو مٹھی میں دبا لیا۔ اس میں لکھی چند سطروں کو پڑھنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

"آسیہ ٹھیک ہے۔۔۔ اور اس کا شوہر۔۔۔؟" مامی نے بھاگ بھری سے مروتاً پوچھا۔۔۔ جبکہ ان کا لہجہ بے زاری کی چغلی کھا رہا تھا۔

"بس ٹھیک ہی ہے جب سے اس گھر میں گئی ہے کوئی ایک دم بھی سکون کا سانس نہ لیا اور احمد یار بیمار ہے ایک نئی آزمائش آپڑی ہے اس کے سر پر۔"

"زندگی کا دوسرا نام ہی آزمائش ہے۔۔۔ ہر انسان حالات کی چکی میں پس رہا ہے۔ مسائل زیادہ اور وسائل کم۔۔۔ رو پیٹ کر زندگی کی گاڑی کھینچ رہے ہیں۔" مامی خالدہ نے اپنی بات میں اس بات کا اشارہ دیا تھا کہ ان سے کسی قسم کی مدد کی توقع نہ رکھی جائے۔ وہ دونوں ان کی بات کو اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔ اور بھاگ بھری نے ان کے رویے سے یہ ہی اندازہ لگایا تھا کہ عذرا پر زندگی کے دروازے یہاں بھی تنگ ہی رہیں گے۔۔۔ جس مقصد کے لیے آسیہ نے اس کو یہاں بھیجا تھا۔ وہ پورا ہوتا نظر نہیں آرہا تھا بھاگ بھری کو۔ ہوشیار، سمجھ دار اور عقل مند لوگ اشارہ ہی سمجھ جاتے ہیں۔ بھاگ بھری بھی ان میں سے ایک تھی۔

"اقبال تو شام میں آئیں گے فیکٹری سے۔ کھانا بالکل تیار ہے۔ کھا کر آرام کرو۔ اقبال آئیں گے تو ان کو بتا دوں گی مل لینا۔۔۔ اور جو بات یا کام ہو وہ بتا دینا۔" خالدہ مامی نے اٹھتے ہوئے کہا اور کسی عارفہ نامی لڑکی کو پکارتی ہوئیں کھانا لگانے کا کہتے ہوئے چلی گئیں۔۔۔ انہوں نے ٹھنڈا یوچھا تھا نا گرم۔۔۔ فوراً" کھانا لگانے کا کہہ دیا تھا۔ عذرا اور بھاگ بھری کی نظروں کا تصادم ہوا۔۔۔ عذرا نظریں چرا گئی۔ بھاگ بھری نے ایک گہری سانس کھینچی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

کچھ دیر بعد ہی ایک لڑکی ٹرے میں کھانا لیے اندر داخل ہوئی اور میز پر رکھ دیا۔

"آئیں کھانا کھالیں۔۔۔" اس نے ان کو کہا اور باہر نکل گئی۔ وہ دونوں اٹھ کر میز کی طرف آگئیں۔

ایک چھوٹے ڈونگے میں مونگ مسور کی بگھاری دال، اچار کی پیالی اور سلاد کی پلیٹ تھی اور ایک رومال میں گنتی کی چار روٹیاں۔۔۔"

وہ ہاتھ دھونا چاہ رہی تھیں مگر کہاں دھوتیں سو خاموشی سے ایک پلیٹ میں تھوڑی سی دال اور اچار کے ساتھ روٹی کھانے لگیں۔

وہ ہی لڑکی ایک بار پھر کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پانی کی بوتل اور دو گلاس تھے۔۔۔ وہ میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دے لینا۔۔۔" اور پھر جھپاک سے باہر نکل گئی۔ دونوں نے ایک ایک روٹی کھائی اور ہاتھ کھینچ لیے۔ پندرہ منٹ بعد خالدہ چلی

آئیں اور بیٹھتے ہوئے بولیں۔
"ارے بیٹھی کیوں ہیں... کھانا کھائیں نا...؟"
"کھالیا..." بھاگ بھری نے جواب دیا۔
"اچھا اس کے ساتھ ہی انہوں نے عارفہ کو آواز دی کہ برتن اٹھالے اور ساتھ ہی اسے دو کپ چائے کا حکم بھی دیا۔
چائے پینے کے بعد بھاگ بھری تو اپنی بیٹی کی طرف چلی گئی۔ اور وہ ماموں کے گھر رہ گئی... مامی اس کو آرام کرنے کا کہتے ہوئے اٹھ کر چلی گئیں۔
ان کے جانے کے بعد عذرا کا ذہن سوچوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اسے ماں کا خیال آرہا تھا ان کا کیا حال ہو گا اور ابا کے عتاب سہنے کے لیے اکیلی رہ گئی تھیں۔
آنے والا وقت اور حالات کیا پیغام لے کر آئے اس کے لیے... وہ سوچنے لگی اور تب یہ الجھی الجھی سوچیں اس کی انگلی تھام کر محبت کی یاد کی طرف لے گئیں... اس پل اس کے سوکھے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اور دل سے صدا نکلی...
"محبت مجھے یہاں کہیں مل جائے... کہیں سے دوڑتا ہوا آئے اور آکر میرا ہاتھ تھام لے..."
محبت کی یاد سے اس کی پریشان سوچیں ایک دم ہی خوش گوار ہو گئی تھیں۔
اقبال کے گھر آنے سے پہلے ہی ان کو اس کے گھر آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔ شام کو جب وہ گھر آئے تو انہوں نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے سلام کے جواب میں انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گلے سے لگالیا۔
ان کے سینے سے لگتے ہی عذرا کو سکون کا احساس ہوا اور ان کے بدن سے ماں جیسی مہک اٹھتی محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں گرم گرم پانی تیر گیا... جسے اس نے اندر ہی جذب کرلیا۔
خون کے رشتوں میں کتنی بھی دوریاں اور فاصلے پیدا ہوں۔ ان کی اپنی مہک ہوتی ہے... ان کا احساس' ان کے جذبے اور ہی ہوتے ہیں۔
"آسیہ کیسی ہے... اور احمد یار...؟"
"ماں تو ٹھیک ہی ہے... ابا بیمار ہیں۔" اس نے مختصر کہا۔
"ہوں..." انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا اور اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"بس زندگی کی الجھنیں... وقت اور حالات کے تقاضے... فرصت ہی نہ دی' کبھی چکر ہی نہ لگا سکا... پھر یہ بھی تھا روز روز چکر لگانے سے آسیہ کا دل اچاٹ ہو جاتا۔ بیٹی جب بیاہی جائے تو اسے سسرال میں ہی دل لگا کر رہنا چاہیے..."
انہوں نے سترہ سال میں ایک چکر بھی بہن کے گھر نہ لگانے کا بہترین جواز پیش کیا تھا۔ عذرا ماموں کو یہ نہ کہہ سکی...
"آپ نے تو اس ڈر سے کبھی ادھر کا رخ نہ کیا... بہن کو کچھ دینا نہ پڑ جائے... یا بہن دو چار دن کے لیے رہنے نہ آجائے... اس لیے کہ وہ آپ کی بہن تھی۔ اگر ان کی جگہ آپ کی بیٹی ہوتی تو کیا ایسا کرتے۔" عذرا اپنی سوچوں کو زبان نہ دے سکی۔
"اور آسیہ کی تو مت ماری گئی ہے... آج کے دور میں پڑھے لکھے لڑکے جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ تمہیں کہاں نوکری ملے گی... اور تم ٹھہری لڑکی ذات..." اس نے سر اٹھا کر ماموں کی طرف دیکھا اور پھر لب بھینچ کر رہ گئی۔
"کچھ پڑھا لکھا ہے تم نے...؟"
"نہیں... بس تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتی ہوں۔ یہ بھی م۔ح..." اس کی زبان پر محبت کا نام آتے آتے رہ گیا۔ اس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں لبوں کو دانتوں سے کچل ڈالا۔
"گھروں میں کام کرنے کی اجازت نہیں دوں گا میں اور باقی کون سی ملازمت رہ جاتی ہے تمہارے لیے... اگر یہ ہی محنت مزدوری یہاں رہ کر کرو گی تو یہ سب وہاں بھی کر سکتی تھی تم وہاں کم از کم ماں کی نظروں کے سامنے تو رہتی... اور تم جوان جہان ہو اور آج کا دور... یہ بہت بھاری ذمے داری ہے... میں یہ رسک نہیں لے سکتا... ویسے بھی یہ ذمے داری تمہاری نہیں...

احمد یار کے اپنے بیٹے ہیں ان کا فرض ہے وہ باپ کی دیکھ بھال کریں۔ اس کی بیماری کا علاج کرائیں۔ فکر کریں۔۔۔"

عذرا کے لبوں پر قفل پڑ گئے۔۔۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی۔۔۔ ماموں کو اس کا آنا اچھا نہیں لگا۔۔۔ اسی لیے وہ ہر بات دلیل کے ساتھ کر رہے تھے۔

"یہ خیال تو دل سے نکال دو میں تمہیں کہیں نوکری لگواؤں گا۔۔۔ یہاں جتنے دن چاہو رہ سکتی ہو۔۔۔ چار' چھ دن بعد جب جانا چاہو گی تو چھوڑ آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ساتھ ہی اسے واپسی کا الارم بھی دے دیا۔ کہ دو' چار دن بعد وہ جانے کی تیاری کرے۔

ان کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر الجھ گئی۔ اسے اپنے چاروں طرف مایوسی نظر آنے لگی۔ بہت دیر گزرنے کے بعد بھی جب کوئی اس کے پاس نہ آیا تو وہ خود ہی اٹھ کر ان کے پاس آ گئی۔ جہاں سب بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی خاموشی سے عارفہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔



اسے آئے ہوئے دو دن گزرے تھے کہ خالدہ مامی کا بھتیجا زبیر آ گیا۔۔۔ اس نے عذرا کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔۔۔ چند لمحے اسے کھڑا دیکھتا رہا اور پھر سر کو ہلاتا ہوا اندر لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے سلام کرنے کے بعد فوراً" اس کے بارے میں پوچھا۔

"پھوپھی یہ قدرت کا حسین شاہکار۔۔۔ کہاں سے آ گیا آپ کے گھر میں کون ہے یہ؟"

"تو اس کے حسن کا تیر چل ہی گیا کسی نہ کسی پر۔۔۔" وہ حد درجہ ناگواری سے بولیں۔

"ایسی کوئی بات نہیں پھوپھی۔۔۔ یہ بتائیں کون ہے۔۔۔ اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی اس گھر میں۔۔۔؟"

"اقبال کی بھانجی ہے عذرا۔۔۔ گاؤں سے آئی ہے پرسوں۔ ماں نے کمائی کرنے کے لیے بھیجا ہے۔۔۔ بیمار باپ کے علاج کے لیے پیسا چاہیے۔"

"تو پھر کہیں کوئی بات بنی۔۔۔؟"

"نوکریاں کیا اوپر ہی رکھی ہیں۔۔۔ وہ بھی ان پڑھ لڑکی کے لیے۔۔۔ اور نہ ہی کسی نے تلاش کی ہے۔۔۔ اقبال اتوار کو واپس چھوڑ کر آئیں گے اس کو۔"

"مگر کیوں۔۔۔؟" زبیر نے تعجب سے پھوپھی کو دیکھا۔

"تو اپنے سر پر عذاب بنا کر رکھوں اس کو۔" انہوں نے انتہائی بےزاری سے کہا۔

"آپ کو ایک مشورہ دوں۔۔۔ اسے واپس نہ بھیجیں۔۔۔ میرا ایک دوست ہے اس کی ایڈورٹائزنگ کمپنی ہے۔۔۔ اس کو آج کل ایک ایسے چہرے کی تلاش ہے جو ماڈلنگ کی دنیا میں تہلکہ مچا دے۔۔۔ اور اس سے پہلے وہ چہرہ اسکرین پر بھی نہ آیا ہو۔۔۔ ایک ہی کمرشل سے لاکھوں روپیہ کما سکتی ہے۔۔۔ اس سے عذرا کی مشکل تو آسان ہو گی ہی۔۔۔ ساتھ میں ہم دونوں کے ہاتھ بھی اچھی خاصی رقم آ جائے گی۔"

اس کی بات ان کے دل کو لگی تھی۔۔۔ مگر شوہر کا خیال ساری خوش گواری ختم کر گیا۔

"اقبال کبھی اس کام کی اجازت نہیں دیں گے۔ بے شک ان کو بھانجی سے پیار نہیں لیکن یہ بھی پسند نہیں کریں گے۔" انہوں نے مایوس سے لہجے میں جواب دیا۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں پھوپھی۔۔۔ پھوپھا کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔۔۔ جب کام ہو گیا تو پتا چلے تو خیر ہو گی۔۔۔ اور جب پیسا ہاتھ آئے تو کسی کو کچھ برا نہیں لگتا۔ اگر یقین نہیں تو آزما کے دیکھ لیں۔۔۔"

"یہ تو ہے مگر پھر بھی۔۔۔" وہ ہچکچا رہی تھیں۔

"آپ صرف اسے میرے ساتھ جانے کی اجازت دیں۔۔۔ باقی کسی بات کی فکر نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے تم اسے اپنے ساتھ لے جانا۔۔۔ مگر اقبال کے آنے سے پہلے چھوڑ جانا۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں صرف اسے دکھانا ہے عذرا کو۔۔۔ باقی سب بعد میں طے ہو گا۔۔۔ صرف ایک گھنٹا لگے گا اور میں پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں وہ

اسے دیکھتے ہی او کے کر دے گا۔" اس نے پھوپھی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔

"لیکن وہ تو لکھنا پڑھنا نہیں جانتی... ہاں آواز خوب صورت ہے' چہرے کی طرح... بولتی ہے تو لگتا ہے پھول جھڑ رہے ہوں۔"

"دو چار ڈائیلاگ تو بول ہی لے گی ریہرسل سے۔ اگر نہیں بھی بول سکتی تو ڈبنگ ہو جائے گی۔ نو پرابلم۔"

"بس اس چیز کا خیال رکھنا کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔" انہوں نے ایک بار اسے تاکید کی۔

"میں نے کہا نہ بے فکر ہو جائیں پھوپھی..."

"کام تو ہو جائے گا نہ...؟" انہیں ابھی سے کرارے نوٹوں کے خواب آرہے تھے۔

"ان شاء اللہ میں آج ہی اس سے ملتا ہوں اور کل کا وقت لے کر اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

اتنے میں عارفہ چائے لے کر آگئی... اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور چائے پینے لگا... چائے کا خالی کپ پلیٹ میں رکھتے ہوئے اس نے پھوپھی سے اجازت چاہی اور چلا گیا۔



اگلی صبح خالدہ ممانی اس کے پاس آئیں اور شہد آگیں لہجے میں بولیں۔

"ناشتا کر لیا عذرا بیٹی...؟"

عذرا جو خاموشی سے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی نیلے آسمان کو تکے جا رہی تھی ان کی آواز اور خاص کر بیٹی کے لفظ نے اسے چونکا دیا۔ آج ان کے لہجے میں بہت مٹھاس تھی...

اس نے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں کبھی کا..."

"پھر یہاں کیوں بیٹھی ہو؟"

"بس یوں ہی... اندر کمرے میں دل نہیں لگا۔ عارفہ لوگ کالج چلی گئیں تو تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔"

وہ جب سے یہاں آئی تھی بولائی بولائی پھر رہی تھی۔ سب لوگ اپنے کاموں میں لگے رہتے اور وہ ہاتھ پیر توڑے خاموشی سے بیٹھی ہوئی ان کو دیکھتی رہتی یا پھر سوچوں میں الجھی رہتی۔ شام کو ماموں آتے دو چار باتیں اس سے کر لیتے اور پھر ٹی وی دیکھنے اور بچوں کے ساتھ مصروف ہو جاتے... ان لوگوں کی زندگی کی اپنی ہی ایک روٹین تھی... اور وہ اس میں ان فٹ تھی... جس مقصد کے لیے وہ آئی تھی وہ ہی پورا نہیں ہوا تھا۔ اب وہ یہاں سے جانا چاہ رہی تھی۔ ماں کی تنہائی کا اسے شدت سے احساس ہوتا تھا۔ ایک دو بار وہ ماموں سے جانے کا کہہ بھی چکی تھی۔ انہوں نے اتوار کا کہا تھا اسے... اس لیے وہ خاموش تھی۔ جیسے بھی ہو یہ وقت تو گزارنا تھا ہی اسے...

"چلو میرے ساتھ اندر تیار ہو جاؤ۔ تمہاری پریشانی دیکھتے ہوئے میں نے اپنے بھتیجے زبیر سے تمہاری نوکری کا ذکر کیا تھا... اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے تمہیں کہیں نہ کہیں اچھی جگہ ملازمت دلوا دے گا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے دوست سے بات کی ہے... تم اس کے ساتھ چلی جاؤ... وہ ابھی آتا ہی ہو گا تم اتنے میں جلدی سے تیار ہو جاؤ..."

"بہت شکریہ مامی... میں واقعی ہی پریشان ہوں... تیاری کیا کرنی۔ وہ آجائیں تو میں چلی جاؤں گی..."

"لو بھلا اس حلیے میں جاؤ گی... یہ شہر ہے گاؤں نہیں جس طرح بیٹھے ہو اٹھ کر چل دو... کوئی صاف ستھرا اچھا سا سوٹ پہن لو... اور چہرہ دھو لو۔"

"جی اچھا..." وہ بیگ کی طرف بڑھی ابھی وہ زپ ہی کھول رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر سے بولیں۔

"تم اپنا سوٹ رہنے دو... جانے کوئی ڈھنگ کا سوٹ ہے بھی کہ نہیں... میں تمہیں عارفہ کا سوٹ دیتی ہوں۔ تمہارا اور اس کا سائز ایک ہی لگ رہا ہے۔" وہ بس حیرانی سے خالدہ مامی کو دیکھتی رہ گئی آج ان کو ہو کیا رہا ہے۔

انہوں نے الماری سے پنک کلر کا انتہائی نفیس اور نازک کام والا سوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ بہت سوٹ کرے گا تم پر.... پہن لو۔"
"مگر یہ تو بہت...."
"اچھی جگہ پر جا رہی ہو تو اچھے حلیے میں ہی جاؤ گی نا...." انہوں نے ذرا تلخی سے کہا۔
"ایک تو تم سوال بہت کرتی ہو.... تھوڑا کم بولا کرو.... اور وہاں بھی زیادہ مت بولنا.... لوگ تنگ آجاتے ہیں زیادہ بولنے والوں سے۔ ویسے بھی زبیر تمہارے ساتھ جا رہا ہے سب کچھ خود ہی ہینڈل کرلے گا۔"
اس نے مزید کوئی سوال کیے بغیر ان کے ہاتھ سے سوٹ لیا اور خاموشی سے چینج کرنے چل دی۔ جب وہ سوٹ پہن کر باہر نکلی تو خالدہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں.... وہ اس سوٹ میں کھلے ہوئے گلاب کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ انہیں اس بات کا یقین ہو گیا وہ کامیاب لوٹے گی۔
"جوتے بھی یہ پہن لو...." انہوں نے بے بی ہیل والے جوتے اس کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ اتنے میں گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔
"بس اب نکلنے کی کرو.... کیونکہ تمہیں جلدی واپس آنا ہے۔" وہ اس کو باہر آنے کا کہہ کر خود بھی باہر جانے لگیں تو کسی خیال کے تحت پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔
"اپنے ماموں سے 'اپنے' کہیں باہر جانے یا کسی نوکری کا ذکر نہ کرنا۔ وہ کبھی راضی نہ ہوں گے۔ تمہاری نوکری ہو جائے پھر میں انہیں سمجھا لوں گی۔"
"جی اچھا...." اس نے مختصراً کہا۔
پھر وہ اس کے ساتھ ہی گاڑی تک آئیں.... گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے اسے بٹھایا اور زبیر کی طرف آتے ہوئے کہا۔
"ذرا دھیان سے جانا اور جلدی واپس آنا...." انہوں نے اسے تاکید کرتے ہوئے کہا۔
"بس ایک گھنٹے تک آجائیں گے آپ دعا کرنا۔" اور اگلے ہی پل گاڑی ٹرن کی اور فراٹے سے بھگا لے گیا۔
عذرا اس طرح کبھی کسی کے ساتھ کہیں نہیں گئی تھی۔ لیکن اب اس کی مجبوری تھی۔ وہ اس کے ساتھ اکیلی سفر کر رہی تھی۔ لیکن اتنی تسلی تھی خالدہ مامی کا بھتیجا ہے اور بھیجنے والی بھی وہ خود ہیں۔

✿ ✿ ✿

زبیر عذرا کو ایک آراستہ کمرے میں لے کر داخل ہوا۔ اور وہ میز کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ وہ آس پاس کی قیمتی اور انوکھی آرائش کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے آج تک ایسی زیب و آرائش کہاں دیکھی تھی۔
"میں 'میں یہاں نوکری کروں گی....' وہ گھبرائی گھبرائی سی بولی۔
"یہاں تو نہیں.... یہ تو اس کا آفس ہے۔ جس نے تمہیں نوکری پہ رکھنا ہے۔ لیکن جہاں تم نوکری کرو گی وہ بھی اچھی جگہ ہو گی.... اور کام بھی کچھ خاص نہیں ہو گا.... اس نوکری سے تمہارا شاندار مستقبل منسلک ہے۔" عذرا کچھ نہ سمجھی۔
"یہ شاندار مستقبل تمہیں کب سے ڈھونڈ رہا تھا اور تم اس سے چھپی ہوئی تھیں۔"
"کیا مطلب....؟"
"جب تم سمجھ جاؤ گی تو خود کو خوش نصیب سمجھو گی...."
"مجھے سمجھ نہیں آ رہی...."
"تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے.... تمہیں صرف وہ کرنا ہو گا جو تمہیں بتایا جائے گا۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دو.... چند دن کی محنت کے بعد.... اتنا کما لو گی کہ ایک ساتھ بہت سارے کام کر سکو...."
عذرا اس کی بات سن کر خاموش رہ گئی۔ اس نے زبیر کی آنکھوں میں جھانکا جن میں ایک اعتماد مسکرا رہا تھا۔ وہ اس کے ارادوں کی پختگی محسوس کر کے تذبذب میں پڑ گئی۔ اتنے میں ایک خوبرو نوجوان دروازہ کھولتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر حیران رہ گئی.... اور گھبرائی گھبرائی سی اسے دیکھنے لگی۔ اسی گھبراہٹ میں وہ اس کو سلام کرنا بھی بھول گئی۔

اس نے زبیر سے مصافحہ کیا اور اس کے ساتھ بیٹھی لڑکی کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔

"اوہ.... سو نائس ویری بیوٹی فل گرل...." وہ ہونٹوں کو سیٹی کی صورت گول کیے میز کی طرف آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی جس کے ہر انداز میں رینلٹی ہو اداکاری نہیں۔ یہ کمرشل اسی کے لیے موزوں ہو گا جس کا پبلک میں کوئی امیج نہ ہو۔ مجھے ایسی ہی لڑکی چاہیے تھی معصوم چہرہ، تیکھے نقوش، متناسب جسم.... اور آنکھوں میں جھیل سی گہرائی۔ اس سے بہتر لڑکی اس کمرشل کے لیے مل ہی نہیں سکتی.... بس ایک بار اسکرین پر آگئی تو ہنگامہ برپا کر دے گی.... اور ایک ہی کمرشل سے اسٹار بن جائے گی۔" اسے دیکھ کر اس نے گھبرا کر دوپٹا سر پر اچھی طرح جما لیا۔

"اور آواز کا بھی جواب نہیں...."

"تم نے کہاں سنی اس کی آواز....؟" زبیر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "اندر داخل ہونے سے پہلے تمہاری باتیں سن رہا تھا۔ آواز کا ٹیسٹ تو ہو گیا۔ بولنے کا انداز بھی خوب صورت ہے اور صورت تو سیدھی دل کو زخمی کرتی ہے۔" اور پھر ان دونوں اسے بولنے کا بہت کم موقع دیا۔

پھر چائے آگئی۔ عذرا تو ان لوگوں کے درمیان بری طرح گھبرا رہی تھی.... ان کے اصرار پر بھی اس نے چائے کو ہاتھ نہ لگایا۔

"تم کل سے انہیں لے کر آجایا کرو.... ریہرسل شروع کرتے ہیں پھر اور میں آج رائٹر سے بھی بات کرتا ہوں.... وہ آکر ریہرسل شروع کروائے کیونکہ اس کمرشل کو ڈائریکٹ بھی وہ ہی کر رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے اب اجازت.... کل وقت پر پہنچ جاؤں گا۔" زبیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جس روز یہ کمرشل شوٹ ہو گی.... تمہیں چھ لاکھ کا چیک مل جائے گا اور اس کے فوراً بعد دوسرا کمرشل کریں گے...." سعد عالم نے کہا۔

پھر وہ اس کے آفس سے نکل آئے۔ اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ بولا۔

"بہت بہت مبارک ہو۔ تم بہت خوش نصیب ہو.... ورنہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے لڑکیاں اپنا کردار بھی کھو چکی ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے ایک ہفتہ لگے گا اور تمہیں ایک بھاری رقم مل جائے گی...."

"مگر مجھے کرنا کیا ہو گا....؟"

"تمہیں سمجھ نہیں آیا....؟"

"کچھ کچھ.... میری آواز.... میرے چہرے کی تعریف.... کیا مجھے گانا گانا ہو گا۔"

"نہیں.... اداکاری.... دلہن کا اشتہار ہے۔ جو تمہیں کرنا ہو گا.... چند لائنیں بولنا ہوں گی.... کیمرے کے سامنے اور وہ شوٹ مکمل ہونے کے بعد T.V چینلز پر چلے گا۔ تمہاری پبلسٹی ہو گی۔ اور ڈیمانڈ بڑھے گی۔ اور تم دنوں میں امیر ہو جاؤ گی۔"

"مگر یہ اچھی بات نہیں.... ٹی وی پر آنا.... بہت بری بات ہے.... ماں تو صدمے سے مر جائے گی۔"

"بے فکر ہو جاؤ تمہاری ماں کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔"

"لیکن پھر بھی یہ اچھی بات نہیں.... اور میں ماں کی اجازت کے بغیر ایسا کام نہیں کروں گی۔" اس نے دوٹوک جواب دے دیا۔

"تم اپنے ابا کا علاج کرانا چاہتی ہو....؟"

"جی...."

"اپنی ماں کو خوش دیکھنا چاہتی ہو۔ ایک اچھی زندگی گزارنے کی خواہش رکھتی ہو....؟"

"ہاں جی کیوں نہیں...."

"تو پھر اس سے اچھا موقع زندگی میں پھر کبھی تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ کیونکہ قسمت بار بار دروازے پر دستک نہیں دیتی۔ اگر پہلی دستک پر دروازہ نہ کھولا جائے تو کسی اور کے دروازے پر جا کھڑی ہوتی ہے۔ جتنا تم ایک کمرشل سے کماؤ گی اتنا ساری زندگی نہیں کما سکتی ہو.... میرا مخلصانہ مشورہ ہے.... دل سے نہیں دماغ سے فیصلہ کرو اور خود سے وابستہ لوگوں کے لیے سوچو۔" زبیر نے اسے جذباتی طور پر ٹارچر کیا۔

کہہ تو وہ صحیح ہی رہا تھا مگر وہ دل سے راضی نہ تھی.... اور پھر اس کی نظروں کے سامنے ابا اور ماں کے چہرے آ گئے.... اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے فیصلہ کر لیا .... لیکن اس کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

وہ گھر پہنچی تو خالدہ مامی بھی اس کے واری صدقے جا رہی تھیں۔ انہوں نے اسے سمجھایا کہ وہ یہ شوٹ ضرور کرے اور وہ فیصلہ تو کر ہی چکی تھی۔ اس نے مامی کو ہاں کر دی۔ زبیر کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اس نے پھوپھی کو کہہ دیا کہ چھ لاکھ سے 'دو لاکھ عذرا کے اور دو' دو ان دونوں کے.... خالدہ مامی کی تو آنکھیں پھیل گئی تھیں.... اور انہیں اس دن کا شدت سے انتظار تھا جب دو لاکھ ان کی مٹھی میں ہوتے....

☆ ☆ ☆

بتاؤ کون کہتا ہے
محبت بس کہانی ہے
محبت تو صحیفہ ہے محبت آسمانی ہے
محبت کو خدا را تم کبھی بھی جھوٹ نہ سمجھو
محبت معجزہ ہے۔ معجزوں کی ترجمانی ہے
محبت پھول کی خوشبو محبت تتلیوں کا رنگ
محبت پربتوں کی جھیل کا شفاف پانی ہے
محبت اک ستارہ ہے' وفا کا استعارہ ہے
محبت سیپ کا موتی' لہجہ بیکرانی ہے
زمیں والے بتاؤ کس طرح سمجھیں محبت کو
محبت تو زمیں پر آسمانوں کی نشانی ہے
محبت روشنی ہے' بے رنگ ہے
خوشبو ہے' نغمہ ہے
محبت اڑتا پنچھی ہے محبت بہتا پانی ہے
محبت ماؤں کا آنچل محبت باپ کی شفقت
محبت ہر جگہ' ہر پل' خدا کا نقش ثانی ہے
محبت بہن کی الفت محبت بھائی کی چاہت
محبت کھیلتا بچہ ہے اور
چڑھتی جوانی ہے
محبت حق کا کلمہ ہے محبت چاشنی من کی
محبت روح کا مرہم' دلوں کی حکمرانی ہے
محبت تو ازل سے ہے محبت تا ابد ہو گی
محبت تو آفاقی ہے' زمانی نہ مکانی ہے
فنا ہو جائے گی دنیا' فنا ہو جائیں گے ہم تم
فقط باقی محبت ہے محبت جاودانی ہے

وہ سعد عالم سے مل کر سیٹ کی طرف آ رہا تھا.... اور اس کی لڑکی پشت کو دیکھنے لگا جو سر پہ دوپٹا اوڑھے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے لفظوں کی ادائیگی غور سے سن رہی تھی۔ لیکن اس کی سماعتوں میں جانی پہچانی آواز گونجی تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی.... اور دل عجیب سی خوش گمانیوں میں گھر گیا۔

"تو کہاں تک پہنچی.... ڈائیلاگ کی مشق....؟"

وہ اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ وہ اس کی پشت پر کھڑا تھا۔

اس بار اس نے اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ اس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پلٹتے ہوئے اسے دیکھا اور اس پل اسے اپنے پیروں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس کی بھی تھی۔ دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا۔

"م.... ح.... ب.... ت" اس کی زبان لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے۔

"ع.... ج.... و...." وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کل تک مٹی کے گھروندوں سے کھیلنے والی لڑکی آج کس مقام پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ سیٹ پر موجود لوگ ان دونوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"کہاں چلے گئے تھے تم محبت.... ؟ پلٹ کر خبر نہ لی۔" اس نے شدت جذبات سے چور لہجے میں کہا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا میری اچانک یہاں تم سے ملاقات ہو جائے گی۔" محبت نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"میں حیران و پریشان ہوں' ڈری سہمی بزدل لڑکی یہاں کیسے پہنچ گئی...."

"تم یقیناً" اس بارے میں بہت کچھ جاننا چاہو گے۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ کچھ نہیں چھپاؤں

گی۔"

"ہاں عجو یہ سب میرے لیے بہت اہم ہے...." محبت نے گہرا سانس لے کر اس کے شانوں پر اپنے ہاتھوں کو رکھا اور دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔

"یہ کوئی اچھی جگہ نہیں ہے.... خاص کر تم جیسی لڑکیوں کے لیے۔ میری بات غور سے سنو' جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم نے ایک بے رحم پیشے میں قدم رکھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے تمہیں یہاں دیکھ کر حیرت ہی نہیں جھٹکا لگا ہے.... یہ اشتہاری کمپنیاں یونہی کسی کو گھاس نہیں ڈالتیں۔ تمہاری خوب صورتی...." محبت نے جملہ ادھورا چھوڑ کر لبوں کو بھینچا اور بہت گہری نظروں سے عجو کو دیکھا.... اور پھر گویا ہوا۔

"بہت دکھ ہوا ہے تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے.... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا دلہن کے کمرشل کی جو کہانی میں نے لکھی ہے اس کردار کو تم ادا کرو گی۔ کیونکہ یہ میری شاہکار کہانی ہے.... میں نہیں جانتا تھا کہ اس کی ماڈل بھی شاہکار ہے.... اگر یہ شوٹ ہو جاتی تو سب دیوانہ وار ٹوٹ پڑتے اشتہار کی ماڈل پر...."

"تو کیا اب یہ شوٹ کینسل ہو گیا....؟" اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی سن کر وہ چونک پڑا۔

"ہاں بالکل کینسل سمجھو اسے...."

زبیر جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے سارا منظر دیکھ رہا تھا اسے اپنی ساری امیدوں پر پانی پھرتا محسوس ہوا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے....؟" زبیر نے ذرا سخت و تلخ لہجے میں پوچھا۔

"یہ ہو چکا ہے مسٹر.... تم ہو کون....؟" محبت نے اس سے بھی تلخ لہجے میں پوچھا۔

"اس سوال کا جواب عذرا دے گی تمہیں...." زبیر نے حد درجہ ناگواری سے کہا۔

"لیکن میں یہ نہیں کہوں گا کہ میرے بارے میں عجو تمہیں بتائے.... میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا.... کیونکہ میں تعارف کا محتاج نہیں۔" محبت کے الفاظ' اس کا لہجہ زبیر کو آگ لگا گیا۔

"بہت دیکھے ہیں تم جیسے ایرے غیرے.... عذرا بتاؤ میں کون ہوں....؟" اس نے محبت کو گھورتے ہوئے.... عذرا کو دیکھا۔

محبت کو اس کے ایرے غیرے پر بہت ہنسی آئی مگر وہ ضبط کر گیا۔ لیکن ایک طنزیہ سی مسکراہٹ لبوں پر بکھر گئی۔

"یہ خالدہ مامی کے بھتیجے ہیں۔" عذرا دھیرے سے کہا۔

"ہوں...." پھر وہ اسے یوں شانوں سے تھامے یوں ہی ایک سائیڈ پر بیٹھ گیا۔

زبیر غصے سے بل کھا کر رہ گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا اسے کچا چبا جائے.... کیسے ایک دم اس نے فلم کے ہیرو کی طرح درمیان میں آ کر اس کا سارا پلان ناکام کر دیا تھا۔ بنا اس کی اجازت کتنی آسانی سے اس نے اشتہار کینسل کر دیا تھا۔ آخر اسے کس نے یہ حق دیا تھا.... وہ اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر سیٹ سے سعد عالم کے آفس کی طرف چلے گئے۔

"اب مجھے مختصر الفاظ میں ساری کہانی بتاؤ.... باقی ساری باتیں بعد میں ہوں گی۔ لیکن یہ یاد رکھو عجو تم یہ اشتہار نہیں کرو گی اور اس پیشے میں قدم نہیں رکھو گی...." اس نے عجو کو تنبیہہ کرتے ہوئے تاکید کی۔ اس نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے مختصر الفاظ میں ساری کہانی بتا دی۔

"ہوں.... سب مجھ پر چھوڑ دو.... میرے ساتھ گاؤں چلو...." عجو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جسے اس نے انگلی کی پوروں سے صاف کر لیا۔ اتنے میں وہ دونوں سعد عالم کے ساتھ سیٹ کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔

سعد عالم اور زبیر کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ کیونکہ شطرنج کی بچھی ہوئی بساط الٹ گئی تھی۔

"یہ 'یہ سب کیا ہے محبت....؟" سعد عالم نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے آپ کو پتا چل گیا ہو گا....؟"

"ہاں وہ تو معلوم ہو گیا ہے۔ لیکن یہ اشتہار شوٹ کرنا بہت ضروری ہے۔ تم اسے کیسے کینسل کر سکتے ہو؟"

"میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ آپ یہ اشتہار شوٹ نہ کریں.... ضرور کریں.... میں آپ کے ساتھ ہوں۔ بس اس اشتہار کی ماڈل عجو نہیں ہو گی آئی مین عذرا...."

"کیوں....؟" سعد عالم اور زبیر نے ایک ساتھ پیشانی پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں اس کا جواب دینا پسند نہیں کرتا۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"میں پھر یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم کون ہو....؟" زبیر نے کڑکتے ہوئے کہا۔

"یہ محبت ہے میری چاچی مہراں کا بیٹا.... بس وقت کی دھند میں کھو گیا تھا۔ آج اچانک ملاقات ہو گئی...."

عجو نے محبت کی طرف دیکھتے ہوئے ان کو جواب دیا تو سب کے سب ڈھیلے پڑ گئے۔

"ٹھیک ہے.... اگر تم اس اشتہار کی...."

"عجو یہ نہیں کرے گی.... اور میرے ساتھ گاؤں جا رہی ہے۔" اس نے سعد عالم کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اور عجو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

"یہ' یہ عذرا کو کہاں لیے جا رہے ہو؟ یہ میرے ساتھ جائے گی.... میں پھوپھی کے حوالے کر دوں اسے پھر جہاں چاہے لے جانا...." وہ محبت کے پیچھے دوڑا۔

"تم میرے ساتھ آؤ وہاں ہی جا رہے ہیں۔"

اور پھر وہ تینوں گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔



اس نے فون پر پھوپھی کو ساری خبر دے دی تھی۔ وہ تب سے ہی غصے سے تلملا رہی تھیں.... سارا کھیل خراب ہو گیا تھا.... اب وہ اس کو ایک لمحے کے لیے اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ جس کام کے لیے وہ اسے برداشت کر رہی تھیں وہ ہی نہیں ہوا تو اسے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا.... پیسے کی کشش ہی ایسی ہوتی ہے ناقابل برداشت چیز بھی برداشت کر لی جاتی ہے۔

"یہ چاچی مہراں کا بیٹا آج سے پہلے کہاں تھا؟ تمہاری ماں کو اس وقت یہ نظر نہیں آیا ماموں کے پاس کیوں بھیجا تھا نوکری کے لیے...."

وہ ٹکر ٹکر خالدہ مامی کا چہرہ دیکھتی رہ گئی.... دو روز پہلے تک ان کا لہجہ کتنا شہد آگیں تھا۔ اور آج انگارہ برسا رہا تھا۔

"یہ مسئلہ آپ کا نہیں.... پہلے کیوں نظر نہیں آیا۔ اب کیوں آیا.... اصل پرابلم یہ ہے آپ کی عجو کے ذریعے جو رقم آپ کو ملنے والی تھی وہ ہاتھ نہیں آئی۔ اسی لیے آگ بگولا ہو رہی ہیں آپ۔" "میں سب جانتا ہوں۔"

"یہ' یہ کس نے کہا تمہیں....؟" خالدہ مامی ہکا بکا رہ گئیں۔

"اسی فیلڈ کا بندہ ہوں میں.... سب جانتا ہوں.... اور کچھ سننا چاہیں گی؟" اس نے خالدہ مامی کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے تم اسے لے کر چلتے بنو.... جہاں چاہو منہ کالا کرو۔ میرے گھر سے دفع ہو جاؤ.... فضول کا خرچا اور جان کو آئی ہوئی ہے میری...." خالدہ مامی نے اپنا سارا غصہ ان پر نکالا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ دونوں کا گلا دبا دیں۔

"میں ایسے نہیں ماموں سے مل کر ان کی اجازت سے جاؤں گی...." عذرا نے اٹل لہجے میں کہا۔

"ان کی طرف سے اجازت ہی اجازت ہے۔ کیونکہ تمہارے آنے سے پہلے تمہارے کرتوت بتا چکی ہوں ان کو.... مجھے زبیر نے فون پر سب کچھ بتا دیا تھا۔"

"آپ کچھ بھی بولیں میں نہیں جاؤں گی...." اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

"خود ہی سن لو...." انہوں نے اقبال ماموں کو فون لگایا اور اس کے آنے سے پہلے نجانے انہوں نے کیا

بتایا تھا ان کو کہ انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا جا سکتی ہے... اس نے ماموں کو ساری بات بتانا چاہی تو انہوں نے مصروف ہونے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ تب خالدہ مامی دھاڑتے ہوئے بولیں۔

"سن لی تم نے اپنے ماموں کی بات۔ اب خود سے جاؤ گی یا ہاتھ پکڑ نکال باہر کروں۔" ان کی بات سن کر محبت ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ماموں نے وہی کہنا ہے نا جو آپ نے ان کو بتایا ہو گا۔ اصل حقیقت کا انہیں کیا معلوم..." اس کی زبان سے نہ جانے کیسے پھسل گیا۔

"تم ایسے نہیں جاؤ گی... دھکے دے کر نکلنا پڑے گا تم جیسی ڈھیٹ کو..." وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ کوئی شریف آدمی اتنی بات سن کر ایک منٹ رکنا پسند نہ کرے... لیکن یہ مت بھولیں خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اگر عجو کے برے وقت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے کل کو یہ وقت آپ پر بھی آ سکتا ہے... اور جس جگہ آپ لوگوں نے اسے پہنچا دیا... آپ کی بیٹی بھی پہنچ سکتی ہے۔"

وہ غصے سے کہتا ہوا عجو کا ہاتھ تھام کر نکل گیا۔

خالدہ منہ پر ہاتھ رکھے اس کو جاتا دیکھتی رہ گئیں... اور غصے سے بولیں۔

"اس صورت کا کمال ہے سارا... دیوانے تو ہوں گے لوگ۔ اب ایک دم سے چاچی مہراں کا بیٹا نکل آیا... نجانے اور کتنے لوگوں سے تعلقات ہوں گے..."

"لگتی تو نہیں ایسی..." زبیر نے جلدی پر تیل کا کام کیا۔

"ایسی ہی لڑکیاں زیادہ گھنی نکلتی ہیں۔ اور یہ سارا ڈرامہ تمہارا رچایا ہوا ہے۔ تم نے اپنے ساتھ مجھے بھی لگا لیا... ورنہ میں تو کبھی کا چلتا کرتی اسے یہاں سے..." انہوں نے لگے ہاتھوں زبیر کو بھی لتاڑا۔

"وہ تو اچھا ہوا اقبال سے ملاقات نہ ہوئی اور میں نے فرضی کہانی سنا کر اقبال سے حقیقت تو چھپا لی۔ ورنہ ان کا خون جوش مارتا تو گھر سے نکال دیتے مجھے... اور تمہارے اماں ابا اپنی دہلیز پر نہ چڑھنے دیتے اس عمر میں سر میں خاک ڈلواتی..."

"بے فکر رہیں اگر پھوپھا کا خون جوش مارتا تو وہ کہیں نہ کہیں اس کی نوکری لگوا دیتے اور آج یوں آپ کی باتوں میں نہ آتے... وہ آپ کے حکم کے غلام ہیں... رہی بات ڈرامے کی... پیسے کا سن کر تو آپ کی آنکھیں بھی چمکی تھیں تب ہی تو اجازت دی تھی۔ اب وہ چلی گئی ہے تو بھول جائیں سب، یہ ہی ہمارے حق میں بہتر تھا..." زبیر کی بات پر وہ بھی شرمندہ سی ہو گئیں اور دوسری طرف دیکھنے لگیں... تب زبیر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ اب اس کے قدم اپنے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔



راستے بھر وہ ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتاتے آئے تھے۔ تب اس نے پوچھا۔

"چاچی مہراں کیسی ہیں؟"

"خود جا کر دیکھ لینا۔" اس نے مسکراتے ہوئے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ کتنا نکھر آیا تھا۔ کتنا خوب صورت ہو گیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن منتشر ہو گئی۔

"عجو..."

"ہوں..."

"تم تو بچپن سے بھی کہیں زیادہ حسین ہو گئی ہو... نظریں نہیں ہٹتیں چہرے سے۔" اس کے دل کی دھڑکن منتشر ہو گئی۔ اور گالوں پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔

"اگر یہ ہی بات میں تم سے کہوں تو..."

"تو روکا کس نے ہے کہہ دو۔" بے ساختہ اس کے لبوں سے پھسل گیا۔

محبت کا ایک بھرپور قہقہہ گاڑی میں گونجا۔ تو حیا سے اس کا سر اور بھی جھک گیا۔

"عجو یہ مختصر سفر اور تمہارا ساتھ... کتنا اچھا لگ رہا

ہے.... میرے گمان میں بھی نہیں تھا کبھی یوں ساتھ ہوں گے.... کبھی کبھی زندگی ہمیں کس موڑ پر لے جاتی ہے کہ ہم حیران رہ جاتے ہیں.... لیکن کچھ بھی ہے.... تمہارا ساتھ میری زندگی کی خواہش ہے.... اور تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟"

"مجھے بھی بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اس نے دھیرے سے کہا۔

"عجو ایک بار اور کہو...." اس نے بے بسی سے محبت کی جانب دیکھا۔

"محبت ایک بات پوچھوں....؟"

"ہوں پوچھو....؟"

"کبھی پلٹ کر خبر نہ لی.... آئے کیوں نہیں گاؤں ....؟" محبت نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"آنا چاہتا تھا مگر تنہا آکر تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ تمہارے ابا بچپن میں ہی اتنا ظلم کرتے تھے پھر تو نجانے کیا سلوک کرتے.... اور گاؤں کے لوگ الگ باتیں بناتے...." اس نے لبوں کو بھینچ لیا۔

وہ اس کی کیفیت سے اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ ضبط کے کون سے مرحلے سے گزر رہا ہے۔ تب اس نے ٹیپ ریکارڈر آن کیا ارشد ملک کی نظم وہ اک پربت کی شہزادی گونجنے لگی۔

وہ اک پربت کی شہزادی
کئی قرنوں سے دل کے تخت پر
جس کی حکومت ہے
ہمیں اک دن اسے تسخیر کرنا ہے
اسے خوابوں کے پردوں سے ادھر
اک جسم میں تصویر کرنا ہے

گاڑی لاہور کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کون سا راستہ کس طرف جاتا ہے۔ بس گاڑی کی ونڈو سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اور چاچی میراں سے ملنے کی خوشی اس کے حواسوں پر چھا رہی تھی۔

اسے خاموش دیکھا تو محبت نے بھی مزید کوئی بات نہ کی۔ وہ اپنے خیالوں سے تب چونکی جب گاڑی ایک خوب صورت سے گھر کے سامنے رک گئی۔ اور محبت نے اس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے اترنے کا کہا۔ وہ خاموشی سے اتر آئی اور ایک گہری نگاہ محبت کے چہرے پر ڈالی۔

وہ اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا۔

"یہ چاچی میراں کا گھر ہے....! اندر چلو...."

وہ کہنا تو چاہتا تھا کہ یہ ہمارا گھر ہے مگر یہ بات لبوں میں دبا گیا۔ وہ گیٹ کے ساتھ چھوٹے دروازے کی طرف بڑھی۔ اور آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ سامنے پیپل کے پیڑ کی چھاؤں میں چاچی میراں لیٹی ہوئی تھیں۔ چارپائی کے ساتھ ہی ایک اسٹک بھی رکھی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر انہوں نے منہ سے دوپٹا ہٹاتے ہوئے دیکھا اور سامنے سے آتی لڑکی کو دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ تب ہی محبت بھی ان کے قریب آگیا۔ وہ حیرانی سے ان کو تکے جا رہی تھی۔ وہ گاؤں والی چاچی میراں تو نہیں تھیں.... بہت بدل گئی تھیں وہ۔ اس کے لب تھرتھرائے لیکن لبوں سے آواز نہ نکلی۔

"امی پہچانا یہ کون ہے؟؟"

"نہیں...." انہوں نے سائیڈ پر رکھی عینک اٹھا کر لگائی اور اسے دیکھنے لگیں۔ تب وہ شدت جذبات سے بولتی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"چاچی میراں...."

"عجو بیٹی...." اس کے چاچی میراں کہنے سے ہی وہ سمجھ گئی تھیں۔ ان کی بانہیں پھیل گئیں اور وہ بھی ان کے سینے سے لگ گئی۔ اس کی آنکھیں برس گئیں۔ اور ان کی بھی۔

"میری جان' میری چندا۔ اچانک کہاں سے آگئی تم ....؟" انہوں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا اور پھر اس کی پیشانی چوم لی۔

"بس آگئی.... آپ خوش ہو گئیں نا اپنی بیٹی کو دیکھ کر۔" محبت نے ماں سے پوچھا۔

"خوش بہت ہی خوش... گویا نئی زندگی مل گئی۔ آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو چین آگیا۔"

"چاچی... چاچی آپ کو کیا ہو گیا ہے؟؟"

"بس کیا بتاؤں... اب آگئی ہو نا تو بہت ساری باتیں بتاؤں گی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو محبت بولا۔

"باتیں تو ہوتی رہیں گی... پہلے کچھ کھا پی لیا جائے کیا خیال ہے؟؟" اس نے دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو چاچی مہراں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ تو محبت نے ملازمہ کو پکار کر کھانا لگانے کا کہا اور اس سے پہلے کولڈ ڈرنک کا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ملازمہ ایک ٹرے میں کولڈ ڈرنک کے تین گلاس رکھے چلی آئی۔ اور کھانا لگانے کے لیے پھر سے کچن میں چلی گئی۔

پھر انہوں نے کھانا کھایا اور وہ تینوں پھر سے باتیں کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔

اس نے مختصر سی ساری کہانی ان کو سنادی تو چاچی ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولیں۔

"عجو بیٹا تم دل چھوٹا نہ کرو۔ جس نے کبھی پلٹ کر بہن کی خبر نہ لی وہ بھانجی کو کیا جانے جس کو اس نے دیکھا بھی نہ ہو۔ جو بھائی ماں پیٹ کا نہ ہوا تو بھانجی کا کیا ہوگا۔ میکا ماں باپ کے دم سے ہوتا ہے۔ بھائی بھابھی ان کے رخصت ہوتے ہی بہنوں سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ ان کا سارا جھکاؤ سسرال والوں کی طرف ہوتا ہے اور جو بیویاں چاہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ بہن بھائی ابھی طرح سے ایک دوسرے کا خیال رکھیں اور ملتے جلتے رہیں میں یہاں اپنے علاج کے لیے آئی تھی' لیکن محبت کے روشن مستقبل کے لیے اسے شہر کے اچھے اسکول میں داخل کروادیا۔ صحت مند ہونے کے بعد کئی بار دل چاہا کہ گاؤں واپس آجاؤں لیکن محبت کا روشن مستقبل شہر میں تھا گاؤں میں نہیں۔ بس یہ ہی سوچ پیروں کی زنجیر بن جاتی۔ محبت نے بہت محنت کی آج اس مقام پر آکھڑا ہوا ہے۔ اسکول جانے سے پہلے اخبار بیچتا پھر اسکول سے آکر ایک فیکٹری میں کام کرتا۔ یوں اخراجات پورے ہو رہے تھے۔ میٹرک کے بعد اسے ایک میڈیکل اسٹور پر ملازمت مل گئی۔ دس سے پانچ بجے تک۔ اس نے نائٹ کالج میں داخلہ لے لیا اور میڈیکل اسٹور پر جانے سے پہلے ایک دو جگہ ہوم ٹیوشن کرنے لگا۔ محبت کو ان تھک محنت کرتا دکھ کر دل کٹتا۔ لیکن اس کی محنت رنگ لائی اور یہ ہر کلاس میں ٹاپ کرتا رہا۔ جب یہ بی کام میں تھا کہ اس کی نانی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔ بی کام میں بھی اس نے ٹاپ کیا تو اس کے ساتھ ہی اس نے مختلف جگہوں پر نوکری کے لیے درخواستیں دینا شروع کردیں اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ ہمارا گزارہ بہت اچھا ہونے لگا۔ لیکن محبت نے تعلیم کو خیرباد نہ کہا اور ایم بی اے کرلیا اور ہر بار کی طرح اپنا تعلیمی ریکارڈ قائم رکھا۔ اسی کمپنی میں اس کی پرموشن ہوگئی تنخواہ بہت اچھی ملنے کے ساتھ کمپنی کی طرف سے گھر اور گاڑی مل گئی اور سکھ کے دن آئے۔ لیکن یہ سب محبت کی دن رات کی محنت سے ممکن ہوا تھا۔ اور اللہ نے بھی اس محنت کا صلہ دیا۔ اس کے ساتھ اس کا ناتا کاغذ قلم سے بھی جڑ گیا۔ پتا نہیں کیا کچھ لکھتا رہتا ہے۔"

"لیکن اس ساری کہانی میں میرا ذکر کیوں نہیں آیا۔ مجھے بھول گئے تھے آپ دونوں؟؟" اس کے لبوں سے شکوہ پھسل گیا۔

"نہیں..." اسی بے ساختگی سے محبت کے لبوں سے بھی نکلا۔ تب چاچی نے اسے دیکھا اور عجو سے گویا ہوئیں۔

"بھولا تو اسے جاتا ہے، جو دل میں نہ ہو۔ تم دل سے ایک لمحے کو جدا نہ ہوئیں۔ بس حالات ہی کچھ ایسے رہے... لیکن اب تم نہ بھی ملتیں تو ہم ضرور آتے۔ تین چار روز سے محبت کو کہہ رہی تھی مجھے گاؤں لے چلو... ایک بار سب سے مل لوں اور تم تو میرے دل کا چین ہو... ایک بار تم سے... تمہاری ماں سے ملنا چاہتی تھی کہ تمہیں اپنے..." ایک دم وہ خاموش ہو گئیں... اس نے دیکھا محبت کے لبوں پر بڑی شریر سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ لیکن وہ ان کی ادھوری بات نہ سمجھ سکی اور نہ ہی محبت کی معنی خیز مسکراہٹ۔

جب موذن کی آواز سنائی دی تو وہ نماز کے لیے اٹھ گئیں۔ تب وہ دونوں اکیلے رہ گئے..... کچھ دیر تک تو ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی پھر اس خاموشی کو عجو نے ہی توڑا۔

"محبت تم بھی.....؟"

"نہیں عجو میں تمہیں بھولا نہیں کبھی نہیں۔ کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرا جس پل تم کو یاد نہ کیا ہو تم میری بچپن کی ساتھی، میری دوست میری محبت ہو۔ کیسے بھول سکتا تھا پھر تمہیں..... اگر ایسا کرتا تو کوئی ایک رشتہ تو میرا ہاتھ پکڑ کر میرے پیروں کی زنجیر بن جاتا۔ لا شعوری طور پر بھی میں کبھی نہیں بھلا پایا تمہیں عجو....."

وہ اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ اب وہ اس سے کیا بولے گی۔ "میرے دل و دماغ پر تم چھائی رہی ہو..... کہ نجانے کس حال میں ہو گی اور تمہارے ابا کا رویہ تم سے تبدیل ہوا ہو گا کہ نہیں۔ اور تم اپنا دکھ درد کس سے شیئر کرتی ہو گی۔ بہت بار چاہا شدت سے 'دل کیا تم سے ملنے کو..... لیکن تمہارے ابا اور دادی کے خیال نے کبھی ہمت نہ کرنے دی کہ میں تو ملنے چلا آتا لیکن اس کے بعد تمہارے لیے کتنی مشکلات کھڑی ہو جاتیں..... اور گاؤں والے باتیں بنانے میں ویسے بھی ماہر ہیں نجانے تمہارے لیے کتنے افسانے بناتے۔ یہ ہی سوچ ہر بار میرے قدم روک لیتی اور اپنی اس بے بسی پر میری آنکھیں بھیگ جاتیں۔ تم اتنی شدت سے یاد آتیں کہ میں خود سے باتیں کرنے لگتا..... اور جانتی ہو کیا کہتا.....؟"

"نہیں....." اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"عجو اتنی شدت سے یاد نہ آیا کرو....."

"محبت....." عجو کی آواز بھیگ رہی تھی۔

"م.....ح.....ب.....ت" کھونا۔ اس کے لہجے میں شدتیں تھیں بے قراری اور بے چینی تھی۔

"کیا..... تم....."

"ہاں مجھے آج بھی یاد ہے تم مٹی پر میرا نام لکھا کرتی تھیں۔" م.....ح.....ب.....ت..... اور میری قلم سے چھڑکی جانے والی سیاہی کی بوندیں مٹی میں جذب ہو جاتیں تو تم ان موتیوں کو بہت احتیاط سے اٹھاتیں اپنی چھوٹی سی ہتھیلی پر "بہت خوب صورت "م" بنایا کرتیں..... اور جانتی ہو یہ سب تم انجانے میں کرتی تھیں۔ لاشعوری طور پر یہ حرکتیں سرزد ہوتی تھیں تم سے..... لیکن میں سب دیکھتا تھا کہ تم کیا کر رہی ہوتی تھیں۔ لیکن میں بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ محبت ہے..... جو ہمارے دلوں میں پھوٹی تھی۔ ایک نئی کونپل پھوٹی تھی اور گزرتے وقت کے ساتھ تناور درخت بنا گئی۔ مجھے بھی بہت دیر سے احساس ہوا کہ اس جذبے کا نام "محبت" ہے اور عجو کو "محبت" سے محبت ہو گئی تھی ہے نا حیرت انگیز بات....." وہ اسے گم صم دیکھ کر بولا۔ جو اپنی موٹی موٹی آنکھوں میں حیرت بھرے اسے تکے جا رہی تھی۔

"ان جھیل سی آنکھوں میں میری محبت کے چراغ روشن ہیں اور ان نین کٹوروں میں میرا عکس دکھائی دے رہا ہے....."

اس نے بہت گہرے اور انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا..... اس نے دیکھا محبت کی آنکھوں میں بھی اس کی محبت کے دیے جل رہے تھے۔ ان کی لو دہک رہی تھی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری غیر اختیاری حرکتوں سے تم واقف تھے۔ اور آج تک یاد رکھے ہوئے ہو۔" اس کے لہجے میں انبساطی خوشی تھی۔

"میرے خلوص، میری محبت میں کبھی کمی نہیں آئی تمہارے لیے محبت۔ اس دل پر جو نام ثبت ہوا تھا۔ وہ اتنا گہرا ہے کہ اسے مٹانا کبھی میرے بس میں نہیں رہا۔" اس نے صاف گوئی سے اپنی محبت کا اقرار کیا۔

"میں بھی اس بات کا قائل ہوں عجو کہ محبت شدید تر ہونی چاہیے..... تم..... عجو تم میری محبت ہو۔ میں نے دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ چاہا ہے۔" اس سے اس کی آنکھوں کے کنول میں موتی سے چمکنے لگے..... اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا تو وہ اس کو دیکھتی رہ گئی۔

"میں بس تم سے اتنا کہوں گا تم میرے ساتھ خوش رہو گی اگر مجھے قبول کر لو تو۔۔۔" اس نے عجو کے چہرے کے تاثرات کو بہت غور سے دیکھا۔۔۔ اس کے گالوں میں حیا کی سرخی گھل گئی تھی اور پلکیں خود بخود جھک گئی تھیں۔

"لیکن اس سلسلے میں آپ کو ابا سے بات کرنی ہو گی۔ میں اپنے والدین کے فیصلے کو دل سے قبول کروں گی۔۔۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"لیکن تمہاری اپنی بھی تو کوئی مرضی ہونی چاہیے ناں۔۔۔ تم کوئی جواب دو گی تو ہی میں امی سے بات کروں گا اور پھر تمہارے والدین سے۔۔۔" اس کا لہجہ شرارت کی چغلی کھا رہا تھا۔ وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔ معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اس کے لیے ابا کے جواب کا انتظار کرنا پڑے گا اور میں اس فیصلے پر بہت خوش ہوں گی جو وہ میرے لیے کریں گے۔"

"عجو تمہیں بہت گہری باتیں آ گئی ہیں۔"

"اس لیے کہ تم بہت گہری باتیں لکھنے لگے ہو اور میں بولنے لگی ہوں۔"

"ہوں یہ بہت اچھا ہو گیا۔۔۔ تم بولا کرنا۔۔۔ میں لکھا کروں گا۔۔۔"

"مگر اس کے لیے پہلے فیصلے کا انتظار کرنا ہو گا تمہیں۔"

"ٹھیک ہے عجو۔۔۔ میں آخری سانس تک انتظار کر سکتا ہوں۔" تو وہ دونوں ایک ساتھ مسکرا دیے اور بچپن کی باتیں پھر سے یاد کرنے لگے۔ اتنے میں چاچی مہراں بھی نماز تسبیح سے فارغ ہو کر آ گئیں اور ان کے ساتھ گفتگو میں شامل ہو گئیں۔

وہ رات ان کی پرانے قصے کہانیوں میں گزر گئی۔

موذن کی آواز پر ان تینوں نے فجر کی نماز ادا کی اور کچھ دیر کے لیے لیٹ گئے اور لیٹتے ہی ان کی آنکھ لگ گئی۔

صبح گیارہ بجے ان کی آنکھ کھلی۔۔۔ تو فریش ہوئے۔۔۔ ناشتا کیا اور گاؤں کے لیے روانہ ہو گئے۔ تیرہ سال بعد وہ اپنے گاؤں جا رہے تھے۔



جب وہ گاؤں میں داخل ہوئے تو عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ ان رستوں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں وہ بچپن میں ان ہی رستوں پر تو چلتا رہا تھا۔ اس کا لڑکپن ان گلیوں کوچوں میں ہی تو گزرا تھا۔

اس نے گاڑی احمد یار کے گھر کے سامنے روک دی۔ اور خود ڈرائیونگ سیٹ سے آ کر پہلے ماں کی طرف کا دروازہ کھول کر ان کو اتارا اور پھر پچھلا دروازہ کھولا تو عجو باہر نکل آئی اور چاچی مہراں کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگی تو انہوں نے عذرا کے ہاتھ پر دباؤ ڈالا۔ اس نے ان کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔۔۔ ان کی نظریں اپنے خستہ حال گھر پر تھیں جس میں انہوں نے زندگی کی کڑی مسافتیں طے کی تھیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو محبت کی کیفیت ان کے جیسی ہی تھی۔

"چلو۔" چاچی مہراں نے بھیگے لہجے میں کہا تو وہ ان کو لیے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گئی اور ان کے پیچھے محبت۔

ایک ہفتے بعد وہ گھر آئی تھی۔ اس کی ماں ابا کے پائینتی بیٹھی ان کے پیر دبا رہی تھیں۔

آسیہ نے کھٹکے کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا تو عجو کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ مگر ان کے ساتھ کون تھیں وہ پہچان نہ سکی۔

"مہراں۔۔۔" قریب آنے پر اس نے ان کو پہچان لیا۔۔۔ وہ اٹھ کر مہراں کے گلے لگ گئی اور محبت کو پیار کیا۔۔۔ تب عجو کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔۔۔ ابا ٹھیک نہیں تھے۔

"ماں۔۔۔ ابا کو کیا ہوا؟"

وہ چاچی مہراں اور محبت کو بٹھانے میں مصروف تھی اس نے سنا ہی نہیں وہ کیا کہہ رہی ہے۔

"ابا۔۔۔" وہ ان کی طرف مڑی۔ بولنے کی کوشش میں ان کے لب تھرتھرا کر رہ گئے۔ لفظ زبان پر ہی دم توڑ گئے۔

"ماں... ابا..."

"فالج ہو گیا ہے..." آسیہ نے دھیرے سے کہا۔ اس نے کھلے لبوں پر ہاتھ رکھ آواز دبائی۔

"کب...؟"

"تمہارے جانے کے اگلے دن۔ اسلم اور کمال آئے تھے۔ باپ سے خوب منہ ماری کی۔ طعنے دیے۔ اسی ٹینشن میں لے..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک گہری سانس لی۔

"لیکن تم کیوں آ گئی ہو... مہراں اور محبت سے کیسے ملاقات ہوئی؟" اس کے بجائے محبت نے مختصر الفاظ ملاقات کا بتا دیا۔ اور عجو نے یہ کہ ماموں اسے گھر رکھنے پر راضی نہیں تھے۔

"خیر اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے... مگر تمہارے ابا کا علاج..."

"آپ فکر نہ کریں... میں کراؤں گا ان کا علاج... میں لے کر آیا ہوں عجو کو۔"

"وہ بہت مسبب الاسباب ہے۔" انہوں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ابا ان کو دیکھ رہے تھے لیکن بول نہیں پا رہے تھے۔ وہ بے بسی کی آخری حدوں پر تھے۔

"تم بیٹھو میں چائے پانی لے کر آتی ہوں۔" آسیہ نے اٹھتے ہوئے کہا تو چاچی مہراں بولیں۔

"بیٹھی رہو آسیہ... راستے میں پی کر آئے ہیں۔ کوئی گنجائش نہیں۔ جب ضرورت محسوس ہوگی تو بول دیں گے... اپنے گھر آئے ہیں۔" تب ابا نے چارپائی کے ساتھ لگی اسٹک گرادی تو سب اس طرف متوجہ ہو گئے۔

"ابا کیا بات ہے...؟" وہ ان پر جھکتی ہوئی بولی۔

ابا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ معافی مانگی... ان کے پاس الفاظ کے بجائے ندامت کے آنسوؤں کے سوا کچھ نہ تھا۔

"ابا نہیں... میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے والی۔" اس نے ابا کے جڑے ہوئے ہاتھ کھولتے ہوئے کہا۔

چاچی مہراں اٹھیں اور احمد یار کی طرف آئیں۔

"بھائی احمد یار میں عذرا بیٹی کا ہاتھ اپنے محبت کے لیے مانگنے آئی ہوں تم سے۔ اگر میرے بیٹے محبت کو اپنی بیٹی کے قابل سمجھیں تو ہاں کر دیں۔"

انہوں نے بولنا چاہا اور اسی کوشش میں ان کے حلق سے بے ہنگم آواز نکلی۔ انہوں نے سر کے اشارے سے ان کو ہاں کر دی۔ تب چاچی نے محبت کو بلایا اور ان کے سامنے کر دیا۔

تب انہوں نے اشارے میں کچھ کہا جو کوئی نہ سمجھ سکا۔ لیکن آسیہ ان کی بات سمجھ گئی۔ انہوں نے عجو کا ہاتھ پکڑ ان کی طرف بڑھایا... تب ایک بار پھر انہوں نے اشارہ کیا تو آسیہ نے محبت کا ہاتھ بھی ان کے سامنے کر دیا... اور پھر ان کے اشارے پر ہی انہوں نے عجو کا ہاتھ محبت کے ہاتھ میں دے دیا۔ تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

آسیہ اور مہراں گلے لگ گئیں۔ اور مبارک باد دی۔

انہوں نے اپنے کیے کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ زندگی بھر کی محرومیوں کا احساس عذرا کے دل سے دور ہو گیا تھا۔ دل صاف شفاف آئینے کی طرح روشن تھے۔

"ابا کا علاج میں کراؤں گا ماں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا دونوں کو..." محبت نے آسیہ کو کہا۔

"نہیں محبت بیٹا... بیٹی کے گھر جا کر رہنا اچھا نہیں لگتا اور ویسے بھی اب تو اس ماحول کی عادت ہو گئی ہے۔ شہر میں دل نہیں لگے گا۔ یہیں ٹھیک ہیں ہم۔"

"نہیں ماں یہ نہیں ہو سکتا... میں آپ کا بیٹا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے ماں باپ کا خیال رکھوں... ان کے دکھ سکھ کا ساتھی بنوں۔ بے شک آپ شہر میں مستقل نہ رہنا لیکن ابا کے علاج کے لیے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔" انہوں نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

ابا کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو بھر آئے اس احساس کے ساتھ کہ اپنے بیٹوں نے تو بے یار و مددگار

چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب دوسرے کی اولاد اپنے ہونے کا احساس دلا رہی تھی اور ان کی دیکھ بھال اپنا فرض بنا لیا تھا۔

محبت خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھا اور اس کے پیچھے عجو۔ جبکہ وہ دونوں باتوں میں مصروف تھیں۔ وہ عجو کے ساتھ اپنے گھر چلا آیا۔

سال' دو سال بعد نہیں آج تیرہ سال بعد وہ اپنے گھر آیا تھا۔ اتنے گزرے ہوئے سالوں کے دوران وہ گھر نہیں پرانے کھنڈر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بہت سارے چھوٹے چھوٹے پودے اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ گھاس اور جھاڑیاں جن کی تیلیاں ہوا میں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ ٹنڈ منڈ درخت ننگی شاخیں... پتوں کے ڈھیر جو ہلکی ہلکی ہوا سے کانپ رہے تھے۔ کتنا عجیب لگ رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ زمین پر گرے ہوئے بھورے مٹیالے پتوں نے سرسراتے ہوئے تالی بجاتے ہوئے اس کا سواگت کیا تھا... تھرتھر کانپتی گھاس کی باریک تیلیاں جھوم جھوم کر اس گھر کے مکیں کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ وہ ذرا اور آگے بڑھا۔ کمرے کے اوپر ادھوری دیوار کے اوپر آدھی چھت غائب تھی۔ اس کی آنکھوں میں دھند اتر آئی اور اس دھند کی چادر میں لپٹے وہ معصوم دن آنکھوں میں گھوم گئے۔

اس کے قریب کھڑی عجو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ محبت نے یکدم مڑ کر دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔

"عجو..."

آج وہ دونوں اس گھر میں موجود تھے۔ اس گھر میں ان کا بچپن گزرا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بے حد معصوم اور نرم دن ابھرنے لگے۔

پت جھڑ اور بہار کے کئی موسم انہوں نے ساتھ دیکھے تھے۔ بارش میں ساتھ نہائے تھے۔ سردیوں کے بے حد نرم و ملائم دھوپیں سینکی تھیں۔

اسی گھر میں دونوں نے اپنی ایک چھوٹی سی کائنات بنائی تھی۔ اور وہ کائنات آج بھی یوں ہی قائم تھی... وہ ہمیشہ اس کے لوٹ آنے کی منتظر رہی تھی۔ وہ دونوں باتیں کرتے اور کھیلتے تھے۔ اسی گھر میں دونوں کے دلوں میں "محبت" نے جنم لیا تھا اور ان کے اندر مضبوطی سے پنجے گاڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"عجو یہ جگہ اور اس سے وابستہ یادیں میں کبھی نہیں بھولا۔ مجھے ہمیشہ تمہاری تنہائی کا خیال رہا۔ تم ہمیشہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہی ہو..."

"محبت..." اس نے بھرپور لہجے میں کہا۔

"مٹی کے چبوترے پر "م... ح... ب... ت" لکھنے والی معصوم سی بچی ہمیشہ میری انگلی پکڑ کر ساتھ چلتی رہی ہے۔ میں تم سے محبت کرنے لگا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تم کب میرے دل میں گھر کر گئیں... روتے ہوئے' ہنستے ہوئے یا ہتھیلی پر "م" بناتے ہوئے۔ اور جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا تو ساری کائنات میں ماں کے بعد ایک تم ہی مجھے اپنی نظر آتیں۔" کوئی اسے اتنا بھی چاہ سکتا ہے۔ زندگی سے بھی زیادہ... اس کی تمنا اس کی آرزو عجو تھی۔

"عجو مجھے ہر وقت' ہر پل ہر گھڑی تمہارا ساتھ

چاہیے۔ میں نے تیرہ سال تمہاری جدائی کا دکھ سہا ہے۔ اب میں تم سے ایک پل دور نہیں رہ سکتا۔۔۔ میں تمہیں زندگی ہر وہ خوشی دینا چاہتا ہوں جس سے تم محروم رہی ہو۔ جس سے تم بیتے ہوئے دکھ کے دنوں کو بھول جاؤ۔ اور جانتی ہو تمہارے لیے خوشی کے کون سے لمحے ہوتے تھے۔" اس نے عجو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سرہلا دیا۔

"وہ لمحے جو تم میرے اور ماں کے ساتھ گزارتی تھیں۔" اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اس نے اثبات میں سرہلایا تھا۔

"پھر بھی نہیں آئے تم۔۔۔" ایک بار پھر اس کی زبان پر شکوہ آہی گیا۔ لیکن یہ صرف شکوہ نہیں۔۔۔ محبت بھرا سوال تھا۔ عجو کا اپنے محبت سے۔

"تم نہ بھی ملتیں تو اب مجھے آنا ہی تھا کیونکہ تمہاری یاد بہت ستانے لگی تھی۔" اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔

وہ اس کا ہاتھ تھامے مٹی کے چبوترے کی طرف آگیا جہاں وہ دونوں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ وہ وہاں بیٹھ گئے۔

حیرت انگیز بات تھی مٹی کے اس چبوترے پر کہیں کوئی گھاس نہیں تھی۔ اتنے برسوں میں مٹی کا لپا ہوا وہ چبوترا ریت کا ٹیلا بن گیا تھا۔ اس نے عجو کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا۔ ذرا دیر اس کی ہتھیلی پر ایک انگلی سے کچھ لکھتا رہا۔

غیر شعوری طور پر اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی۔

"نہیں عجو نہیں۔۔۔ اب یہ ہاتھ کبھی نہیں چھوٹے گا۔" وہ شرم سے لال ہوگئی۔ اس کے چہرے میں گھلی سرخی بہت دل کش لگ رہی تھی۔

دکھ کے دن گزر گئے تھے۔ سکھ اور محبت نے اس کے من آنگن میں اپنے قدم رکھ دیے تھے۔

سوکھی ٹہنیوں والے درخت کی ننگی شاخوں پر سرخ پتوں والی کونپلیں نکل آئی تھیں اور خوشی سے لہراتی' جھومتی ناچتی ہوئی ٹہنیاں ان پر پھول برسا رہی تھیں۔

پت جھڑ کا موسم گزر گیا تھا۔۔۔ چاروں اور بہار رقصاں تھیں اور تب اس نے محبت کے کاندھے پر سر رکھ کر پلکیں موند لیں اور اس وقت نیم کے پیڑ کی چھاؤں اور بھی گہری اور ٹھنڈی ہوگئی تھی۔

محبت کی "محبت" کا ڈھیروں سکون اس کے اندر اتر آیا تھا۔ اور یہ عجو کی محبت تھی۔ جو بہت حسین اور ہر شے کے سامنے اونچی اور بلند تھی۔ پاکیزہ پاک اور مقدس بھی۔

محبت نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا تو وہ ایک دم کھلکھلا دی۔ اس گھر میں سوئی ہوئی زندگی پھر سے جاگ اٹھی تھی۔۔۔ سامنے کھڑی چاچی مہراں اس کی ہنسی میں ساتھ دے رہی تھیں۔

"چاچی۔۔۔" اس نے محبت کے ہاتھ سے ایک بار پھر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

"میں ہمیشہ یہ ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیکھوں۔۔۔" انہوں نے پیار سے دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہمیشہ دو ہاتھ ایک بن کر رہیں گے۔"

"ان شاء اللہ۔" چاچی مہراں نے نظروں ہی نظروں دونوں کی نظر اتاری۔

وہ یادگار شام زندگی پہلی اور رومانی شام۔ وہ شام اس کی زندگی کی بڑی حسین شام تھی۔

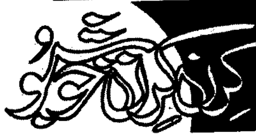
اسے اپنے سب سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔

اسے اپنی منزل مل گئی تھی۔۔۔ گھر۔ اپنا گھر۔۔۔ اپنے گھر کا سکھ۔۔۔ محبوب حسین گھر۔۔۔ جس کے آگے تخت و تاج سب ہیچ تھے۔ اپنے گھر سے بڑھ کر دنیا کا کوئی گھر نہیں ہوسکتا۔ دل میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ وہ محبت کے ساتھ ہواؤں میں رقص کررہی تھی۔

گھر دیواروں چھتوں سے نہیں بنتے۔ سائبان سے بنتے ہیں۔ زندگی کا اصل مالک تو سائبان ہی ہوتا ہے۔

✡ ✡

شعاع عمیر



القرآن

(میدان جہاد میں) تیز دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپتے ہیں(1) پھر جو پتھروں پر سم مار کر چنگاریاں نکالتے ہیں۔(2) پھر جو صبح ہوتے ہی (دشمن پر) اچانک حملہ کر ڈالتے ہیں(3) پھر وہ اس (حملے والی) جگہ سے گرد و غبار اڑاتے ہیں(4) پھر وہ اسی وقت (دشمن کے) لشکر میں گھس جاتے ہیں(5) بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے(6) اور یقیناً" وہ اس (ناشکری پر) خود گواہ ہے(7) اور بے شک وہ مال کی محبت میں بہت سخت ہے(8) تو کیا اسے معلوم نہیں جب وہ (مردے) اٹھائیں جائیں گے جو قبروں میں ہیں؟(9) اور (راز) ظاہر کردیے جائیں گے جو سینوں میں ہیں؟(10) بے شک ان کا رب اس دن ان (کے اعمال) سے خوب خبردار ہوگا۔(11)

(سورۃ العٰدیت..... آیت 1 سے 11)

قبولیت کا یقین رکھو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

تم اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں دعا کیا کرو کہ تم قبولیت کا یقین رکھا کرو۔ اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غفلت سے بھرے دل سے دعا قبول نہیں کرتا (ترمذی)

سات تباہ کن گناہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سات تباہ کن گناہوں سے بچو"

لوگوں نے پوچھا "وہ کون سے گناہ ہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔(1) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔(2) جادو کرنا۔(3) کسی کو ناحق مارنا(4) سود کھانا(5) یتیم کا مال ہڑپ کرنا۔(6) میدان جہاد سے بھاگ جانا۔(7) نیک عورتوں پر تہمت لگانا۔

(بخاری، مسلم، ابوداؤد، سنن النسائی)

بے وقوف کی پہچان

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: تین موقعوں پر احمق کی پہچان ہوتی ہے۔

1۔ جس چیز میں کچھ حاصل نہ ہو اس میں گفتگو کرنے سے۔

2۔ جس چیز کے بارے میں پوچھا ہی نہیں اس کا جواب دینے سے۔

3۔ اپنے امور میں لاپروا ہونے سے۔

اقرا افضل جٹ..... منچن آباد

خیال دل

☆ محبت کا رشتہ جتنا مضبوط ہے اتنا ہی نازک، ایک معمولی سے دراڑ بھی اس کی بنیادوں کو ہلا دیتی ہے۔

☆ دنیا اگر ہاتھ سے نکل جائے تو بندہ غریب ہو جاتا ہے۔ اگر یہ دنیا دل سے نکل تو بندہ ولی بن جاتا ہے۔

☆ اچھے وقت سے زیادہ اچھے دوست کو عزیز رکھا کرو کیونکہ اچھا دوست برے وقت کو بھی اچھا بنا دیتا ہے۔

سیدہ نسبت زہرا..... کھڑوڑ پکا

فیصلہ کرنے کا طریقہ

گاندھی جی نے ایک بار قائد اعظم سے پوچھا۔

"آپ اپنے سیاسی فیصلے کیسے کرتے ہیں؟"

قائد اعظم نے جواب دیا۔ "میں اپنے فیصلوں کا فارمولا بتانے سے پہلے آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے سیاسی فیصلے کیسے کرتے ہیں۔"

گاندھی جی نے کہا۔ "ہاں بتائیے۔"

قائد اعظم نے فرمایا۔ "آپ سیاسی میدان میں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے یہ معلوم کرتے ہیں کہ لوگوں کا موڈ' مزاج اور رائے کیا ہے؟ جب آپ کو لوگوں کی رائے معلوم ہو جاتی ہے تو آپ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی رائے کے مطابق اپنا فیصلہ سناتے ہیں جب کہ میں ہمیشہ اس کے برعکس فیصلہ کرتا ہوں۔"

گاندھی جی نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

قائد اعظم نے فرمایا۔ "میں صرف یہ دیکھتا ہوں کیا صحیح ہے اور کیا غلط اس کے بعد جو صحیح ہوتا ہے میں اس کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہوں۔"

گاندھی جی نے پوچھا۔ "کیا لوگ آپ کے اس نوعیت کے فیصلوں کو تسلیم کر لیتے ہیں۔"

قائد اعظم نے فوراً" جواب دیا۔ "نہیں لوگ شروع میں میرے ان فیصلوں کی بھرپور مخالفت کرتے ہیں لیکن میں سچ پر ڈٹا رہتا ہوں یہاں تک کہ میرے فیصلوں کے مخالف آہستہ آہستہ سچائی کو تسلیم کر لیتے ہیں اور وہ بھی میرے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔" قائد اعظم نے فرمایا۔ "ایک صحیح فیصلہ ایسے ہزاروں فیصلوں سے بہتر ہوتا ہے جو صرف لوگوں کو خوش کرنے کے لیے کیا جائے۔"

فوزیہ ثمروٹ۔۔۔ گجرات

بلھے شاہ

دل نوں لگ جان روگ تے کی کریئے
کسی دی یاد وچ اکھیاں رون تے کی کریئے
سانوں تے ملن دی آس رہندی اے ہر ویلے بلھیا
جے یار ہی بھل جان تے کی کریئے

صدف سمیع۔۔۔ کراچی

امام شافعی

☆ جب کام زیادہ ہوں تو سب سے پہلے اہم کام شروع کرو۔

☆ دنیا کو مرغوب رکھنے والا دنیا والوں کا غلام بن جاتا ہے۔

☆ جو تمہارے سامنے دوسروں کی برائی کرتا ہے وہ دوسروں کے سامنے تمہاری برائی بھی بیان کرتا ہوگا۔

ثنا شہزاد۔۔۔ کراچی

جگاڑ

ناسا نے مریخ پر جانے کے خواہش مند افراد کے انٹرویو لینے کا فیصلہ کیا۔ صرف ایک ہی آدمی جا سکتا تھا اور واپسی کا کوئی بندوبست بھی نہیں تھا۔ جانے والے شخص کو اپنی خوراک اور پانی ساتھ لے جا کر بقایا زندگی مریخ پر رہ کر زمین والوں کو معلومات فراہم کرنی تھیں۔

سب سے پہلا امیدوار پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھا۔ چند رسمی سوالات کے بعد اس سے دریافت کیا گیا کہ وہ سفر کا معاوضہ کتنی رقم تک وصول کرنے کی توقع کر رہا ہے۔

"ایک ملین ڈالر اور یہ ساری رقم میں خلائی تحقیق کے ادارے کو ڈونیٹ کر کے جاؤں گا۔ یہ میرا زمین کو آخری تحفہ ہوگا۔"

دوسرا امیدوار پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا اس سے معاوضہ کی بارے میں پوچھا گیا۔ ڈاکٹر نے رسانیت سے جواب دیا۔

"دو ملین ڈالر۔ ایک ملین میں اپنے خاندان والوں کو دے کر جاؤں گا اور ایک ملین ڈالر کینسر کے علاج کی ریسرچ فاؤنڈیشن کو ڈونیٹ کروں گا۔" تیسرا امیدوار پاکستانی تھا ان سے معاوضہ کے بارے میں پوچھا گیا تو پہلے تو ادھر ادھر دیکھا اور انٹرویو لینے والے صاحب کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر سرگوشی جتنی آواز میں کہا۔ "تین ملین ڈالر"

انٹرویو لینے والے شخص نے تعجب آمیز نگاہوں

سے سرگوشی کو ملاحظہ کیا اور پھر اتنی ہی آہستہ آواز میں پوچھا۔ "آپ ان دونوں پچھلے امیدواروں سے بھی زیادہ معاوضہ مانگ رہے ہیں۔"

پاکستانی نے نہایت اطمینان سے سرگوشی کی۔ "آپ مجھے تین ملین ڈالر دیں اس میں ایک ملین آپ کا اور ایک ملین ڈالر میرا۔ باقی بچنے والا ایک ملین ڈالر انجینئر کو دے کر اسے مریخ پر بھیج دیں گے۔"

ریما نور رضوان۔۔۔ کراچی

محبت بانو قدسیہ کی نظر میں

☆ محبت میں ذاتی آزادی کو طلب کرنا شرک ہے۔ بیک وقت دو افراد سے محبت نہیں کی جا سکتی۔ محبوب سے بھی اور اپنی ذات سے بھی۔ اس طرح محبت ایک طرح کی غلامی کا عمل ہے۔

☆ اگر کسی سے کچھ مانگنا ہے تو محبت مانگو۔۔۔ محبت مل جائے تو سب کچھ مل جاتا ہے۔۔۔ محبت کے بغیر ہر چیز ایسے ملتی ہے جیسے مرنے کے بعد کفن ملتا ہے۔

ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

دشمن کی موت

کوئی شخص نوشیروان عادل کے پاس خوش خبری لے کر گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے فلاں دشمن کو دنیا سے اٹھا لیا ہے۔ نوشیروان نے کہا۔ "کیا تو نے یہ بھی سنا ہے کہ موت نے مجھے چھوڑ دیا ہے ہمارے لیے دشمن کی موت خوشی کا موقع نہیں ہے کہ ہماری زندگی بھی ہمیشہ نہیں ہے۔"

نشا نورین جاوید۔۔۔ رکھ بھروکی

مصور کا قلم

علامہ اقبال کی ایک ہندو لڑکی پر نظر پڑ گئی۔ لڑکی بہت خوب صورت تھی۔ اقبال بار بار اسے دیکھ رہے تھے کہ لڑکی بولی۔۔۔!

اپنے سے اونچا جو صنم دیکھتے ہیں
زندگی میں رنج والم دیکھتے ہیں

اس پر اقبال نے کہا۔۔۔!

تجھ سے غرض نہ تیری صورت سے غرض
ہم تو مصور کا قلم دیکھتے ہیں

سوچنے کی بات

کسی نے ایک درویش سے پوچھا۔ "دنیا میں سب دکھی کیوں ہیں؟"

درویش نے ہنس کر جواب دیا۔ "خوشیاں سب کے پاس ہیں۔ بس ایک کی خوشی دوسرے کا درد بن جاتی ہے۔"

اقصیٰ ماہ نور ہراج۔۔۔ داؤد والہ تلمبہ

ایجادات

ہم جانتے ہیں کہ ریڈیو مارکونی اور ٹیلی فون گراہم بیل کی ایجاد ہے مگر ہم یہ نہیں جانتے کہ

صابن: حضرت صالح علیہ السلام نے
پل: حضرت یوسف علیہ السلام نے
کشتی: حضرت نوح علیہ السلام نے
سوئی: حضرت ادریس علیہ السلام نے

ایجاد کی۔ ایجادوں کا یہ سلسلہ انبیاء علیہ السلام نے ایجاد کیا تھا۔

کوثر خالد۔۔۔ جڑانوالہ

ریمائنڈر

تم نے کہا تھا
پہلی بارش کے پڑتے ہی
لوٹ آؤ گے۔۔۔!
ہم اور تم مل کر بھیگیں گے
دیکھو جاناں۔۔۔!
کتنی پھواریں بیت چکی ہیں
ساون پھر سے لوٹ آیا ہے
برسوں پہلے کیا تھا تم نے
مجھ سے عہد
نبھا جاؤ ناں
جاناں! لوٹ کے آجاؤ ناں
اب تو لوٹ کے آجاؤ ناں

(وصی شاہ)



بشریٰ محمود



"رباب علی" کی ڈائری میں تحریر

احمد ندیم قاسمی کی

"وطن کے لیے دعا"

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو

یہاں جو سبزہ اُگے وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو

خدا کرے کہ نہ خم ہو سرِ وقارِ وطن
اور اس کے حسن کو تشویشِ ماہ و سال نہ ہو

ہر اک فرد ہو تہذیب و فن کا اوجِ کمال
کوئی ملول نہ ہو کوئی خستہ حال نہ ہو

خدا کرے کہ میرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو زندگی وبال نہ ہو

"فاطمہ کنول" کی ڈائری میں تحریر

فرحت عباس شاہ کی نظم

"تم، ساون اور رنگ"

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ...
دریاؤں میں بھی پانی نہیں آتا
کبھی ایسا بھی لگتا ہے کہ
آنکھوں کے سمندر میں کسی نے ریت بھر دی ہے
اور کبھی کوئی کہانی
بس کسی روٹھے ہوئے پل کی کہانی ایک سیلِ آب
بھر دیتی ہے شریانوں کے صحرا میں
وہ برستی ہوئی
وہ نیلی شام جو میں نے تیری جھلک آنکھوں میں
گزاری تھی
میری اس خشک سالی میں بلا کا معجزہ تھی
اور اس دن میں نے اپنے دل کی آنکھوں کو بہت
سرسبز پایا تھا
تیرے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو
تیرے زخموں پر گرتے تھے تو لگتا تھا
دکھوں پہ رنگ اترے ہیں
تجھے معلوم ہے، یہ تشنگی مر بھی تو جاتی ہے
مگر اس پل
میں اپنی تشنگی کو پھر سے زندہ دیکھ کر لوٹا
تو کتنے ہی دن تیری بھیگی ہوئی آنکھوں کا
عالم یاد کر کر کے بہت رویا، بہت رویا
میرے اشکوں نے اس دن
میری پیلی روح کے جنگل میں
کتنے جل مرے پیڑوں کو پھر سے زندگی دی تھی
وہ برستی ہوئی
وہ نیلی شام کتنی سبز تھی
یہ تو کوئی اس درد سے پوچھے
جو خوابوں اور خیالوں کی ہر اک کونپل پہ
مہکی خوشبوؤں سے پھوٹ آیا ہے

سدرہ بتول، کی ڈائری میں تحریر

شکیل بدایونی کی غزل

غم عاشقی سے کہہ دو رہ عام تک نہ پہنچے
مجھے خوف ہے یہ تہمت تیرے نام تک نہ پہنچے

میں نظر سے پی رہا تھا تو یہ دل نے بد دعا دی
تیرا ہاتھ زندگی بھر کبھی جام تک نہ پہنچے

یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک
مگر ایسی بے رخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے

جو نقاب رخ اٹھا دی تو یہ قید بھی لگا دی
اٹھے ہر نگاہ لیکن کوئی بام تک نہ پہنچے

نئی صبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈر ہے
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے

وہی اک خموش نغمہ ہے شکیل جان ہستی
جو زبان پر نہ آئے جو کلام تک نہ پہنچے

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر

جاوید اختر کی نظم

کبھی یوں بھی تو ہو

کبھی یوں بھی تو ہو
دریا کا ساحل ہو، پورے چاند کی رات ہو
اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو
پریوں کی محفل ہو، کوئی تمہاری بات ہو
اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو
یہ نرم ملائم ٹھنڈی ہوائیں
جب گھر سے تمہارے گزریں
تمہاری خوشبو چرائیں میرے گھر لے آئیں
کبھی یوں بھی تو ہو
سونی ہر منزل ہو، کوئی نہ میرے ساتھ ہو
اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو
تنہائی ہو دل ہو
بوندیں ہوں، برسات ہو
اور تم ہو

ندا یاسر، کی ڈائری میں تحریر

کشور ناہید کی غزل

کبھی نظر تو آ، تسکین اضطراب تو دے
مری کھلی ہوئی آنکھوں کو کوئی خواب تو دے

جواز ڈھونڈ نہ برسوں کی رنجشوں کا مگر
قریب آ کے تماشائے اجتناب تو دے

کبھی تو سنگ صدا توڑ دے سکوت وفا
کبھی وہ خواب میں آ کر دم سراب تو دے

میں زخم تشنہ لبی سے لپٹ کے رو لوں گی
نہ دے سکون وفا، پھر اضطراب تو دے

نہ چھین ہم سے ہی یک گونہ لذت تدبیر
نسیم مسند گل، عرصۂ حباب تو دے

بچھڑ کے ملنے میں لذت سہی مگر ناہید
کبھی تو وصل مسلسل کا ہی عذاب تو دے



شگفتہ سلیمان



نمرہ، اقرا — کراچی

کیوں ڈال کے پھرتے ہو نقابوں پہ نقاب
بے عیب ہے چہرہ دکھا کیوں نہیں دیتے

نادیہ، عظمیٰ — فیصل آباد

بھول جانا، بھلا دینا، فقط وہم ہی تو ہے
دلوں سے کب نکلتے ہیں محبت جن سے ہو جائے

ندا، نغمہ — لاہور

ابھی تک یاد کر رہے ہو پاگل ہو تم قسم سے
اس نے تو تیرے بعد بھی ہزاروں بھلا دیے

آسیہ جاوید — علی پور چٹھہ

دشمنوں کے ستم کا خوف نہیں
دوستوں کی وفا سے ڈرتے ہیں

شاہینہ عارف — اورنگی ٹاؤن

کیا حسین خواب محبت نے دکھایا
کھل گئی آنکھ تو تعبیر پہ رونا آیا

عاصمہ ندیم — کراچی

راستے کہاں ختم ہوتے ہیں زندگی کے سفر میں
منزل تو وہاں ہے جہاں خواہشیں تھم جائیں

سعدیہ، مریم — شریف آباد

برباد کرنے کے اور بھی راستے تھے فراز
نجانے انہیں محبت کا ہی خیال کیوں آیا

مدیحہ فہیم — مدینہ کالونی

مخلص ہر کسی کے ساتھ رہتا ہوں
شاید اسی لیے خالی ہاتھ رہتا ہوں

رخسانہ نسیم — شور کوٹ

لوگ پتھر کے بتوں کو پوج کر بھی معصوم رہے فراز
ہم نے اک انسان کو چاہا اور گناہ گار ہو گئے

نغمہ نور — روہڑی

تجھ سے بچھڑ کے بس اتنا ہوا دوست
تیرا کچھ گیا نہیں، میرا کچھ بچا نہیں

ندا یاسر — جہلم

زندگی کو ایک لمحہ صبر نہیں
شاید کہ اس کو اب میری قدر نہیں
ہر سفر میں میرا کبھی ہمسفر تھا وہ
اب سفر ہوا ہے مگر وہ ہمسفر نہیں

فرمین ظفر — کراچی

ہم کسی کو اپنی مرضی سے چاہ تو سکتے ہیں
لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم مجھ سے محبت کرو

نادیہ یاسر — کراچی

نہ کہا کرو ہر بار ہم چھوڑ دیں گے تم کو
نہ ہم اتنے عام ہیں نہ تیرے بس کی بات ہے

سدرہ عالم — فیصل آباد

ہم ہی نہیں شامل اس جرم محبت میں
نظریں جب بھی ملتی تھیں مسکرایا تم بھی کرتے

لبنیٰ خاور — فیصل آباد

کبھی ہم بھیگتے ہیں چاہتوں کی تیز بارش میں
کبھی برسوں نہیں ملتے کسی ہلکی سی رنجش میں
بہت سے زخم ہیں دل میں مگر اک زخم ایسا ہے
جو جل اٹھتا ہے راتوں میں جو دیتا ہے بارش میں

ثمینہ اعجاز — خان پور

موسم تھا بے قرار تمہیں سوچتے رہے
کل رات بار بار تمہیں سوچتے رہے
بارش ہوئی تو گھر کے دریچے سے لگ کے ہم
چپ چاپ سوگوار تمہیں سوچتے رہے

گلناز ابراہیم — جلال پور پیروالا

الفاظ سے مالا مال ہے
کچھ لہجوں کا بھی کمال ہے
یہ تنہائی کا موسم یونہی نہیں دانش
یہ میرے اپنوں کے خلوص کی مثال ہے

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

عورت

"عورت چاند کی طرح نہیں ہونی چاہیے جسے ہر کوئی بے نقاب دیکھے بلکہ مسلمان عورت تو سورج جیسی ہونی چاہیے جسے دیکھنے سے پہلے ہی آنکھیں جھک جائیں۔"

(مجھے ہے حکم اذاں۔ ام مریم)
طیبہ خان۔۔۔ نواب شاہ

اقتباس

"میں نہ پاگل ہوں نہ دیوانہ۔ میرے راستے الجھ گئے ہیں ایک راستہ اپنی طرف بلاتا ہے تو دوسرا اپنی طرف کھینچتا ہے۔"

"تو کوئی ایک راہ کیوں نہیں اختیار کرلیتے اللہ یار۔"

"کیسے۔۔۔ کیسے کروں اختیار۔ ایک راستہ بالکل بند ہے جتنا بھی چلوں چلتا جاؤں۔۔۔ وہ بند ہی ملے گا ادھر جانے پر اختیار نہیں اور دوسرا راستہ۔۔۔ مجھے اپنا آپ اس پر چلنے کے قابل نہیں لگتا بڑی مشکل راہ ہے بڑا اوکھا پینڈا ہے۔ میں تو اس راہ پر ذرا سا چل کر ہی ہمت ہار بیٹھا ہوں۔ اور وہ جھونپڑی والا بابا کہتا تھا۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے۔۔۔ وہ راہ تمہاری نہیں۔۔۔ وہ بند گلی تھی یہ راہ تمہاری ہے اسی پر چل کر منزل پاؤ گے۔ پر مجھے تو سمجھ میں نہیں آتی کون سی راہ پر چل کر منزل ملے گی اور وہ اوپر آسمانوں پر بیٹھا مجھ پر ہنستا ہے۔ میرے اندر تو عجب طرح کی آگ لگی ہے۔ آگ جو جلاتی ہے اور راکھ کرتی ہے۔"

بات کرتے کرتے وہ پھر کھو گیا تھا اور ہاتھوں کی انگلیوں سے زمین پر لکیریں بنانے لگا تھا۔ لکیریں جو راستے تھے۔۔۔ راہیں تھیں لیکن ہر راہ بند ملتی تھی۔

(بار وفا۔۔۔ نگہت سیما)
سیدہ بتول فاطمہ۔۔۔ چکوال

موسم

میں اسے ناامید نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ امید کے آخری سرے پر بے یقینی ڈیرہ ڈالے ہوتی ہے۔ بے یقینی کتنی بری چیز ہے اس کا دکھ کتنا گہرا ہوتا ہے آنکھیں بنجر کردیتا ہے دل کو پتھر کردیتا ہے۔ باہر کی دنیا میں خواہ کوئی بھی موسم ہو مگر دل کی دنیا میں ایک موسم ٹھہر جاتا ہے۔ ہجر کا موسم اور آنکھوں میں برسات کا موسم اور پھر چاہے کچھ بھی کرلو یہ رت بدلتی ہی نہیں۔

(صائمہ شاہد۔۔۔ شہر دل کی گلیوں میں)
صائمہ مشتاق۔۔۔ بھاگٹانوالہ سرگودھا

گہوارہ

ایک عورت کی گود میں جب بچہ آتا ہے تو اس پر نبیوں اور ولیوں جتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک ایسا فرض جس میں غفلت کی گنجائش نہیں ہے۔ جب ایک انسان کو پرورش کے لیے' تربیت کے لیے ایک دوسرا انسان دیا جاتا ہے تو جیسے کل انسانیت کی لگام اس کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہیں کہ اسے ابلیس بنادو کہ کل انسانیت کے لیے وبال بن جائے یا وہ بندہ جو اپنے آگے اور پیچھے اور دائیں بائیں خیر کی روشنی بکھیرتا چلا جائے۔ سارے انسان خیر ہوتے ہیں امر حسن۔۔۔ بس ان کی پرورش کے جو گہوارے ہوتے ہیں وہ انہیں کچھ کا کچھ بنادیتے ہیں۔ یہ سب پھول ہوتے ہیں بس ہم ہی انہیں توڑ کر مسل کر اپنی مرضی کے کیچڑ میں پھینک دیتے ہیں۔

(سمیرا حمید۔۔۔ یارم)
ممتاز مظہر۔۔۔ گجرانوالہ

کتبے

کیا قبروں پہ کتبے لگانے ضروری ہوتے ہیں؟ جن لوگوں کی پہچان ہمیں ان کی زندگی میں نہیں ہوتی' تو مرنے کے بعد ان کی قبروں کو نشانیاں دینے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ ہم نے ان کی قبروں کو ڈھونڈ کے کون سی ایسی خوشی دینا ہوتی ہے جو ان کی ساری زندگی کے دکھوں کا مداوا کر سکے؟ تمہیں نہیں لگتا ہمیں کتبوں کو زندہ لوگوں پہ نصب کرنا چاہیے تاکہ ان کی پہچان ہم ان کے جیتے جی ہی کر سکیں۔ پھر شاید انہیں قبروں تک پہنچنے کی اتنی جلدی نہ ہو۔

(مصباح مشتاق۔۔۔ پتھر کرو دو آنکھ میں)

شاہدہ عامر۔۔۔ کراچی

غلام

ہندوستان آزاد ہو گیا تھا۔ پاکستان عالم وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا تھا' لیکن انسان دونوں مملکتوں میں غلام تھا۔ تعصب کا غلام۔۔۔ مذہبی جنون کا غلام۔۔۔ حیوانیت و بربریت کا غلام

(سعادت حسن منٹو۔۔۔ مرلی کی دھن)

مسرت۔۔۔ کراچی

شروعات

کبھی نماز میں دل لگتا ہے' کبھی نہیں لگتا' کبھی ذہن میں سکون ہوتا ہے' کبھی انتشار' کبھی وسوسوں کا ہجوم ہوتا ہے' کبھی پریشان خیالیاں حملہ آور ہوتی ہیں۔ نماز کے وقت یکسوئی شاذونادر ہی نصیب ہوتی ہے۔ اس سے دل میں یہ کھٹک رہتی ہے کہ "ایسی ناقص نماز کا کیا فائدہ جو صرف اٹھک بیٹھک پر مشتمل ہو" رفتہ رفتہ ایک بات سمجھ میں آئی کہ عمارت کی تعمیر کے لیے ابتدا میں تو صرف بنیاد مضبوط کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے خوش نما ہونے کے پیچھے نہیں پڑتے اس میں روڑے پتھر وغیرہ بھر دیتے ہیں اور بعد میں اس پر عالی شان محل اور بنگلے تعمیر ہوتے ہیں۔ اس طرح ناقص عمل کی مثال بھی کامل عمل کی بنیاد کے مترادف ہے۔ بنیاد کی خوب صورتی اور بد صورتی پر نظر نہ کی جائے جو کچھ جس طرح بھی ہو' کرتا رہے۔ جیسے نماز گویا ناقص ہی ہو' مگر ہو حدود میں وہ ہو جاتی ہے۔ اسی پر عمل کرنے سے نماز کامل کا دروازہ بھی اپنے پر کھولنا شروع ہو جاتا ہے۔

(قدرت اللہ شہاب۔۔۔ شہاب نامہ)

شازیہ اعجاز۔۔۔ فیصل آباد

بولنا

شیطان سب سے اچھا فرشتہ تھا' مگر وہ تب بنا جب وہ بول پڑا' اسی لیے پیدا ہونے والے بچے فرشتے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں بولنا نہیں آتا اور جوں ہی وہ فر فر بولنا شروع کرتے ہیں ماں باپ کہتے ہیں یہ شیطان ہو گئے۔

(ڈاکٹر یونس بٹ۔۔۔ شیطانیاں)

افشاں سمیع۔۔۔ کراچی

سارا جیون عبادت

"ساری عمر دہری عبادت کی جیون! قلب سے بھی اور ہاتھ سے بھی۔ اسی لیے تو کہتا ہوں عبادت کا حکم ہر وقت ہے۔ پانچ وقت تو حاضری لگانی ہوتی ہے۔ باقی عبادت تو سارا دن چلتی ہے"

جیون: "لیکن چاچا ہمہ وقت کیسے ہو سکتا ہے اللہ کا ذکر۔۔۔؟"

"جب تو ہل چلاتا ہے' عبادت کرتا ہے۔ جب میں صراحی' گل دان' تھال میں گل بوٹے بناتا ہوں' عبادت ہی تو ہوتی ہے۔ ہاتھوں سے رزق حلال کھانے اور کھلانے والا اور کیا کرتا ہے۔ جیون بیٹا! جب میری جہاں آرا کشیدہ کاری کرتی ہے۔۔۔ روٹی بناتی ہے وہ بھی تو عبادت ہی کرتی ہے۔"

(اشفاق احمد۔۔۔ من چلے کا سودا)

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

✲ ✲



قابل دید

شادی کی پہلی رات شرمائی لجائی دلہن بہت کم بول رہی تھی۔ شوہر نے اپنی بیوی سے رومانٹک ہو کر کہا۔ "دیکھو جان! میں تمہیں ایک بے حد خوب صورت تحفہ دوں گا' اگر تمہاری آواز میرے کانوں میں آئے۔"

اور پھر شادی کے دوسرے سال ہی شوہر کو یہ کہتے سنا گیا۔ "اری نیک بخت' مجھ سے بڑے سے بڑا تحفہ لے لو۔ مگر خدا کے لیے اپنی زبان بند رکھو۔"

عابدہ مغل۔۔۔ مانسہرہ

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں

ایک عورت اپنے شرابی شوہر کو راہ راست پر لانا چاہتی تھی۔ نفسیاتی ڈاکٹر نے اسے مشورہ دیا کہ لڑائی جھگڑے کے بجائے وہ شوہر کے ساتھ پیار و محبت کا برتاؤ کرے۔ ایک رات شوہر نشے میں دھت گھر واپس آیا تو بیوی نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ اس کے موزے اتارے' کپڑے تبدیل کرنے کو دیے اور پھر بڑے پیار سے کہا۔ "ڈیئر! اب تم سو جاؤ۔"

شوہر نے گھبرا کر کہا۔ "جان من! کمال کرتی ہو تم بھی' اگر میں سو گیا تو میری بیوی مجھے کچا ہی چبا جائے گی۔"

حنا کرن۔۔۔ پتوکی

فرائض منصبی

ایک آدمی نے گڑھا کھودا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا آدمی آیا اور اس نے گڑھے میں مٹی ڈال کر اسے بند کر دیا۔ اس طرح کئی دفعہ پہلے آدمی نے گڑھا کھودا اور دوسرے آدمی نے اسے بھر دیا۔

ایک آدمی کافی دیر سے ان کے اس عمل کو دیکھ رہا تھا۔ آخر اس نے قریب جا کر ان سے اس معاملے کی وجہ پوچھی۔

ایک آدمی نے جواب دیا۔ "ہم دونوں سرکاری ملازم ہیں' ہمارا تیسرا ساتھی آج چھٹی پر ہے' جسے ان گڑھوں میں پودا لگانا تھا' وہ نہیں آیا تو کیا ہم بھی اپنی ڈیوٹی انجام نہ دیں۔"

عظمیٰ شفیق۔۔۔ جڑانوالا

حسین سپنے

ایک مریض نے ماہر نفسیات سے کہا۔ "سب سے بڑی مصیبت میرے رنگین خواب ہیں' میں خواب میں ہمیشہ ایک ہی منظر دیکھتا ہوں کہ لڑکیاں اسکول میں ادھر سے ادھر دوڑتی پھرتی ہیں' کچھ کھیل میں مصروف ہو جاتی ہیں اور کچھ ورزش کرنے میں۔۔۔ پھر اچانک اسکول کی گھنٹی بج جاتی ہے اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔"

ماہر نفسیات نے غور سے مریض کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو تم چاہتے ہو کہ میں اپنے علاج سے تمہیں یہ خواب دیکھنے سے روک دوں؟"

ہرگز نہیں! مریض نے سٹپٹا کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ اسکول کی گھنٹی بجوانا بند کر دیں۔"

لبنیٰ لقمان۔۔۔ فیصل آباد

قابل دید

ایک نوجوان نے دوست کو بتایا۔ "زیادہ ورزش کی وجہ سے میں اعصابی انتشار کا شکار ہو گیا ہوں۔"

دوست نے مشورہ دیا۔ "تو پھر تم ورزش نہ کیا کرو۔"

نوجوان بولا۔ "ورزش میں نہیں' سامنے فلیٹ میں رہنے والی شوخ و شنگ حسینہ کرتی ہے۔"

اریبہ شہزاد۔۔۔ آزاد کشمیر



مدیر کرن



عطیہ ذیشان..... قطر

میرا تعلق قطر سے ہے اور پاکستان پڑھنے کے لیے آئی ہوئی ہوں۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کچھ تفریح بھی تو اسٹوڈنٹ کا حق ہے اور ہماری تفریح کرن کو پڑھنا ہی ہے۔ اب بات کروں گی کہانیوں کی "من مورکھ" ایک ایسی کہانی ہے جس میں حازم کا کردار بہت پسند آیا۔ حازم کے باپ نے اس کی ماں کے ساتھ بہت برا کیا جب عمر کی نقدی ختم ہونے کے قریب ہوتی ہے تو معافی یاد آتی ہے یہ بھی انسانی وصف ہے "راپنزل" میں تنزیلہ ریاض کا ہر کردار اپنے اندر ایک دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔ "مہجور نشیمن" مصباح علی سید نے بھی کہانی پر اپنی گرفت مضبوط رکھی ہوئی ہے۔ اور کہانی بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ "بیلا" میں منشا علی نے ایک خوب صورت نہیں بلکہ ذہین لڑکی کی کہانی کو پیش کیا ہے جو شہر میں پڑھنے کے لیے گاؤں سے آئی ہے۔ "رت پیار کی" اور "گلاب موسم" دونوں کی کہانیاں ملتی جلتی لگیں۔ افسانے سارے اچھے تھے۔ آخر میں اتنا کہوں گی کہ کوئی ای میل ایڈریس دیں کہ ہم لیٹرز وہاں پر میل کرسکیں۔

ج: پیاری عطیہ! آپ پہلی مرتبہ ہماری محفل میں شریک ہوئی ہیں بہت بہت شکریہ۔ آپ نے کہانیوں پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ ناول کا نام "گلاب موسم" نہیں بلکہ "گلاب دل" ہے شاید یہی غلطی ہوئی ہے جو آپ کو "رت پیار کی" اور "گلاب دل" کی کہانیاں ایک جیسی لگیں جبکہ ان دونوں کی کہانیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ای میل ایڈریس کرن ڈائجسٹ میں موجود ہے آپ وہاں سے دیکھ کر اپنا خط میل کرسکتی ہیں۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ پاکستان تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئی ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائے آمین۔

ثنا شہزاد..... کراچی

اب کی دفعہ ماڈل بہت پیاری لگی۔ حمد و نعت کو پڑھ کر دل کو روشن کیا افسانے بس تین اچھے لگے صائمہ قریشی کا "ڈیزائنر محبت" بہت پسند آیا۔ طیبہ مرتضیٰ نے حقیقت بیان کی دور کے ڈھول واقعی میں سہانے لگتے ہیں۔ راشدہ رفعت نے "قصہ کاکروچ کا" خوب لکھا۔ "بیلا" بہت زبردست چل رہا ہے بیلا کا کردار بہت مضبوط دکھایا گیا ہے۔ لڑکیوں کو کردار کا مضبوط ہی ہونا چاہیے۔ "بیلا" ویلڈن۔ "من مورکھ کی بات نہ مانو" کی کمی محسوس ہوئی۔ "راپنزل" کا اینڈ ہونے والا ہے یہ قسط بھی بیسٹ تھی۔ "مہجور نشیمن" مصباح جی کا زور قلم اور زیادہ ہو۔ "چوڑیاں تیرے نام کی" ریحانہ آفتاب کی ہلکی پھلکی تحریر مزا دے گئی۔ "رت پیار کی" ندا حسنین نے اس بار محفل لوٹ لی۔ "گلاب دل" فرح بخاری نے بھی اچھا لکھا۔ شبانہ شوکت کے شوہر اور فاخرہ گل کی والدہ کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا ان کی مغفرت کی دعا کی۔ طلعت حسین سے ملاقات کرنا اچھا لگا۔ آفان وحید کی بھی سن لی۔ "مقابل ہے آئینہ" میں عمارہ نثار کے جوابات پسند آئے چلتے چلتے آواز کی دنیا میں رضوان زیدی سے ملے۔ مستقل سلسلے سب اچھے تھے۔ اگلے ماہ ملاقات ہوگی ان شاءاللہ۔

ج: پیاری ثنا آپ ہر ماہ ہماری محفل میں شریک ہوتی ہیں اور اپنی رائے کا بھرپور اظہار کرتی ہیں آپ بہنوں ہی کی رائے ہماری حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ہم اس کی روشنی میں کرن کے معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

انوش البصار..... اسلام آباد

بہت بہت شکریہ مجھ جیسی معمولی قاری کے خطوط کو جگہ دینے کا سب فرینڈز کو اپنا خط پڑھوایا یقین کریں مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ بات "راپنزل" کی ہو یا "من مورکھ" کی یا "مہجور نشیمن" سب ایک سے بڑھ کر ایک "بیلا" ہو یا پھر "چوڑیاں" سب چھنکتے اچھے لگے۔ "قصہ کاکروچ کا" "لومیرج" "اجنبی" سب نے دل لوٹ لیا اس دفعہ میں نے سرسری سا تبصرہ کیا ہے وجہ میرے پیپرز ہیں۔

ج: پیاری انوش واقعی اس دفعہ آپ نے سرسری سا ہی تبصرہ کیا ہے صرف تعریفیں ہی بیان کی ہیں کوئی رائے اور مشورہ نہیں دیا لیکن وجہ آپ نے اپنی تعلیمی مصروفیت بتائی ہے واقعی پہلے آپ اپنی پڑھائی پر توجہ دیں باقی سب بعد میں.....

اقراء ممتاز..... سرگودھا

ہمیشہ کی طرح ٹائٹل گرل پسند آئی۔ "میری بھی سنیے" آفان وحید قریشی سے ملاقات اچھی لگی۔ آفان

وحید لیفٹیننٹ ہیں اندازا نہیں تھا۔

سب سے پہلے مکمل ناول مصباح علی سید کا "مہجور نشیمن" کیا زبردست قسط تھی۔ مصباح جی نے اسٹوری کو کیا موڑ دیا ہے۔ ہماری تو دلی خواہش بر آئی۔ حنبل ذکا اور روائیبہ کا ایک ہو جانا۔ کچھ کچھ اندازہ تھا۔ حنبل ذکا تو اتنا ڈیسنٹ آدمی ہے ہائے زینب بے چاری اس کا کیا بنے گا۔ حنبل ذکا کی ہر ایک بات پر خوش ہو جانے والی۔

مکمل ناول "چوڑیاں تیرے نام کی" ریحان آفتاب کا مکمل ناول بہت سپرہٹ تھا۔ سہام علوی اور ناہید بیگم کی نٹ کھٹ باتوں نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ شکر ہے ثمر سے جلدی ہی جان چھوٹ گئی۔ سیمیں اور سہام علوی کا ایک ہو جانا دل خوش ہو گیا۔

ناولٹ "رت پیار کی منتظر تیری" ندا حسنین نے کیا شیری کا نقشہ کھینچا۔ شوکت تو بہت لالچی انسان نکلا۔ صرف دولت کے لیے اپنی بھتیجی کی زندگی تباہ کرنے لگا تھا۔ ایسے لوگ صرف دولت کے پجاری ہوتے ہیں۔ شہروز نے صدق دل سے مانگا۔ جانیا اسی کا ہی مقدر بنی۔ "کرن کتاب" سے ہمیشہ کی طرح معلومات کا خزانہ ملا۔ اب تو کرن سے زیادہ کرن کتاب کا انتظار رہتا ہے۔ "راپنزل" یا "بیلا" کی جگہ فرح بخاری سے اچھا سا قسط وار ناول لکھوائیں۔ جس میں زیادہ سے زیادہ کزنز ہوں۔

ج : اقراء جی کرن میں خط لکھنے کا بہت شکریہ۔ آپ کی فرمائش فرح بخاری کو پہنچا دی گئی ہے۔

کلثوم ملک ۔۔۔۔ سیالکوٹ

اس بار خط لکھنے کی اہم وجہ اس سال میں شروع ہونے والا بہترین ناول "مہجور نشیمن" ہائے مصباح علی نے مجبور کر دیا کہ اگر ان کی تعریف نہ کی جائے تو بہت زیادتی ہو گی۔ ایک ایک سطر' ایک ایک پارٹ نے اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ کمال بات یہ ہے کہ چوتھی قسط آ گئی اس کی دلچسپی اور تجسس میں ذرا برابر فرق نہیں پڑا۔ کس کمال طریقے سے روائیبہ کو پاکستان بلایا اور حنبل سے اس کی شادی۔۔۔

ویسے یہ عجیب نہیں ہو گیا جنب' اذلان' شہروز' کمال یہ بھی سب "ہیرو" کی طرح دکھائے جا رہے ہیں۔ ادھر زینب اور سلوی وہ بھی "ہیروئن" کے روپ میں موجود ہیں۔ اب پتا نہیں مصباح کہانی کو کیا موڑ دیتی ہیں۔ لیکن ناول واقعی پورے "کرن" کی جان ہے۔ بہت بہت شکریہ ہمارے لیے اتنا اچھا ناول لانے کے لیے۔

"من مورکھ" آسیہ مرزا نے اس بار قسط کیوں نہیں بھیجی وہ صفحات خالی خالی لگے۔

افسانوں میں راشدہ رفعت نے کیا خوب "قصہ کا کردچ کا" لکھا۔ افسانوں میں چھایا رہا۔

"ڈیزائنر' محبت' لومیرج" کچھ خاص پسند نہیں آئے۔ باقی سارا شمارہ ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ طلعت حسین سے ملاقات اچھی رہی۔ "مقابل ہے آئینہ" میں عمارہ نثار کے جواب حقیقت پسند لگے۔

ج : کلثوم جی کرن کی جو کہانیاں آپ کو پسند آئیں بے حد خوشی کی بات ہے اور جو پسند نہیں آئیں ان کے لیے معذرت۔ ہم اسی لیے کرن میں مختلف انداز کی کہانیاں شائع کرتے ہیں کہ ہمارے تمام قارئین اپنی اپنی پسند کی کہانیوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔

فوزیہ ثمرہٹ' ہانیہ عمران' آمنہ رئیس ۔۔۔۔ گجرات

برائیڈل کے روپ میں ماڈل اچھی لگی "حمد باری تعالیٰ" اور "نعت رسول مقبول ﷺ" ہمیشہ کی طرح پڑھ کر سکون ملا۔ فہرست کو دیکھا۔ "من مورکھ کی بات نہ مانو" اس ماہ قسط غائب تھی۔ دلی افسوس ہوا اب تو کہیں جا کے کچھ ناول کا مزا آنے لگا تھا۔ آئندہ ماہ پلیز اس ناول کے صفحات زیادہ رکھیے گا۔

"راپنزل" کو سب سے پہلے پڑھا۔ توبہ ہے تنزیلہ جی نے تو اس بار رلا رلا کے مار دیا۔ شہرین کی حالت پہ بہت دل دکھا اور رویا "کیا کینسر کی بیماری میں ہر مریض کی یہی حالت ہوتی ہے۔"

دکھ تو سمیع اور نیناں پر بھی ہوتا ہے۔ ماننا پڑے گا بھئی مرد بھی سچی محبت کر سکتا ہے۔

اظفر کی پرسنالٹی بھی سامنے آ گئی زری سمجھ دار نکلی اس نے شوہر کی بے اعتنائی اور عیش مزاجی کا ماں اور بہن سے پردہ رکھا۔ اینڈ کا بے صبری سے انتظار ہے۔ پلیز صوفیہ نے ساری عمر شوہر کی بے اعتباری جھیلی ہے۔ زری اور نیناں کو اسے دکھ سے دو چار مت کیجیے گا۔

اس بار شاہین صاحبہ نے انٹرویو خاصی بڑی شخصیت کا کیا۔ ان کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ کسی مہینے زبیدہ آپا کا بھی انٹرویو کریں۔

"مقابل ہے آئینہ" میں عمارہ نثار کی نٹ کھٹ مزے دار باتیں اچھی لگیں۔ مزاح کی حس غضب کی ہے جناب ہ کی۔

"مہجور نشیمن" پہلی قسط پڑھی تھی اور اب چوتھی پڑھی۔ خلاصہ سے کافی معلومات ملیں۔ تحریر میں 'مین ٹارگٹ روائیہ اور حنبل ہیں۔ لگتا ہے زیب کا کردار اپوس نہیں ڈالا رائٹر جی نے آگے جا کے یہ محترمہ بھی کچھ نہ کچھ کرنے والی ہیں اب جندب کا کیا ہوگا۔ جاگیرداروں کی اسٹوری ہے اور ابھی تک کوئی مولا جٹ 'شفقت چیمہ ولن کی انٹری نہیں ہوئی۔

دوسرے نمبر پر جو ناول "گلاب دل" تھا۔ پڑھ کر ہمارا بھی دل گلابو گلاب ہو گیا پیار بھری نوک جھوک غرض ہر قسم کا مرچ مسالا تھا اس تحریر میں۔ ویسے ہیپی اینڈ اچھا تھا ورنہ تو بڑے بھیا نے ولن بننے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

اس تحریر کے بعد میں پہنچی "چوڑیاں تیرے نام کی" ناول پر جی سہام علوی کو خوب سزا ملی سیمیں کو تنگ کرنے کی۔ سیمیں نے اتنے جلدی اس کو معاف کر دیا۔ تھوڑا اور تنگ کرنا چاہیے تھا۔ اسے پتا تو چلتا کسی کے دل کو کھلونا سمجھنا آسان ہوتا ہے پر جب کوئی اپنے دل کو کھلونا سمجھ کر کھیلتا ہے تو کتنا دکھ ہوتا ہے چلو اک ٹھوکر راہ راست پر لے ہی آئی سہام علوی کو۔

ناولٹ "بیلا" اس تحریر میں یہ پتا ہی نہیں چل رہا کہ منعم اور بیلا کی جوڑی ملے گی یا پھر ڈیرک کی محبت جیت جائے گی۔ پلیز لاسٹ قسط میں گاؤں کے حوالے سے زیادہ باتیں لکھیے گا۔ بیلا اور اس کے والد کی۔ منعم اور بیلا کو ملائے گا ضروری۔

نداحسنین کی "رت پیار کی" اچھی لگی۔ جو نقشہ رائٹر نے باہر کے ملک سے آنے والوں کا پیش کیا ہے شیری کا۔ ہنس ہنس کے برا حال ہو گیا۔ کیا اسٹوری میں نمونہ ڈالا تھا۔

افسانے اس بار چھ عدد تھے اور سب نے چھکے لگائے یعنی کے سارے کے سارے مزے کے تھے۔ خاص اور بیسٹ "قصہ کاکروچ کا" لگا۔ ایک تو آئیڈیا منفرد تھا دوسرا پیغام بہت اچھا لگا۔

صنوبر جب کاکروچ کا کچومر نکال رہی تھی وہ سین بہت مزے کا تھا۔ لگتا تھا اس نے بس میں ہوتا تو یونہی خاور کا بھی بھرتہ بنا دیتی۔ "کرن کتاب" مطلب "کرن کا دسترخوان" اب بہت اچھا ہو گیا۔ اس میں آپ نے کئی سلسلے شروع کر دیے ہیں۔ پہلے کرن کتاب کو میں سنبھال کر نہیں رکھتی تھی اب سنبھال کر رکھنا پڑے گا۔ بہت کار آمد ہو گئی یہ بک "کچن اور آپ"۔ واہ بھئی واہ! صفیہ ناز کیا ہی کہنے ہیں آپ کے۔ کیا خوب مزاحیہ انداز میں اپنے کچن کے خیالات بیان کیے ہیں میرے خیال میں ان محترمہ کو "مقابل ہے آئینہ" میں بھی انٹری دینی چاہیے اک شاباشی تو ان کی بنتی ہیں ناں۔

مجھے یہ پوچھنا تھا کہ "کچن اور آپ" میں کسی ڈش کی ترکیب لکھنا لازم ہے کیا؟

اب اس کتاب میں گھریلو اشیاء سے ڈیکوریشن پیس بنانا بھی بتایئے گا جیسے کہ میں نے سنا ہے پرانے اخبار سے لوگ بہت ساری اشیاء بنا رہے ہیں اور پلیز یہ رنگوں کے بارے میں بھی بتایئے گا۔ رنگ کیسے بنتے ہیں۔ لال میں کالا ملانے سے کیا جامنی ہوتا ہے۔ اس کے متعلق بھی ضرور شائع کریں اور مستقل سلسلے سارے بہت اچھے تھے۔ اور ہاں جی اب اپنے فیورٹ سلسلے "نامے میرے نام" کی بات ہو جائے پہلے تو بہت بہت شکریہ آپ نے میرے خط کو شامل کیا۔

ج : فوزیہ 'ہانیہ عمران' آمنہ رئیس آپ تینوں کا بہت شکریہ کہ آپ نے کرن کی محفل "نامے میرے نام" میں شرکت کی۔ آپ کی فرمائشیں نوٹ کر لی گئی ہیں ان شاء اللہ جلد پورا کریں گے۔ فوزیہ آپ "کچن اور آپ" یا "مقابل ہے آئینہ" میں شرکت کرنا چاہتی ہیں تو ہمیں ضرور اپنے جوابات بھیجیں۔ دوسری بات یہ کہ جو تمام قارئین بہنوں کے لیے ہے کہ اگر آپ کو کسی اپنے کے لیے کوئی پیغام یا مبارک باد دینی ہے تو یا کسی رائٹر کو کوئی پیغام دینا ہے تو کرن کے دسترخوان کے سلسلے "آپ کا پیغام 'اپنوں کے نام" کے ذریعے دے سکتی ہیں۔

طیبہ خان..... نواب شاہ

میری ایک فرمائش ہے پلیز عائشہ جہاں زیب "خبرناک" کی ہوسٹ کا انٹرویو کریں نا۔ اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف۔ "من مورکھ" کو نہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی "راپنزل" میں تنزیلہ ریاض جی نے پہلے تو سلیم کو مار کے کہانی کا مزا ہی خراب کر دیا اور اب نینا کی شادی سمیع سے خاور بے چارے کا کیا بنے گا بہت اچھی ہے یہ کہانی "مہجور نشیمن" بھئی زبردست جا رہا ہے اور "بیلا" تو میرا

موسٹ فیورٹ ناولٹ ہے اس میں مجھے بیلا اس کی امی ' ابا اور جیدی کا کردار بہت پسند ہے۔ "گلاب دل" بھی زبردست ناول تھا عارب اور ماہ رخ کا کردار پسند آیا "چوڑیاں" بھی اچھا ناول تھا "رت پیار کی" ندا حسنین نے بھی اچھا لکھا افسانوں میں سب سے اچھا افسانہ "تجھ سے ناراض نہیں زندگی" تھا فرح بے چاری کس قدر مجبور تھی امتیاز صاحب جیسے بھیڑیے تو جگہ جگہ موجود ہوتے ہیں ماں کو تو اسے سمجھنا چاہیے تھا ایک لڑکی کے لیے سب سے قیمتی چیز عزت ہی تو ہوتی ہے۔

"ڈیزائنر محبت" بھی زبردست تھا عرشیہ بے چاری بھی حق پہ تھی ظاہر ہے جینے کے لیے پیسا ضروری ہوتا ہے اور جیسی سلائی طیبہ کو آتی ہے اللہ کرے مجھے بھی آجائے آپ لوگ بھی دعا کرنا۔ "قصہ کا کرچ کا" میں راشدہ رفعت نے بھی کمال کر دیا شکر ہے خاور کو عقل تو آئی جیسے بھی سہی۔ "دور کے ڈھول سہانے" اچھا سبق ملا ثروت اور سونیا کو "اجنبی" افسانہ بھی اچھا تھا "لو میرج" میں بچے توبہ توبہ بڑوں سے بھی چار ہاتھ آگے نکلے شکر ہے رازی کی تو نیا پار لگی۔ بہت اچھا لگا یہ افسانہ بھی "کچھ موتی چنے ہیں" سلسلہ بھی بہت اچھا ہے اور "نامے میرے نام" میں فوزیہ ثمر بٹ اور ثمینہ اکرم کا خط شوق سے پڑھتی ہوں۔ "مقابل ہے آئینہ" میں عمارہ نثار سے ملاقات اچھی رہی۔

ج : طیبہ جی! آپ ہم سے ہمیشہ اچھی امید رکھا کیجیے ایسا تو ممکن ہی نہیں کہ آپ قارئین ہمیں خط لکھیں اور ہم اسے "نامے میرے نام" کی محفل میں شریک نہ کریں۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید کو پہنچا دی گئی ہے ان شاءاللہ جلدی پوری کریں گے۔ کرن کی کہانیوں کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔

اصغری عنایت اللہ...... قصور

اس مہینے کا رسالہ بھی ہمیشہ کی طرح سب پر بازی لے گیا۔ نیا شروع ہونے والا ناول مصباح علی سید کا "مہجور نشیمن" جتنی خوب صورتی سے کرداروں کو لے کر چل رہی ہیں تو ایک ہی لفظ کہوں گی ماشاءاللہ اتنے کردار ' ہر کردار پر پوری گرفت۔

اچھا بہن ایک بات بتاؤ یہ ہیرو کو مروا کر آخر ملتا کیا ہے۔ فرحت اشتیاق نے عابی مار دیا۔ آسیہ مرزا نے حازم مارا۔ تنزیلہ بہن نے سلیم کو جینے نا دیا۔ اور مصباح بیٹا تم نے تو ازمیر کے ساتھ مریم بھی مار دی۔ بہت بہت دیر رونا آیا ایک تو عرشہ جینے نہ دے اوپر سے منظر ایسے جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔ بہت ہی خوب پیار لکھا۔ مریم ازمیر کا ب ذکر کرتے بھی آنسو آگئے۔

روائیہ نام بہت خوب صورت لگا۔ مطلب ضرور بتانا۔ آج کل میں اچھے اچھے نام جمع کر رہی ہوں۔ سمجھ تو گئیں ہوں گی آپ (بہو امید سے ہے خیر سے) ناولز کا ذکر اور میری پیاری بہن تنزیلہ کا نا ہو پھر تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ "راپنزل" بہت ہی کمال کر دیا آپ نے مجھے شروع سے نینا بہت پسند آئی۔ آسیہ مرزا اس بار کہاں چلی گئیں۔ بس کہانی ختم ہے جلدی سے اینڈ بتا دو۔

ناولٹ دونوں اچھے تھے "بیلا" بھی اچھا ہے بڑی ہی بیبا بچی بنائی مشا نے۔ افسانے اچھے تھے سبق آموز بھی۔

"زندگی ناراض نہیں" ثمینہ مشتاق کا بہت اچھا حقیقت سے بالکل قریب تر۔

رسم و رواج کو روتے رہو۔ بھلے عزت رہے نہ رہے۔ توبہ ہے لوگوں کی سوچ پر۔

"چوڑیاں تیرے نام کی" ریحانہ آفتاب کا کچھ خاص نہیں لگا۔ "گلاب دل" فرح بخاری نے ہلکے انداز میں لکھا۔ اماں کی سادگی ' تائی جان سے لڑائی۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ طیبہ مرتضیٰ نے دور کے ڈھول سہانے بجائے رطلعت حسین میرے پسندیدہ اداکار کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔

ج : اصغری صاحبہ آپ نے "نامے میرے نام" میں شرکت کی بہت خوشی محسوس ہوئی۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی کرن کی کہانیوں کے بارے میں اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں گی۔ ہمارے طرف سے آپ کو اور آپ کی بہو کو بہت بہت مبارک ہو۔

رامین ملک...... نامعلوم

کرن کا سرورق بہت اچھا لگا۔ حمد اور نعت سے فیض یاب ہوئے اور پھر ترتیب سے رسالہ پڑھنا شروع کیا۔ "راپنزل" نے بالکل سمیٹ دیا اب آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ سب سے پہلے افسانوں پر دوڑ لگائی سارے ہی زبردست لگے۔ "لو میرج" عائشہ تنویر نے بہت پیارا لکھا پڑھتے ہوئے کئی جگہ ہنسی بھی آئی اتنے دھڑلے کے ساتھ خالہ بی ' عاقل میاں کی بے عزتی کرتی پائی گئیں۔ روما اور رازی کیا خوب صورت جوڑی۔ ثمینہ مشتاق کا "ناراض نہیں زندگی" یہ کہانی ہماری معاشرتی سوچ کی بالکل عکاسی کرتی ہے گھر جلدی آنے والی کو بھی دیر سے

آنے والی کو بھی کسی نہ کسی طرح طعنوں کی نوک پر رکھتے ہیں جس طرح فرح کو رکھا۔ اس کے ہمسائیوں نے۔ ''اجنبی'' اور ڈیزائنر محبت بھی اچھا لگا۔ اب آتے ہیں ناولٹ کی طرف ندا حسین کا ''رت پیار کی منتظر تیری'' بہت ہی خوب صورت لکھا۔ عید کی مناسبت سے کہانی لطف دے گئی۔ خاص طور پر نانی اور پوتی رانی کے مکالمے اور پھر نانی اور دادی نے مل کر جانیا اور شہروز کے لیے راستہ کس خوب صورتی سے صاف کیا۔ سلطانہ بیگم اپنا سامنہ لے کر رہ گئیں۔

مکمل ناول میں مصباح علی کا ''مجبور نشیمن'' ۔ کہانی بہترین ہے ۔ مصباح کے پہلے بھی دو چار افسانے پڑھے ٹھیک ہے اچھے تھے لیکن ایسے بھی کوئی توپ مار کے نہیں تھے۔ جس طرح سے وہ اس کہانی کو لے کر آئی ہیں اتنی بڑی چیز مکمل گرفت کے ساتھ۔ حنبل ذکا کا کردار مکمل اور خوب صورت۔ جہاں جہاں اس کا پارٹ آتا ہے لمحوں میں وقت گزر جاتا ہے۔ لیکن مجھے بہت خوف ہے نہیں مصباح حنبل کے ہاتھوں روائیبہ کو مروا نہ دیں کیوں کہ حنبل نے شادی سے پہلے کہا تھا کہ ہم عزت پر حرف نہیں آنے دیتے عورت کو مار دیتے ہیں کیونکہ بہت سے کردار روائیبہ کی زندگی کے گرد گھما رہی ہیں۔ پلیز دکھی اینڈ نہیں کیجیے گا۔ باقی مستقل سلسلے بھی بہت خوب صورت تھے۔ خاص طور پر ''مسکراتی کرنیں''۔

''کرن دستر خوان'' کتاب بہت اچھی تھی اس سے تو ہمارا بھی دستر خوان سچ مچ سج گیا۔ ''میری بھی سنیے'' میں آفان وحید کو خوب سنا۔ محمد عامر کرکٹر کا انٹرویو شائع کریں۔ اتنا بڑا کارنامہ کر دیا انڈیا سے جیت کر اور اپنے کسی ایک کھلاڑی کا انٹرویو شامل نہیں کیا۔

ج : رامین ملک جی! آپ نے کرن کی کہانیوں کو پسند کیا بے حد شکریہ۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا دی گئی ہے۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی ''نامے میرے نام'' کی محفل میں ضرور شرکت کریں گی۔

صبا آصف

جولائی کا شمارہ خوب صورت ٹائٹل سے سجا ہمارے ہاتھوں میں خوب صورت لباس میں زیورات سے سجی ماڈل بہت اچھی لگی سرورق عید کی مناسبت سے تھا ماڈل کے ہاتھ کی مہندی اور چوڑیاں ''دور کے ڈھول سہانے'' طیبہ مرتضیٰ کی ہلکی پھلکی تحریر انسانی فطرت کے قریب دیکھی۔ مقابلے بازی زیادہ تر خواتین اور لڑکیوں کی عادت لیکن سونیا نے تو حد ہی کر دی۔ فرح بخاری کا ناول ''گلاب دل'' اچھا تھا ایک گھریلو کہانی نگار۔ عارب' ریبا اچھی فطرت رکھنے والے اچھے انسان دنیا میں ایسے لوگوں کی وجہ سے لوگوں کی زندگیاں آسان ہو جاتی ہیں۔ منشا محسن علی کا ناولٹ ''بیلا'' ہمیشہ کی طرح اچھا لگا علم حاصل کرنے کی جدوجہد کرتی بیلا اور علم کے حصول کے لیے اس کے والد والدہ اور بھائی کی بیٹی اور بہن سے دوسری لوگوں کی مخالفت مول لے کر بیٹی کو دوسرے شہر بھیجنا۔ ایک اچھی کہانی بیلا کا پہلی سحری میں فون کرنا اور ماحول کو محسوس کرنا مجھے اس زمانے میں لے گیا جب میں شادی کے بعد سعودی عرب میں رہتی تھی میں رمضان' عید' بقر عید کے تہوار کو ایسے ہی محسوس کرتی تھی اور تصور میں پاکستان پہنچی ہوتی تھی۔ راشدہ رفعت کا افسانہ ''قصہ کاکروچ کا'' بہت زبردست خاور تو خاصا سمجھ دار نکلا۔ ''تجھ سے ناراض نہیں زندگی'' ثمینہ مشتاق کی حالات کی تلخی لیے تحریر' حالات کی چکی میں پستی لڑکیاں معاشرتی ناہمواریاں لوگوں کی گندی سوچ چاہے وہ پڑوسن ہوں یا امتیاز صاحب زندگی کو دوسروں کے لیے مشکل بنا دینے والے لوگ۔ کرن کا دستر خوان بہت اچھا لگا۔ کھانا پکانے کی بہترین ترکیبوں کے ساتھ ساتھ بہت سے رنگ لیے عمرانہ مقصود کا انٹرویو بہت اچھا لگا بہت کام کی باتیں بتائیں۔ ''رشتے نبھانا'' سیکھیں زبردست اور ''کچن اور آپ'' میں کچن سے متعلق صفیہ ناز کے دلچسپ جوابات نے تو میلا لوٹ لیا پڑھتے ہوئے بہت مزا آیا۔ سوال نمبر 1 کے جواب اور ''آملیٹ'' نے تو مسکرانے پر مجبور کر دیا مسکراہٹ کی یہ مجبوری ہمیں بہت بھائی۔ ویلڈن صفیہ ناز ویلڈن اتنا اچھا سلسلہ شروع کرنے پر شکریہ تو بنتا ہے تو بھئی بہت بہت شکریہ۔

ج : صبا جی! آپ نے خط لکھا اور اپنی پسند اور رائے سے آگاہ کیا بہت شکریہ ہم آئندہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی ''نامے میرے نام'' میں ضرور شرکت کریں گی۔

☆ ☆